تحقیقی مقالہ برائے ڈی۔فل۔

نگراں

پروفیسر شبنم حمید

صدر شعبۂ اردو

الہ آباد یونیورسٹی پریاگ راج (الہ آباد)

مقالہ نگار

امتیاز احمد

ریسرچ اسکالر

شعبۂ اردو الہ آباد یونیورسٹی پریاگ راج (الہ آباد)

شعبۂ اردو

الہ آباد یونیورسٹی پریاگ راج (الہ آباد)

۲۰۲۱ء

RIYASAT JAMMU-O-KASHMEER MEIN URDU NOVEL 1947 KE BAAD

A THESIS SUBMITTED FOR THE DEGREE OF D.Phil. IN THE FACULTY OF ARTS UNIVERSITY OF ALLAHABAD

Under the Supervision of:

Prof. Shabnam Hameed
Head of Department
Department of Urdu
University of Allahabad
Prayagraj (Allahabad)

Submitted By:

Amtiaz Ahmad
Research Scholar
Department of Urdu
University of Allahabad
Prayagraj (Allahabad)

DEPARTMENT OF URDU
UNIVERSITY OF ALLAHABAD
PRAYAGRAJ, ALLAHABAD
2021

PDF By :

Meer Zaheer Abass Rustmani

Cell Number : +92 307 2128068

Facebook Group Link :

https://www.facebook.com/groups/1144796425720955/

تلخیص

اردو ادب کی مشہور نثری اصناف میں سے ناول بھی ایک اہم صنف ہے۔اس کی اہمیت اس لئے بھی اور بڑھ جاتی ہے کیوں کہ اس میں ہماری حقیقی زندگی کا عکس نظر آتا ہے اس میں ہماری امنگیں اور آرزوئیں جھلکتی ہیں۔ہمیں زندگی میں کن کن مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے کس طرح کی پریشانیاں دیکھنی پڑتی ہیں کن حالات سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔غرض ناول جس دور میں اور جس جس جگہ یا جس معاشرے کو بنیاد بنا کر لکھا جاتا ہے اس مقام کے افراد، رسم ورواج تہذیب ومعاشرت، زبان وبیان وہاں کے تاریخی آثار، وہاں کا جغرافیائی پس منظر، وہاں کی سیاسی سرگرمیاں وغیرہ کی مکمل عکاسی کرتا ہے۔اردو زبان میں اب تک بے شمار ناول لکھے گئے ہیں۔ریاست جموں وکشمیر میں اردو ناولوں کی طرف اگر چہ بہت بعد میں توجہ کی گئی لیکن ریاست جموں وکشمیر میں لکھے گئے اردو ناول بھی اردو ادب کے لئے بیش قیمت اثاثہ ہیں اس مقالے میں آزادی کے بعد ریاست جموں وکشمیر میں لکھے گئے ناولوں کا تنقیدی جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ مقالے کو پانچ ابواب میں تقسیم کیا گیا ہے۔

باب اول:۔''اردو ناول کا سیاسی وسماجی پس منظر'' کے عنوان سے قائم کیا گیا ہے۔ ۱۸۵۷ء کی بغاوت ایک ایسا ہنگامہ ہے جس نے ہندوستان کے ہر شعبہ پر اثر ڈالا چاہے وہ سیاسی ہو یا سماجی ثقافتی ہو یا ادبی ہر زاویہ نظر سے بڑی اہمیت رکھتا ہے۔اس لڑائی کے پیچھے اسباب وعلل کا پورا ایک سلسلہ تھا لیکن یہاں صرف ادب سے متعلق بحث کی گئی ہے کوئی بھی ادب اپنے سماج سے متاثر ہوئے بغیر ایک قدم بھی آگے نہیں بڑھ سکتا۔ ہر دور کا ادب اس وقت کے سیاسی وسماجی اتار چڑھاؤ سے کسی نہ کسی نوعیت میں منسلک رہتا ہے۔ پھر یہ ہنگامہ جو مختلف تبدیلیوں کا باعث بنا جس کے اثرات سے ہندوستان ایک انقلابی موڑ سے دوچار ہوا۔ جہاں سماجی وسیاسی تبدیلیاں رونما ہوئیں وہاں ادبی اعتبار سے بھی یہ غدر بہت متاثر کن ثابت ہوا۔غدر

سے پہلے اردو ادب ایک دوسرے ہی ماحول سے دوچار تھا۔ شاعروں اور ادیبوں کے سرپرست عام طور پر امیر اور رئیس لوگ ہوا کرتے تھے۔ سماج میں نرمی، شیرینی اور آسودگی تھی۔ آرام پسندی اور عیش وعشرت معاشرے کا حصہ تھا۔ جاگیردارانہ، سرمایہ دارانہ نظام کے اثرات غالب تھے۔ چنانچہ ادب میں بھی کچھ اس طرح کے عناصر اور اثرات دکھائی دیتے ہیں۔ پھر جب یہاں انگریز حاکم ہوئے رفتہ رفتہ ظلم وجبر کا دور دورہ ہونے لگا۔ اس کے جواب میں بغاوت کی آگ بھڑک اٹھی سارا شیرازہ بکھر گیا۔ ہر شے میں انقلاب آ گیا۔ پورے ہندوستانی سماج میں یہ تضاد اور انتشار پھیلتا گیا۔ ایسٹ انڈیا کمپنی اپنے ظلم کے شکنجے کستی چلی گئی۔ امتیازات بڑھتے گئے۔ دہلی اجڑ چکی تھی لکھنوی تہذیب انگریزوں کے پیروں تلے روندی جا چکی تھی۔ ایسے حالات میں ادب کیسے بچ سکتا تھا لہٰذا وہ بھی لپیٹ میں آیا۔ ادیب بھی پریشانی اور خستہ حالی کے بھنور میں پھنسے اور یہی خستہ حالی، افسردگی ہمیں اس وقت کے ادب میں نمایاں طور پر نظر آتی ہے کیوں کہ ادیب بھی اس سماج کا حصہ تھے وہ بھی ان حالات سے دوچار ہوئے چنانچہ اس عہد کے ادب میں نمایاں تبدیلیاں رونما ہوئیں۔

مرزا غالب اس دور کے ادبی اور تمدنی روایات کے بہترین پیکر سمجھے جاتے ہیں۔ جو بعض مقامات میں انگریزی پالیسی کے معترف بھی تھے لیکن بغاوت نے انہیں بھی متاثر کیا۔ ان کی شاعری اور خطوط میں اس کے اثرات واضح طور پر دیکھے جا سکتے ہیں۔ خطوط غالب، داستان غدر از ظہیر دہلوی، تاریخ سرکشی بجنور اور اسباب بغاوت ہند از سرسید، تاریخ ہند از ذکا اللہ فغاں دہلوی، واجد علی شاہ، منیر شکوہ آبادی، بہادر شاہ ظفر، شیفتہ وغیرہ کی نظمیں جو دوران بغاوت لکھی گئی تھیں کافی اہم ہیں۔

یہ حقیقت ہے کہ بغاوت اچانک اٹھی اور دب گئی۔ ہنگامے ہوئے اور سرد پڑ گئے لیکن بغاوت کے بعد جو ہندوستانی عوام کا ذہن جاگا، دل میں بیداری آئی، اپنے آپ کو پہچاننے کی سمجھ آئی اور جب ان سب کے باوجود انگریزوں کے ظلم وزیادتی میں کسی طرح کی کمی نہیں آئی تو ساری بیداریاں متحد ہو گئیں اور اپنے آپ کو ایک سنجیدہ اور روشن راہ پر گامزن کر دیا، ذہن جاگا، فکر نے کروٹ لی خیالات روشن ہوئے اور ان سب کے نتائج غدر کے بعد آہستہ آہستہ نمایاں طور پر نظر آنے لگتے ہیں۔ ادب میں بھی اس طرح کی

تبدیلیاں رونما ہوئیں ہنگامے سے ذرا پہلے اور ہنگامے کے وقت جو افسردگی، بے بسی، تاریکی اور ویرانی ادب میں ملتی ہے بغاوت کے بعد اس میں بھی تبدیلی آنے لگتی ہے۔ ۱۸۵۷ء کے بعد اردو ادب میں ایک نئی فکر، ایک نئے جوش ایک نئی تبدیلی، ایک نئی تحریر کا آغاز ہونے لگا۔ ادیبوں اور دانشوروں نے بھی سوچا کہ نئے خیالات سے ادب کو کافی فائدہ مل سکتا ہے۔ لہٰذا وہ مستقبل کی شمع روشن کرنے میں لگ گئے اور ادب میں رفتہ رفتہ ایک خاموش انقلاب کی شکل نظر آنے لگی مثنویوں کا دور ختم ہوا کیوں کہ اس کے مزاج کی فضا اب باقی نہ رہی۔ دربار اجڑ گئے تو قصیدے کا زوال آ گیا۔ نیا دور آیا تو مشغولیات بڑھیں۔ داستانیں مٹنے لگیں۔ فرد کے بجائے اب پورے سماج سے تعلق ہونے لگا۔ ادیب سنبھلے اور اپنے قلم کو فضولیات سے ہٹا کر زندگی کی حقیقتوں کی طرف موڑ دیا نیا دور اپنے ساتھ سائنس لایا۔ مغربی رجحانات لایا۔ بس ایسے ہی ماحول میں اردو ادب کے چند علم بردار سامنے آئے جنھوں نے فرسودہ ادب میں نئے خیالات، نئے احساسات اپنے قلم کے ذریعے دیے۔ غرض کہ اس بغاوت سے اردو ادب میں بے شمار تبدیلیاں رونما ہوئیں۔

علی گڑھ تحریک کے ذریعے اردو نثر کی ترقی کے لئے جو کام کیا گیا ہے وہ نا قابل فراموش ہے اردو نثر سر سید احمد خاں کی کاوشوں کی بدولت نہ صرف متاثر ہوئی بلکہ پروان بھی چڑھی اور آخر انیسویں صدی کی ہر ادبی تخلیق پر ان کے افکار و خیالات اور نثری نگارشات کا اثر نظر آتا ہے۔ نہ صرف اردو بلکہ مستقبل کی زبان کے لئے بھی نئی سمت مقرر کی۔

سر سید جو بنیادی طور پر مصلح تھے۔ انہیں جب اپنی آراء اور افکار کے اظہار کے لئے اردو کا دامن تنگ نظر آیا تو انھوں نے خود اپنا ایک جہانِ زبان و ادب تعمیر کر ڈالا۔ انھوں نے ارادی طور پر ایسے مضامین لکھے جن میں دلائل و شواہد کی ایک خاص منطقی ترتیب ہوتی ہے ان کی نثر تضاد سے پاک ہے عموماً عبارت آرائی، انشا پردازی اور روایتی محاسن نگارش کو اہمیت نہیں دیتے بلکہ اپنے مقصد کو صراحت اور سلاست سے بیان کرنا ضروری سمجھتے ہیں۔ سر سید نے اپنی تمام تر مصروفیات کے باوجود تصنیف و تالیف کے لئے وقت نکالا تاریخ، آثار قدیمہ، سیاست، صحافت، ادب، مذہب اور سائنس وغیرہ سے ان کی دلچسپی نے ان سے ہر طرح کے موضوعات و مضامین پر خامہ فرسائی کے مواقع فراہم کرائے۔ انھوں نے جس موضوع و مضمون کو بھی

اپنے احاطۂ تحریر میں لیا، نہ صرف یہ کہ اس کا حق ادا کر دیا بلکہ سرگرم کارکنوں کی ایک جماعت بھی تیار کر دی جنھوں نے ایک نئے طرز فکر اور دبستان کی بنیاد ڈالی۔ انسٹی ٹیوٹ گزٹ اور تہذیب الاخلاق میں ان کے بے شمار مضامین شائع ہوئے یہ مضامین دو قسم کے تھے، علمی مضامین اور انشائیے۔ سرسید نے اپنے رسالوں اور تحریروں کے ذریعے اردو کے دوسرے ادیبوں کی توجہ ایسے ادب کی طرف مبذول کی جو تعمیری، اخلاقی اور افادی ہوں اور ان کے افکار و خیالات سے متاثر ہو کر ارباب علم و فن کا ایک ایسا حلقہ پیدا ہو گیا جو ان کا ہمنوا اور ہم مسلک بنا، جنھیں انھوں نے فکری سطح پر معروضی طرز اختیار کرنے اور سائنسی نقطہ نظر اپنانے کی دعوت دی۔ رفتہ رفتہ یہ حلقہ وسیع ہوتا گیا اور ان اہل قلم نے جس دبستان کی بنیاد ڈالی وہ علی گڑھ تحریک کے نام سے معروف ہوئی ان کے رفقا نے بھی سلیس و صاف زبان میں اظہار خیال کیا چنانچہ اس تحریک کے زیر اثر انیسویں صدی کی آخری تین دہائیوں میں اردو میں کئی ادیب سامنے آئے جن میں محسن الملک، وقار الملک چراغ علی، محمد حسین آزاد، نذیر احمد، الطاف حسین حالی، شبلی نعمانی اور ذکا اللہ وغیرہ کے نام اہم ہیں۔

وقار الملک بھی سائینٹیفک سوسائٹی کے سرگرم رکن تھے اور تعلیمی تحریک میں سید احمد خاں کے دوش بدوش کوشاں رہے۔ انھوں نے مغربی تعلیم کے ساتھ ساتھ مذہب کی تدریس کو بھی ضروری قرار دیا۔ ان کی تحریروں سے اردو نثر کی ترویج ہوئی ان کے اخلاقی اور اصلاحی مضامین انسٹی ٹیوٹ گزٹ اور تہذیب الاخلاق میں شائع ہوئے۔ انھوں نے کارلائل کی کتاب سے ''انقلاب فرانس'' کا اردو ترجمہ کیا۔ اور ان کے خطوط کا مجموعہ بھی سرسید اکیڈمی علی گڑھ سے طبع ہوا ہے۔ چراغ علی عربی، فارسی، انگریزی اور اردو زبانوں کے ماہر تھے۔ لاطینی اور یونانی سے بھی واقفیت تھی چونکہ انھیں اسلام سے غیر معمولی موانست تھی۔ انھوں نے عیسائیوں کی طرف سے اسلام پر کئے گئے اعتراضات کا مدلل جواب لکھا اور کئی انگریزی کتابوں کا اردو میں ترجمہ کیا جن میں ''محمد پیغمبر برحق''، ''تعلیقات''، ''تحقیق الجہاد''، ''اسلام کی دنیاوی برکتیں'' اور ''قدیم قوموں کی مختصر تاریخ'' وغیرہ اہم ہیں۔ محمد حسین آزاد نے ''آب حیات''، ''سخندان فارس''، ''قصص ہند''، ''دربار اکبری'' اور ''نیرنگ خیال'' جیسی تصانیف اردو ادب کے لئے یادگار چھوڑی ہیں منشی ذکاء اللہ بھی سائنٹفک سوسائٹی کے رکن ۱۸۶۶ء میں بنے۔ انھوں نے مغربی علوم کی کتابوں کے اردو تراجم کی پرزور تائید

کی اور عملاً سوسائٹی کے اس مقصد کو تقویت پہنچائی۔ ان کی اکثر کتابیں انگریزی سے ترجمہ ہیں۔ ان کی تصانیف ریاضی، تاریخ ادب و فلسفہ اور جغرافیہ کے موضوع پر ہیں تدریسی رسالوں کے علاوہ ''تاریخ ہندوستان'' آٹھ جلدوں میں ان کا ایک اہم کارنامہ ہے۔

مولوی نذیر احمد بھی سرسید تحریک سے وابستہ تھے۔ اصلاح قوم کا جذبہ دونوں میں مشترک تھا۔ نذیر احمد نے اپنا سارا زور قلم اصلاح معاشرہ پر صرف کیا اور اس کے ایک جز و یعنی طبقہ نسواں کے حال زبوں کی طرف توجہ کی اور اپنے ناولوں کو ان کی تعلیم اور کردار کی درستی کا ذریعہ بنایا۔ ان کے چھ ناول ''مراۃ العروس''، ''رویائے صادقہ''، ''بنات النعش''، ''توبتہ النصوح''، ''فسانہ مبتلا'' اور ''ابن الوقت'' ہیں جنہیں اردو ادب میں بے پناہ مقبولیت حاصل ہوئی۔

مولانا حالی سے سرسید نے ''مسدس مدو جزر اسلام'' لکھوائی۔ حالی کی نظمیں نیچرل شاعری کا اعلیٰ نمونہ تھیں۔ ''مقدمہ شعر و شاعری'' ان کا ایک اہم کارنامہ ہے ''حیات سعدی''، ''یادگار غالب'' اور ''حیات جاوید'' بھی کافی اہمیت کی حامل ہیں۔ شبلی نعمانی مدرسۃ العلوم علی گڑھ میں عربی زبان و ادب کے مدرس ۱۸۸۴ء میں مقرر ہوئے۔ شبلی نے ''المامون''، ''الغزالی''، ''الفاروق''، ''شعر العجم'' اور ''موازنہ انیس و دبیر'' لکھ کر اردو نثر کو فروغ دیا۔ غرض کہ علی گڑھ کے زیر اثر اردو نثر کی ترقی کی رفتار نہ صرف تیز ہوئی بلکہ اس میں نمایاں تبدیلیاں بھی رونما ہوئیں۔ علی گڑھ تحریک نے علمی نثر کو بالخصوص فروغ دیا۔

اردو ناول کی بنیاد نذیر احمد کے ناول ''مراۃ العروس'' سے پڑی جو ۱۸۶۹ء میں لکھا گیا۔ مراۃ العروس نذیر احمد کا وہ شاہکار کارنامہ ہے جو ان کی شہرت کا باعث بنا۔ جب بھی اردو ناول کا ذکر کیا جائے گا تو نذیر احمد کا نام ضرور آئے گا کیوں کہ نذیر احمد ہی اس صنف کے بانی ہیں۔ مراۃ العروس کا موضوع تعلیم نسواں ہے۔ مولانا تعلیم نسواں کو اس لئے ضروری قرار دیتے ہیں کہ بچوں کی پرورش و نگہداشت کی ذمہ داری عورتوں پر ہے۔

کچھ فنی خامیوں کے باوجود مراۃ العروس ناول میں مافوق الفطرت عناصر سے گریز اور اس دور کی معاشرتی زندگی کی بھرپور عکاسی اس بات کا ثبوت ہے کہ نذیر احمد نے ناول کی داغ بیل ڈال کر یہ واضح کر دیا

کہ ناول ہی اصلاح معاشرہ کا بہترین ذریعہ ہے بنات النعش ،ابن الوقت، رویائے صادقہ ،توبتہ النصوح اور''فسانہ مبتلا'' بھی ان کے اہم ناول ہیں۔نذیر احمد کے بعد دوسرے اہم ناول نگار پنڈت رتن ناتھ سرشار ہیں ان کے ناولوں میں ''فسانہ آزاد'' ''سیر کہسار''، ''کافی''، ''پی کہاں''، ''جام سرشار''، ''خدائی فوجدار''، ''کڑم دھڑم'' وغیرہ کافی مقبول ہوئے سرشار انگریزی کے مطالعے سے صنف ناول سے واقف ہو چکے تھے اور اپنی تخلیقات کو انہوں نے ناول سمجھ کر ہی لکھا۔لیکن وہ کہیں لاشعوری طور پر ناول کی حدود سے نکلتے چلے گئے۔وہ اکثر لکھنؤ کی بھیڑ بھاڑ اور سرور کی زبان کے جادو میں اس قدر کھو جاتے ہیں کہ ان کی تحریر اپنے آپ کو ناول نگاری سے دور لے جاتی ہے۔ بہر حال سرشار نے نذیر احمد سے بالکل الگ موضوع لے کر اپنی تخلیقات کے ذریعہ صنف ناول میں بہت اہم اضافے کئے جن کو کبھی فراموش نہیں کیا جا سکتا۔عبدالحلیم شرر نے اردو میں تاریخی ناول کی بنیاد ڈالی۔ان کے ناولوں میں ''ملک العزیز ورجینا''،''حسن انجیلنا''، ''منصور موہنا''، ''قیس ولبنیٰ''، ''ایام عرب''، ''فردوس بریں''، ''مقدس نازنین'' وغیرہ اہم ہیں۔''فردوس بریں'' اردو ناول کی ہیئت میں سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے ناول کا وہ آہنگ جس میں ناول کے پورے عناصر ترکیبی مل کر ایک مکمل تاثر پیدا کرتے ہیں اس ناول میں پلاٹ، کردار، مکالمے، ماحول، جذبات نگاری اور فلسفۂ حیات مل کر اردو ناول کی ہیئت میں ڈرامائی ناول نگاری کی بنیادیں مستحکم کیں۔''فردوس بریں'' میں بھی ڈرامائی ناول کا امتیازی وصف یعنی زندگی کے تجربات کی تصویر کشی ملتی ہے شرر کی ناول نگاری کی حیثیت مسلم ہے انہوں نے تاریخی ناول لکھے ہیں شرر چونکہ اسلامی جذبے سے سرشار تھے اس لئے ان کے یہاں اسلامی کردار مثالی بن کر سامنے آئے ہیں۔شرر دراصل ایمان وآگہی کے تقاضوں کو اپنے ناولوں کی تخلیق سے پورا کرنا چاہتے ہیں لہٰذا اس عقبی زمین میں وہ تجدید نہیں ہو پاتی۔جس کے وہ خواہاں ہیں۔اسلامی شعار مبالغے میں دب جاتا ہے اور تجدید اسلام کی اسپرٹ دم توڑ دیتی ہے مرزا محمد ہادی رسوا کے اہم ناولوں میں ''ذات شریف''، ''شریف زادہ''، ''اختری بیگم''، ''افشائے راز'' اور ''امراؤ جان ادا'' ہیں ان کی شہرت کا باعث ''امراؤ جان ادا'' ہی بنا، رسوا کے ناول مقصدیت کے حامل ہیں رسوا نے اپنے زمانے کی سماجی زندگی کے جملہ پہلوؤں کو اپنے ناولوں میں مہارت اور خوبی کے ساتھ پیش کیا ہے۔سماجی مسائل کو حالات و واقعات

کے پیرائے میں پیش کیا ہے اردو ناول کی تاریخ میں ان کا نام ''امراؤ جان ادا'' کی وجہ سے کافی شہرت کا حامل ہے۔

باب دوم:۔''ریاست جموں وکشمیر میں اردو زبان وادب کا ارتقا اور ناول کی روایت'' کے عنوان سے قائم کیا گیا ہے۔ ریاست جموں وکشمیر جو اپنے قدرتی حسن اور فطرت کی جادوگری سے مزین ہے کشمیر کے باغات، برف سے ڈھکی ہوئی خوبصورت پہاڑیاں، ڈل جھیل کا منظر، گلمرگ یا سونا مرگ کے وہ خوبصورت مقامات جو ہر راہگیر کو اور ہر سیاح کو اپنا گرویدہ بنا لیتے ہیں جس نے بھی اس وادی میں قدم رکھا اس نے اس کی خوبصورتی اور مسحورکن صورتحال کو قبائے سخن بنا کر پیش کیا۔ مصنفین کے لئے ہمیشہ ہی کشمیر ایک محبوب موضوع رہا ہے مختلف شاعروں، ادیبوں اور سیاحوں نے کشمیر کو مختلف نام دیئے ہیں کسی نے اسے فردوس بریں کہا کسی نے جنت بے نظیر کہا ہے یہاں کی تاریخ پر نگاہ ڈالیں تو پتہ چلتا ہے کہ مشہور صوفی سید اشرف الدین عبدالرحمٰن بلبل ۱۳۳۶ء میں اپنے مریدوں اور عقیدت مندوں کے ساتھ کشمیر تشریف لائے۔ ان دنوں کشمیر کے راجاؤں کے آپسی جھگڑوں اور غلط کاموں کی وجہ سے سارا نظام بگڑ چکا تھا۔ ان حالات کے پیش نظر ہندو راجاؤں کو اقتدار سے ہاتھ دھونا پڑا اور لداخ کا ایک شہزادہ رنچن شاہ کے ہاتھوں بیعت ہو کر مسلمان ہو گیا۔ بلبل شاہ نے نام صدرالدین رنچن شاہ رکھا۔ رنچن شاہ کا ایک وزیر جو خود بھی مسلمان ہو گیا تھا فارسی زبان سے آشنا تھا۔ وہ دین کی باتیں سن اور سیکھ کر مقامی لوگوں میں اسلام کی تبلیغ کیا کرتا تھا۔ اس طرح قرآن و احادیث اور اسلامی تعلیمات کی وجہ سے عام کشمیری لوگ فارسی اور عربی زبانوں سے واقف ہونے لگے۔

اس طرح فارسی زبان کا چلن عام ہوتا گیا اور اس زبان نے عوام الناس میں اپنی جگہ بنائی اس کی بڑھتی ہوئی مقبولیت کے پیش نظر فارسی سرکاری زبان قرار پائی ڈوگرہ راجاؤں کے عہد تک ریاست میں فارسی ہی سرکاری زبان رہی۔ مہاراجہ گلاب سنگھ نے ۱۸۴۶ء میں برطانوی حکومت کے زیر اثر آ کر ریاست جموں وکشمیر کو ۷۵ لاکھ کے عوض خرید لیا تھا۔ جس کا اظہار علامہ اقبال نے اپنی شاعری میں بھی کیا ہے گلاب سنگھ نے جب حکومت سے دست برداری کے بعد ۱۸۵۶ء میں مہاراجہ رنبیر سنگھ کو حکومت سونپ دی۔ رنبیر

سنگھ تقریباً ۲۹ برس حاکم رہے رنبیر سنگھ کے عہد میں بھی اگر چہ فارسی ہی سرکاری زبان رہی لیکن اس دور میں اردو زبان نے اپنے قدم مضبوط کیئے۔ رنبیر سنگھ نے سنسکرت کالج، رنبیر لائبریری اور دارالترجمہ قائم کیا۔ اس کے علاوہ رنبیر سنگھ نے ''بدیا بلاس پریس'' کے نام سے ایک چھاپہ خانہ قائم کیا۔ جس سے دارالترجمہ میں ترجمہ شدہ کئی کتابیں شائع کی گئیں۔ ۱۸۸۵ء میں مہاراجہ رنبیر سنگھ کا انتقال ہوا تو مہاراجہ پرتاپ سنگھ ان کے جائے نشین ہوئے۔ ان کے عہد تک فارسی ہی سرکاری زبان تھی لیکن پرتاپ سنگھ نے اپنے دورِ حکومت میں ۱۸۸۸ء میں اردو کو سرکاری زبان کا درجہ دیا پرتاپ سنگھ نے عیسائیت تبلیغ کے ردِ عمل میں ''سناتن دھرم سبھا'' قائم کی تو سالک رام سالک نے کئی کتابچے لکھے جن میں مورتی منڈن، دھرم اپدیش، ارتھ شاستر، لغت اردو، محاورات اردو، داستان جگت روپ وغیرہ شامل ہیں ڈوگرہ دورِ حکومت میں ریاست میں پریس قائم کرنے اور رسائل اور اخبارات جاری کرنے پر پابندی تھی تو اہل کشمیر بیرون کشمیر کے دوسرے شہروں سے اخبارات و رسائل جاری کرتے تھے جن میں ''اخبار عام''، ''خیر خواہ کشمیر''، ''ہمدرد کشمیر''، ''کشمیری گزٹ''، ''کشمیری مخزن''، ''صبح کشمیر''، ''بہار کشمیر'' وغیرہ اہم ہیں لیکن بیسویں صدی میں جموں و کشمیر سے ڈوگرہ حکومت کی اجازت کے مطابق پہلا اخبار ''رنبیر'' ۱۹۲۴ء میں جاری ہوا۔ جس کے اڈیٹر ملک راج صراف تھے۔ اس کے بعد کشمیر سے ''وتستا''، ''ہمدرد''، ''صداقت''، ''مارتنڈ''، ''وکیل''، ''حقیقت''، ''خالد'' اور ''خدمت'' وغیرہ اخبارات شائع ہوتے رہے جن میں مقامی ادباء و شعرا کی تخلیقات کو شائع کیا جاتا تھا۔ ۱۹۴۷ء کی تقسیم اور آزادی کے بعد متعدد اخبارات اور رسائل کا سلسلہ جاری ہوا جو آج بھی برقرار ہے آج کی تاریخ میں جموں و کشمیر سے ''شیرازہ''، ''حکیم الامت''، ''تعمیر''، ''بزم ادب'' اور ''تفہیم'' وغیرہ ادبی رسالے شائع ہو رہے ہیں ان اخباروں میں ادبی تخلیقات تحقیقی و تنقیدی مضامین کالم وغیرہ شائع ہوتے ہیں، حامدی کاشمیری، محمد یوسف ٹینگ، پروفیسر ظہور الدین، عرش صہبائی، سلطان الحق، رفیق راز اور شبیب رضوی کے علاوہ سیکڑوں شعرا اور ادبا اپنی نگارشات کے ذریعہ ریاست جموں و کشمیر میں اردو زبان و ادب کو پروان چڑھانے میں مصروف ہیں چونکہ اردو ریاست کی سرکاری، درباری، دفتری اور کاروباری زبان بھی ہے اور ذریعہ تعلیم بھی ہے اگر چہ ریاست جموں و کشمیر میں اردو کو بعض مسائل کا سامنا ضرور ہے لیکن اس ریاست

میں اردو کی جڑیں اتنی مضبوط ہیں کہ ریاست جموں وکشمیر میں اردو کا مستقبل تابناک اور محفوظ ہی نظر آتا ہے۔

ریاست جموں وکشمیر میں اردو ناول کی روایت زیادہ قدیم نہیں ہے لیکن پھر بھی یہاں جو ناول لکھے گئے ہیں وہ ریاست کو ملک کی دوسری ریاستوں کے مدمقابل لا کھڑا کرتے ہیں ریاست جموں وکشمیر میں اردو ناول کے ابتدائی نقوش اگرچہ آزادی سے پہلے بھی ملتے ہیں جس میں سالک رام سالک کی ''داستان جگت روپ'' اور ''تحفہ سالک'' کو اردو ناول کے ابتدائی نقوش قرار دیا گیا ہے اس کے علاوہ محمد دین فوق پنڈت نندلا، موہن لال مروہ، وشوا ناتھ ورما وغیرہ کے قصوں کو ابتدائی نقوش مانا گیا ہے لیکن وہ تمام ابتدائی نقوش فسادات کی وجہ سے تلف ہو گئے ہیں دستیاب شدہ ناولوں کے مطابق اردو کا پہلا باقاعدہ ناول ''اور انسان مر گیا'' (۱۹۴۸ء) ہے جو رامانند ساگر کی تصنیف ہے اس سے پہلے پریم ناتھ پردیسی نے اگرچہ ایک ناول ''پوتی'' کے عنوان سے لکھا تھا لیکن ۱۹۴۷ء کے فساد میں وہ شائع ہونے سے پہلے ہی تلف ہو گیا۔ اس اعتبار سے رامانند ساگر کو ہی اردو کا پہلا ناول نگار مانا جائے گا۔ رامانند ساگر کے بعد ریاست میں دوسرے ناول نگاروں نے اس روایت کو آگے بڑھایا جن میں ٹھاکر پونچھی، حامدی کاشمیری، علی محمد لون وغیرہ شامل ہیں۔

باب سوم: ''ریاست جموں وکشمیر میں اردو ناول ۱۹۴۷ء سے ۱۹۷۰ء'' عنوان کے تحت قائم کیا گیا ہے اس باب میں چھ ناول نگاروں کو شامل کیا گیا ہے رامانند ساگر کا ناول ''اور انسان مر گیا'' ریاست جموں و کشمیر کا پہلا ناول ہے یہ ناول فسادات کے موضوع پر لکھا گیا ہے ناول چار حصوں پر مشتمل ہے پہلے حصے میں لاہور کے کشت وخون کی تفصیلات ہیں قومیت کے نام پر روا رکھی جانے والی تباہی اور غارت گری کو پیش کیا گیا ہے دوسرے حصے میں ہندوؤں مسلمانوں کے آپسی تضادات کو موضوع بنایا ہے اور پھر تیسرے حصے میں آنند جب مایوس ہو کر اپنے ہاتھوں سے اپنے بیوی بچوں کو ہلاک کرتا ہے اور لڑتے ہوئے جان دینے کے لئے نکل جاتا ہے اس کے علاوہ عورتوں پر کئے جانے والے ظلم و جبر کو بھی اس ناول میں دکھایا ہے۔

ٹھاکر پونچھی کا تعلق خطۂ جموں سے ہے ان کے ناولوں میں ''رات کے گھونگھٹ''، ''شمع ہر رنگ میں جلتی ہے''، ''قفس اداس ہے''، ''چاندنی کے سائے'' اور ''پیاسے بادل'' اہم ہیں۔ ''رات کے گھونگھٹ'' ناول میں سماج کے ٹھیکیداروں کے راز فاش کئے گئے ہیں ٹھاکر پونچھی نے حقیقت کو ہو بہو نقل کر دیا ہے سماج

کے چہرے سے پارسائی کے پردوں کی نقاب کشائی کرنے کی کوشش کی ہے ناول نگار نے ایسے کرداروں کو تراشا ہے جو بظاہر نیکی اور شرافت کا لبادہ اوڑھے رہتے ہیں اور بہ باطن انسان کو فریب کے جال میں پھنسانا چاہتے ہیں غرض کہ ناول نگار نے مختلف کرداروں کے ذریعے نئے سماج میں پنپ رہے ناسور کی طرف اشارہ کیا ہے۔ ''شمع ہر رنگ میں جلتی ہے'' ناول دراصل ایک مصور کا المیہ ہے اس میں ان کا درد وکرب اور سماج کے ہاتھوں ان پر روا رکھے جانے والے سلوک کی کہانی کو بہترین انداز میں پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے ''قفس اداس ہے'' ٹھاکر پونچھی کا مشہور سوانحی ناول ہے اس ناول میں غلام رسول سنتوش کی زندگی کو پیش کیا گیا ہے یہ ناول ایک دکھ بھری کہانی ہے جس کے لفظ لفظ میں مصنف کا حساس اور دردمند دل دھڑک رہا ہے ''چاندنی کے سائے'' ناول میں بعض اہم سماجی اور جاگیردارانہ نظام کے مسائل کو موضوع بنایا ہے ناول میں طبقاتی کشمکش اور سماج کے فرسودہ روایات کو بھی نشانہ بنایا گیا ہے ''پیاسے بادل'' ناول میں سماج کے اندر پنپنے والی برائیوں کو پیش کیا گیا ہے اور حقیقت کو عیاں کرنے کے لئے ناول کو ذریعہ بنایا ہے ٹھاکر پونچھی نے اپنے ناولوں میں اس عہد کے مسائل کو بڑی باریکی سے پیش کیا ہے ٹھاکر پونچھی کے ناول فن کے اعتبار سے بھی کامیاب ناول ہیں پلاٹ، کردار نگاری، منظر کشی، مکالمہ نگاری میں ٹھاکر پونچھی نے فنی چابکدستی سے کام لیا ہے علی محمد لون ناول ''شاید ہے تیری آرزو'' میں دلی کے اس علاقے کو موضوع بنایا ہے جس کی فضا اور جس کی طرز زندگی بداخلاقیات کی غلاظت سے غلیظ ہو چکی ہے سماج میں دین ودھرم، ذات پات رنگ ونسل اور غریب اور امیر کی بنیادوں پر انسانوں کو تقسیم کیا جاتا ہے اس فرق سے لوگوں کے دل سے محبت، ہمدردی، خلوص اور انسان دوستی کا جذبہ بالکل ختم ہو گیا ہے ناول کا پس منظر یہی ہے۔ غلام رسول سنتوش کا ناول ''سمندر پیاسا ہے'' بہت اہم ہے اس ناول میں سنتوش نے بڑی بے رحمی کے ساتھ انسان کے باطن میں موجود ہوسنا کی اور زہرناکی کو ابھارا ہے یہاں زندگی کو ایک روگ کہا گیا ہے یہ روگ انسان کے باطن میں پرورش پاتا ہے یہ خود پرستی، بوالہوسی اور لذت پرستی کا روگ ہے۔ یہاں محبت کی ناکامی کو بھی موضوع بنایا گیا ہے۔

سماج میں رائج کردہ غلط تصورات کتنے نقصان دہ ثابت ہوتے ہیں۔ جو ایک انسان کی جان لے لیتے ہیں کشمیری عوام کے غلط تصورات اور توہمات کے خلاف سنتوش کا یہ ناول ایک احتجاج بھی ہے۔ یہ ناول

فنی اور موضوعی دونوں اعتبار سے کامیاب ہے حامدی کاشمیری کے ناولوں میں ''بہاروں میں شعلے''، ''اجنبی راستے'' اور ''بلندیوں کے خواب'' شامل ہیں۔ ''بہاروں میں شعلے'' ناول میں کشمیری عوام کی زندگی کو موضوع بنایا گیا ہے ناول نگار نے سماجی و معاشرتی زندگی کے مسائل کے علاوہ سیاسی صورتحال اور ڈوگرہ تاناشاہی کے خلاف تحریک کو بھی اس ناول میں پیش کیا ہے ناول نگار نے کشمیری عوام کے مسائل اور کشمیری سماج میں پائی جانے والی برائیوں کو اجاگر کر کے ان کی اصلاح کرنے کی ایک کوشش کی ہے سماجی مسائل کی تصویر کشی کر کے اس سماج کی اصلاح کرنا حامدی کاشمیری کا مقصد تھا۔ ناول فنی اعتبار سے بھی ایک کامیاب ناول ہے منظر کشی کے بہترین نمونے ناول میں ملتے ہیں ''اجنبی راستے'' حامدی کاشمیری کا ایک اہم ناول ہے اس ناول میں ناول نگار نے ایک متوسط طبقے کے ایک مسلم گھرانے کی زندگی کو موضوع بنایا ہے اس طبقے میں محبت کی جو قدر و قیمت ہے خودداری کا جو عنصر ہے تضاد کی جو صورت ہے اور توہمات کے جو بت ہیں وہ صاف طور پر ہمارے سامنے آتے ہیں متوسط طبقے کی گھریلو زندگی کے بے تکلف ماحول کو ناول میں دیکھا جا سکتا ہے۔ یہ حامدی کاشمیری کا کمال ہے کہ کرداروں کو عام زندگی اور عام ماحول کا نمائندہ بناتے ہیں۔ ان کے کردار متوسط طبقے کے مرد اور عورت ہیں کہانی میں جو مسائل ملتے ہیں وہ کشمیر کے متوسط طبقے کے مسائل ہیں ناول میں عوامی زندگی کے ایک اہم مسئلے بچپن کی شادی کو موضوع بنایا گیا ہے لیکن اس سماجی مسئلے کو پیش کرتے ہوئے کئی دوسرے مسائل کی طرف بھی اشارہ کر دیا گیا ہے۔ ناول کا پلاٹ سیدھا سادہ اور عام فہم ہے۔ کہانی بیانیہ ہے واحد متکلم کی تکنیک میں بیان کی گئی ہے ناول ''بلندیوں کے خواب'' کو عشقیہ داستان کے طور پر پیش کیا گیا ہے ناول میں پہاڑوں، بادلوں اور ہواؤں کے طوفانی پہلوؤں کو دکھایا گیا ہے کہ انسان فطرت کے قہر و غضب کا کس طرح شکار ہوتا ہے اس میں انسان کو قدرت کے سامنے بے بس اور مجبور دکھایا گیا ہے ساتھ ہی انسان کی ہمت و کاوش کے ذریعے فطرت کے طوفانی پہلوؤں سے نبرد آزما ہونے کے مناظر کی عکاسی بھی کی گئی ہے وہ پہاڑوں کو عبور کرتا اور برفیلی آندھیوں سے راستہ نکالتا ہے لیکن انسانی سماج میں جو خرابیاں ہیں اونچ نیچ ہے جو استحصال ہے وہ اس کے خوابوں اور ارادوں کو پامال کر دیتا ہے انسان فطرت پر تو قابو پا لیتا ہے مگر وہ سماجی برائیوں کو دور نہیں کر سکتا ہے اور غم و الم کا شکار ہو جاتا ہے۔ پریشانیوں سے دوچار ہوتا ہے۔ یہی

ناول کا موضوع ہے جو پورے ناول میں نظر آتا ہے ناول کا پلاٹ مربوط ہے کردار نگاری، مکالمہ نگاری اور منظر کشی میں بھی حامدی کاشمیری نے فنی چابکدستی سے کام لیا ہے ناول موضوع اور فن دونوں اعتبار سے ایک کامیاب ناول ہے۔ حامدی کے ناولوں کے پلاٹ میں جغرافیائی حقیقت اور مقامی رنگ کی عکاسی ملتی ہے حامدی کاشمیری نے اپنے ناولوں کے پلاٹ کی تعمیر میں وادی کشمیر کا سہارا لیا ہے۔ انھوں نے ناولوں کے پلاٹ میں جموں وکشمیر کے خوبصورت مقامات، جھیلوں، باغوں اور دریاؤں وغیرہ کے صحیح نام اور سچی تصویریں پیش کی ہیں۔ پلاٹ کی تشکیل میں حامدی کاشمیری نے اپنی فنی مہارت کا ثبوت دیا ہے حامدی کے ناولوں کے کردار بھی حقیقی زندگی سے قریب تر معلوم ہوتے ہیں انھوں نے اپنے ناولوں میں جو کردار پیش کئے ہیں وہ اسی معاشرے سے تعلق رکھتے ہیں منظر کشی میں بھی حامدی کاشمیری نے فنی چابکدستی سے کام لیا ہے ماحول کی عکاسی ان کے ناولوں میں بھی دلچسپی کی ایک اور وجہ ہے مکالمہ نگاری میں بھی بڑی فنی مہارت کا ثبوت دیتے ہیں حامدی کے ناول اسلوب کے اعتبار سے بھی کافی دلکش اور دلچسپ ہیں۔

وجے سوری کا تعلق صوبہ جموں سے ہے ان کا نام ان کے ناول ''ایک ناؤ کاغذ کی'' کی وجہ سے مشہور ہے یہ ناول دراصل ایک ادیب، قلم کار پال کی محبت کی ناکامی کی داستان ہے لیکن کہانی میں دلچسپی کا عنصر باقی رہتا ہے پال جو ایک ادیب ہے ناول اور شاعری میں اس کی خصوصی دلچسپی ہے اس کے اندر تخلیقی صلاحیت بدرجہ اتم موجود ہے وجے سوری نے پال کا جو نقشہ کھینچا ہے وہ صرف پال جیسے ادیب کا نقشہ نہیں بلکہ ہمارے ملک کے تمام ادیبوں کے لئے وہ موزوں ہے ناول کا پلاٹ صاف اور سپاٹ ہے کہانی میں کوئی بھی جھول نہیں ملتا۔ پال اور جوالا کے علاوہ بھی ناول کے کئی کردار ملتے ہیں جو ضمنی ہیں بہرحال ناول کا ہیرو پال اور ہیروئن جوالا ہی ہے زبان و بیان کے اعتبار سے بھی یہ کامیاب ناول ہے اسلوب بیان نہایت دلکش ہے مکالمہ نگاری میں بھی وجے سوری نے کمال دکھایا ہے غرض وجے سوری کا یہ ناول فنی اور موضوعی دونوں اعتبار سے کامیاب ناول ہے۔

باب چہارم: ''ریاست جموں وکشمیر میں اردو ناول ۱۸۷۱ء سے ۲۰۰۰ء تک'' کے عنوان کے تحت قائم کیا گیا ہے اس باب میں جان محمد آزاد، عبدالغنی شیخ، شبنم قیوم، نور شاہ، زینت فردوس، عمر مجید، جیوتیشور

پتھک اور فاروق رینزو کے ناولوں کو شامل کیا گیا ہے جان محمد آزاد کا تعلق سری نگر سے ہے ان کا ناول ''وادیاں بلا رہی ہیں'' بہت مشہور ہے اس ناول کا موضوع کچھ نیا نہیں اس میں کرشن چندر کے زیر اثر کشمیر کے ایک پہاڑی علاقے ''کاغان'' کے پس منظر میں سماجی زندگی کے تضاد اور شکست اور محرومی کو اپنا موضوع بنایا ہے۔ ناول نگار نے سماج کے مختلف طبقوں کے درمیان تصادم، کوہستانی علاقوں کے لوگوں کی سادگی، خلوص، خوابوں اور آرزؤں کی کہانی کو پیش کیا ہے جان محمد آزاد نے کشمیر کے خوبصورت مناظر کے علاوہ کشمیر کی غریب عوام کی زندگی کے مسائل کو بڑے موثر انداز میں پیش کیا ہے۔ ''کشمیر جاگ اٹھا'' میں بھی کشمیر کے ایک دور افتاہ علاقہ کو موضوع بنایا ہے ناول میں مطلق العنانیت کے تاریک ترین دور میں استحصال اور جبریت کے ہاتھوں مظلوموں اور بے زبان انسانوں کی کہانی پیش کی گئی ہے ''ظلمات کے مسافر'' ایسے نامراد لوگوں کی کہانی ہے جو موت کی وادیوں سے بے لگام عفر یتوں کی طرح رات کے سینے پر بدی کے سفیر اور فن کی پکار بن کر چھا گئے۔ ناول موضوع اور فن دونوں اعتبار سے بہترین ناول ہے ناول کا پلاٹ مربوط ہے کردار نگاری، منظر کشی اور مکالمہ نگاری میں بھی ناول نگار نے فنی چابکدستی سے کام لیا ہے ''برفیلے لمحوں کا جنگل'' ایک جاسوسی ناول ہے اس ناول میں ایک بین الاقوامی زیرزمین گینگ کی کہانی کو پیش کیا گیا ہے اس گینگ کا بگ باس کے۔ کے ہے جو ہر وقت لوگوں کی آنکھوں میں دھول جھونکنے میں مہارت رکھتا ہے یہ گینگ اپنی سرگرمیوں کا مرکز کشمیر کے ایک صحت افزا مقام گلمرگ کو بناتا ہے اس جگہ کا انتخاب اس لئے کیا جاتا ہے کہ یہاں دنیا کے مختلف حصوں سے لوگ سیاحت کے لئے آتے ہیں غیر قانونی منشیات کی تجارت اس گینگ کا خاص بزنس ہے۔

عبدالغنی شیخ کا تعلق لداخ سے ہے ان کے دو ناول ''وہ زمانہ'' اور ''دل ہی تو ہے'' ہیں ''وہ زمانہ'' ناول میں لداخ کے رسم ورواج، رہن سہن، تہواروں اور میلوں کا ذکر ملتا ہے یہ ایک نیم تاریخی ناول ہے اس ناول کے مطالعے سے قدیم وجدید لداخ کی تہذیب وتمدن، رہن سہن، طرز معاشرت، تعلیم وتربیت وغیرہ سے متعلق پوری جانکاری حاصل ہوتی ہے ان کا دوسرا ناول ''دل ہی تو ہے'' لیہہ کے پس منظر میں لکھا جانے والا پہلا رومانی ناول ہے۔ خطۂ لداخ کے ننگے پہاڑ اور ریتیلے میدان جو صدیوں سے خاموش اور گم سم تھے۔

اچانک سیاحوں کی آمد سے جاگ اٹھتے ہیں سیاحوں کی آمد سے جہاں متعدد لوگوں کی اقتصادی خوشحالی یقینی بن جاتی ہے وہیں اس سرزمین کے لوگوں کا ذہنی سکون، ان کی انفرادیت اور معصومیت مجروح ہونے لگتی ہے ناول کا پلاٹ مربوط ہے عبدالغنی شیخ نے عالمی ادب کے شاہکار ناولوں کا مطالعہ کیا ہے اور ان سے فیض حاصل کیا ہے انہیں پوری طرح اس بات کا احساس تھا کہ پلاٹ ناول کی ریڑھ کی ہڈی ہے یہ نہ ہو تو ناول کی عمارت اٹھ نہیں سکتی۔ عبدالغنی شیخ کے دونوں ناول اپنے موضوع اور فن کے اعتبار سے بھی کامیاب ناول ہیں۔

شبنم قیوم کا تعلق سرینگر سے ہے ان کا ناول ''زندگی اور موت'' جذباتیت اور انقلاب پسند رومانیت کا ایک دلچسپ امتزاج ہے ناول اگرچہ اپنے موضوع کے اعتبار سے ایک بہترین ناول ہے لیکن فنی اعتبار سے دیکھا جائے تو کچھ کمزور نظر آتا ہے یہ ابتدائی کوشش تھی اس لئے ناول نگار فن پر توجہ نہیں دے پائے۔ ''چراغ کا اندھیرا'' ناول میں غنڈہ گردی کے ایسے دور کو موضوع بنایا گیا ہے جب رہبر رہزن بن گئے تھے۔ یہاں انھوں نے اس قسم کے سیاہ کارنامے یا حرکتیں کرنے والے حاکموں اور سیاسی ٹھیکیداروں پر ایسی ضربیں لگائیں ہیں جن سے قاری متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ ناول میں وہ تمام صفات موجود ہیں جو ایک عمدہ اور معیاری ناول کے لئے ضروری تصور کی جاتی ہیں۔ تجسس اور سنسنی خیزی، بدی کی ناکامی اور اچھے لوگوں کی فتح اس ناول کا بنیادی موضوع ہے۔

''یہ کس کا لہو ہے، کون مرا''، شبنم قیوم کا نیم تاریخی اور سیاسی ناول ہے ناول کا موضوع کشمیر کی سیاسی تاریخ ہے ناول کا پس منظر ۱۹۴۷ء کے بعد ریاست جموں وکشمیر میں پیدا ہونے والے حالات و واقعات پر مبنی ہے تقسیم کے بعد جہاں ایک طرف پاکستان نے قبائلی فوج کو وادی بھیج کر یہاں کی اینٹ سے اینٹ بجا دی تھی تو دوسری طرف مہاراجہ ہری سنگھ اور شیخ محمد عبداللہ کی درخواست پر ہندوستان کی افواج کو قبائلوں کے مقابلے میں صف آرا ہونا پڑا غرض ناول میں آزادی کے بعد کی سیاسی صورتحال کا نقشہ ناول میں ملتا ہے شبنم قیوم کا یہ ناول تمام فنی تقاضوں کو پورا کرتا ہے موضوع کی جدت کی بنا پر ناول بہت مقبول ہوا اور بہت تیزی سے فروخت ہوا۔ کشمیر کی تاریخی اور سیاسی سچائی کو ناول نگار نے اپنے ناول میں پیش کر کے ایک اہم کارنامہ انجام دیا ہے۔ نور شاہ کا تعلق سرینگر سے ہے ان کے ناول ''قفس اداس ہے''، ''آؤ سو جائیں'' اور ''لمحے اور

زنجیریں'' ہیں۔ ''قفس اداس ہے'' وادی کے معتبر فکشن نگار جناب نور شاہ کے زورِ قلم کا نتیجہ ہے۔ نور شاہ فن کی کرشمہ سازیوں پر بھروسہ رکھتے ہیں اور زندگی وسماج کے تمام مسائل کا حل فن ہی میں ڈھونڈتے ہیں انہیں اس بات کا کامل یقین ہے کہ فنون لطیفہ انسانی زندگی کے بے شمار مسائل کا حل نہیں نور شاہ ترقی پسند تحریک سے لکھ رہے ہیں اور وہ ادب کے بدلتے رجحانات سے پوری طرح واقف ہیں جدیدیت کی گھن گرج کو انہوں نے محسوس بھی کیا ہے اور اظہار ذات کے لئے بروئے کار بھی لایا ہے۔ ''آؤ سو جائیں'' ناول میں مصنف نے جنسی ونفسیاتی خواہشات کے ساتھ ساتھ کشمیر کی نیم تاریخ کو بھی علامتوں اور اشاروں کے تحت بیان کیا ہے ناول میں عشق ومحبت کے قصے، احباب کے بچھڑنے کا غم اور کشمیر کی عوام پر ہوئے ظلم وستم وغیرہ جیسے چھوٹے چھوٹے واقعات کا بیان ملتا ہے اور واقعات کے علاوہ کشمیری لیڈروں پر طنز، فرقہ پرستوں سے دور رہنے کا سبق، حب الوطنی کا جذبہ اور آپسی بھائی چارے کا پیغام ملتا ہے۔ اس کے علاوہ ایک بدکردار عورت کا کردار تراش کر ناول نگار نے یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ بدکردار عورتوں سے دور رہنا چاہئے۔ نور شاہ نے ناولٹ میں کرداروں کی خارجی اور باطنی دنیا کو کبھی براہ راست اور کبھی بلا واسطہ طور پر بڑی باریک بینی سے پیش کیا ہے نور شاہ کا اسلوب اکثر ایک دلکش استعاراتی فضا کی تشکیل بھی کرتا ہے جو ان کے مخصوص رومانی مزاج سے ہم آہنگ ہے ''لمحے اور زنجیریں'' ناول کے ذریعے معاشرے میں پائی جانے والی ایسی برائیوں اور خامیوں کو اجاگر کیا ہے کہ جن سے ہندوستانی تہذیب ومعاشرت کی توہین ہوتی ہے قارئین کو ان برائیوں سے بچانے اور خامیوں کو دور کرنے کا سبق ملتا ہے فنی اعتبار سے نور شاہ کے تینوں ناول بہت کامیاب ہیں۔ ان کے ناولوں میں قصہ، پلاٹ، کردار نگاری مکالمہ نگاری، منظر کشی اور زبان و بیان کا استعمال بڑی فنی چابکدستی سے کیا گیا ہے۔

زینت فردوس ریاست جموں وکشمیر کی خواتین ناول نگاروں میں پہلا نام ہے ان کا ناول ''نئی سحر'' اپنے موضوع کے اعتبار سے بہت اہمیت کا حامل ہے۔ ناول کا موضوع انسانیت اور اتحاد کے اقدار کا اظہار کرتا ہے۔ انسان دوستی، تفریق کا خاتمہ، دوستی، محبت، اخوت، بھائی چارہ آپسی میل جول اور ایک دوسرے کو برداشت کرنے کی قوت کی بہترین مثالیں ناول میں پیش کی ہیں اس ناول میں بارہا ایسے واقعات رونما

ہوتے ہیں جن سے ہمارے جذبات کی تطہیر ہوتی ہے ناول اپنے موضوع کے اعتبار سے بہترین ناول ہے لیکن ناول کی بے جا طوالت اور پیچیدگی ناول کی کمزوری بن جاتی ہے ناول چند فنی خامیوں کے باوجود کامیاب ناول ہے ناول کی پوری کہانی میں انسان دوستی اور ہندو مسلم اتحاد و بھائی چارگی کی فضا چھائی ہوئی نظر آتی ہے۔عہد حاضر میں اس ناول کی اہمیت اور بھی بڑھ جاتی ہے۔عمر مجید کا ناول ''یہ بستی یہ لوگ'' گاؤں کی زندگی پر مبنی ہے ناول میں گاؤں کی زندگی کے مسائل کو دیکھ کر یہاں کی مصیبت زدہ عوام کے دکھ درد کی تصویر کشی بڑی فنکاری سے کی ہے ناول میں جلنور گاؤں کے پس منظر میں پورے کشمیر کے گاؤں کی درد بھری اور کراہتی زندگی کو پیش کرنے کی کوشش کی ہے ان کے اس ناول میں سرمایہ داروں اور جاگیرداروں کے ہاتھوں کئے جانے والے ظلم کو بھی بیان کیا گیا ہے عمر مجید کا یہ ناول اپنی تمام فنی خوبیوں کے باعث ایک کامیاب ناول ہے موضوع کے اعتبار سے بھی ناول کافی دلچسپ ہے مکالمہ نگاری اور منظر کشی میں بھی ناول نگار نے کمال دکھایا ہے۔

جوتیشور پتھک کا تعلق جموں سے ہے ان کے تین ناول ہیں ''ہجوم''، ''میلی عورت'' اور ''کھڑکیاں''۔''ہجوم'' ناول میں سیاست دانوں کا نئی نسل کے ساتھ استحصال کو پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے نوجوان اور معصوم لوگوں کو سیاست کے دلدل میں کس طرح پھنسانے کی مذموم کوشش ہوتی ہے ''میلی عورت'' کا موضوع سماجی قدروں کی پامالی ہے ہمارے سماج میں روز بروز خودغرضی، موقع پرستی اور بناوٹ میں اضافہ ہورہا ہے سائنس دان زمین کی حدود سے پار چاند تاروں اور سیاروں پر کمند ڈال رہے ہیں مگر آج کے انسان کا وجود اتنا ہی سکڑ کر محدود ہوتا جارہا ہے آج کا انسان اپنی غرض پوری کرنے کے لئے نہ اخلاقی قدروں کا خیال کرتا ہے نہ ہی آپسی رشتوں کی پرواہ کرتا ہے۔''کھڑکیاں'' ناول کا موضوع ایک اہم مسئلہ ہے سیاست اخلاقی دیوالیہ پن کا ذریعہ بن چکی ہے اور نئی نسل کو اپنے مقصد کے لئے استعمال کیا جارہا ہے اس طرح نئی نسل کا اہم مستقبل تباہ کررہے ہیں مجموعی طور پر جیوتیشور پتھک کے تینوں ناول اپنے موضوع اور فن کے اعتبار سے بہترین ناول ہیں۔

فاروق رینزو کا تعلق سرینگر سے ہے ان کا ناول ''زخموں کی سالگرہ'' بہت مشہور ہے ناول میں

موجودہ دور کے اہم مسئلے کوموضوع بنایا گیا ہے یہ مسئلہ طلبا کی بے چینی اوراضطراب ہے طالب علم دن بدن مایوسی کا شکار ہوتے جاتے ہیں۔اس انتشار، مایوسی اور ناامیدی کی کئی وجوہات ہیں عہد حاضر میں ٹوٹتی ہوئی انسانی قدریں اور ہماری زندگی کی پیچیدگیاں ایک اہم وجہ ہے۔''انقلاب کا شہید'' ناول میں ناول نگار نے ان جیتے جاگتے کرداروں کے ذریعے جوحق پر ہیں سچ پر ہیں اوراپنی بات ظالموں کے ظلم کی پرواہ کئے بنا سچ سچ کہتے ہیں پورے معاشرے کی یعنی کشمیری عوام کی زندگی کی دردبھری داستان بڑے موثر انداز میں پیش کی گئی ہے ناول اپنے تمام فنی تقاضوں کو پورا کرتا نظرآتا ہے''کشمیر جھیل جلتی ہے'' ناول کے ذریعے سرزمین کشمیر میں پروان چڑھ رہی بدعنوانیوں، لاقانونیت اور بدحالی کی تصویر دکھانے کی کوشش کی گئی ہے ناول میں فاروق ریزونے ریاکاروں اورمکاروں کے چہرے سے نقاب اتارنے کی کوشش کی ہے

باب پنجم:''ریاست جموں وکشمیر میں اردو ناول ۲۰۰۰ء سے تاحال'' کے عنوان سے قائم کیا گیا ہے اس باب میں آنندلہر، ترنم ریاض، عبدالرشید راہگیر، شبنم قیوم، وحشی سعید، حامدی کاشمیری اور شفق سوپوری کے ناولوں کا شامل کیا ہے۔آنندلہر کا تعلق خطہ جموں سے ہے ان کا ناول''اگلی عید سے پہلے'' سرزمین کشمیر کی ایک درد بھری داستان ہے یہ درد بھری داستان ۱۹۴۷ء سے ۱۹۹۶ء تک کی ہے جو نصف صدی پر پھیلی ہوئی ہے ناول فنی اعتبار سے بھی کامیاب ناول ہے۔''سرحدوں کے بیچ'' ناول کے لئے آنندلہر نے جس موضوع کا انتخاب کیا ہے وہ بےحد جذباتی ہے ہرحساس انسان سرحد کی پابندیوں کی وجہ سے دل برداشتہ ہوجاتا ہے جہاں نہ کوئی رشتہ ہے نہ کوئی رشتہ دار ہے سرحد لوگوں کے دلوں کو جوڑنے سے معذور ہے سرحد کے قریب رہنے والے لوگوں کی زندگی کی عکاسی ملتی ہے کشمیر کے پس منظر میں لکھا گیا یہ ناول سرحد کے قریب رہنے والے لوگوں پر مبنی ہے جو اس پورے علاقے کو اپنا مانتے ہیں''مجھ سے کہا ہوتا'' ناول میں جانوروں اور پرندوں کے ذریعے تباہی و بربادی کے المیے کو پیش کیا گیا ہے جن میں حال و ماضی اور مستقبل سبھی زمانے شامل ہیں یہ ناول بہت سے انسانی مسائل کا بھی احاطہ کرتا ہے جو آفاقی نوعیت کے حامل ہیں مثلاً ملکوں کی آپسی رنجشیں، نسلی امتیازات، رشتوں کا زوال، ان کی بے حرمتی، انسان کی کم ظرفی، خودغرضی، امیر قوموں کے ہاتھوں غریبوں کا استحصال، بارود کے دھوئیں سے ہونے والی زمینی تباہیاں وغیرہ جیسے مسائل شامل ہیں

''یہی سچ ہے'' ناول میں زندگی کے حقائق کو فلسفیانہ انداز میں مختلف کرداروں اور واقعات کے ارتباط سے بڑے ہی موثر انداز میں پیش کیا گیا ہے اور یہ دکھایا ہے کہ عصر حاضر میں کوئی ایسا شعبہ نہیں جہاں رشوت خوری، بے ایمانی، استحصال نہیں ہے مجموعی طور پر آنند لہر کے سبھی ناول چند فنی کمزوریوں کے باوجود کامیاب ناول ہیں۔

ترنم ریاض کا ناول ''مورتی'' ازدواجی زندگی کی ناکامی اور اس ناکامی کے اسباب پر مبنی ہے ملیحہ نامی ایک لڑکی جو مجسمہ ساز ہے جو طرح طرح کے مجسمے بناتی ہے اور لوگ اس کے فن کو دیکھنے اور مجسمے خریدنے دور دور سے آتے ہیں ناول نگار اس ناول میں مجسمہ تراشی سے ملیحہ کے گہرے عشق کے سہارے قاری کو وادی کشمیر کے خوبصورت تاریخی وثقافتی مراکز کی سیر کراتی ہیں اس کے ساتھ ہی یہ بھی بتانے کی کوشش کی ہے کہ کس طرح ایک فن کار کے فن کی ناقدری کے سبب وہ اپنا دماغی توازن کھو بیٹھتا ہے ''مورتی'' ناول کا پلاٹ مربوط ہے منظر کشی کی بھی بہترین مثالیں ملتی ہیں اسلوب، کردار نگاری اور مکالمہ نگاری میں بھی ناول نگار نے فنی چابکدستی سے کام لیا ہے۔ ''برف آشنا پرندے'' ناول میں زمانی ومکانی تناظر کی حد تک خطہ کشمیر کے لازوال حسن، اس کی زخم خوردہ روح، قوت تحمل ماضی کی خوابیدہ گزرگاہوں اور حال میں زندگی کے افق پر نئی تاب وتپش اور معنویت پر مبنی ایک کبھی نہ ختم ہونے والی کہانی ہے کشمیر کی روزمرہ زندگی، کشمیر کی قدرتی خوبصورتی، وہاں کے پکوان اور طرز زندگی کی تصویر کشی کی گئی ہے ناول تاریخ کا ایک آئینہ ہے جس میں کشمیر کی شناخت کشمیری افراد کے مصائب، کشمیر کے تہذیبی احیا کو دیکھا اور محسوس کیا جاسکتا ہے یہ ناول اپنے موضوع، پلاٹ، کرداروں، مکالمات، پرندوں، نباتات، خوبصورت تاریخی عمارتوں اور مختلف جذبوں کی کیفیات کے باوصف ایک اہم ناول نظر آتا ہے۔

عبدالرشید راہگیر کا تعلق خطۂ لداخ سے ہے ان کا ناول ''احساس'' لداخ کے پس منظر میں لکھا گیا ہے اور اسی مقصد کے تحت عبدالرشید راہگیر نے لداخی رسم ورواج اور تہذیب وتمدن کے تحفظ اور اسے نئی نسل میں منتقل کرنے کی کوشش کی ہے اس کے علاوہ لداخ میں اردو زبان وادب کو فروغ دینا اور نوجوان نسل کو اس کی طرف مبذول کرنا ہے۔ ناول موضوع وفن دونوں اعتبار سے ایک مکمل ناول ہے شبنم قیوم کے ناول

''پچھتاوا'' کا موضوع آج کے ترقی یافتہ سائنسی وتکنیکی دور میں اخلاقی وروحانی قدروں کے زوال سے تعلق رکھتا ہے ناول نگار نے بہت ہی جرات مندانہ انداز میں ٹی وی، کمپیوٹر، لیپ ٹاپ، موبائل فون اور دوسری ایسی تکنیکی سہولیات کے ذریعے گھر گھر میں فحاشی پہنچانے جیسے پہلوؤں کو ناول میں سمو دیا ہے۔اس ناول میں یہ واضح اشارہ ملتا ہے کہ تکنیکی ایجادات کا غلط استعمال ان لوگوں کی زندگی تباہ کرتا ہے کس طرح وہ فلموں کے ہیرو اور ہیروئن کو دیکھ کر غلط راہ اپنا لیتے ہیں یہ ناول اپنے تمام فنی تقاضوں کو پورا کرتا ہے۔

نعیمہ احمد مہجور کا ناول ''دہشت زادی'' ایک سوانحی ناول ہے ناول کا موضوع نعیمہ احمد مہجور کی حیات پر مبنی ہے اس کو سوانحی ناول قرار دیا گیا ہے نعیمہ نے اپنی زندگی میں رونما ہونے والے حالات وواقعات کو کشمیر کی خواتین کے تناظر میں بیان کرنے کی کوشش کی ہے اس طرح یہ ناول پورے معاشرے کی عورتوں کی زندگی کی مکمل ترجمانی کرتا ہے حامدی کاشمیری کا ناولٹ ''پرچھائیوں کا شہر'' ایک نہایت ہی حساس، دانشمند اور تعلیم یافتہ لڑکی کی کہانی ہے جو اپنی منزل پانے کے لئے بہت کچھ سہنے کے لئے مجبور رہے ناولٹ اپنے موضوع اور فن کے اعتبار سے ایک بہترین ناولٹ ہے پلاٹ مربوط، کرداروں کا عمدہ انتخاب، منظر کشی کی عمدہ مثالیں، مکالمے جاندار غرض کہ تمام فنی تقاضوں کو یہ ناولٹ پورا کرتا ہے۔

وحشی سعید عصر حاضر کے مشہور ناول نگار ہیں ان کا ناول ''پتھر پتھر آئینہ'' انسانی قدروں کے عروج و زوال کی ایک ایسی تاریخ ہے جسے پڑھ کر قاری میں ترقی کا جذبہ بھی بیدار ہوتا ہے اور دلوں میں محبت، ایثار اور قربانی کا جذبہ پیدا ہوتا ہے ''پتھر پتھر آئینہ'' ناول موضوع کے اعتبار سے نفسیاتی اور رومانی ناول ہے محبت کی ایک انوکھی کہانی کو اپنے منفرد انداز میں پیش کیا ہے جو اس بات کا ثبوت ہے کہ ناول نگار کو ناول کے فن پر مہارت ہے ''ایک موسم کا خط'' اس ناول میں ممبئی کی مدنی زندگی کی ایک جھلک ملتی ہے جس میں امیری اور غریبی کے تفاوت کو منعکس کرنے کی کوشش کی گئی ہے جس سے رومانی واقعات کی طرف اشارہ ملتا ہے۔ ''عجب زندگی......غضب موت'' ناولٹ میں دولت کے لالچ، انتقام کی آگ، نفرت محبت کے جذبات ملتے ہیں یہ چیزیں ایک شریف انسان کو بھی کیا سے کیا بنا دیتی ہیں انہوں نے ناول کے ذریعے انتقام اور انتقام کے نتیجے میں ہونے والے حالات کے بارے میں آگاہ کیا ہے۔ یہ ناولٹ اپنے موضوع اور فن دونوں اعتبار

سے ایک بہترین ناولٹ ہے۔''جائز ...... ناجائز'' ناولٹ میں وحشی سعید نے ایک اعلیٰ خاندان میں پیدا ہونے والے انور خان کی ناجائز اولاد افضل کی بہت دردناک کہانی بیان کی ہے۔''فطرت ......محبت ...... ندامت'' میں ناولٹ کا پلاٹ چھٹی اور ساتویں دہائی کی فلموں سے ملتا جلتا ہے جہاں مزدوروں کے حقوق کی خاطر ٹریڈ یونین کا قیام اور پھر کارخانے کا کسی ایسے حادثے سے دوچار ہونا جس کی وجہ سے اس کی سوچ میں مثبت تبدیلی آتی ہے اور فلم کا خاتمہ خوشی پر ہوتا ہے''وحشت محبت'' اور''قحط'' بھی اپنے موضوع اور فن کے اعتبار سے کامیاب ناولٹ میں وحشی سعید عصر حاضر کے مشہور ادیب ہیں۔

شفق سوپوری کا تعلق سرینگر کشمیر سے ہے''نیلیما'' ناول کے ذریعے آدی واسی سماج کی عورتوں کی نفسیاتی کیفیت اور اس طبقے کے لوگوں کی بنیادی کمزوریوں کا مشاہدہ کرکے ناول میں پیش کیا ہے نیلیما کے ذریعے اس طبقے کی سچی تصویر پیش کی ہے نیلیما چونکہ شروع سے آخر تک مختلف پریشانیوں کا سامنا کر رہی ہے اس لئے وہ معاشرے کی ساری حقیقت کو اچھی طرح سمجھنے لگی۔ ناول میں یہ دکھانے کی کوشش کی گئی ہے کہ آدی واسی مرد جنسی معاملات میں پاک رشتوں کا کوئی خیال نہیں رکھتے ہر کسی کو اپنی ہوس کا نشانہ بنا کر ظلم و جبر کرتے ہیں ناول کا پلاٹ مربوط ہے فنی و موضوعی دونوں اعتبار سے یہ کامیاب ناول ہے۔شفق سوپوری کا دوسرا ناول''فائرنگ رینج: کشمیر ۱۹۹۰'' ہے جس میں کشمیری عوام پر فوج کے ظلم و جبر کی داستان کو پیش کیا گیا ہے فوج جھوٹے الزامات لگا کر کشمیری عوام پر کس طرح ظلم و جبر کرتی ہے انہیں سچ سننے سے مطلب ہی نہیں۔ وہ سچ بتانے والے کو جھوٹے الزام میں پھنسا کر تشدد کا نشانہ بناتے ہیں ناول نگار نے بڑے جرات مندانہ انداز میں اس حقیقت کی تصویر کشی کی ہے۔شفق سوپوری کے دونوں ناول اپنے موضوع اور فن کے اعتبار سے بہترین ناول ہیں۔

مجموعی اعتبار سے دیکھا جائے تو ریاست جموں وکشمیر میں اردو ناول کی تعداد اگرچہ بہت کم ہے لیکن اب اس کی رفتار میں تیزی بھی آئی ہے اور معیار میں بھی نمایاں تبدیلی رونما ہوئی ہے ریاست میں لکھے گئے اکثر ناول موضوع اور فن دونوں اعتبار سے کامیاب ناول ہیں۔

☆☆☆

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ابتدائیہ

ریاست جموں و کشمیر دنیا کے خوبصورت مقامات میں سے ایک ہے یہاں کی خوبصورتی کے پیش نظر لوگوں نے اسے جنت بے نظیر یا خلد ارضی کہا ہے۔ یہاں کے اونچے اونچے خوبصورت پہاڑ، سرسبز و شاداب میدان، آسمان کو چھوتے ہوئے آبشار، یہاں کے لہلاتے دھان کے کھیت، زعفران کے خوبصورت پھول، سفید چادر کی مانند برف سے لدی خوبصورت چوٹیاں، مغل حکمرانوں کے بنائے ہوئے باغات، گلمرگ اور سونہ مرگ کے ہموار میدان اور وہاں کے دلکش مناظر اور دوسرے کئی خوبصورت قدرتی مناظر جو دنیا بھر کے لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کرتے ہیں اور دور دراز سے لاکھوں کی تعداد میں لوگ یہاں سیاحت کی غرض سے آتے ہیں۔ غرض یہ ریاست اپنی خوبصورتی کے باعث دنیا بھر میں مشہور ہے یہاں کے خارجی حسن سے تو دنیا واقف ہے لیکن داخلی حسن میں بھی جموں و کشمیر کم نہیں ہے یہاں کی ادبی فضا بھی کافی ذرخیز ہے۔ یہاں مغلوں کے عہد سے ہی فارسی زبان کو سرکاری زبان کا درجہ حاصل تھا لیکن بول چال کے لئے اردو زبان بھی استعمال ہونے لگی تھی۔ چناچہ اردو کی بڑھتی ہوئی مقبولیت کے پیش نظر مہاراجہ پرتاپ سنگھ نے ۱۸۸۸ء میں اسے سرکاری زبان کا درجہ دے دیا اور اس کے بعد یہاں اردو میں باقاعدہ تصنیف و تالیف کا آغاز ہوا اگر چہ آزادی سے پہلے اردو زبان و ادب کے فروغ کے لئے یہاں بہت کم کام ہوا۔ اس کی کئی وجوہات رہیں کیونکہ وہاں کے حالات بھی اچھے نہیں تھے اور چھاپہ خانہ قائم کرنے پر بھی پابندی تھی اس لئے آزادی سے پہلے یہاں اردو زبان میں شعر و ادب پر بہت کم کام ہوا۔ لیکن ابتدائی دور میں بھی یہاں کے شعراء و ادبا نے جس طرح اردو دوستی کا ثبوت دیا اور مقامی شعراء و ادبا نے بیرون کشمیر سے اردو رسائل و جرائد شائع کرنا شروع کیا اور ان رسائل و جرائد میں اپنی تخلیقات شائع کرنے لگے، آزادی کے بعد اس کی رفتار تیز ہوئی یہاں پریس قائم ہوئے اور اہل کشمیر نے اپنی تخلیقات اور اپنے مضامین یہاں سے شائع ہونے والے رسائل و جرائد میں چھپوانا شروع کیئے۔ اس طرح اردو زبان و ادب کی ترقی کے لئے راہیں ہموار ہوئیں اور یہاں تصنیف و تالیف کا باقاعدہ آغاز ہوا۔ اگر اردو ناول کی

بات کی جائے تو ریاست جموں وکشمیر میں اس کی روایت زیادہ پرانی نہیں ہے اگر چہ آزادی سے قبل بھی اردو ناول کے ابتدائی نقوش کا ذکر مختلف تحقیقی کتابوں اور مضامین میں ملتا ہے لیکن وہ ناول اب دستیاب نہیں ہیں چناچہ ریاست جموں وکشمیر میں اردو ناول کا باقاعدہ آغاز راما نند ساگر کے ناول سے ہوتا ہے اور اس کے بعد ٹھاکر پونچھی، حامدی کاشمیری، غلام رسول سنتوش وغیرہ نے اس روایت کو آگے بڑھایا اور اس طرح اردو ناول ترقی کی منازل طے کرتا گیا۔

اردو فکشن میں شروع سے ہی میری دلچسپی بھی رہی ہے اور ریاست جموں وکشمیر میں لکھے گئے ناولوں پر اس سے پہلے کوئی تحقیقی کام بھی نہیں ہوا تھا لہٰذا ڈی۔ فل۔ میں داخلہ کے لئے جب انٹرویو کا مرحلہ آیا تو میں نے اپنی دلچسپی کے مطابق انٹرویو کمیٹی کے سامنے ''ریاست جموں وکشمیر میں اردو ناول ۱۹۴۷ء کے بعد'' موضوع پر کام کرنے کی خواہش ظاہر کی جس پر کمیٹی کے ممبران بھی راضی ہو گئے اس طرح میرے ڈی فل کے مقالے کا موضوع ''ریاست جموں وکشمیر میں اردو ناول ۱۹۴۷ء کے بعد'' طے پایا۔ اصول تحقیق کے مطابق اس مقالے کو میں نے پانچ ابواب میں یوں تقسیم کیا ہے:

باب اول: ''اردو ناول کا سیاسی وسماجی پس منظر'': اس باب میں ناول کے پس منظر پر بحث کی گئی ہے ۱۸۵۷ء کی بغاوت نے اردو ادب کو کس طرح متاثر کیا اور ان اثرات سے ادب میں کیا تبدیلیاں رونما ہوئیں۔ اس کے علاوہ علی گڑھ تحریک سے وابستہ مصنفین نے اردو نثر کی ترقی میں کیا رول ادا کیا اس کا بھی مختصر جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ علاوہ ازیں نذیر احمد، رتن ناتھ سرشار، عبدالحلیم شرر اور رسوا کے ناولوں کا ایک مختصر تعارف بھی پیش کیا گیا ہے تا کہ اردو ناول کے ارتقائی سفر کو سمجھنے میں مدد ملے۔

باب دوم: ''ریاست جموں وکشمیر میں اردو زبان وادب کا ارتقا اور ناول کی روایت'': اس باب میں ریاست میں اردو زبان وادب کے ارتقا کا جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ مختلف ادوار میں یہاں کون کون سی زبانیں بولی جاتی رہیں اور کس عہد میں کون سی زبان سرکاری زبان رہی اس کا جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ جموں وکشمیر میں اردو ناول کی روایت پر بحث کی گئی ہے کہ ریاست جموں وکشمیر میں اردو ناول کی ابتداء کب ہوئی اور باقاعدہ اردو کا پہلا ناول کون سا ہے، اس پر مدلل روشنی ڈالی گئی ہے۔

باب سوم: ''ریاست جموں وکشمیر میں اردو ناول ۱۹۴۷ء سے ۱۹۷۰ء تک'': اس باب میں ریاست کے اس عہد کے ناول نگاروں کا مختصر تعارف پیش کرنے کے بعد ان کے ناولوں کا تنقیدی جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ اس عہد کے ناول نگاروں میں رامانند ساگر، ٹھاکر پونچھی، حامدی کاشمیری، علی محمد لون اور غلام رسول سنتوش وغیرہ کے ناولوں کو شامل کیا گیا ہے۔

باب چہارم: ''ریاست جموں وکشمیر میں اردو ناول ۱۹۷۱ء سے ۲۰۰۰ء تک'': اس باب میں مذکورہ دور میں لکھے جانے والے ناولوں کا جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ اس عہد کے ناول نگاروں میں جان محمد آزاد، عبدالغنی شیخ، شبنم قیوم، نور شاہ، زینت فردوس، عمر مجید، جیوتیشور پتھک وغیرہ شامل ہیں۔ ان ناول نگاروں کی حالات زندگی اور ادبی کارناموں پر مختصر روشنی ڈالنے کے بعد ان کے ناولوں کا تنقیدی جائزہ پیش کیا گیا ہے۔

باب پنجم: ''ریاست جموں وکشمیر میں اردو ناول ۲۰۰۱ء سے حال تک'': اس آخری باب میں اکیسویں صدی میں لکھے گئے ناولوں کا جائزہ لیا گیا ہے۔ اکیسویں صدی کے ناول نگاروں میں آنند لہر، ترنم ریاض، عبدالرشید راہگیر، شبنم قیوم، وحشی سعید اور شفق سوپوری وغیرہ ہیں۔ اس باب میں بھی ان تمام ناول نگاروں کا مختصر تعارف پیش کرنے کے بعد ان کے ناولوں پر تنقیدی نظر سے روشنی ڈالی گئی ہے۔

مقالے کے آخر میں حاصل مطالعہ پیش کیا گیا ہے اس کے بعد کتب و رسائل کی فہرست بھی درج کی گئی ہے جن سے میں نے دوران تحقیق استفادہ کیا ہے۔

میں اللہ رب العزت کی بارگاہ میں سجدۂ شکر ادا کرتا ہوں جس نے مجھے علم کے نور سے آراستہ کیا، مجھے صحت اور تندرستی عطا کی، میرے اندر محنت کرنے کا جذبہ پیدا کیا اور میرے اندر اتنی صلاحیت پیدا کی کہ میں اس مقالے کو پائے تکمیل تک پہنچا پایا۔

ریسرچ میں میرا داخلہ استاد محترم پروفیسر علی احمد فاطمی صاحب کی نگرانی میں دسمبر ۲۰۱۶ء میں ہوا۔ تحقیقی کام کرنے کے دوران ہی میری تقرری بطور استاد عارضی طور پر ایک سرکاری اسکول، پونچھ (جموں) میں فروری ۲۰۱۸ء میں ہوگئی جس کے باعث میری تحقیق کا سلسلہ درمیان میں ہی منقطع ہوگیا۔ بعض دقتوں کی وجہ سے میری ملازمت کا سلسلہ صرف ایک سال کی مدت تک ہی چلا اور میں نے دوبارہ تحقیقی مقالہ کو مکمل کرنے کا ادارہ

کیا۔اس دوران استادمحترم پروفیسرعلی احمد فاطمی صاحب ملازمت سے سبکدوش ہو گئے جس کی وجہ سے یہ مقالہ پروفیسرعلی احمد فاطمی صاحب کی نگرانی میں مکمل نہیں ہوسکا۔ میں استادمحترم کا بے حد شکرگزار ہوں کہ انھوں نے مجھے اپنے ساتھ کام کرنے کا موقع فراہم کیا۔ایک بہترین استاد ہونے کے ناطے انھوں نے نہ صرف میرے ادبی ذوق کی آبیاری کی بلکہ فلسفۂ حیات کا درس بھی دیا اور دوران تحقیق مسلسل میری رہنمائی اور حوصلہ افزائی فرماتے رہے۔اللہ ان کو جزائے خیر عطافرمائے۔

جب میں نے دوبارہ اپنی تحقیق جاری کرنے کی خواہش کا اظہار محترم المقام (صدرشعبۂ اردو، الہ آباد یونیورسٹی) پروفیسر شبنم حمید صاحبہ سے کیا تو اس سلسلہ میں استانی محترمہ پروفیسر شبنم حمید صاحبہ نے میری رہنمائی کی اور مجھے اپنی زیرنگرانی کام کرنے کا موقع فراہم کیا۔محترمہ پروفیسر شبنم حمید صاحبہ کی نگرانی میں میرا مقالہ پایۂ تکمیل کو پہنچا۔ دوران تحقیق مجھے بہت ساری دقتوں اور پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑا بالخصوص مواد کی فراہمی کا معاملہ دشوار تھا۔اس سلسلہ میں استانی محترمہ نے میری مدد کی اور مجھے بیرون شہر کی لائبریریوں میں جانے کا مشورہ دیا جس سے میری کافی دقتیں حل ہوگئیں۔شعبہ میں علم وادب کا ماحول بھی استانی محترمہ کی کاوشوں کا نتیجہ ہے۔انھوں نے ایسی ادبی اور علمی فضا کی تخلیق کی اور شعبہ میں ''مسیح الزماں لائبریری'' بھی قائم کی جہاں بیٹھ کر مطالعہ کرنے میں آسانی ہوگئی۔ میں استانی محترمہ پروفیسر شبنم حمید صاحبہ کا پرخلوص شکریہ ادا کرتا ہوں جنھوں نے مجھے یہ احساس نہیں ہونے دیا کہ میں اپنے شہر اور اہل خانہ سے دور ہوں۔ میں ان کی شفقت ومحبت کا احسان مند ہوں۔اللہ سے دعا کرتا ہوں کہ انھیں لمبی عمر اور صحت عطافرمائے۔

میں الہ آباد یونیورسٹی کے سابق شیخ الجامعہ پروفیسر رتن لعل ہانگلو کا بھی شکرگزار ہوں جنھوں نے ریسرچ کے دوران مجھے ملازمت کرنے کی بھی اجازت دی۔

گورنمنٹ ڈگری کالج پونچھ سے بی۔اے۔کرنے کے بعد میں نے ایم۔اے۔(اردو) کے لئے جموں یونیورسٹی میں داخلہ لیا۔دوران تعلیم ہی مجھے ڈاکٹریٹ کرنے کا شوق پیدا ہوا۔ایم۔اے۔(اردو) مکمل کرنے کے بعد پی۔ایچ ڈی۔کے موضوع کے انتخاب کے لئے میں ڈاکٹر لطیف میر (اسسٹنٹ پروفیسر، گورنمنٹ ڈگری کالج، پونچھ) کے پاس گیا۔میرے ذہن میں ریاست جموں وکشمیر کے ناولوں پر کام کرنے کا خاکہ تھا۔ میں نے اس سلسلہ میں ڈاکٹر لطیف میر صاحب سے مشورہ کیا۔انھیں یہ موضوع بہت پسند آیا اور

انھوں نے اس پر کام کرنے کی رائے دی۔ ان کے علاوہ پروفیسر قدوس جاوید صاحب (سابق صدر، شعبۂ اردو، کشمیر یونیورسٹی) سے بھی اس سلسلہ میں گفتگو ہوئی۔ انھوں نے بھی اس موضوع میں دلچسپی کا اظہار کیا۔ میں ان دونوں صاحبان کا شکر گزار ہوں جنھوں نے موضوع پر اپنی قیمتی آرا سے مجھے نوازا۔

میں جموں یونیورسٹی کے اساتذۂ کرام صدر شعبۂ اردو پروفیسر شہاب عنایت ملک، ڈاکٹر محمد ریاض احمد، پروفیسر ضیاء الدین، ڈاکٹر عبدالرشید منہاس، ڈاکٹر فرحت شمیم اور ڈاکٹر چمن لعل بھگت کا بے حد شکریہ ادا کرتا ہوں جن سبھی کی ادبی و علمی دولت نے مجھ ناچیز کو علم و ادب کی ابتدائی منزلیں طے کرنے میں مدد کی اور حوصلہ بھی عطا کیا۔ ان کے علاوہ میں شعبہ اردو، الہ آباد یونیورسٹی کے اساتذۂ کرام ڈاکٹر محمد کاشف، ڈاکٹر ظفر اللہ انصاری اور ڈاکٹر سنجے کمار کا بھی شکریہ ادا کرتا ہوں جن سبھی نے وقتاً فوقتاً میری رہنمائی کی اور بطور استاد مجھے مفید مشوروں سے نوازا۔

میں ڈاکٹر رضوانہ شمسی (اسسٹنٹ پروفیسر، شعبۂ اردو، بابا غلام شاہ بادشاہ یونیورسٹی، راجوری) کا بے حد شکر گزار ہوں جنھوں الہ آباد یونیورسٹی میں میرے داخلہ سے لے کر تحقیق میں آنے والی دقتوں میں میری بہت مدد کی۔ میں ڈاکٹر لیاقت علی کا بھی شکریہ ادا کرتا ہوں جنہوں نے سناپسس (Synopsis) تیار کرنے میں میری مدد کی۔

میں اپنے سینئرس (Seniors) ڈاکٹر نوشاد کامران، ڈاکٹر محمد افضل، ڈاکٹر محمد سلیم، ڈاکٹر محمد عرفان، اور ڈاکٹر آنند جی راؤ کا تہہ دل سے شکریہ ادا کرتا ہوں جنہوں نے میری حوصلہ افزائی کی اور نیک مشوروں سے نوازا۔ اس کے بعد میں اپنے ریسرچ کے ساتھیوں اور دوستوں جن میں طالب اکرام ،محمد ریحان خان ،محمد دانش، رخسار پروین، صفت زہرا، کائنات، راشدہ خاتون، زینب افضال، عالیہ بیگم ،فرح بانو، ارم نعیم، حرا شہاب، نہاں، محمد قاسم، سوریہ پرکاش راؤ، محمد مبشر، جاوید احسن، عامر اقبال، ارشد علی، محمد عارف وغیرہ شامل ہیں، میں سب کا شکریہ ادا کرتا ہوں جنہوں نے میری حوصلہ افزائی کی اور دعاؤں سے نوازا۔ میں محترمہ سفینہ سماوی صاحبہ اور محترمہ اسنیٰ سحر صاحبہ کا دل کی عمیق گہرائیوں سے شکریہ ادا کرتا ہوں جنہوں نے دوران تحقیق میرے ہر کام میں میرا ساتھ دیا اور جب بھی کوئی ضرورت محسوس ہوئی یا کسی مشکل سے سابقہ پڑا تو دونوں بہنوں نے بلا چون و چرا ہر ممکن مدد کی۔ میں اللہ سے دعا گو ہوں کہ اللہ آپ سب کو اجر عظیم عطا فرمائے۔ آمین

میں شعبۂ اردو الہ آباد یونیورسٹی کے غیر تدریسی عملہ (جناب محترم توفیق صاحب ،حسینہ صاحبہ اور روشن

صاحبہ) کا بھی شکر گزار ہوں جنہوں نے میرے کام کو ہمیشہ سنجیدگی اور ایمانداری سے کیا۔

میں محترم فہیم صاحب (راعی بک ڈپو) کا بھی شکریہ ادا کرتا ہوں جنہوں نے مجھے چند نایاب کتابیں فراہم کیں اس کے علاوہ کچھ نئے پرانے رسائل بھی منگا کر دیئے۔

تحقیق کے دوران میں نے مختلف کتب خانوں سے استفادہ کیا۔ میں ان کے لائبریرین اور ذمہ داران کا شکریہ ادا کرتا ہوں جنہوں نے میری ہر طرح سے مواد کی فراہمی میں مدد کی۔ الہ آباد یونیورسٹی کی سنٹرل لائبریری کے ملازم رحمت صاحب کا بے حد شکر گزار ہوں جنہوں نے موضوع سے متعلق کتابیں تلاش کرنے میں میری مدد کی۔ شعبۂ اردو جموں یونیورسٹی کی منظر اعظمی لائبریری کی انچارج محترمہ عظمت چودھری کا شکریہ جنہوں نے موضوع سے متعلق کتابیں فراہم کیں۔ اس کے علاوہ بارہمولہ پبلک لائبریری کے ملازمین کا شکریہ جنہوں نے مجھے تقریباً پچیس کتابیں دو دن میں فوٹو کاپی کرا کر دی۔ میں رامپور رضا لائبریری کے ملازمین کا بھی شکریہ ادا کرتا ہوں بالخصوص محترم اطہر مسعود صاحب کا شکریہ جنہوں نے کتابیں فوٹو کاپی کرانے میں مدد کی۔ شعبۂ اردو گورنمنٹ گرلز پی۔ جی۔ کالج رامپور میں تعینات اسسٹنٹ پروفیسر محترمہ رضیہ پروین کا بھی بے حد شکریہ جنہوں نے میری ہر ممکنہ مدد کی اور میرے مستقبل کے لئے نیک خواہشات کا اظہار کیا۔ میں ڈاکٹر تصنیف عزیز صاحبہ کا بھی بے حد شکر گزار ہوں جنہوں نے اپنی تمام تر مصروفیات کے باوجود میرے تحقیقی موضوع سے متعلق مجھے کتابیں ارسال کیں۔ اللہ انہیں اجر عظیم عطا فرمائے۔ آمین

میں اپنے معزز و مکرم والد محترم جناب منظور حسین صاحب اور اپنی مشفق و مہربان والدہ محترمہ رشیدہ بی کا پر خلوص شکریہ ادا کرتا ہوں جن کی محنت اور مشقت کا میں عین شاہد ہوں۔ جنھوں نے میری پرورش میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی اور حسب استعداد یا میں کہوں کہ اپنی استعداد سے باہر جا کر میری بہترین پرورش کی اور اعلیٰ تعلیم کے حصول میں میرے لئے راہیں ہموار کیں۔ والد محترم کا میری تعلیم و تربیت میں بہت بڑا ہاتھ رہا ہے وہ خود بھی محکمہ تعلیم میں استاد رہے اور تیس برس درس و تدریس سے وابستہ رہے انہوں نے ہزاروں طلبا کو تعلیمی زیور سے آراستہ کیا اور ان کی خواہش تھی کہ وہ مجھے بھی اعلیٰ تعلیم سے آراستہ کرائیں لہٰذا انہوں نے اردو انگریزی کی بنیادی تعلیم مجھے گھر پر خود دی اور پھر شہر کے اچھے اچھے اساتذہ کے پاس مجھے کوچنگ کے لئے بھیجا تا کہ آگے چل کر میرے راستے میں کسی قسم کی کوئی پریشانی حائل نہ ہو۔ پونچھ سے بی۔ اے۔ کرنے کے بعد جب میں نے

جموں یونیورسٹی سے اردو میں ایم۔اے۔کرنے کی خواہش کا اظہار والد محترم سے کیا تو وہ میرے ذوق وشوق کو دیکھ کر نہ صرف راضی ہوئے بلکہ انہیں خوشی بھی محسوس ہوئی اس طرح ایم۔اے۔اور پھر بی۔ایڈ کرنے میں بھی میرا ہمہ وقت ساتھ دیا۔بی۔ایڈ کے جب میں نے پی۔ایچ ڈی۔کے لئے الہ آباد یونیورسٹی میں داخلہ لینے کی بات کی تب بھی والد محترم نے میری حوصلہ افزائی کی اور یہ نصیحت بھی کی کہ وہاں گرمی بہت زیادہ ہوگی شاید مجھے وہاں کی آب وہوا راس نہ آئے لیکن اگر میں کرنا چاہتا ہوں ہوں تو ان کی طرف سے اجازت ہے۔ دوران تحقیق جب میری سلیکشن گورنمنٹ اسکول میں بحیثیت استاد ہوا تو میں نے جب والد محترم سے اس بات کا اظہار کیا تو انہیں بہت خوشی ہوئی انہوں نے مجھے یہ صلاح دی کہ میں یہ جاب جائن کروں اور ریسرچ بھی جاری رکھوں۔میں نے ان کی بات پر عمل کرتے ہوئے جاب جائن کر لی دوران ملازمت بھی انہوں نے مجھے اپنے نیک مشوروں سے نوازا۔وہ ہر روز میرے پاس آدھا گھنٹہ یا ایک گھنٹہ بیٹھتے کبھی مجھے نصیحت کرتے کبھی میری کمزوریوں کی طرف اشارہ کرتے اور کبھی میری کامیابی پر میری حوصلہ افزائی کرتے۔والد محترم کے کن کن احسانات کو یاد کروں ان کا شکریہ ادا کرنے کے لئے الفاظ کم پڑ رہے ہیں۔مجھے اس مقام تک لانے میں میرے والد محترم کا بہت بڑا ہاتھ ہے۔میں آج جو کچھ بھی ہوں والد محترم کی وجہ سے ہوں۔میں بارگاہ خداوندی میں دعا گو ہوں کہ اللہ ان کی مغفرت فرمائے ان کے درجات بلند کرے اور اللہ انہیں جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے۔آمین

جب میں تحقیق کو دوبارہ جاری رکھنے کے لئے الہ آباد آیا تھا اور یہاں مسلسل کوششوں میں سرگرداں تھا۔اسی دوران میرے والد محترم ۲۵ ستمبر ۲۰۱۹ء کو داغ مفارقت دے گئے۔میں اس وقت الہ آباد میں موجود تھا اور ان کے آخری دیدار سے محروم رہ گیا۔بہر حال دو دن کا طویل اور مشکلوں بھرا سفر میں نے کیسے طے کیا میں خود نہیں جانتا۔چند روز گزر جانے کے بعد میں نے ڈی۔فل۔کو جاری رکھنے کا ارادہ ترک کر دیا کیونکہ میں اپنے گھر میں سب سے بڑا ہوں اور والد صاحب کے بعد مجھ پر گھر کی ساری ذمہ داریاں آ گئی تھیں۔لیکن میری والدہ،میرے بھائی بہنوں اور عزیزوں نے مجھے حوصلہ دیا اور تسلی دی کہ وہ لوگ مل کر ساری ذمہ داریاں سنبھال لیں گے۔لہٰذا میں ان کے وعدے پر الہ آباد واپس آیا اور فیس وغیرہ جمع کرنے کے بعد میرا ایڈمیشن رینیو (Renew) ہو گیا اس طرح میں نے اپنے تحقیقی کام کو مختلف دشواریوں کے باوجود جاری رکھا اور یہ مقالہ مکمل

کرنے میں کامیاب ہوا۔

یہ ناانصافی ہوگی اگر میں اپنے عزیز بھائیوں محمد ایاز اور معشوق احمد کا شکریہ ادا نہ کروں جنھوں نے میرے اس کام کی اہمیت کو سمجھا اور گھر کی ذمہ داریوں کو بخوبی نبھایا۔ میں اپنی بہن محترمہ فرزانہ صاحبہ کا بھی شکر گزار ہوں جن کی دعائیں ہمیشہ میرے ساتھ رہیں۔ میں اپنے بہنوئی جناب حاجی نصیر احمد صاحب کا بھی دل کی عمیق گہرائیوں سے شکریہ ادا کرتا ہوں جنہوں نے بڑے بھائی کی طرح مشکل وقت میں میرا ساتھ دیا اور ہر دکھ سکھ میں پیش پیش رہے۔ ان کے علاوہ میں اپنے عزیز و اقارب کا بھی شکریہ ادا کرتا ہوں جنھوں نے وقتاً فوقتاً میری حوصلہ افزائی کی۔ بالخصوص حاجی محمد بشیر صاحب (بڑے ابو) اور چچا محترم محمد شبیر صاحب کا بھی شکریہ جن کا سایۂ شفقت ہمیشہ میرے ساتھ رہا۔

میں شکر گزار ہوں محترم جناب محمد حفیظ صاحب کا جن کے گھر رہ کر میں نے اپنے تحقیقی کام کو مکمل کیا۔ میں ان کی اہلیہ محترمہ رانا بیگم کا خصوصی شکریہ ادا کرتا ہوں جنہوں نے مجھے اپنے بیٹوں کی طرح رکھا اور کھانے پینے کا بھی انتظام کیا۔ میں ان کے بچوں (آصف حفیظ، کاشف حفیظ، رانی حفیظ اور روزی حفیظ) کا بھی شکر گزار ہوں جنہوں نے مجھے اپنا بھائی سمجھ کر کسی نہ کسی صورت میں میری مدد کی۔ میں دعا گو ہوں کہ اللہ پاک محترم محمد حفیظ اور ان کے تمام اہل خانہ کو سدا سلامت رکھے اور دنیا و آخرت میں کامیابی و کامرانی عطا فرمائے۔

میں جناب فرید اختر صاحب کا بے حد شکر گزار ہوں جنہوں نے اس مقالے کی کمپوزنگ کی ذمہ داری قبول کی اور بڑی محنت، لگن اور جانفشانی سے اس کام کو انجام دیا۔ مقالے کی کمپوزنگ کے علاوہ انہوں نے میرے دیگر کام بھی بہت ایمانداری سے کئے۔ اللہ پاک انہیں اجر عظیم عطا فرمائے۔ آمین

میں ان تمام عزیز و اقارب کا بھی شکر گزار ہوں جن کا نام میں فرداً فرداً نہ لے سکا اور جن کا تعاون کسی نہ کسی صورت میں شامل رہا۔ اللہ سب کو اس کا بہترین اجر عطا فرمائے۔ آمین یا رب العالمین

امتیاز احمد

شعبۂ اردو الہ آباد یونیورسٹی، پریاگ راج

۱۵ر جنوری ۲۰۲۱ء

فہرست

باب اوّل

اردو ناول کا سیاسی وسماجی پس منظر

(۱) ۱۸۵۷ء کی بغاوت کے اردو ادب پر اثرات

(۲) علی گڑھ تحریک کے زیر اثر اردو نثر کا ارتقا

(۳) نذیر احمد، سرشار، شرر اور رسوا کے ناول۔ایک تعارف

۱۸۵۷ء کی بغاوت کے اردو ادب پر اثرات

۱۸۵۷ء کا ہنگامہ ایک ایسا ہنگامہ ہے جس نے ہندوستان کے ہر شعبہ پر اثر ڈالا۔ چاہے وہ سیاسی ہو یا سماجی، ثقافتی ہو یا ادبی ہر زاویۂ نظر سے بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ ۱۸۵۷ء کی یہ لڑائی حادثہ نہ تھی بلکہ اس کے پیچھے اسباب وعلل کا ایک پورا سلسلہ تھا۔ یہاں اس کے سیاسی محرکات سے بحث نہیں اس کے ذہنی تار و پود پر غور کرنا ہے۔ ۱۸۵۷ء کا ہنگامہ ایک حادثہ کے طور پر بہت تیزی سے اٹھا اور دب گیا لیکن اپنے آپ میں ایک ایسی مثال رقم کر گیا کہ ہندوستان کی کوئی تاریخ اس حادثہ کے بغیر مکمل نہیں ہوسکتی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ حادثہ محض اتفاقی نہ تھا بلکہ اس کے پس پردہ فکر و سیاست کا ایک طویل سلسلہ تھا۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ اس حادثہ کا تعلق براہ راست سماجی وسیاسی تھا لیکن اس کی اہمیت زندگی کے ہر حصے پر اثر انداز ہوئی۔ زبان وادب بھی اس کے اثرات سے بچ نہ سکے۔ زبان وادب کا رشتہ سیاست اور سماج سے بڑا گہرا ہوتا ہے۔ کوئی بھی ادب اپنے سماج سے متاثر ہوئے بغیر ایک قدم بھی آگے نہیں بڑھ سکتا۔ ہر عہد کا ادب اپنے وقت کے سماجی اتار چڑھاؤ سے ہر حالت میں کسی نہ کسی نوعیت میں منسلک رہتا ہے پھر یہ ہنگامہ جو مختلف تبدیلیوں کا باعث بنا جس کے اثرات سے ہندوستان ایک انقلابی موڑ سے دو چار رہا۔ ادبی اعتبار سے بھی یہ ہنگامہ اپنی مثال آپ ہے۔

بقول محمد حسن:

> ’’1857ء کی لڑائی فکر وخیال کے طویل سلسلے کی ایک کڑی کی حیثیت رکھتی ہے اور چونکہ ادب بھی خیال اور جذبہ ہی کا نام ہے اس لئے اس عہد کے فکری تانے بانے کو اس لڑائی نے جس طرح متاثر کیا تھا وہ ادبی مورخ کے لیے بھی دلچسپی کا موضوع ہے۔‘‘[۱]

محمد حسن کے اس قول کے مطابق اس حادثے کا اثر ادب پر پڑنا لازمی تھا۔ اب یہ تلاش کرنے کے لیے

[۱] محمد حسن، شعر نو، ص ۳۲، ادارہ فروغ اردو لکھنؤ، ۱۹۶۱ء

کہ اس کے اثرات اردو ادب پر کس حد تک اور کس انداز سے رونما ہوئے اس وقت کے ادب کی طرف مڑنا ہوگا۔

غدر سے پہلے اردو ادب ایک دوسرے ہی ماحول سے دوچار تھا شاعروں اور ادیبوں کے سرپرست عام طور پر امیر اور رئیس لوگ ہوا کرتے تھے۔ سماج میں نرمی، شیرینی اور آسودگی تھی۔ آرام پسندی اور عیش وعشرت معاشرے کا حصہ تھا۔ جاگیردارانہ، سرمایہ درانہ نظام کے اثرات غالب تھے۔ چنانچہ ادب میں کچھ اسی قسم کے اثرات اور عناصر دکھائی دیتے ہیں۔ پھر جب یہاں انگریز حاکم ہوئے رفتہ رفتہ ظلم و جبر کا دور دورہ ہونے لگا۔ اس کے جواب میں بغاوت کی آگ بھڑک اٹھی۔ سارا شیرازہ بکھر گیا۔ ہر شے میں انقلاب آ گیا۔ پورے ہندوستانی سماج میں یہ تضاد اور انتشار پھیلتا گیا۔ ایسٹ انڈیا کمپنی اپنے ظلم کے شکنجے کستی چلی گئی۔ امتیازات بڑھنے لگے۔ دہلی اجڑ چکی تھی، لکھنوی تہذیب انگریزوں کے پیروں تلے روندی جا چکی تھی ایسی حالت میں ادب کیسے بچ سکتا تھا۔ وہ بھی لپیٹ میں آیا۔ ادیب بھی پریشانی اور خستہ حالی کے بھنور میں پھنسے اور یہی خستہ حالی افسردگی ہمیں اس وقت کے ادب میں نمایاں طور پر نظر آتی ہے کیونکہ ادیب بھی اسی سماج کے تھے وہ بھی انہیں حالات سے دوچار ہو رہے تھے۔ پھر ان کا قلم کیوں کر رک سکتا تھا۔

مرزا اسد اللہ خاں غالب اس دور کے ادبی اور تمدنی روایات کے بہترین پیکر سمجھے جاتے ہیں جو بعض مقامات میں انگریزی پالیسی کے معترف بھی تھے لیکن جب بغاوت اٹھی تو یہ بھی اس میں پسے بغیر نہ رہ سکے جس کے اثرات ان کی شاعری اور خطوط میں بھی نظر آتے ہیں۔ محمد حسین آزاد کے والد محمد باقر کو گولی ماردی گئی۔ اس کے علاوہ شاعر امام بخش صہبائی اور ان کے دو بیٹوں کو قتل کر دیا گیا۔ مصطفیٰ خاں شیفتہ کو گرفتار کر کے جیل میں ڈال دیا گیا۔ اس عہد کے مشہور ومعروف عالم مولانا فضل حق کو جلا وطن کر کے انڈمان بھیج دیا گیا۔ جہاں ان کا بعد میں انتقال ہو گیا۔ منیر شکوہ آبادی کی نظموں میں اس وقت کے حالات کا پتہ چلتا ہے ان کو گرفتار کر کے ان پر مقدمہ چلایا گیا ان سب کی تخلیقات کا اگر بغور مطالعہ کیا جائے تو ایک ایک شعر میں اس عہد کی تصویر نظر آئے گی۔ افسردگی کا یہ مزاج اس وقت کی پوری شاعری میں سما گیا تھا۔ غزل نے ایک الگ روپ اختیار کر لیا اشارے و کنایے کی زبانیں تیز ہو چلیں۔ بہادر شاہ ظفر آخری تاجدار مغلیہ حکومت جو شاعر بھی تھے۔ ان کی لے میں کس قدر آہ و درد ہے ان کے ساتھ ظالموں نے بڑا ظلم کیا۔ ان کی ایک غزل سے آنسو ٹپکتے ہیں ۔

یا میرا افسر شاہانہ بنایا ہوتا
یا میرا تاج گدایانہ بنایا ہوتا
اپنا دیوانہ بنایا مجھے ہوتا تونے
کیوں خرد مند بنایا نہ بنایا ہوتا

واجد علی شاہ اختر جو اپنی علمی و ادبی صلاحیتوں کے لیے مشہور تھے اور ایک خاص مزاج نفاست اور لطافت کے مالک تھے۔ اپنی تباہ حالی کا بیان اپنی مثنوی میں بڑے درد کے ساتھ کرتے ہیں ان کی بعض غزلیں بھی سوز و گداز سے پر ہیں شیفتہ اپنے وقت کے مشہور شاعر ہیں انھوں نے بھی اپنی شاعری میں انقلاب کے اثرات کا اظہار کیا ہے۔ اردو شاعری کے یہ چند موتی جو اس آگ کی لپیٹ سے بچ سکے اس دور کی خستہ حالی، پریشانی اور مصیبتوں کے مظہر ہیں۔ ورنہ زیادہ تر سرمایہ تو برباد ہو گیا اور محفوظ نہ رہ سکا۔ پھر بھی جو تصانیف ہمیں مل جاتی ہیں درج ذیل ہیں:

خطوط غالب، داستان غدر از ظہیر دہلوی، تاریخ سرکشی بجنور اور اسباب بغاوت ہند از سرسید، تاریخ ہند از ذکا اللہ، فغاں دہلی، واجد علی شاہ، منیر شکوہ آبادی، بہادر شاہ ظفر، غالب، شیفتہ وغیرہ کی نظمیں جو دوران بغاوت لکھی گئی تھیں اہم ہیں۔ یہ حقیقت ہے کہ بغاوت اچانک اٹھی اور دب گئی۔ ہنگامے ہوئے اور سرد پڑ گئے لیکن بغاوت کے بعد جو اہمیت تسلیم اور اس کی باریکیوں، نزاکتوں اور دور سے نظر آنے والے فائدوں کو پڑھا اور سمجھا گیا۔ ۱۸۵۷ء میں اس کی اصلی شکل نہ سمجھی جا سکی تھی وہ تو بس ہندوستان کی بدنصیبی لاپرواہی، اپنی کمزوری اور انگریزوں کی طاقت کی علامت سمجھی گئی تھی۔

۱۸۵۷ء کی بغاوت کا ابتدا میں صحیح تصور ذہن میں نہ تھا لیکن جب بغاوت سرد پڑی تب ہندوستانی عوام کا ذہن جاگا دل میں دماغ میں بیداری آئی۔ اپنے آپ کو پہچاننے کی سمجھ آئی اور جب ان سب کے باوجود انگریزوں کے ظلم و زیادتی میں کسی طرح کی کمی نہ آئی تو ساری بیداریاں متحد ہو گئیں اور اپنے آپ کو ایک سنجیدہ اور روشن راہ پر گامزن کر دیا۔ ذہن جاگا، فکر نے کروٹ لی، خیالات روشن ہوئے اور ان سب کے نتائج غدر کے بعد آہستہ آہستہ نمایاں طور پر نظر آنے لگتے ہیں ادب میں بھی اس طرح کی تبدیلیاں رونما ہوئیں۔ ہنگامے سے ذرا پہلے اور ہنگامے کے وقت جو افسردگی، بےبسی، تاریکی اور ویرانی ادب میں ملتی ہے بغاوت کے بعد اس میں

بھی تبدیلی آنے لگتی ہے۔ ظ۔ انصاری کا خیال بالکل درست ہے:

''1857ء کے ہنگامے سے اس کے پہلے اور اس کے بعد کے احساس
پس ماندگی اور شکست مکمل کے جو منفی اثرات اردو ادب میں نظر آتے ہیں
وہ تصویر کا ایک دردناک رخ ہے لیکن دوسرا رخ اس قدر تابناک بھی
ہے۔ اس تاریخی واقعہ کی جدلیات (Dialecties) کا سراغ ملتا ہے
جب ہم شعرا اور ادیبوں کی تباہ حالی، عام لوگوں کے احساس، بے بسی،
ادبی مرکزوں کی سراسیمگی، کلیات، دیوانوں اور تصنیفوں کی تلخی، بے باک
اہل قلم کی زبان بندی، قتل، پھانسی اور کالے پانی کی سزاؤں کے ساتھ
ادب کے سرپرستوں کی پریشان زندگی کے ان گھپ اندھیروں میں نئے
تصورات، عقلیت پسندی نئی آگاہی اور نئے قومی ذہن کی بیداری کو
اونچے ہوتے دیکھتے ہیں۔ یہ لو آہستہ آہستہ اونچی ہوتی ہے اور اس کی
روشنی اس خونی افق سے پھیلی ہے جس میں ہمارے بڑے بڑے روشن
ستارے ڈوب گئے۔''[۱]

یہ تھی کفن کی سفیدی میں پوشیدہ نظر آنے والی روشنی، موت کی آڑ میں جھانکتی ہوئی زندگی کے آثار، ظلم کی آواز میں گونجتی مخالفت کی لہر، نیا شعور، نیا ذہن، نیا سماج ابھر رہا تھا۔ اس کانپتے ہوئے دور میں جب انگریز حکومت اکھڑی اکھڑی سانسیں لے رہی تھی، ہندوستانی عوام، ہندوستانی سماج، نئے جذبات، نئے احساسات کے ساتھ ایک نئی اٹھکیلیاں دکھا رہا تھا۔ افسردگی تازگی کا روپ لینے لگی۔ احساس پسپائی کی شدت میں کسی حد تک کمی آ چکی تھی ماضی روشن مستقبل کے لیے تڑپ رہا تھا۔ ان سب کا براہ راست اثر ادب پر پڑا۔ ۱۸۵۷ء کے بعد اردو ادب میں ایک نئی فکر، ایک نئے جوش، ایک نئی تبدیلی، ایک نئی تحریک کا آغاز ہونے لگا۔ احتشام حسین لکھتے ہیں:

''اس کے بعد ادب کے بیشتر حصے سے ایک مختلف رنگ نمایاں ہے اس
کے بعد کے شاعروں اور ادیبوں کو نئے انداز فکر کے راہی قرار دیا جا سکتا

[۱] ظفر انصاری، زبان و بیان، ۱۸۵۷ کے دور میں اردو ادب، ص ۲۴۵، آزاد کتاب گھر دہلی ۱۹۵۹ء

ہے جنھوں نے ادب کو قوم کے ارتقا میں ایک تعمیری عمل تصور کیا۔ ان کے
خیال میں ادب کا کام لوگوں میں نیا شعور پیدا کرنا بھی ہے ان میں اہم
ترین شخصیتوں کے نام یہ ہیں:

سر سید احمد خاں، خواجہ الطاف حسین حالی، مولانا محمد حسین آزاد،
نذیر احمد، مولانا شبلی، مولانا ذکاء اللہ، چراغ علی، محسن الملک اور
وقار الملک۔ ان سب کا عقیدہ یہ تھا کہ ادب زندگی کے مطابق بھی ہو اور
اس کے لیے فائدہ مند بھی۔'' [۱]

غدر سے پہلے اور غدر کے بعد ادب میں یہ فرق تھا اور یہ فرق غدر نے ہی پیدا کیا۔ اسی بنا پر ۱۸۵۷ء کی جدوجہد تنہا ہماری سیاسی تاریخ ہی نہیں بلکہ ہمارے ذہن، تمدن اور ادبی ارتقا میں بڑی اہمیت کی حامل ہے۔ ۱۸۵۷ء کے بعد کا ماحول ڈگمگا رہا تھا ادب میں ایک عجیب سی بے چینی نظر آ رہی تھی قدامت اور جدیدیت ایک دوسرے کو نوچ کھسوٹ رہی تھی۔ اچھے اور برے دونوں عناصر مل جل کر ایک نیا خمیر بنا رہے تھے۔ دربار سے رشتہ ٹوٹ کر سماج سے جڑنے لگا تھا۔ اپنے ذہن اور اپنے بازوؤں پر اعتماد کیا جانے لگا۔ شکست کے بعد اس حقیقت سے انکار کی گنجائش قطعی نہ رہ گئی کہ نئے خیالات اور نئے حالات کو آنے سے اب کوئی روک نہیں سکتا ہے۔ ماضی کی عظمت سے انکار نہیں۔ لیکن تنہا اس کو گلے لگا کر جینا اب مشکل ہے یہ احساس رفتہ رفتہ سماج میں اثر کرنے لگا اس لئے ادبی تحریروں میں فرق آیا۔ ادیبوں نے سوچا کہ حال تو تباہ ہو گیا اب مستقبل ہاتھ سے نہ جانے پائے اور مستقبل کو سنوارنے کے لیے روشن ماضی ہی کا سہارا لیا جا سکتا ہے۔ اسی خیال کے تحت ہم کو غدر کی اہمیت کو تسلیم کرنے میں شاید ہچک نہ ہو کہ اسی وجہ سے ادب میں ایک خوشگوار انقلاب آیا اور یہ حادثہ ہی ادب کی تاریخ میں ایک دور کا خاتمہ کرتا ہے تو دوسرے سنبھلے ہوئے دور کا آغاز بھی۔ فراق گورکھپوری کا یہ خیال حقیقت پر مبنی ہے کہ:

''ہندوستان کا 1857ء کا غدر دودھاری تلوار تھا، جس نے دونوں طرف
سے وار کیا اور جو تخریبی کے ساتھ ساتھ تعمیری اور تخلیقی بھی تھا۔'' [۲]

---

[۱] پی۔سی۔ جوشی، انقلاب ۱۸۵۷ء، ص ۲۴۶، ترقی اردو بیورو ۱۹۸۳ء
[۲] مرزا رسوا، حیات اور ناول نگاری از آدم شیخ، ص ۳۵، نسیم بک ڈپو لکھنؤ ۱۹۶۸ء

دربار سے شاعری کا رشتہ ٹوٹا تو اردو شاعری کا دامن نئے ہندوستان سے آراستہ ہونے لگا۔ اب شاعری کی باگ ڈور متوسط طبقے کے ہاتھ آ گئی نئے نظام کے زیر سایہ پلنے لگی۔ نئے بکھرے ہوئے شاداب جھرنوں کے سوتے شاعری میں پھوٹنے لگے۔ سرسید، حالی، شبلی، نذیر احمد، ذکاء اللہ یہ سب الگ الگ مزاج الگ الگ ذہن، لے کی ایک نئی فکر کے ساتھ ادب میں داخل ہوئے ان سب میں سے کسی ایک کا تعلق دربار سے دور دراز تک نہ تھا۔ ان میں سے کوئی بھی دربار کے کسی طور طریقہ سے واقف نہ تھے ان لوگوں نے آگے چل کر کیا کیا گل افشانیاں کیں اس کا تذکرہ آگے تفصیل سے آئے گا یہاں پر صرف یہ ظاہر کرنا ہے کہ غدر سے قبل داستانوں کا رواج تھا وہ ایک دم سے سلیس اور معنی خیز نثر میں تبدیل ہو گیا۔ بقول محمد حسن:

> ''داستانوں میں ہر داستان کا تاج شہزادوں اور بادشاہوں کے سر سے اتر کر متوسط طبقے کے گھرانوں کے حصے میں دے دیا گیا اس نئی ادبی فضا نے کون سے رخ اختیار کیے یہ جدید اردو ادب کا محبوب موضوع رہا ہے اس فضا کا نقطۂ آغاز 1857ء ہی کو قرار دیا جا سکتا ہے۔''[۱]

اس بغاوت میں ہندوستان کو خاصے تجربات ہوئے۔ نئے خیالات کے ساتھ جدید ہندوستانی قومی تحریک کی تعمیر و تشکیل بھی ہونے لگی ادب دربار سے باہر نکلا اور عوام کی زندگی میں شامل ہو گیا پروفیسر خلیق احمد نظامی لکھتے ہیں کہ :

> ''1857 کا غدر ہندوستان کی سیاسی اور ثقافتی تاریخ میں ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے قدیم اور جدید کے درمیان یہی وہ منزل ہے جہاں سے ماضی کے نقوش پڑھے جا سکتے ہیں اور مستقبل کے امکانات کا بھی جائزہ لیا جا سکتا ہے۔''[۲]

ادیبوں اور دانشوروں نے یہ سوچا کہ نئے خیالات سے ادب کو کافی فائدہ مل سکتا ہے۔ لہٰذا وہ مستقبل کی شمع روشن کرنے میں لگ گئے اور ادب میں رفتہ رفتہ ایک خاموش انقلاب کی شکل نظر آنے لگی۔ مثنویوں کا دور ختم

---

۱ ۱۸۵۷ء کی ادبی اہمیت (شعر نو محمد حسن) ص ۴۶، ادارہ فروغ اردو لکھنؤ، ۱۹۶۱ء

۲ خلیق نظامی، ۱۸۵۷ء کا تاریخی روزنامچہ، ص ۳، ندوۃ المصنفین، ۱۹۵۸ء

ہوا۔ کیونکہ اس کے مزاج کی اب فضا باقی نہ رہی دربار اجڑ گئے تو قصیدے کا زوال آ گیا پہلے ایک ایک شعر پر نواب اشرفیاں برسا دیتے تھے اب خود نواب ہی مال و زر کو ترستے تھے نیا دور آیا تو مشغولیات بڑھیں۔ داستانیں مٹنے لگیں۔ فرد کے بجائے اب پوری جماعت سے تعلق ہونے لگا۔ ادیب سنبھلے اور اپنے قلم کو فضولیات سے ہٹا کر زندگی کی حقیقتوں کی طرف موڑ دیا نیا دور اپنے ساتھ سائنس لایا مغربی رجحانات لایا۔ بس ایسے ہی ماحول میں اردو ادب کے چند علم بردار سامنے آئے جنھوں نے فرسودہ ادب میں نئے خیالات، نئے احساسات اپنے قلم کے ذریعے دیے۔

غرض کہ ادب جو اب تک محض فرضی داستانوں یا قصوں تک محدود تھا اس میں اب نئے خیالات کی بھرمار ہو گئی۔ اصلی تصویر ادب کے ذریعے پیش کی جانے لگیں جس کے اثرات دور دراز تک پھیل گئے آج تک اردو کا پورا سرمایہ ان کے خیالات کے گرد ناچ رہا ہے۔ اسی نقطۂ نظر سے یہ جدوجہد محض سیاسی بیداری کی ہی حامل نہیں بلکہ ہماری ذہنی بیداری نئے فکری رجحانات اور ادبی تاریخ میں بھی ایک اہم مقام رکھتی ہے۔

علی گڑھ تحریک کے زیر اثر اردو نثر کا ارتقا

یہ حقیقت ہے کہ اردو زبان وادب بالعموم اور نثر بالخصوص سید احمد خاں سے نہ صرف متاثر ہوئی بلکہ ان کی کاوشوں کی بدولت پروان چڑھی اور آخر انیسویں صدی کی ہر ادبی تخلیق پر ان کے افکار وخیالات اور نثری نگارشات کا اثر نظر آتا ہے اور نہ صرف اس دور میں بلکہ مستقبل کی زبان کے لیے بھی نئی سمت مقرر کی انھوں نے اپنی زبان کے سرمائے کا جائزہ لیا تو اندازہ ہوا کہ:

> ''فن شاعری جیسا ہمارے زمانے میں خراب وناقص ہے اس سے زیادہ کوئی چیز بری نہ ہوگی مضمون تو بجز عاشقانہ کے کچھ اور نہیں ہے وہ بھی نیک جذبات انسانی کو ظاہر نہیں کرتا۔ بلکہ ان جذبات کی طرف اشارہ کرتا ہے جو ضد حقیقی تہذیب واخلاق کے ہیں۔''[1]

شاعری میں غزل کی صنف نظم پر حاوی تھی۔ یہ سید احمد خاں کے تنقیدی خیالات کا اثر تھا کہ ''انجمن پنجاب'' کی تاسیس سے جدید نظم نگاری کا آغاز ہوا اور محمد حسین آزاد اور مولانا الطاف حسین حالی نے روایتی غزل کو چھوڑ کر موضوعاتی نظمیں لکھنا شروع کیں۔ انھوں نے اس نئی انقلابی کوشش سے خوش ہو کر لکھا:

> ''اردو زبان کے علم وادب کی تاریخ میں 1874ء کا وہ دن جب لاہور میں نیچرل شاعری (پوئٹری) کا مشاعرہ ہوا ہمیشہ یادگار رہے گا محمد حسین آزاد کی مثنوی ''خواب امن'' ہمارے دلوں کو خواب غفلت سے جگاتی ہے مولانا خواجہ الطاف حسین حالی کی مثنویوں نے ہمارے دلوں کے حال کو بدل دیا ہے ان کی مثنوی ''حب وطن'' اور مثنوی ''مناظرۂ رحم و انصاف'' درحقیقت ہمارے زمانے کے علم وادب میں ایک اہم کارنامہ

---

[1] تہذیب الاخلاق، جلد سوم، شمارہ نمبر ا، ۱۱ مارچ ۱۸۷۲ء، ص ۴

ہے ان کی سادگیٔ الفاظ، صفائیٔ بیان، عمدگیٔ خیال ہمارے دلوں کو بے اختیار کھینچتی ہے۔''[1]

لیکن سرسید کا عظیم کارنامہ اردو نثر کی ترقی و ترویج ہے ان سے قبل اردو نثر کا کم و بیش سارا سرمایہ داستانوی ادب سے متعلق تھا۔ اور نثر میں علمی و ادبی مضامین بہت کم لکھے گئے تھے۔ اس وقت کے ذخیرہ کو تین زمروں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔

فورٹ ولیم کالج کی نثر

غالب کے خطوط کی نثر

اور دلی کالج کی نثر

فورٹ ولیم کالج کے ذریعے اردو نثر میں جو کچھ لکھا گیا اس کا بنیادی مقصد غیر اردو داں انگریز حکام کو اردو سے روشناس کرانا تھا اس لیے اس کالج سے یا تو مختلف علوم سے ترجمے یا پھر دیگر زبانوں کی منظوم داستانوں سے ماخوذ نیم طبع زاد کتابیں شائع ہوئیں۔ کالج میں جو ادبی اصلاح عمل میں آئی اس کا تعلق زبان و بیان سے تھا نہ کہ موضوعات اور مباحث سے۔ وہاں کے ارباب قلم نے دقیق اور مشکل اسلوب سے گریز کیا اور سادہ اور عام فہم زبان میں قصے کہانیاں لکھیں۔

غالب نے اپنے خطوط میں رنگین اور مرصع زبان کے بجائے سلیس اور بے ساختہ عبارت لکھی اور سہل ممتنع کی داغ بیل ڈالی۔ انھوں نے اپنے قلبی واردات، ذہنی افکار، کائنات کے اسرار اور اپنے مشاہدات و تجربات کو سیدھے سچے بے تکلف مگر سحر آفریں طریقے پر بیان کیا۔ یہ خطوط نہ صرف ان کی ظاہری اور باطنی زندگی کے ترجمان تھے بلکہ ایک ایسا مجلیٰ اور مصفیٰ آئینہ جس میں ہر شخص اپنے خدوخال دیکھ سکتا اور دل کی دھڑکن سن سکتا۔ لیکن اس کے باوجود ان کا اسلوب اتنا قوی نہیں تھا کہ عمیق، دقیق اور علمی و فنی موضوعات کا بار گراں اٹھا سکتا۔

دلی کالج سے متعلق مصنفین نے اپنی تخلیقات سے علمی نثر کو فروغ دیا۔ بالخصوص ماسٹر رام چندر نے ہر نوع کے مضامین لکھے جو ان کے ذاتی اخبار ''فوائد الناظرین'' اور ''محبِّ وطن'' میں شائع ہوئے جو ملک و قوم کی

[1] تہذیب الاخلاق، جلد ۴، شمارہ نمبر ۱، یکم محرام الحرام ۱۲۹۲ھ مطابق ۱۸۷۵ء، ص ۵

اصلاح کی خاطر اور زمانے کے تقاضوں اور مطالبات کو سمجھ کر تحریر ہوئے تھے۔

اردو نثر کے اس محدود سرمایہ سے سرسید احمد خاں یقیناً مستفید ہوئے ہوں گے لیکن نسبتاً نثر کا دائرہ محدود تھا کبھی طوعاً و کرہاً لکھی بھی جاتی تو وہ چیستاں و معمہ معلوم ہوتی تھی اور اس کو سمجھنے کے لیے ہفت خواں طے کرنا پڑتا تھا۔ سید احمد خان بنیادی طور پر مصلح تھے۔ اس محشر خیال مصلح کو جب اپنی آراء اور افکار کے اظہار کے لیے اردو کا دامن تنگ نظر آیا تو انھوں نے خود اپنا ایک جہانِ زباں و ادب تعمیر کر ڈالا۔ انھوں نے ارادی طور پر ایسے مضامین لکھے جن میں دلائل و شواہد کی ایک خاص منطقی ترتیب ہوتی ہے ان کی نثر حشو و زوائد اور تضاد سے پاک ہے عموماً عبارت آرائی انشا پردازی اور روایتی محاسن نگارش کو اہمیت نہیں دیتے بلکہ اپنے مقصد کو صراحت اور سلاست سے بیان کرنا ضروری سمجھتے ہیں۔ پروفیسر رشید احمد صدیقی نے درست فرمایا ہے:

> ''سرسید کی تحریریں اس امر کا ثبوت ہیں کہ مقاصد اعلیٰ ہوں تو ان کے فیضان سے زبان خود ارفع و اعلیٰ ہو جاتی ہے تمام ملکوں اور قوموں کے شعر و ادب کی تاریخ اس حقیقت پر گواہ ہے کہ شعر و ادب کی توسیع و ترقی اور ترفع اس وقت نصیب ہوتی ہے جب اس کو کسی بڑے مقصد کے حصول یا حفاظت کا وسیلہ بنایا گیا ہو۔''[1]

انیسویں صدی سے قبل اردو نثر کے دامن میں چند تصوراتی داستانوں تذکروں اور تصوف کے رسالوں کے سوا کچھ بھی نہ تھا۔ سرسید نے اپنی تمام تر مصروفیات کے باوجود تصنیف و تالیف کے لیے وقت نکالا۔ تاریخ، آثار قدیمہ، سیاست، صحافت، ادب، مذہب اور سائنس وغیرہ سے ان کی دلچسپی نے ان سے ہر طرح کے موضوعات و مضامین پر خامہ فرسائی کے مواقع فراہم کیے۔ لطف کی بات یہ ہے کہ انھوں نے جس موضوع و مضمون کو اپنے احاطۂ تحریر میں لیا نہ صرف یہ کہ اس کا حق ادا کر دیا بلکہ سرگرم کارکنوں کی ایک جماعت بھی تیار کر دی جنھوں نے ایک نئے طرز فکر اور دبستان کی بنیاد ڈالی۔

انسٹی ٹیوٹ گزٹ اور تہذیب الاخلاق میں سرسید کے شائع شدہ مضامین کو دو حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔

---

[1] رشید احمد صدیقی، اردو نثر کا بنیادی اسلوب، فکر و نظر جنوری ۱۹۶۰ء، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، شمارہ اول، ص ۹۶

علمی مضامین

اور انشائیے

سنجیدہ علمی مضامین ان کا طرۂ امتیاز نہیں جن میں انھوں نے حقیقت پسند دانشور کی طرح واقعات و کوائف کا محاکمہ اور مسائل پر تبصرہ کیا ہے۔

انشائیے دراصل مضمون نگار کی وہ صورت ہے جس میں مصنف کسی موضوع پر اپنے خیالات اور تاثرات کو بے ساختہ اور برجستہ انداز میں پیش کرتا ہے تاکہ قاری تک اس کے احساسات کی ترسیل میں کوئی اشکال اور پیچیدگی نہ ہو اور جب کبھی انشائیہ نگار اپنے موضوع سے بھٹک جاتا ہے تو ایسے انشائیے کو ذہن کی ایک لہر سے تعبیر کیا گیا ہے۔ انشائیہ نگاری میں شواہد کا وہ التزام نہیں ہوتا جو علمی و ادبی مضامین کے لیے مختص ہے۔

سرسید احمد خاں کے انشائیوں کو اس صنف کی ابتدائی اور نیم پختہ شکل کہا جا سکتا ہے ان کے انشائیوں میں امید کی خوشی، بحث و تکرار، گذرا ہوا زمانہ اور جاڑا اہم ہیں۔ سرسید احمد خاں نے سادہ رواں اور عام فہم زبان لکھ کر اردو کو اس قابل بنایا کہ علمی اور سائنسی موضوعات کی متحمل ہو سکے۔ ان کی تحریروں میں لسانی تزئین و تہذیب کی اتنی کارفرمائی نہیں جتنی تصنیفی تنظیم اور ترتیب کی۔ ان کا یہ مخصوص طرز تحریر ادبی اہمیت کا حامل ہے انھوں نے مقصدیت، واقعیت اور افادیت کے تانے بانے سے اپنی نثر کا جامہ تیار کیا اور حقیقت نگاری کے ساتھ ساتھ عبارت کو جاندار اور مؤثر بنانے کے لیے تشبیہ و استعارے سے بھی کام لیا جو خیالی اور دور از کار نہیں ہوتیں۔ مثلاً انھوں نے ایک مضمون ''بحث و تکرار'' میں کتوں کے باہمی جنگ و جدل کا نقشہ استعاراتی طور پر پیش کر کے غیر مہذب انسانوں کے بحث و مباحثہ کا نقشہ یوں کھینچا:

> ''مہذب آدمیوں کی مجلس میں بھی آپس میں اس طرح تکرار ہوتی ہے پہلے صاحب سلامت کر کے آپس میں مل بیٹھتے ہیں پھر دھیمی دھیمی بات چیت شروع ہوتی ہے ایک کوئی بات سمجھتا ہے دوسرا بولتا ہے واہ یوں نہیں وہ کہتا ہے واہ تم کیا جاؤ؟ وہ بولتا ہے تم کیا جانو؟ دونوں کی نگاہ بدل جاتی ہے تیوری چڑھ جاتی ہے آنکھیں ڈراونی ہو جاتی ہیں باچھیں چڑھ جاتی ہیں۔ لپا دگی ہونے لگتی ہے کسی نے بیچ بچاؤ کر کر چھڑا دیا تو غراتے ہوئے

ایک ادھر چلا گیا اور ایک ادھر۔''[1]

ان کی موثر طرز تحریر کی ایک اور مثال انشائیہ امید کی خوشی ہے۔

''دیکھ نادان بے کس بچہ گہوارہ میں سوتا ہے اس کی مصیبت زدہ ماں اپنے دھندے میں لگی ہوئی ہے اس گہوارے کی ڈوری بھی ہلاتی جاتی ہے ہاتھ کام میں ہے اور زبان سے اس کو لوری دیتی ہے سورہ میرے بچے سورہ، اے اپنے باپ کی مورت اور میرے دل کی ٹھنڈک سورہ۔ تیرا مکھڑا چاند سے بھی زیادہ روشن ہوگا۔ تیری خصلت تیرے باپ سے بھی زیادہ اچھی ہوگی، تیری ہستی ہمارے اندھیرے گھر کا اُجالا ہوگی۔''[2]

سرسید اردو شعر و ادب میں ترقی پسندانہ اقدامات کے حامی تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ یہ پرانی اور فرسودہ روایات کے دائرے سے نکل کر انگریزی علوم وفنون کے خطوط پر تخلیق ہوں اس سلسلے میں انھوں نے اپنے مضامین اور تقاریر سے کام لیا۔ وہ ترجمہ شدہ علوم وفنون کے قائل نہیں تھے بلکہ چاہتے تھے کہ اصل ماخذ تک رسائی حاصل کی جائے۔

سرسید نے ایک اردو لغت بھی لکھنا شروع کیا تھا جو نامکمل رہا۔ انھوں نے اردو ادب کی تاریخ کا خاکہ بھی بنالیا تھا۔ ببلوگرافی کا خیال بھی ذہن میں تھا۔ انھوں نے ایک معیاری صحافت کی ابتدا کی۔ اردو ٹائپ کے استعمال پر زور دیا۔ اردو علامات قرأت کی بھی تجویز کی تھی۔ یہ سب ان کے وسعت مطالعہ، مضطرب ذہن اور خلاقانہ صلاحیتوں کی غماز تھیں۔ سرسید نے ردیف وقافیہ، اوزان کی پابندی اور معریٰ اور آزاد نظم کے متعلق بھی اظہار خیال کیا۔ سرسید کے یہ خیالات بڑے ہمہ گیر اور انقلابی تھے۔ جس سے متاثر ہو کر بعد کے شعراء اور اہل علم نے انھیں بلندی تک پہنچایا۔ سرسید نے اردو میں جس آسان، سادہ اور علمی نثر کا آغاز کیا وہ بہت کچھ انہی کی مرہون منت ہے۔ انھوں نے اردو زبان کو سنجیدہ اور علمی خیالات کا ذریعہ بنایا۔ خیالات کو واضح اور مدلل طریقے سے بیان کرنے پر زور دیا۔ اور اس طرح اردو نثر کو ہر طرح کے مضامین کے اظہار پر قادر کردیا۔ جس کی نثر کا اثر

---

[1] مقالات سرسید، مرتبہ مولانا محمد اسماعیل پانی پتی، ص ۲۱، مجلس ترقی ادب کلب روڈ لاہور ۱۹۶۳ء

[2] انور صدیقی، انتخاب مضامین سرسید، ص ۱۰۲، مکتبہ جامعہ نئی دہلی ۲۰۱۱ء

اس حد تک تھا کہ ان کے مخالفین بھی انہی کے انداز تحریر میں جواب دینے کی کوشش کرتے جس سے سر سید کی نثر کو اور بھی پھلنے پھولنے کا موقع ملا۔

سر سید نے اپنے رسالوں اور تحریروں کے ذریعے اردو ادیبوں کی توجہ ایسے ادب کی طرف مبذول کی جو تعمیری، اخلاقی اور افادی ہو اور ان کے افکار و خیالات سے متاثر ہو کر ارباب علم و فن کا ایک ایسا حلقہ پیدا ہو گیا جو ان کا ہمنوا اور ہم مسلک بنا جنھیں انھوں نے فکری سطح پر معروضی طرز اختیار کرنے اور سائنسی نقطۂ نظر اپنانے کی دعوت دی۔ رفتہ رفتہ یہ حلقہ وسیع ہوتا گیا۔ اور ان اہل قلم نے جس دبستان ادب کی بنا ڈالی وہ علی گڑھ تحریک کے نام سے معروف ہوئی۔ ان کے رفقا نے بھی سلیس و صاف زبان میں اظہار خیال کیا۔ چنانچہ اس تحریک کے زیر اثر انیسویں صدی کی آخری تین دہائیوں میں اردو میں کئی ادیب نمایاں ہوئے۔ مثلاً محسن الملک، وقار الملک، چراغ علی، محمد حسین آزاد، نذیر احمد، الطاف حسین حالی، شبلی نعمانی اور ذکاء اللہ کے نام اہم ہیں۔

سید مہدی علی محسن الملک (۱۸۳۷۔۱۹۰۷ء) کی پیدائش اٹاوہ میں ہوئی۔ سر سید انھیں ایک جان دو قلب کہتے اور اسی ہم نشینی کی وجہ سے انھوں نے ان کے خیالات کی توضیح اور نشر و اشاعت کو اپنی زندگی کا مقصد بنا لیا تھا۔ وہ ابتداء ہی سے ۱۸۶۴ء میں سائنٹیفک سوسائٹی کے رکن بن گئے اور اکثر مدرسۃ العلوم اور مذہبی موضوعات پر اخبار سائنٹیفک سوسائٹی اور تہذیب الاخلاق میں لکھتے رہتے تھے۔ ان کا شمار ان ادیبوں میں تو نہیں ہوتا جنھوں نے اردو کو نئی جہتوں سے روشناس کیا۔ البتہ نثر کے فروغ میں ان کے کارنامے معاون ثابت ہوئے۔ انھوں نے ''رسالہ میلاد شریف'' ۱۸۶۰ء ''آیات بینات'' ''تقلید و عمل بالحدیث'' اور فی تفسیر علوم القرآن وغیرہ تصنیف کیں۔ محسن الملک کی تحریروں کی ایک انفرادی خصوصیت اعتدال پسندی اور میانہ روی تھی۔ وہ مغربی تہذیب کی اندھا دھند تقلید کے بجائے مسائل کا فلسفیانہ تجزیہ کرتے اور جدید دور کے مفید و معتبر عناصر کو مشرقی مذاق کے مطابق ڈھالنے کے لئے کوشاں رہتے تھے۔ ان کی آواز سر سید کی ہی آوازِ بازگشت تھی۔ وہ ان کے مشن اور علی گڑھ تحریک کے پُرجلوش مبلغ تھے جس کا اندازہ ان الفاظ سے لگایا جا سکتا ہے:

> ''مجھ سے زیادہ سر سید کا جاننے والا، ان کی عزت کرنے والا، ان کی خوبیوں کو سمجھنے والا کوئی دوسرا نہیں۔''[1]

[1] حیات محسن، مرتبہ محمد امین زبیری، مسلم یونیورسٹی پریس علی گڑھ ۱۹۳۴ء، ص ۲۰۹

مشتاق حسین وقارالملک (۱۸۳۹ـ۱۹۱۷ء) بھی سائینٹیفک سوسائٹی اورخزینۃ البضاعۃ کے سرگرم رکن اور تعلیمی تحریک میں سید احمد خاں کے دوش بدوش کوشاں رہے انھوں نے مغربی تعلیم کے ساتھ ساتھ مذہب کی تدریس کو بھی ضروری قرار دیا۔ ان کی تحریروں سے اردو نثر کی ترویج ہوئی۔ ان کے اخلاقی اور اصلاحی مضامین انسٹی ٹیوٹ گزٹ اور تہذیب الاخلاق میں شائع ہوئے۔ انھوں نے کارلائل کی کتاب سے ''انقلاب فرانس'' کا اردو ترجمہ کیا اور ان کے خطوط کا مجموعہ بھی سرسید اکیڈمی علی گڑھ سے طبع ہوا ہے۔ مولوی چراغ علی (۱۸۴۴ـ۱۸۹۵ء) عربی، فارسی، انگریزی اورعربی زبانوں کے ماہر تھے۔ لاطینی اور یونانی سے بھی واقفیت تھی چونکہ انھیں اسلام سے غیر معمولی موانست تھی۔ انھوں نے عیسائیوں کی طرف سے اسلام پر کئے گئے اعتراضات کا مدلل جواب لکھا اور کئی انگریزی کتابوں کا اردو میں ترجمہ کیا جن میں ''محمد پیغمبر برحق''، ''تعلیقات''، ''تحقیق الجہاد''، ''اسلام کی دنیاوی برکتیں'' اور ''قدیم قوموں کی مختصر تاریخ''، عظم الکلام فی ارتقاء الاسلام اہم ہیں۔ پروفیسر حامد حسن نے چراغ علی کے متعلق یوں لکھا ہے کہ:

> ''مولوی چراغ علی کا طریقہ استدلال وہی ہے جو سرسید کا ہے ہر مسئلہ کے ایک ایک پہلو بلکہ حسب ضرورت ہی محاورہ و لفظ پر بحث کرتے ہیں ہر ممکن ذریعہ عقلی و نقلی سے اس پر دلیل دیتے ہیں، جوابات لکھتے ہیں نہایت متانت وقوت سے لکھتے ہیں۔ طرز تحریر و زبان سرسید کے مقابلے میں زیادہ صاف رواں اور بامحاورہ ہے۔ سرسید، نواب محسن الملک، مولوی محمد علی وغیرہ اس زمانے کے اکثر لکھنے والے الفاظ کی صحیح ترتیب کا خیال نہیں رکھتے۔ مولوی چراغ علی میں یہ بات نہیں ہے۔''[۱]

مولانا محمد حسین آزاد، منشی ذکاء اللہ اور مولوی نذیر احمد کا علی گڑھ سے براہ راست تعلق نہ تھا مگر تینوں سرسید کی پُرخلوص شخصیت اور ان کے اصلاحی خیالات کے معترف تھے۔

محمد حسین آزاد (۱۸۳۰ـ۱۹۰۷ء) نے آب حیات، سخندان فارس، قصص ہند، دربار اکبری کے علاوہ ۱۸۸۰ء میں نیرنگ خیال تمثیلی مضامین کا مجموعہ دو جلدوں میں انگریزی طرز پر لکھا وہ بھی سرسید کی طرح انگریز

[۱] حامد حسن قادری، داستان تاریخ اردو، ص ۳۷۷، عزیزی پریس آگرہ ۱۹۵۷ء

مصنفین اوران کے مضامین سے متاثر ہوئے۔

مولانا محمد حسین آزاد کا معاملہ اپنے ہمعصر نثر نگاروں سے الگ ہے وہ نثر نگار نرالے،ان کی آب حیات بھی نرالی قبول عام کی سند تو ترت کے ترت مل گئی مگر محققین اپنی تحقیق کے تیز تلوار لے کر اس پر پل پڑے۔ پانچ سو تحقیقی غلطیاں تو اکیلے قاضی عبدالودود نے گنوا دیں۔ حافظ محمود شیرانی نے جو عیب گنائے وہ الگ بہر حال ''آب حیات'' پر کچھ لوگوں کے اعتراضات اور نکتہ چینیوں کے باوجود ان کے مداحوں میں کوئی کمی نہیں ہے آب حیات اپنی گونا گوں خوبیوں کی وجہ سے ہاتھوں ہاتھ فروخت ہوگئی اور چند دنوں کے بعد یونیورسٹیوں کے نصاب میں جگہ پا گئی۔

آزاد نے چلتی پھرتی بزرگوں کی حالات والی تصویروں کو اپنی تصنیف نیرنگ خیال میں اس ہنر سے تحریر میں سجایا کہ بعدازاں مرزا فرحت نے اسی نیرنگ خیال کو بنیاد بنا کر ''دہلی کا آخری یادگار مشاعرہ'' لکھا اور اپنے خیال سے مرقع نگاری کی ایسی روح پھونک دی کہ یہ دہلی کی تہذیب وثقافت کے مطالعہ کے لیے ایک نظیر بن گئی جو بالیقین جدید اردو نثر کی معماریت میں نہ صرف اضافی قدم ثابت ہوئی بلکہ اس نے محمد حسین آزاد کو زندہ جاوید کر دیا اور اس وسیلے سے مرزا فرحت اللہ بیگ نے بھی بحیثیت مرقع نگار اور سوانح نگار اپنی شناخت قائم کی۔ چنانچہ اگر محمد حسین آزاد کی آب حیات اور نیرنگ خیال کی شگفتہ تحریروں کے عناصر کا جائزہ لیا جائے تو بلاشبہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ آب حیات کے تذکرے ہوں یا نیرنگ خیال کی سحر بیانی دونوں نے بالواسطہ یا بلاواسطہ جدید اردو نثر کی مقبولیت میں اضافہ کیا ہے۔

منشی ذکاءاللہ (۱۸۳۲۔۱۹۱۵ء) سائنٹفک سوسائٹی کے رکن ۱۸۶۶ء میں بنے۔ انھوں نے مغربی علوم کی کتابوں کے اردو تراجم کی پُر زور تائید کی اور عملاً سوسائٹی کے اس مقصد کو تقویت پہنچائی۔ ان کی اکثر کتابیں انگریزی سے ترجمہ ہیں ان کی تصانیف ریاضی، تاریخ ادب وفلسفہ اور جغرافیہ کے موضوع پر ہیں علاوہ تدریسی رسالوں کے ''تاریخ ہندوستان'' آٹھ جلدوں میں ان کا کارنامہ ہے اتنی مبسوط کتاب اردو میں اس سے پہلے نہیں ملتی۔ تاریخ عہد انگلشیہ بھی اہم تصنیف ہے۔ انھوں نے بھی سرسید کی طرح تاریخ نویسی میں معروضی انداز فکر اپنایا۔ اس کے علاوہ انھوں نے ملکہ وکٹوریہ اور حاجی سمیع اللہ خاں کی سوانح عمریاں بھی لکھیں۔ ان کی علمی کاوشیں ڈیڑھ سو کے قریب ہیں۔ ملازمت کے سلسلہ میں وہ دہلی، آگرہ اور الہ آباد رہے لیکن ذہنی لگاؤ علی گڑھ

سے تھا اور سرسید کو اپنا فکری قائد سمجھتے تھے۔

مولوی نذیر احمد (۱۸۳۰۔۱۹۱۲ء) بھی دلی کالج کے طالب علم اور عربی کے استاد تھے۔ ان کی پہلی ملاقات دوران ملازمت جب سرسید سے ہوئی تو وہ ان کی راست بازی خلوص اور فعال شخصیت کے قدرشناس ہو گئے۔ اصلاح قوم کا جذبہ دونوں میں مشترک تھا۔ نذیر احمد نے اپنا سارا زورِ قلم اصلاح معاشرہ پر صرف کیا اور اس کے ایک جزو یعنی طبقہ نسواں کے حال زبوں کی طرف توجہ کی اور اپنے ناولوں کو ان کی تعلیم اور کردار کی درستی کا ذریعہ بنایا۔

ان کا پہلا ناول ''مراۃ العروس'' ۱۸۶۹ء میں اپنی لڑکی تعلیم کے سلسلے میں چھپا۔ پھر رویائے صادقہ اور بنات النعش شائع ہوئے اور اپنے لڑکے کو پڑھانے کے لیے ''توبۃ النصوح'' ۱۸۷۷ء میں لکھا ۱۸۸۵ء میں فسانۂ مبتلا اور ابن الوقت چھپے۔ ابن الوقت میں نذیر احمد نے ان مغربی تعلیم یافتہ نوجوانوں کا کردار پیش کیا جو مغربی تہذیب سے مرعوب اور مغربیت زدہ ہو گئے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ ابن الوقت کی تخلیق انھوں نے سرسید کو پیش نظر رکھ کر کی لیکن یہ ایک مفروضہ ہے کیونکہ وہ ان کے خیالات وافکار کے اس قدر قائل تھے تو پھر ان کا استہزا کیسے گوارا کرتے ابن الوقت کے کردار میں جو ضروری مماثلت ہے وہ اتفاقی ہوسکتی ہے وہ فکشن کے سربراہ اور سرخیل ہیں نذیر احمد کی مذہبی کتابوں میں ''الحقوق والفرایض''، ''امہات الامۃ'' اور ''مطالب قرآن'' قابل ذکر ہیں ان کے متعدد مضامین بھی تہذیب الاخلاق میں شائع ہوئے انھوں نے تحریر وتقریر کے سبھی ذرایع اصلاح قوم کے لیے استعمال کیے اور اپنی ذکاوت اور علم وفضل سے سرسید کے مشن کو وسعت ومعنویت بخشی۔

مولانا الطاف حسین حالی (۱۸۳۷۔۱۹۱۴ء) نے شاعری کی ابتدا غزل سے کی مگر انھیں سرسید کا اصلاحی نصب العین اتنا عزیز تھا کہ غزل گوئی ترک کر کے نظم نگاری شروع کی۔ انھوں نے اس بات کا اعتراف یوں کیا ہے:

> ''اس کی چتوں میں غضب کا جادو بھرا ہوا ہے کہ جس کی طرف آنکھ اٹھا کر
> دیکھتا ہے وہ آنکھیں بند کر کے اس کے ساتھ ہو لیتا ہے اس کی ایک نگاہ
> اِدھر بھی پڑی اور اپنا کام کر گئی۔''[1]

[1] الطاف حسین حالی، دیباچہ مسدس حالی، ص ۷، مطبع مجتبائی دہلی، ۱۸۷۷ء

مسدس مدو جزر اسلام سرسید کی فرمائش پر لکھی گئی تھی۔ اور اسنے ان کے لیے ''توشۂ آخرت'' مہیا کر دیا تھا۔ حالؔی کی نظمیں نیچرل شاعری کا اعلیٰ نمونہ تھیں نیچرل کی اصطلاح حالی نے سرسید سے لی۔ مقدمہ شعر و شاعری (۱۸۹۳ء) جو اردو تنقید میں کلاسیک کا درجہ رکھتی ہے اس میں شعر کی خصوصیات سادگی، اصلیت اور جوش کو قرار دیا۔ پھر مناظر قدرت، مظاہر فطرت اور حیات انسانی کے عام رموز کو جاننے کے لیے قوت متخیلہ اور تفحص الفاظ کو اہم بتایا۔ واقعات و مسائل کو صداقت سے بیان کر دینے کے اصول نے آگے چل کر ترقی پسند تحریک کی راہ ہموار کی۔

حالی اور محمد حسین آزاد نے ورڈ ورتھ اور کورج کی طرح روایت سے بغاوت کی۔ ان کے مابین شاعری اور تنقید مشترک ہیں۔ مقدمہ شعر و شاعری پر ورڈ زورتھ اور کولرج کی تصنیف ''لریکل بیلیڈ'' کا اثر دیکھا جا سکتا ہے۔

انھوں نے عورتوں کے حال زار پہ اصلاحی نظمیں ''مناجات بیوہ'' (۱۸۸۶ء) اور ''چپ کی دادا'' (۱۹۰۵ء) میں لکھیں۔ حالی کو کئی ادبی اصناف مثلاً نظم گوئی، تنقید اور سوانح نگاری میں تقدم حاصل ہے ''حیات سعدی'' (۱۸۸۶ء)، ''یادگار غالب'' (۱۸۹۷ء) کے علاوہ ''حیات جاوید'' (۱۹۰۱ء) سرسید احمد خان کی دلاویز اور جامع سوانح ہے جس میں حالی نے ان کی زندگی کے مختلف واقعات اور انقلاب آفرین کارناموں کا مفصل جائزہ اور محاکمہ کیا ہے جس سے سرسید اور علی گڑھ تحریک سے ان کی وابستگی کا اندازہ ہوتا ہے۔

حالی کے حوالے سے جب ہم گفتگو کرتے ہیں تو یہ تعین قدر کرنا بھی ناگزیر ہو جاتا ہے کہ حالی نے جدید اردو نثر کے معمار کی حیثیت سے جو گراں قدر خدمات انجام دی ہیں اس کا میدان بہت وسیع ہے انہوں نے نہ صرف اپنے ادبی نظریات سے جدید اردو نثر کو ثروت مند کیا ہے بلکہ منظومات کو بیش بہا بنانے میں بھی پیش پیش رہے ہیں۔

مولانا شبلی نعمانی (۱۸۵۷۔۱۹۱۴ء) مدرسۃ العلوم علی گڑھ میں عربی زبان و ادب کے مدرس ۱۸۸۴ء میں مقرر ہوئے اور سوانح نگاری کی داغ بیل شعرا کے تذکروں سے پڑی لیکن صنف کی حیثیت سے فروغ سرسید کا مرہون منت ہے۔ ''سیدۃ فریدیہ'' میں انھوں نے اپنے نانا خواجہ فریدالدین کے حالات زندگی اور اپنی والدہ عزیزالنساء کے گھریلو ماحول اور خود اپنی تعلیم و تربیت کے متعلق واقعات بیان کئے ہیں یہ کتاب محدود معنی

میں سوانح کہی جاسکتی ہے لیکن ان کے رفقا میں حالی اور بالخصوص شبلی نے با قاعدہ صنف بنایا۔شبلی کوامام ابوحنبلہ سے بہت عقیدت تھی ۔انھوں نے ان کی مستند سوانح عمری''النعمان'' ۱۸۹۲ء لکھی چونکہ امام کا نام نعمان تھا اس لئے اظہار عقیدت کے طور پر اپنے نام کے ساتھ بھی نعمانی کا اضافہ کیا۔انھوں نے بھی تاریخی سوانح اس مقصد سے لکھیں کہ قوم اپنے قابل رشک ماضی اور اسلاف کے کارناموں سے آگاہ ہو سکے''الفاروق'' 1899ء ''المامون''، ''الغزالی'' ۱۹۰۲ء سوانح مولانا روم ۱۹۰۲ء اور پیغمبر اسلام کی سیرت کی ایک ہی جلد لکھ پائے تھے کہ ان کا انتقال ہو گیا باقی جلدیں ان کے ممتاز شاگرد سید سلیمان ندوی نے ختم کیں۔اس کے علاوہ علم الکلام ۱۹۰۳ء جیسی فلسفیانہ کتاب بھی تحریر کی۔ادبی تاریخ وتنقید میں شعرالعجم (۱۹۰۶۔۱۹۱۲ء)اور''موازنہ انیس و دبیر'' (۱۹۰۷ء) شامل ہیں شعرالعجم فارسی شاعری کی تاریخ پانچ جلدوں میں ہے انھوں نے شاعری کے اصول فصاحت و بلاغت محاکات اور مرقع نگاری بیان کئے ہیں۔اور موازنہ سے اردو میں عملی اور تقابلی تنقید کی ابتدا ہوئی جدید اردو ادب اور تنقید میں حالؔی نے ادب کے سماجی مقصد اور اس کی افادیت پر زور دیا اور مغربی تصورات سے روشناس کیا تو شبلی نے ادبیت اور ادب کے حسن پر زور دیا ان کی نثر پختہ اور مہذب ہے۔

علی گڑھ کے کچھ اور اہل قلم نے مختلف اصناف اور متفرق اوقات میں نام پیدا کیا ان میں خوشی محمد ناظر، فانی بدایونی،عزیز مرزا،عنایت اللہ دہلوی، چودھری محمد علی، احمد علی،شوق قدوائی اور عبدالحق جیسے لوگ شامل تھے۔

سرسید کے انتقال کے بعد بیسویں صدی کی ابتدائی دھائیوں میں حالی محمد اسماعیل اور وحیدالدین سلیم نے اردو صحافت میں عملی حصہ لیا۔دونوں علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ اور تہذیب الاخلاق سے منسلک رہے اور اپنے اجراء کردہ رسالہ''معارف'' میں بھی ادبی مضامین اور تراکی سے تراجم شائع کرتے تھے۔علی گڑھ کے نوجوان طلبا نے صحافت کے ارتقاء میں عملی حصہ لیا۔مثلاً محمد علی جوہر نے''کامریڈ''اور''ہمدرد''اخبار جاری کئے۔ سرسید کی طرح ان کی صحافت بلند ہمتی اور قومی ہمدردی کا آئینہ تھی۔حسرت موہانی نے اردوئے معلیٰ نکالا مگر سیاست میں زندگی گزارنے کے باوجود اپنی ادبی صلاحیتوں کو کبھی نظر انداز نہیں کیا۔ پھر ظفر علی خاں مدید روزنامہ''زمیندار'' لاہور نے اداریوں اور تبصروں کے ذریعے باشعور صحافی ہونے کا ثبوت دیا۔عہد حاضر میں عبدالماجد دریا آبادی بتدریج سچ،صدق اور صدق جدید کے بانی اور مدیر رہے۔ان کی تحریروں میں گرد و پیش

کے حالات پر طنز کا عنصر نمایاں تھا۔

حیدرآباد دکن میں سر اکبر حیدری نے یورپی علوم اردو میں پڑھائے جانے کی تحریک ۱۹۱۷ء میں شروع کی اور اس کو سر راس مسعود نے ۱۹۱۸ء میں جامعہ عثمانیہ کی شکل میں عملی جامہ پہنایا جس میں انگریزی زبان کی تدریس کے ساتھ ساتھ درسی مغربی کتابوں کے اردو ترجمے پڑھائے جاتے تھے۔ چنانچہ اس اسکیم کے تحت مختلف علوم کے اردو تراجم بڑے پیمانے پر ہوئے۔ اس دارالترجمہ کے بیشتر اہل قلم علی گڑھ سے وابستہ رہ چکے تھے۔

سر سید احمد خاں اور ان کے رفقاء کی تحریروں سے لوگوں کو ذہنی آزادی حاصل ہوئی۔ انھوں نے تاریخ، مذہب، تعلیم، سائنس، جمہوریت، آزادیٔ رائے، ملکی قوانین، بین الاقوامی حالات وافکار، زبان وادب، صنعت وحرفت، زراعت، معاشرتی ومعاشی مسائل اور تعلیم نسواں جیسے موضوعات پر خلوص سے اظہار خیال کیا اور زندگی کے تمام شعبوں میں حرکت وعمل کی روح پھونک دی اور تہذیب کا ایک وسیع تصور عام کیا اور علمی نثر کو بالخصوص فروغ دیا اس بنا پر علی گڑھ تحریک (حیائے علوم) کے دور سے موسوم کی گئی اس طرح ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ اردو نثر کے ارتقا میں علی گڑھ تحریک نے اہم کارنامہ انجام دیا جو ناقابل فراموش ہے۔

نذیراحمد، سرشار، شرراوررسوا کے ناول: ایک تعارف

تاریخ شاہد ہے کہ زمانہ قدیم میں لوگوں کے پاس فرصت زیادہ تھی لوگ وقت گذاری کے لیے خیالی قصے کہانیاں سنتے سناتے ،قصہ گوئی کا تعلق انسانی دلچسپی ہے یہ ضرور ہے کہ جیسے جیسے انسانی ذہن کی پرتیں ہٹتی گئیں قصہ گوئی بھی پہلو بدلتی گئی اوراس کی شکل تغیر پذیر ہوتی گئی۔قصہ انسان کو ذہنی تفکرات اور تر ددات سے دور لے جاتا ہے تھوڑی ہی دیر کے لیے سہی لیکن سکون اور فرحت بخشتا ہے اور شاید اسی لیے ہر دور میں قصوں اور کہانیوں کو بڑی اہمیت دی گئی ہے چاہے وہ سکون اور آرام کا دور ہو یا اس کے برخلاف پریشانیوں اور الجھنوں کا۔اس لیے ادب میں بھی اس کا ایک اہم مقام ہے کیونکہ یہ قصے خلا میں جنم نہیں لیتے بلکہ ان کی روشنی میں ہمیں اس دور کی عکاسی بھی ملتی ہے۔

اردو نثر کی ابتدا بھی قصوں اور کہانیوں کے ذریعہ ہوئی۔فارسی کی بہت سی حکایتوں کے ترجمے اردو میں کیے گئے۔اردو کی تمام نثری داستانوں میں ہمیں جو عناصر ملتے ہیں وہ آج کے دور کے بالکل برعکس ہیں۔مافوق الفطری عناصر، دیو پری کے قصے، ہیرو کی ہمیشہ فتح، اس کا جن کی شہزادی پر عاشق ہونا، حوض میں کودتے ہی پتھر ہو جانا، زمین کے نیچے خوبصورت باغ ہونا، آج کے لیے مضحکہ خیز ضرور ہیں لیکن اس عہد کی دلچسپی کا ایک اہم ذریعہ تھے اس کے بعد کی داستانوں پر غور کریں تو فورٹ ولیم کالج کی داستانیں جو انگریزوں کی آمد کے بعد ترجمہ کی گئیں ان میں زبان و بیان اور قصے کی ایک بدلتی ہوئی شکل ملے گی۔خاص طور پر سب رس، رانی کیتکی کی کہانی باغ و بہار اور فسانہ عجائب وغیرہ یہ داستانیں فورٹ ولیم کالج اور اس کے بعد کی پیداوار ہیں یہ ساری داستانیں اس وقت لکھی گئیں جب مغلیہ سلطنت دم توڑ رہی تھی۔چاروں طرف غیر ملکیوں کا دور دورہ تھا یہ ضرور ہے کہ ان داستانوں میں بھی وہی عناصر ہیں جو اس سے قبل کی داستانوں میں ملتے ہیں۔لیکن بدلتا ہوا سماجی شعور بیدار ہوتا ہوا سماجی ذہن، لاشعوری طور پر ان میں جھلکتا ہوا نظر آئے گا۔اس وقت کے سیاسی اور افراتفری کے اثرات ملیں گے۔بادشاہ کی بے بس اور مجبوری نظر آئے گی۔

اعلیٰ طبقوں کا بکھرتا ہوا شیرازہ ملے گا۔ یہ تمام داستانیں زیادہ تر انیسویں صدی کی ابتدا میں لکھی گئیں اس کے بعد غدر کے اثرات نظر آنے لگتے ہیں۔ پھر اچانک ۱۸۵۷ء کے حادثہ نے ان سب کو چونکا دیا یہ ایک بڑا حادثہ تھا جس نے زندگی کے ہر شعبہ کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔ داستان کا دور ختم ہوا لیکن اس حادثہ سے قبل انگریز حاکموں نے ہندوستانی ادب میں بیداری کی ایک نئی روح پھونک دی تھی جس سے داستانی رنگ رفتہ رفتہ غائب ہوتا جا رہا تھا۔ فورٹ ولیم کالج کے بعد دلی کالج اس کی مثال تھی۔ انگریز اپنے ساتھ ادب اور تمدن لے کر آئے تھے۔ یہاں فارسی کی دلچسپ اور شیریں حکایتیں سانسیں لے رہی تھیں۔ دونوں کا سنگم ہوا اور ایک نیا ادب وجود میں آیا ناول نگاری دونوں کے امتزاج سے نکلے ہوئے نتیجے کی شکل ہے جس میں فارسی داستانوں کی شیریں حکایتوں کے اجزاء بھی شامل ہوئے اور مغربی اثرات کی بیداری بھی داستانوں نے ایک دم سے رخ پلٹا اور ناول کی شکل اختیار کر لی۔

ناول کی وہ خصوصیات جو بادی النظر میں اسے داستان سے ممتاز کرتی ہیں حقیقت نگاری، کردار کی اہمیت اور فلسفیانہ گہرائی ہے۔ حقیقت اگر چہ کسی نہ کسی داستان میں بھی موجود ہے مگر مجموعی اعتبار سے داستان میں محیرالعقول واقعات و کردار پیش کئے جاتے ہیں جن کا حقیقی دنیا سے کوئی تعلق نہیں ہوتا ہے اس طرح وہاں عام حقیقتوں کو بھی تخیلی دنیا میں اس طرح پیش کیا جاتا ہے کہ نہ صرف ان کی اصلیت مجروح ہو جاتی ہے بلکہ ان کا ایک رخ ہی سامنے آتا ہے اس کے برعکس ناول میں تخیل اس دنیا کی حقیقتوں کی بازیافت یا ممکنہ ترتیب و تشکیل کے فرائض انجام دیتا ہے ناول میں توجہ کا مرکز کردار ہوتے ہیں جن کا تعلق اس دنیا کے جیتے جاگتے انسانوں سے ہوتا ہے اس میں واقعات اگر چہ کردار کے تابع ہوتے ہیں لیکن ان کے مابین ایک قابل شکست رشتہ موجود ہوتا ہے۔

اردو ناول کی بنیاد نذیر احمد کے ناول ''مراۃ العروس'' سے پڑی جو ۱۸۶۹ء میں لکھا گیا۔ اگر چہ اس سے پہلے مولوی کریم الدین 'خط تقدیر'' لکھ چکے تھے اور مختلف ناقدوں نے اس کو ناول مانا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ ''خط تقدیر'' ناول پر کھرا نہیں اترتا۔ اس میں ان اجزائے ترکیبی کا فقدان ہے جس کی وجہ سے اسے پہلا ناول تسلیم نہیں کیا گیا۔ مولوی نذیر احمد کا ناول ''مراۃ العروس'' انھوں نے اپنی بیٹی کے لیے لکھا۔ نذیر احمد جب یہ قصہ لکھ رہے تھے تب انھیں یہ معلوم نہیں تھا کہ وہ اردو کا پہلا ناول لکھ رہے ہیں انھیں اپنی تصانیف کی طباعت کا

شوق بھی نہیں تھا اتفاقاً نذیر احمد ملازمت کے سلسلے میں کسی دورے پر تھے۔ وہیں ناظم تعلیمات بھی اپنے کسی کام کی وجہ سے آئے تھے۔ صبح جب وہ سیر کو نکلے تو نذیر احمد کے فرزند بشیر بھی ان کے ساتھ نکلے ناظم تعلیمات کمیشن نے چند پند اور مراۃ العروس کے نام بتائے۔ چند پند نذیر احمد نے اپنے بیٹے کے لیے ایک کتاب لکھی تھی۔ مسٹر کمپسن نے جب ان کتابوں کو دیکھا تو وہ حیران رہ گئے اور انھوں نے بشیر سے کتابیں لے کر اپنے پاس رکھ لیں دوسرے دن جب مسٹر کمپسن سے نذیر احمد کی ملاقات ہوئی تو انھوں نے نذیر احمد کو ناول کی اشاعت کا مشورہ دیا۔ نذیر احمد کو اس ناول کی اشاعت پر ایک ہزار کا انعام ملا اور اس کی دو ہزار جلدیں حکومت نے خرید لیں خود نذیر احمد کے الفاظ میں ''شیر کے منھ کو خون لگ گیا'' یعنی انعام ملا وہ خوش ہوئے اور مزید لکھنے کا شوق پیدا ہوا۔ اس کے بعد انھوں نے چھ ناول اور لکھ ڈالے۔

نذیر احمد کے ناول بعض فنی خامیوں اور نقادوں کی شدید نکتہ چینی کے باوجود آج بھی زندہ ہیں اور ہمیشہ زندہ رہیں گے۔ کیونکہ نذیر احمد کے ناول اردو ناول کے ارتقا کی کڑیاں ہیں جن میں اس دور کے معاشرتی حالات کی ہو بہو عکاسی کی گئی ہے نذیر احمد نے اپنے تمام قصوں میں معاشرے کی اصلاح، نئی نسل کی تربیت اور طبقہ نسواں کی تعلیم کا بیڑا اٹھایا۔ افراد قصہ کی شخصیت کو اہمیت بخشی اور معاشرتی زندگی کی چھوٹی چھوٹی باتوں سے دلچسپی پیدا کی۔

مراۃ العروس نذیر احمد کا وہ شاہکار کارنامہ ہے جو ان کی شہرت کا باعث بنا جب بھی اردو ناول کا ذکر کیا جائے گا تو نذیر احمد کا نام ضرور آئے گا کیونکہ نذیر احمد ہی اس صنف کے بانی ہیں۔ مراۃ العروس کا اہم موضوع تعلیم نسواں ہے مولانا تعلیم نسواں کو اس لیے لازمی قرار دیتے ہیں کہ بچوں کی پرورش ونگہداشت کی ذمہ داری بچوں پر ہی ہے اس لیے عورت کا تعلیم یافتہ ہونا بہت ضروری ہے۔ تاکہ وہ بچوں کو پڑھا لکھا بھی سکے کیونکہ انہیں بچوں کو بڑا ہو کر قوم کا ستون بننا ہے۔

ناول کے دو اہم کردار ہیں اکبری اور اصغری، اکبری علم سے بے بہرہ ہے اس لیے بدسلیقہ ہے اس کے خلاف اصغری تعلیم یافتہ باشعور اور ہنرمند ہے جو اپنی فہم اور سوجھ بوجھ سے گھر کو جنت ارضی بنا دیتی ہے تعلیم کی اہمیت پر زور دیتے ہوئے مولانا نے خود بھی اس تصنیف کا مقصد یوں بیان کیا ہے:

''خانہ داری کی بلکہ یوں کہو کہ دنیا داری کی درستی موقوف ہے عقل پر اور

عقل کی علم پر۔''[1]

نذیر احمد کے اس ناول سے پتہ چلتا ہے کہ وہ علم کو ہی زندگی پر فوقیت دیتے تھے اور اُن کا خیال تھا کہ معاشرے کو سنوارنے میں علم کا بہت بڑا ہاتھ ہے۔

کچھ فنی خامیوں کے باوجود مراۃ العروس ناول میں فوق فطری عناصر سے گریز اور اس دور کی معاشرتی زندگی کی بھر پور عکاسی اس بات کا ثبوت ہے کہ نذیر احمد نے ناول کی داغ بیل ڈال کر یہ واضح کر دیا کہ ناول ہی اصلاح معاشرہ کا بہترین اور واحد ذریعہ ہے۔

نذیر احمد نے اپنی تمام قوت مسلم قوم کی اصلاح میں صرف کر دی ان کے ناولوں کے مطالعہ سے یہ بات واضح ہے توبتہ النصوح کے دیباچے میں لکھتے ہیں:

''اس کتاب میں انسان کے اس فرض کا ذکر ہے تربیت اولاد کے نام سے مشہور ہے اس کتاب کے تصنیف کرنے سے مقصود اصلی یہ ہے کہ اس فرض کے بارے میں جو غلط فہمی عموماً لوگوں سے واقع ہو رہی ہے اس کی اصلاح ہو۔[2]

بنات النعس کے دیباچے میں انھوں نے لکھا ہے:

''معلومات علمی خاصہ تعلیم دین داری کا ایک مضمون رہ گیا ہے۔''[3]

نذیر احمد کے ناولوں میں ہر جگہ اصلاحی عناصر رچ بس گئے ہیں جو بعض اوقات ناول کی لطافت کو مجروح کر دیتے ہیں اس میں کوئی دورائے نہیں کہ ناول ہمیشہ مقصد کے تحت لکھا جاتا ہے لیکن مقصد اس قدر حاوی نہیں ہونا چاہئے کہ ناول کے فن کو چوٹ پہنچے۔

بہر حال نذیر احمد کے ناولوں میں مقصدیت جا بجا حاوی رہتی ہے ان کو زبان و بیان پر اتنی قدرت حاصل تھی کرداروں کو قصہ کے اندر ڈھالنے کی اتنی صلاحیت تھی کہ یہ خوبیاں بھی پورے ناول میں مقصدیت کے

---

[1] ڈپٹی نذیر احمد، مراۃ العروس، ص ۱۳، کتابی دنیا ۲۰۰۳ء

[2] ڈپٹی نذیر احمد، توبۃ النصوح، ص ۲، اتر پردیش اردو اکادمی لکھنؤ، ۱۹۸۳ء

[3] ڈپٹی نذیر احمد، دیباچہ بنات النعش، ص ۱، اتر پردیش اردو اکادمی لکھنؤ، ۱۹۸۳ء

ہم پلہ نظر آتی ہیں ورنہ ان کی تمام تخلیقات خالص اصلاحی تحریریں ہو کر رہ جاتیں اور قصہ پن سے دور ہو جاتیں۔ نذیر احمد کے ناول قصے کم وعظ زیادہ لگتے ہیں لیکن ماحول کی مصوری خاندانوں کی اندرونی حالات کی جو تصویریں نذیر احمد نے کھینچی ہیں وہ اس سے قبل نہیں ملتیں۔ ان کے قلم میں بلا کی طاقت ہے ان کے اسلوب اور طرز تحریر نے ان کے کرداروں کو زندہ کر دیا۔ پہلی بار اردو ناول میں زندگی کی حقیقتوں کو سمویا اور ناول کو زندگی سے قریب لانے کی کوشش کی۔ پہلی بار کہانیوں میں دنیا کے حالات کو ڈھالا۔ خود نذیر احمد مراۃ العروس کے شروع میں لکھتے ہیں:

> ''جو آدمی دنیا کے حالات پر کبھی غور نہیں کرتا اس سے زیادہ بیوقوف کوئی نہیں غور کرنے کے واسطے دنیا میں ہزاروں طرح کی باتیں ہیں لیکن سب سے عمدہ اور ضروری آدمی کا حال ہے غور کرنا چاہئے کہ جس روز سے آدمی پیدا ہوتا ہے زندگی میں مرنے تک اس کو کیا باتیں پیش آتی ہیں اور کیوں کر اس کی حالت بدلا کرتی ہیں۔''[1]

نذیر احمد نے اخلاق و درس پر یقیناً زور دیا لیکن پھوہڑپنے کے ساتھ نہیں بلکہ پوری فنکاری کے ساتھ ورنہ آج ان کے ناولوں کا شمار نہ ہوتا انھوں نے اپنی فنکاری کی وجہ سے ہی چند ایسے کردار پیدا کر دیئے جو اردو ادب میں ہمیشہ یاد کئے جائیں گے۔

نذیر احمد نے فن ناول نگاری کو ایک نئی زبردست تحریک دی اور پہلی بار حقیقت کی طرف نگاہ ڈالی۔ یہ سب جانتے ہیں کہ ان سے قبل اردو قصہ نگاری داستانوں پر ہی مشتمل تھی۔ پہلی بار نذیر احمد نے داستانوں کو ناول کی طرف موڑا مافوق الفطرت عناصر کی جگہ زندگی کے حقیقی کرداروں پر قلم کو جنبش دی اور اس میں جان ڈالی اختر اورینوی کا یہ اقتباس ملاحظہ ہو:

> ''انھوں نے قصوں کی ایک نئی دنیا بسائی۔ اس دنیا کو وہ فوراً سر سبز اور دلکش کیسے بنا دیتے۔ نئی دنیا تو بستے بستے بستی ہے اور سجتے سجتے سجتی ہے حیرت یہ نہیں کہ نذیر احمد کی ناولوں میں اتنی دلکشی نہیں جتنی مغربی فنکاروں کی

[1] ڈپٹی نذیر احمد، مراۃ العروس، ص ۵، کتابی دنیا ۲۰۰۳ء

ناولوں میں ہے بلکہ حیرت یہ ہے کہ نذیر احمد کے دکھائے ہوئے راستے پر
کئی بعد میں آنے والے ناول نویس سلیقہ سے نہ چل سکے۔''[1]

نذیر احمد نے دلی کالج علی گڑھ تحریک اور اپنے مزاج کی آمیزش سے مسلمان طبقے کی جو زبردست اصلاح کی اور ناول کو ایک خوش گوار راہ پر لا کر چھوڑا آگے چل کر شرر، رسوا اور پریم چند نے اس کینوس کو اور پھیلایا۔ شرر نے بھی اصلاح کی لیکن ان کا راستہ بدل گیا۔ رسوا نے ایک خاص ڈھنگ سے سماجی اصلاح کی۔ اصلاح تو پریم چند نے بھی کی لیکن ان کا فریم خاصا پھیل گیا۔ ان کی نظریں پورے ہندوستان پر تھیں لیکن ان سب پر نذیر احمد کا احسان ہے کیونکہ نذیر احمد کے ناول ان سب کے لیے پیش خیمہ تھے، نذیر احمد نے پہلی بار صنف ناول کو اردو ادب سے متعارف کرایا۔ اویس احمد ادیب کی رائے کے مطابق:

''مولانا نے ایک اعلیٰ ناول نگار کے فرائض کو نہایت خوش اسلوبی سے
انجام دیا ہے۔''[2]

---

[1] تحقیق وتنقید، اختر اورینوی، ص ۱۴۶، کتابستان کملا نہرو روڈ، الہ آباد ۱۹۶۱ء

[2] اویس احمد ادیب، اردو کا پہلا ناول نگار، ۱۹۳۴ء

پنڈت رتن ناتھ سرشار

نذیر احمد کے بعد دوسرے اہم ناول نگار رتن ناتھ سرشار ہیں جن کا ناول نگاری میں ایک اہم مقام ہے۔انھوں نے کئی ناول لکھے۔فسانہ آزاد، سیر کہسار، کامنی، پی کہاں، جام سرشار، خدائی فوجدار کڑم دھڑم وغیرہ کافی مقبول ہوئے۔سرشار کا زمانہ اگرچہ نذیر احمد سے زیادہ دور نہ تھا لیکن ان دونوں کے مزاجوں کا بنیادی فرق ان کی تصنیفات میں ملتا ہے۔نذیر احمد کے سامنے دلی کے اجڑے ہوئے گھرانے اور ایک زوال آمادہ سوسائٹی کا نقشہ تھا۔سرشار کو لکھنوی نظام معاشرت سے بے پناہ محبت تھی۔لہٰذا وہ اس کی مصوری نہایت موثر انداز میں کرتے ہیں۔

لکھنو غدر سے قبل کا ہو یا بعد کا اس کی ادبی اہمیت کا اندازہ ہر دور میں لگایا جا سکتا ہے لیکن ہم یہاں اختصار کے ساتھ لکھنؤ کے مشہور و معروف اخبار اودھ پنچ سے تعلق رکھنے والے گروہ کا ذکر کرتے ہوئے سرشار کی ناول نگاری پر تبصرہ کریں گے۔اس اخبار سے تعلق رکھنے والے گروہ میں منشی سجاد حسین، مرزا محمود بیگ، ہمزاد، تربھون ناتھ ہجر، احمد علی شوق، اکبرالہ آبادی اور رتن ناتھ سرشار اہم تھے۔خطہ دلی میں غدر کے بعد ابھرنے والی اہم شخصیتوں میں سرسید، نذیر احمد، شبلی، حالی، چراغ علی اور دوسرے لوگ تھے۔لیکن وہ لوگ جنھوں نے ان دونوں گروہ کی اہم شخصیات اور ان کے کارنامے کا گہرائی سے مطالعہ کیا ہے۔وہ ان دونوں کے فرق سے اچھی طرح واقف ہوں گے۔ان دونوں کے کارناموں کے پیچھے دونوں جگہوں کا ماحول پوشیدہ ہے جس طرح کی تخلیقات سرسید، شبلی، حالی، اور نذیر احمد کی منظر عام پر آئیں وہ باتیں لکھنؤ کے ادیبوں میں نہیں حالانکہ دونوں گروہ غدر کے بعد کے ہیں دونوں جگہوں کی تباہی ایک ساتھ ہوئی اور دونوں جگہوں پر انگریزوں کا ایک ساتھ قبضہ ہوا۔دونوں کی تخلیقات کا مقصد بھی ایک تھا۔پھر بھی دونوں میں ایک زبردست فرق، یہ بات قابل غور ہے اور یہی خط فاصل ہم نذیر احمد اور سرشار کے درمیان کھینچ سکتے ہیں۔ڈاکٹر قمر رئیس، نذیر احمد اور سرشار کے درمیان بنیادی فرق کو اس طرح لکھتے ہیں:

''نذیر احمد مولوی تھے سرشار مست، لااُبالی، نذیر احمد کی تعلیم و تربیت شیوخ وعلماء کے گھر میں ان کے زیر سایہ ہوئی تھی۔ سرشار کی لکھنؤ کے رنگین مزاجوں اور شعر و ادب کے دل دادگان میں نذیر احمد نے انگریزی چھپ چھپا کر پڑھی تھی سرشار نے اسکول اور کالج میں نذیر احمد کے سامنے دلی کے اجڑے ہوئے مسلمان تھے۔ سرشار کی نظر لکھنؤ کے ہر محلّہ، ہر کوچہ اور ہر طبقہ پر تھی۔ نذیر احمد کے مذہبی اور اخلاقی عقائد اشخاص کے لطیف اور نازک جذبات کو دیکھنے اور دکھانے کے مانع رہے۔ سرشار کی رندمشربی نے ہر قسم کے جذبات کو ایسی گرم جوشی سے لبیک کہا کہ مذہب اور اخلاق منھ تکتے رہ گئے۔''[1]

یہی دونوں میں بنیادی فرق ہے جس نے نذیر احمد کو مراۃ العروس، توبۃ النصوح وغیرہ لکھوانے پر مجبور کر دیا اور سرشار کو فسانہ آزاد جام سرشار وغیرہ۔ بعض لوگ نذیر احمد کے ناولوں کو پند و نصیحت کا پلندہ کہہ کر آگے بڑھ جاتے ہیں اور سرشار کے ناولوں کو فنی اعتبار سے مکمل قرار دیتے ہیں لیکن یہ فیصلہ جلد بازی کا ہے جو بہت زیادہ اہمیت نہیں رکھتا۔ اتنی بات سب جانتے ہیں کہ نذیر احمد کے کئی ناول سرشار کے فسانہ آزاد سے پہلے شائع ہو چکے تھے۔ کیونکہ فسانہ آزاد اگرچہ اودھ اخبار میں بالاقساط چھپتا رہا لیکن کتابی شکل میں ۱۸۸۰ء میں شائع ہوا اور اس سے قبل نذیر احمد کے کم از کم تین ناول مراۃ العروس ۱۸۶۹ء، بنات النعش ۱۸۷۲ء، توبۃ النصوح ۱۸۷۴ء، میں منظر عام پر آ چکے تھے۔ لیکن بدمستوں اور بےفکروں کا یہ گروہ لکھنؤ کی اس زندگی میں ایسا مست اور سرشار تھا کہ اس نے ادھر نظر کیے بغیر اپنے تمام زور قلم کو وہیں کی نقش گری میں صرف کر دیا۔ یہ ان کی فن کاری تھی کہ اس میں چند نقوش ایسے تھے جس نے ان کو حیات جاوید بخش دی۔ فسانہ آزاد اسکی جیتی جاگتی مثال ہے جس کا مقصد خاص یہ تھا کہ خوبصورت اور دلکش پیرایہ میں گرتی ہوئی لکھنوی تہذیب کا اظہار کیا جائے اور قہقہوں کے دائروں میں بکھرے ہوئے لکھنو کے ادب کی عکاسی کی جائے لیکن اس کے ساتھ ہی ساتھ اس کا مقصد اقتصادی اور معاشی حالات کی پیش کش بھی تھی کیونکہ سرشار ادب کے میدان میں صحافت کے راستے سے

---

[1] قمر رئیس، پریم چند کا تنقیدی مطالعہ، ص ۱۲۴

آئے تھے اس سے قطع نظر اگر ہم سرشار کی فنکاری پر غور کریں تو بہت سے معاملات میں وہ نذیر احمد سے آگے بڑھ جاتے ہیں۔ اور صرف ناول کے ارتقا میں نذیر احمد سے بڑا رول ادا کر جاتے ہیں۔ رتن ناتھ سرشار اس ماحول کی پیداوار ہیں جس کے لیے لکھنؤ مشہور ہے اس کے لیے رجب علی بیگ سرور کی شاگردی اور رنگ لے آئی۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ جب انھوں نے پورے طور پر ہوش وحواس کی آنکھیں کھولیں تو اپنے سر پر مغربی سورج کو ابھرتے دیکھا اور مشرقی تمدن کو غروب ہوتے دیکھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وہ قدیم اور جدید کے بھنور میں آگئے۔ اب یہ ان کی قسمت تھی کہ پلا جدیدیت کی طرف زیادہ جھک گیا جو بعد میں ان کی عظمت اور شہرت کا باعث بن گیا۔

مذکورہ بالا بحث کی روشنی میں اب ان کے تمام ناولوں کا تجزیہ کیا جائے تو یہ نقص ضرور ہے کہ ان کے سب کے سب ناول ایک ہی موضوع پر لکھے گئے ہیں۔ چاہے وہ فسانہ آزاد ہو جام سرشار یا سیر کہسار ہو، کڑم دھڑم یا پی کہاں کوئی بھی ہو ان کے فن کو جانچنے کے لیے ان کے دو ناول فسانہ آزاد اور جام سرشار کافی ہیں۔ جس میں فسانہ آزاد ہی شہرت ومقبولیت کا باعث بنا اور بقول آل احمد سرور، سرشار اپنے فن کی وجہ سے پہچانے گئے اور ان کی دوسری تصنیفات ان کے نام سے جانی گئیں۔

سرشار کے فسانہ میں پورا لکھنؤ سمایا ہوا ہے وہ لکھنؤ جو اپنے جاگیردارانہ عہد کو کھو رہا ہے اپنی عظمتوں سے ہاتھ دھو رہا ہے سرشار نے بہت ہی خوبی کے ساتھ لکھنؤ کے اس دور کی عکاسی کی ہے۔ وہی بے فکرے، شاعر، رمال، طوائفیں، قوال، مولوی سب وہی جو سرور کے صفحات میں جگمگاتے ہیں لیکن سرور کے یہاں ان تمام کرداروں کی عظمتیں ہیں لیکن سرشار نے ان تمام کرداروں کو گرتی ہوئی تہذیب کا نمائندہ بنا کر پیش کیا اور اتنا ہی نہیں ان کرداروں کے ساتھ انہوں نے پروفیسر، فوٹو گرافر، وکیل، بیرسٹر، اخبار والے ٹکٹ بابو وغیرہ جیسے کرداروں کو بھی پیش کیا اور یہیں سے سرشار سرور سے آگے نکل جاتے ہیں۔ کیونکہ سرشار کے سامنے ایک نیا تعلیمی گروہ اور روشن خیال طبقہ ابھر رہا تھا جس کا سرشار نے استقبال کیا اور یہی بات سرور کے یہاں نہیں ملتی جو انھیں سرشار سے بالکل الگ کر دیتی ہے۔ یہ فرق سرشار کو نمایاں تو ضرور کر دیتا ہے لیکن ان کے اپنے نقطۂ نظر کو بہت زیادہ واضح نہیں کرتا۔ وہ بعض جگہوں پر مشرق کا مذاق بھی اڑاتے ہیں اور بعض قباحات پر اس کی روانگی پر افسوس بھی ظاہر کرتے ہیں۔

فسانہ آزاد ایک شہر ایک سماج کی بہت سی پرتوں کو ہمارے سامنے الٹتا ہے۔ سرشار کے گہرے مشاہدے اور مطالعے کا ثبوت ملتا ہے کہ جس موضوع پر قلم اٹھاتے ہیں اپنے زبان و بیان کی قدرت سے اس میں ایسی جان ڈال دیتے ہیں کہ قاری بغیر مکمل کیے اٹھ نہیں سکتا۔ سرشار فطری طور پر طنز و مزاح نگار تھے لکھنؤ کی گرتی ہوئی تہذیب کو انھوں نے اپنے مزاج کے اس سانچے میں ڈھالا۔ سرشار ہنسی ہنسی میں بڑی سے بڑی بات کہہ جاتے ہیں لیکن جہاں سنجیدہ ہوئے لطف غائب بقول علی عباس حسینی:

> ''سرشار نے جہاں کہیں متین بننے کی کوشش کی وہ بالکل آورد ہے وہاں وہ روکھے پھیکے بن بیٹھتے ہیں کہ بے ساختہ ضلع کے ضلع پلٹ دینے کو جی چاہتا ہے۔''[۱]

اور آگے لکھتے ہیں:

> ''ان کے ناولوں میں سارا لطف ان غپوں ہی میں ہے جب وہ بقوے ''بے پر کی'' اڑاتے ہیں خوجی خود اپنے سورما ہونے کا قصہ سو بار سنائیں۔ آپ اس بے پر کی سنیں گے مگر اللہ رکھی کی درد بھری کہانی جہاں ایک بار کے بعد دوسری بار دہرائی گئی دم الجھنے لگا۔ مہراج بلی کو حماقتوں کا اعادہ ہنسائے بغیر نہیں رہ سکتا۔ مگر جہاں لکچروں کا ذکر چھڑایا ہندوستان کا رونا شروع ہوا طبیعت گھبرائی۔''[۲]

ان کے ناولوں کا پھکڑ پن اور غپیں ہی ان کی کامیابی کا راز ہیں ورنہ اس کے بالکل برعکس نذیر احمد بعض ناولوں میں اخلاق اور درس سے لبریز تقریریں۔ مثلاً میر تقی میر کی تقریر مبتلا کو (فسانہ مبتلا) نصوح کی نصیحتیں۔ اصغری کے والد کا خط (اصغری کے نام) بھی ان ناولوں کے بہترین حصے سمجھے جاتے ہیں۔ یہاں سرشار کا فن قابل قدر ہے کہ انھوں نے ابھرتی ہوئی صنف ناول میں چاہے کوئی اور اضافہ کیا ہو یہ نہ کیا ہو لیکن نذیر احمد کے ناولوں کے متعدد موضوعات جو غیر دلچسپ اور روکھے سمجھے جاتے ہیں ان کو دلچسپ پیرائے میں

۱۔ علی عباس حسینی، ناول کی تاریخ و تنقید، ص ۱۹۸، ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ، ۱۹۸۷ء

۲۔ علی عباس حسینی، ناول کی تاریخ و تنقید، ص ۱۹۸ 198، ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ، ۱۹۸۷ء

میں ناول کے دائرے میں لاکر اضافہ کردیا۔

سرشار نے کئی ناول لکھے جن میں فسانۂ آزاد، سیر کہسار، کافی پی کہاں، جام سرشار، خدائی فوجدار، کڑم دھڑم وغیرہ کافی مقبول ہوئے۔

ناول ''کافی'' میں اپنی پسند کی شادی کا مسئلہ اٹھایا گیا ہے ایک ہندوستانی لڑکی اپنی پسند کی شادی کرے تو اسے اس عہد کے سماج میں کس قدر برا سمجھا جاتا ہے اسے ناول میں بڑے خوبصورت پیرائے میں پیش کیا گیا ہے۔

ان کا دوسرا نام ''پی کہاں'' میں ایسے شہزادے کی داستان بیان کی گئی ہے جو تپ دِق کا مریض ہے اور آخر تک اپنے محبوب سے ملنا چاہتا ہے لیکن ملاقات نہیں ہو پائی اور وہ ختم ہو جاتا ہے۔

تیسرا ناول ''کڑم دھڑم'' ہے اس ناول میں کافی کی طرح نوشابہ بھی سماج کے فرسودہ رسم ورواج کے خلاف بغاوت کرتی ہے۔ نوشابہ ایک تعلیم یافتہ لڑکی ہے اور نواب چھوٹے مرزا کے آوارہ، بدچلن لڑکے سے شادی کرنا چاہتی ہے لیکن گھر والے اس کا نکاح پھوپھی زاد بھائی سے کر دیتے ہیں اس ناول میں سماج اور خاندان کی کشاکش کو پیش کیا گیا ہے۔

ان کا مشہور ناول ''جام سرشار'' جس میں شراب نوشی کی لت کے انجام دکھائے گئے ہیں نواب صاحب جو اس ناول کا مرکزی کردار ہے ان کو شراب کی لت پڑ جاتی ہے اور ظہورا جیسی نچلی ذات کی عورت سے عشق کرنے لگتے ہیں وہ طوائف بن جاتی ہے۔ نواب صاحب یہ دیکھ کر کنویں میں کود کر جان دے دیتے ہیں۔ سیاسی اور سماجی اعتبار سے ان کے دو ناول اہم ہیں ایک تو ''فسانہ آزاد'' دوسرا ''سیر کہسار'' سیر کہسار کا موضوع جیسا کہ نام سے ظاہر ہے سیر کہسار ہے اس میں نواب محمد عسکری کی داستان حیات قلمبند کی گئی ہے یہ ناول ''فسانۂ لطیف'' کے نام سے اودھ اخبار میں قسط وار شائع ہوا ہے۔ یہ ناول دو جلدوں پر مشتمل ہے جو ۱۸۹۰ء میں اودھ اخبار میں چھپا۔ اس کی کہانی میں ایک متوسط طبقے کے مہذب گھرانے کے نواب صاحب ہیں جو عیاشی اور بری لت میں گرفتار ہیں ہر جوان عورت کو دیکھ کر اپنی معشوقہ سمجھ بیٹھنا نواب کی عادت ہے۔ کثرت شراب نوشی بھی ان کے مزاج میں داخل ہے جس کے خطرناک نتائج انھیں زندگی کے آخری ایام میں بھگتنے پڑتے ہیں۔ فسانۂ آزاد کی طرح اس کو بھی فنی نقطۂ نظر سے مکمل ناول نہیں کہہ سکتے کیونکہ فسانۂ آزاد کی طرح یہاں بھی بے تکا

پن موجود ہے۔ بہر حال اگر سیر کہسار کے تمام واقعات، حادثات اور بے ڈھنگے پن کو یکجا کیا جائے تو ناول کی صورت میں پیش کیا جا سکتا ہے۔ سیر کہسار میں مہاراجہ بلی اپنے طبقے کے نمائندہ کردار کہے جا سکتے ہیں جو نوابین اور امرا کے زیر سایہ پرورش پاتے ہیں اور بے فکری کی زندگی بسر کرتے ہیں انھیں اپنی زندگی کی زبوں حالی تک کا احساس نہیں ہوتا۔ بوالہوسی تفریح و تفنن اور عیاشی ان کی زندگی کا عام خاصہ ہے ''سیر کہسار'' کا یہ کردار پیش کر کے سرشار نے اس دور کی عام ذہنیت کا نقشہ بڑی کامیابی کے ساتھ کھینچا ہے اس کے علاوہ مہاراجہ بلی کا کردار ایسے زوال پذیر معاشرہ کی تصویر کشی کرتا ہے جس میں انسان اپنی تباہی اور بربادی کے بعد بھی بجائے اس کے کہ سنبھلنے اور اُبھرنے کی کوشش کرے وہ اور بھی زیادہ غارت گری اور تباہی کے دہانے پر کھڑا نظر آتا ہے۔ ایسی مردہ سوسائٹی اور ایسی مردہ قوم کے لیے ان کے ذہن اور دماغ کو جھنجھوڑنے کے لیے سرشار کے ہاتھ میں صرف ایک ہی نسخہ تھا۔ یعنی اپنی تصانیف کے ذریعہ ان کے کردار کا مضحکہ خیز پہلو پیش کریں۔ لہٰذا انھوں نے اپنی ظرافت کو نصیحت کا جامہ پہنا کر ہر جگہ پیش کیا ہے۔ لیکن مقصود یہی ہے کہ مردہ قوم میں زندگی کے آثار پیدا ہوں۔ یہ بھی زندگی کی تعمیر میں حصہ لیں۔ جس کی زندگی کا کوئی نصب العین نہیں اور وقت گزاری اس کے لیے سب سے بڑا مسئلہ ہے۔

جس سوسائٹی میں فرد کا کردار ایسا ہو اس سے کسی قسم کی توقعات وابستہ کرنا فضول ہے ظاہر ہے یہ سب زوال آمادہ سماج کی نشانیاں تھیں جنھیں سیر کہسار میں آزاد نے پیش کیا ہے۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ مجموعی طور پر سرشار نے ناول کو کیا دیا یہ بات واضح ہو چکی ہے کہ سرشار انگریزی کے مطالعہ سے صنف ناول سے واقف ہو چکے تھے اور اپنی ان تخلیقات کو انہوں نے ناول سمجھ کر ہی لکھا۔ لیکن وہ کہیں لاشعوری طور پر ناول کی حدود سے نکلتے چلے گئے وہ اکثر لکھنؤ کی بھیڑ بھاڑ اور سرور کی زبان کے جادو میں اس قدر کھو جاتے ہیں کہ ان کی تحریر اپنے آپ ان کو ناول نگاری سے دور لے جاتی ہے۔ یقیناً زندگی کو پیش کیا جاتا ہے لیکن وہ صرف مصوری کرتے ہیں۔ لکھنؤ کے بازاروں، گلی کوچوں، محفلوں، طوائف کی کوٹھیوں اس طرح کے دوسرے مناظر کا دلکش پیرائے میں تذکرہ کرنا ہی وہ ناول کے لیے لازم سمجھتے ہیں۔ انھوں نے ناول کو دلچسپی کا مقصد بنا دینا ہی اپنا مقصد سمجھا۔ جب کہ صرف تذکروں کو ناول نہیں کہتے۔ بلکہ ناول کے کچھ تقاضے ہوتے ہیں جن کا مشاہدہ اور مطالعہ تو ہونا ہی چاہئے۔ ساتھ ہی ساتھ اس کی اپنی روح اور اپنا

فلسفہ بھی ہونا چاہئے۔سرشار ہر جگہ ایسا نہیں کر سکے۔ بقول قمر رئیس:

''وہ مداری کی طرح زندگی کا تماشا دکھانے ہی کو ناول کا فن سمجھتے ہیں۔ انھیں یہ علم نہیں تھا اور نہ ہوسکتا تھا کہ ناول زندگی کی مسوری ہی نہیں، اسکی فلسفیانہ تعبیر اور تعمیر بھی ہے اور یہ کہ ناول کا تخلیقی عمل قارئین کے مذاق، پاس ولحاظ سے کہیں زیادہ عصری زندگی کے حقائق اور فن کے گہرے شعور کا مطالبہ کرتا ہے۔''[1]

بہرحال سرشار نے نذیر احمد سے بالکل الگ موضوع لے کر اپنی تخلیقات کے ذریعہ صنف ناول میں بہت اہم اضافے کئے۔جن کو کبھی فراموش نہیں کیا جاسکتا۔

[1] قمر رئیس، تلاش وتوازن، ص۲۲، جمال پریس دہلی، اپریل ۱۹۶۸ء

عبدالحلیم شرر

عبدالحلیم شرر جو بنیادی طور پر مضمون نگار تھے جب ناول کی طرف آئے تو سب سے پہلے انھوں نے ۱۸۸۵ء میں اپنا پہلا معاشرتی ناول ''دلکش'' لکھا لیکن جلد ہی وہ تاریخ کی طرف مڑ گئے اور ۱۸۸۸ء سے ناول نگاری کا جو آغاز کیا وہ تاریخی ناول نگاری کے باب میں سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے انھوں نے اپنا پہلا تاریخی ناول ۱۸۸۸ء میں ''ملک العزیز ورجینا'' کے عنوان سے لکھا اس کے بعد ۱۸۸۹ء میں ''حسن انجلینا''، ۱۸۹۰ء میں ''منصور موہنا''، ۱۸۹۱ء میں قیس ولبنیٰ'' ۱۸۹۲ء سے ۱۸۹۶ء میں ''دلکش''، ''یوسف نجمہ'' اور ''فلورا فنڈرا'' لکھے۔ ۱۸۹۹ء میں ''ایام عرب'' کا پہلا حصہ اور ''فردوس بریں''، ۱۹۰۰ء میں ''ایام عرب'' کا دوسرا حصہ اور ''مقدس نازنین'' لکھے لیکن ان سب میں اور ان کے پورے ناولوں میں ہیت کے اعتبار سے ''فردوس بریں'' ہی ان کا شاہکار ہے۔

فردوسِ بریں اردو ناول کی ہیئت میں سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے ناول کا وہ آہنگ جس میں ناول کے پورے عناصر ترکیبی مل کر ایک مکمل تاثر پیدا کرتے ہیں۔ شرر کے ''فردوس بریں'' میں پوری طرح نظر آتا ہے۔ اس ناول میں پلاٹ، کہانی، کردار، مکالمے، ماحول، جذبات نگاری اور فلسفۂ حیات مل کر اردو ناول کی ہیئت میں ڈرامائی ناول نگاری کی بنیادیں مستحکم کیں۔ ''فردوس بریں'' میں بھی ڈرامائی ناول کا امتیازی وصف یعنی زندگی کے تجربات کی تصویر کشی ملتی ہے۔ ''فردوس بریں'' میں شرر نے اس ناول کے ہیرو حسین کے ان تجربات کو پیش کیا ہے جن سے وہ دوچار ہوتا رہتا ہے۔ ڈرامائی ناول کی یہ خصوصیت بھی ''فردوس بریں'' میں پوری طرح موجود ہے کہ کردار کی صفات سے عمل متعین ہوتا ہے اور عمل اس کے کردار میں تبدیل ہوتا ہے۔ اس طرح سے ان دونوں کے عمل اور ردعمل سے ناول انجام کی طرف بڑھتا ہے۔ یہی ڈرامائی اور اچھی ساخت ناول کی خصوصیت ہوتی ہے۔ اچھی ساخت کے ناول بیسویں صدی کی ناول نگاری کی خصوصیت رہے ہیں۔ صرف ہندوستان ہی نہیں بلکہ ساری دنیا میں ان ناولوں میں ابتدا میں جو اسرار پیدا ہوتا ہے اس کے لیے ضروری ہوتا

ہے کہ اس میں ایسی پیچیدگی ہو جو ناول کے آخر میں واضح ہو سکے۔ کیونکہ ناول ہی میں یہی اسرار ناول کے مختلف عناصر کو ایک مرکز پر لاتا ہے اور یہی ارتکاز ناول کی اچھی ساخت کا ضامن ہوتا ہے۔ فردوس بریں میں بھی ایک بنیادی اسرار ہے جو زرد کے غائب ہو جانے کے بعد شروع ہوتا ہے۔ اس اسرار میں حسین رفتہ رفتہ الجھتا رہتا ہے اسے دوسری دنیا سے زرد کے پیغامات ملتے ہیں اور وہ ان پر عمل کر کے فرقہ باطنیہ میں شامل ہو جاتا ہے۔
پروفیسر علی احمد فاطمی شرر کی ناول نگاری کے متعلق لکھتے ہیں:

''اردو میں تاریخی ناول نگار کی حیثیت سے سب سے بڑی شخصیت شرر کی ہے اور حقیقت یہ ہے کہ شرر واحد ناول نگار ہیں جنھوں نے اپنے ناول کے کینویس میں تاریخ کا باضابطہ استعمال کیا اور اپنے پہلے تاریخی ناول ملک العزیز ورجنا (1888ء) کے ذریعہ اردو میں تاریخی ناول کی بنیاد ڈالی۔ اور اپنی جملہ ادبی زندگی کی وساطت سے اردو فکشن کے سرمایہ کو چند اچھے تاریخی ناول دیئے اردو میں تاریخی ناول کے تصور کو سمجھتے وقت شرر جیسے مقبول و معروف نگار کے ذہن میں ناول اور تاریخی ناول کا کیا تصور تھا اس بات کو بھی سمجھ لیا جائے قطعی غیر ضروری نہ ہوگا۔''[1]

شرر کے سامنے اصلاحی اور معاشرتی ناول کے کچھ نمونے تھے کچھ انھیں کے اثرات قبول کرتے ہوئے شرر نے اپنی ناول نگاری کی ابتدا کی۔ اگر چہ یہ ناول کامیاب ہوئے لیکن اس دور کے تقاضے اور ادب میں تاریخی ناول کی مقبولیت اور ابتدا سے تاریخ کی طرف جھکتے ہوئے ذہن نے انھیں اصل میدان کی طرف مڑنے پر مجبور کر دیا۔ اور شرر کی شخصیت اس میدان میں نیرنگیاں دکھانے لگیں کہیں کسی ناول کا ترجمہ کیا۔ کہیں کسی کا جواب دینے بیٹھ گئے کبھی تاریخ پڑھنے لگے تو اتنا پڑھا کہ اس کے ایک ایک پہلو کو چن چن کر الگ الگ انداز سے ناول کی شکل میں ڈھالا۔ اس کے علاوہ سماجی، معاشرتی، اصلاحی، گھریلو غرض کہ ہر طرح کے ناول لکھے اور چالیس سالہ ادبی زندگی میں صرف ناولوں کی تعداد تقریباً ۳۴ کے قریب پہنچ گئی۔
شرر کے ناولوں میں ''فردوس بریں'' شاہکار کی حیثیت رکھتا ہے اگر ناول کی حیثیت سے یہ ایک

[1] علی احمد فاطمی، عبدالحلیم شرر بہ حیثیت ناول نگار، ص ۲۱۰۔۲۰۹، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ۲۰۰۷ء

کامیاب ناول ہے لیکن تاریخی ناول کی حیثیت سے اس میں بعض جھول نظر آتے ہیں۔ کیونکہ ناول کا اچھا ہونا الگ بات اور تاریخی ہونا الگ فردوس بریں اپنی بے شمار خوبیوں کے باوجود اچھا تاریخی ناول نہیں بن سکا ہے اس ناول میں شرر نے بلاشبہ ایک پراسرار فضا بھی پیدا کی ہے۔ فرقہ باطینہ کے طریقۂ عمل کو بھی نہایت ہی فن کارانہ انداز سے پیش کیا ہے لیکن اس ناول میں جیسا کہ تاریخی ناول سے مطالبہ کیا جاتا ہے اس عہد کی پوری زندگی سامنے نہیں آتی۔

شرر مذہبی ہوتے ہوئے بھی نہایت روشن خیال اور وسیع النظر انسان تھے وہ جہالت، توہم پرستی، بے جا پردہ اور پرانے خیالات سے دور نظر آتے ہیں وہ پردے کے مخالف نہیں تھے۔ لیکن ایسے پردے کے ضرور خلاف تھے جس کا تعلق اس کہانی سے ہے کیونکہ اسلام میں پردہ کی پابندی تھی مولوی ہوتے ہوئے بھی مولوی سے نفرت کرتے تھے۔ کیونکہ ایسے مذہبی لوگ اسلام کے نرم اصولوں کو سخت اور غلط طریقے سے عوام کے سامنے پیش کرتے ہیں۔ اور شرر کو ایسے اصولوں سے نفرت تھی۔ وہ ان اصولوں میں نرمی اور وسیع الخیالی چاہتے تھے پردہ ہو لیکن بدر النساء کی طرح نہ ہو کہ پوری زندگی ہی تباہ ہو جائے۔ شرر نے پردہ کی مخالفت کر کے اس وقت کے معاشرے کی اندھی تقلید کے ماننے والوں کی آنکھیں کھولی ہیں۔ اپنے عہد کے لکھنوی معاشرت کی عکاسی کرتے ہیں شرر اپنے ناولوں میں اس وقت کے لکھنو کی تصویر کشی کرنے میں کامیاب نظر آتے ہیں۔

شرر کے پہلے ناول کا عنوان ''دلچسپ'' اور دوسرے کا ''دلکش'' ہے ناول کے عنوان قائم کرنا محض اتفاق نہیں ہے عنوان کی مناسبت یا غیر مناسبت سے زیادہ فن کار کا ناول سے متعلق ایک مخصوص تصور ابھرتا ہے وہ یہ کہ ناول منجملہ اوصاف کے دلچسپی یا دلکشی کا وصف خاص رکھتا ہے اور ناول کیا پورے فکشن میں دلچسپی کے عنصر سے انکار ممکن نہیں ہے۔ شرر نے اس چیز کی طرف خاص توجہ دی ہے۔

شرر کی ناول نگاری کی حیثیت مسلم ہے انہوں نے تاریخی ناول لکھے ہیں۔ ناول کے فنی تقاضے کیا ہیں اس پر لکھنا فی الحال ضروری نہیں لیکن اپنے وقت میں ان کے تاریخی اور معاشرتی ناول ذوق وشوق سے پڑھے جاتے تھے۔ ظاہر ہے ان میں مبالغے کی کیفیت نمایاں رہتی تھی۔ شرر چونکہ اسلامی جذبے سے سرشار تھے اس لئے ان کے یہاں اسلامی کردار مثالی بن کے سامنے آتے ہیں۔ مقابلے میں سبقت لے جاتے ہیں اور دشمنوں کی صفوں میں بجلی بن کر گرتے ہیں تاریخی واقعات کے ساتھ تخیلی معاملات اتنے دخیل ہیں کہ ان کو الگ کرنا

مشکل ہے۔ شرر دراصل ایمان و آ گہی کے تقاضوں کو اپنے ناولوں کی تخلیق سے پورا کرنا چاہتے ہیں لہٰذا اس عقبی زمین میں وہ تجدید نہیں ہو پاتی۔ جس کے وہ خواہاں ہیں اسلامی شعار مبالغے میں دب جاتا ہے اور تجدید اسلام کی اسپرٹ دم توڑ دیتی ہے۔ وقار عظیم لکھتے ہیں:

''شرر نے اردو میں تاریخی ناول بھی لکھے اور اصلاحی و معاشرتی ناول بھی لیکن ناول نگاری کی تاریخ میں ان کے نام کو عموماً تاریخ نگار کی حیثیت سے اہمیت دی جاتی ہے۔ ان کا پہلا تاریخی ناول ''ملک العزیز ورجنا'' 1888ء اور آخری ناول ''مینا بازار'' 1925ء میں۔ 37 سال کی اس مدت میں شرر نے جو تاریخی ناول لکھے ان کے فنی مرتبے تعین میں بڑی افراط و تفریط سے کام لیا گیا ہے ان کے ناولوں پر وقتاً فوقتاً جو اعتراض کیے گئے ہیں ان کا خلاصہ یہ ہے کہ شرر کے یہ تاریخی ناول ناظر کو دس پانچ صدی پیچھے لے جاتے ہیں اور شرر ان واقعات کی ایسی تصویر نہیں کھینچ سکتے۔ جو اصل سے مطابقت رکھتی ہو۔ یہ ناول نہ ماضی کی تدوین کرتے ہیں اور نہ ان سے ماضی کے کسی دور کے حامل احیا اور باز آفرینی کا وہ مقصد پورا ہوتا ہے جو تاریخی ناول کی امتیازی خصوصیت ہے ان ناولوں میں آنے والے ہیرو اور ہیروئن ایک سے ہیں وہ سب من چلے بلند بالا اور مہذب ہیں ہم ایک کو دوسرے سے تمیز نہیں کر سکتے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ان کے فرزندانِ معنوی میں سے کسی نے بھی ایسی شہرت حاصل نہیں کی کہ اس کا نام ہر شخص کی زبان پر ہو۔''[1]

شرر کو تاریخ سے غیر معمولی دلچسپی تھی اور داستانوں کا تریاق مہیا کرنے کے لیے انھوں نے ناول میں تاریخ اسلام کی طرف توجہ کیا اور اس کی آمیزش کر کے قوم کے جذبات میں گرمی پیدا کرنے کی کوشش کی۔ ہیرو شپ اس دور میں عام تھی اور اردو قارئین کو اپنی تہذیب تاریخ کے نہاں خانوں میں جب ایسے ہیرو نظر آتے

[1] داستان سے افسانے تک، وقار عظیم، جمال پریٹنگ پریس جامع مسجد دہلی

جن کے قد روقامت کے آگے یورپ کی بڑی بڑی شخصیتیں بونا نظر آئیں تو لوگ بے حد مسرور ہوئے یہی وجہ ہے کہ شرر کے تاریخی ناول کو بے پناہ مقبولیت حاصل ہوئی۔ انھوں نے کامیابی کے ساتھ تاریخی حقائق میں رومانی اور افسانوی رنگ آمیزی کے ذریعے لوگوں کے دلوں کے اندر گھر کرلیا۔ انہوں نے زوالِ بغداد، ایام عرب، فردوس بریں، جویائے حق، فلورا فنڈا، فتح اندلس جیسے ناولوں کے آئینے میں پوری تاریخ اسلام کے تابناک اوراق کو منعکس کردیا۔

جیسا کہ اوپر ذکر کیا گیا ہے کہ شرر نے معاشرتی ناول ''دلکش'' اور ''دلچسپ'' کے ذریعہ اپنی ناول نگاری کی ابتدا کی لیکن بنیادی طور پر وہ تاریخی ناول نگار تھے۔ اس وجہ سے وہ فوراً اپنے راستے پر مڑ گئے لیکن اس کے باوجود ضرورت کے مطابق وہ درمیان میں بھی اصلاحی اور معاشرتی ناول لکھتے رہے۔ معاشرتی اور اصلاحی ناولوں کا رجحان انھیں نذیر احمد اور سرشار کے ناولوں کے ذریعہ پیدا ہوا۔ رجحان نہ ہونے کے باوجود زودنویسی یہاں بھی اپنے رنگ دکھاتی گئی جس کے سبب ان کے معاشرتی ناولوں کی تعداد بھی اچھی خاصی ہوگئی۔ شاید اس وجہ سے احسن فاروقی لکھتے ہیں:

> ''ان کے معاشرتی ناولوں کا ڈھیر بھی شاید اتنا ہی اونچا لگایا جاسکے جتنا کہ
> ان کے تاریخی ناولوں کا مگر اس ڈھیر میں شاید ہی کوئی ناول ایسا چنا جاسکے
> جس کو آج کل عام ناظر بھی برداشت کرے۔''[۱]

بلاشبہ احسن فاروقی نے یہاں مبالغہ آرائی سے کام لیا ہے لیکن بعد کا جملہ یقیناً قابل غور ہے یہ سچ ہے کہ ان کے معاشرتی ناولوں میں کوئی بھی ایسا ناول نہیں ہے جس کو معیاری وعمدہ کہا جاسکے اور اسی وجہ سے شرر نے بھی اپنے اچھے ومنتخب ناولوں میں کسی معاشرتی ناول کا شمار نہیں کیا۔

دراصل شرر کا اصل مقصد معاشرتی ناول لکھنا نہیں تھا۔ اس نوعیت کے ان کے زیادہ تر ناول حادثے کے طور پر لکھے گئے مثلاً دلچسپ اور دلکش اپنے احباب کی فرمائش پر غیر ارادی طور پر لکھا۔ بدرالنساء کی مصیبت ایک سچا واقعہ تھا جو ان دنوں اخبار کی سرخی بنا ہوا تھا۔ شرر کے دل پر اس واقعہ کا اثر پڑا بس قلم چل پڑا۔ دربار حرام پور اور حسن کا ڈاکو یہ سب مصلحتاً لکھے گئے۔ آغا صادق کی شادی غیب داں دلہن، یہ ان دنوں لکھنوی تہذیب

[۱] احسن فاروقی، اردو ناول کی تنقیدی تاریخ، ص ۱۲۰

پر لکھے گئے ناولوں کا تقریباً جواب ہیں۔ یوسف و نجمہ، خوفناک محبت اور طاہرہ یہ واقعی وہ ناول ہیں جن کو پڑھنے کے بعد ایسے لگتا ہے کہ کہانی خیالی ہے اور ان خیالی کہانیوں پر شرر نے محنت کی ہے لیکن یہ محنت بھی زیادہ راس نہ آسکی اور اس پر مقصدیت غالب آ گئی۔

شرر کی ناول نگاری پر ادیبوں اور نقادوں نے اپنے اپنے طور پر متضاد رائیں دیں ہیں۔ جن میں کچھ اہل قلم ایسے ہیں جو انھیں ناول نگار مانتے ہی نہیں اور چند ایسے ہیں جو انھیں ناول نگار تو مانتے ہیں لیکن ان کی ناول نگاری میں خامیوں و نقائص کا ڈھیر لگا کر انھیں دوسرے درجے پر لا کر کھڑا کر دیتے ہیں یہاں کچھ ادیبوں اور نقادوں کی رائے پیش کرنا لازمی ہوگا۔ ڈاکٹر احسن فاروقی کی یہ رائے:

> ''شرر کی تاریخی اہمیت بہت ہے اور باوجود ان کی خامیوں کے ان کے زمانے کے ناول نگاروں کی صف اول میں جگہ ملتے رہے گی جب ان کی صلاحیتوں کا اندازہ لگایا جائے گا تو ان کو تیسرے درجے کا ناول نگار کہا جائے گا مگر جب اردو کے بڑے ناول نگاروں کے نام گنے جائیں تو انکا نام سرشار اور رسوا کے ساتھ ضرور لیا جائے گا۔'' [1]

سہیل بخاری لکھتے ہیں:

> ''جہاں تک ناول نگاروں کے اصولوں کا تعلق ہے شرر اردو ادب کی تاریخ میں اپنا مقام رکھتے ہیں وہ ایک طرح سے اردو ناول کے موجد ہیں وہ پہلے ناول نگار ہیں جنھوں نے انگریزی ناول نگاروں کی تقلید میں ناول نگاری شروع کی۔'' [2]

ڈاکٹر محی الدین قادری صاحب لکھتے ہیں:

> ''عبدالحلیم شرر پہلے انشا پرداز ہیں جنھوں نے انگریزی ادب سے متاثر ہوکر اردو زبان میں ناول نگاری کی باضابطہ ابتدا کی اگر چہ اردو زبان میں

۱؎ ڈاکٹر احسن فاروقی، اردو ناول کی تنقیدی تاریخ، ص ۱۲۶، ادارہ فروغ اردو لکھنؤ ۱۹۶۲ء

۲؎ سہیل بخاری، اردو ناول نگاری، ص ۷۱۔۷۰، مکتبہ جدید لاہور، ۱۹۶۰ء

صنف ناول کو روشناس کرانے کے سہرا پنڈت رتن ناتھ سرشار کے سر ہے
اور بعد میں نذیر احمد نے بھی اس قسم کی کوششیں کی ہیں لیکن شرر نے ایک
مستحکم حیثیت پیدا کر لی ہے۔''[1]

ڈاکٹر قمر رئیس کے مطابق:

''شرر اردو کے پہلے ادیب ہیں جنھوں نے شعوری طور پر ناول کے فن کو
سمجھنے اور برتنے کی کوشش کی اور اپنے ناولوں کی تکمیل میں بعض اجزائے
فنی کا لحاظ رکھا۔''[2]

اس میں شک نہیں کہ شرر نے اپنی ناول نگاری کے سلسلے میں اپنے مقصد کو ہر جگہ غالب رکھا۔ لیکن یہ بھی سچ ہے کہ انھوں نے خالص تاریخ کی ذمہ داری شبلی جیسے مورخ پر چھوڑ کر ناول کا سہارا لیا اور اپنے مقصد کی تکمیل کے لیے یہ ضروری سمجھ لیا کہ ان کے ناول جبھی کامیاب ہو سکتے ہیں جب تک اس میں حسن وعشق کا تذکرہ نہ ہو رومانی مکالمے نہ ہوں۔ اسی وجہ سے ان کا ہر ناول دلچسپ شاعرانہ زبان سے لبریز ہوتا ہے اگر ایک طرف عشق ومحبت کی داستان ہے تو دوسری جانب عرب کے ریگستانوں کا خوبصورت منظر بھی ہے ایک طرف اگر حسین کا کردار دکھایا جا رہا ہے تو دوسری جانب اسی ناول میں شیخ وجودی کا کردار ہے۔ غرض کہ قدم قدم پر یہ رومانی عناصر جہاں ایک طرف قاری کا دل بہلا رہے ہیں تو دوسری جانب ناول کی شکل بھی سنوارے جا رہے ہیں۔

غرض عبدالحلیم شرر نے اپنی دیگر تحریروں کے علاوہ اپنے ناولوں کے ذریعہ اپنے عہد کے معاشرتی اور تہذیبی زندگی کی عکاسی بھی کی اور اسے ایک مثبت تعمیری اور صحت مند رخ دینے کی کوشش کی۔ علی احمد فاطمی شرر کی ناول نگاری کی اہمیت کا اعتراف یوں کرتے ہیں:

''عبدالحلیم شرر اردو کے ان ناول نگاروں میں سے ہیں جن کے احسانوں
سے اردو ادب بالعموم اور اردو ناول بالخصوص کبھی سر نہ اٹھا سکے گا۔''[3]

---

[1] محی الدین قادری زور، اردو کے اسالیب بیان، ص ۹۷، احمدیہ پریس چار مینار، حیدرآباد، ۱۹۳۲ء

[2] قمر رئیس، پریم چند کا تنقیدی مطالعہ، ص ۱۵۹، سرسید بک ڈپو، علی گڑھ ۱۹۶۳ء

[3] علی احمد فاطمی، عبدالحلیم شرر بحیثیت ناول نگار، ص ۳۸۴، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی ۲۰۰۷ء

مرزا محمد ہادی رسوا

مرزا رسوا کا نام بحیثیت ناول نگار کے اس لیے مشہور ہے کہ انھوں نے تخیل پسندی اور مثالیت پسندی کو چھوڑ کر حقیقت نگاری پر اپنے ناولوں کی بنیاد رکھی اور زندگی کے سچے اور بہترین نقشے کھینچے۔ انھوں نے اپنے ناولوں کا پلاٹ اپنے ملک کی سرزمین پر ہی قائم کیا۔ افراد قصہ بھی وہی لوگ منتخب کیے جنھیں وہ اپنی روزمرہ کی زندگی میں دیکھتے تھے۔ مرزا رسوا خالص لکھنوی تہذیب کے چشم و چراغ تھے ان کو طوائفوں سے بے حد لگاؤ تھا۔ اور کوٹھے پر بھی جایا کرتے تھے۔ لیکن اپنے ناول کے لیے انھوں نے طوائف کا کردار محض اس لئے منتخب کیا ہو یہ بات بھی پورے طور پر صحیح نہیں ہے۔ اس قصے میں لکھنو کی سیاسی، سماجی اور معاشرتی صورتحال کو ایک طوائف کی زبانی سنایا گیا ہے ناول کو پڑھنے کے بعد قاری یہ محسوس کرتا ہے کہ لکھنؤ میں دولت کی فراوانی، نوابی عہد اور تہذیبی رکھ رکھاؤ کس معیار کا ہے اس ناول (امراؤ جان ادا) میں انہوں نے دو زمانوں کو دکھانے کی کوشش کی ہے نوابی عہد کا زوال، دوسرے غدر کے بعد کا لکھنؤ ان دونوں دور کے رنگوں کی آمیزش کے ذریعہ لکھنو کا ماضی اور موجودہ معاشرہ سامنے آجاتا ہے۔ ابوبکر عباد اپنے ایک مضمون ''اردو ناول: ارتقا سے ترقی پسند تحریک تک'' میں لکھتے ہیں:

> ''مرزا محمد ہادی رسوا نے پانچ طبع زاد ناول لکھے جن میں دو مردہ، دو نیم مردہ اور ایک زندہ جاوید ہے یوں تو ان کے ناول ''ذاتِ شریف''، ''شریف زادہ''، ''اختری بیگم'' اور ''افشائے راز'' بھی ہیں، لیکن ادبی دنیا میں رسوا کی شہرت وشناخت دراصل ان کے اسی زندہ جاوید ناول یعنی ''امراؤ جان ادا'' سے قائم ہے۔''[1]

[1] منصور خوشتر، اردو ناول کی پیش رفت، ابوبکر عباد، اردو ناول ارتقا سے ترقی پسند تحریک تک، ص ۷۰
ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، ۲۰۱۷ء

امراؤ جان ادا کی ہیروئن ایک غریب اور شریف مسلم خاندان کی لڑکی تھی۔ اس کے والد فیض آباد میں بہو بیگم کے مقبرے کے جمعدار تھے۔ وہ سیدھے سادے سچے مسلمان تھے۔ دلاور خاں نامی ایک بدمعاش ہمسائے کی گرفتاری پر عدالت میں اس کے چال چلن کے بارے میں سچی بات کہہ دینے سے قید کر دیا گیا۔ رہا ہونے پر اس نے بدلا لینے کی ٹھکان لی اور ایک دن موقع پا کر جمعدار کی آٹھ سالہ لڑکی امیرن کو ہلاک کرنے کی نیت سے اغوا کیا لیکن اپنے دوست پیر بخش کی صلاح پر لکھنو لے جا کر اسے فروخت کرنے کا منصوبہ بنایا۔ چنانچہ پیر بخش کے بھائی گھر میں امیرن کو اتارا گیا جہاں رام دئی نامی دوسری اغوا شدہ لڑکی بھی تھی امیرن مشہور چکلے دار رنڈی خانم کے ہاتھ فروخت کی گئی۔ اور رام دئی ایک بیگم صاحبہ کے یہاں خانم نے امیرن کا نام بدل کر امراؤ رکھ دیا۔ اسے لکھایا پڑھایا اور موسیقی کی تعلیم دلوائی۔ جس میں اس نے بہت جلد مہارت حاصل کر لی۔ گوہر مرزا اس کا ہم مکتب تھا۔ شروع شروع میں دونوں لڑتے جھگڑتے ہیں پھر ایک طرح کا لگاؤ آپس میں پیدا ہو گیا یہاں تک کہ گوہر مرزا امراؤ جان ادا کا گلچین اول ثابت ہوا۔ اس بات کی بھنک ملتے ہی خانم نے اس کو رنڈی بنا دیا اور دوسری رنڈیوں کی طرح اس کا بھی الگ عملہ قائم ہو گیا۔

خانم کی لڑکی بسم اللہ نے بھی ترقی کی اور اعلیٰ رنڈیوں میں شمار ہونے لگی ناول میں امراؤ اور بسم اللہ کے مختلف لوگوں کے ساتھ تعلقات کو الگ الگ بیان کر کے گویا دونوں کا تقابلی مطالعہ پیش کیا گیا ہے۔ اس طرح خانم کی دوسری نوچیوں کی داستان بھی بیان کی گئی ہے۔

امراؤ کے آشناؤں میں سب سے نمایاں اور ممتاز نواب سلطان صاحب تھے جن کو امراؤ دل و جان سے چاہتی تھی پھر فیضو ڈاکو اسے خانم کے کوٹھے سے بھگا لے گیا لیکن اس کے ساتھ وہ اور مصیبتوں میں پھنس گئی۔ بڑی مشکل سے وہ کانپور پہنچی اور وہاں ایک کمرہ کرائے پر لے کر پیشہ کرنے لگی اور جلد مشہور ہو گئی۔ کانپور میں اس کی ملاقات رام دئی سے ہوئی۔ اس کے بعد خانم کے آدمی سمجھا بجھا کر اسے دوبارہ لکھنؤ لے گئے غدر کے دوران لکھنؤ کے شاہی دربار سے وابستہ رہی جب انگریزوں نے اودھ کے باغیوں کو تتر بتر کر دیا تو وہ فیض آباد چلی گئی۔ جہاں اس کا پیشہ خوب چمکا اور ایک دن وہ خود اپنے گھر مجرے کے لیے بلائی گئی۔ ماں نے بیٹی کو پہچان لیا۔ دونوں گلے مل کر خوب روئیں۔ دوسرے دن اس کا بھائی اسے قتل کرنے کے ارادے سے اس کے کمرے پر آیا لیکن اس کی دکھ بھری کہانی سن کر چپ چاپ چلا گیا۔

اب امراؤ لکھنؤ آ گئی جہاں اسے پھر عروج حاصل ہوا۔نواب محمود علی خاں نے دعویٰ کیا کہ امراؤ ان کی منکوحہ ہے اس وقت نواب اکبر علی خان نے امراؤ کی مدد کی اور اسے اپنے گھر میں پناہ دی۔ جہاں وہ تین برس رہی۔ایک دن درگاہ میں اس کی ملاقات اسی بیگم سے ہوئی جو رام دئی کو لے گئی تھی۔اس نے امراؤ کو اپنے یہاں بلا لیا اور اس کے نواب وہی سلطان صاحب نکلے جن پر کبھی امراؤ فریفتہ تھی۔امراؤ کو رام دئی پر شک آیا اور وہ اپنی قسمت کو کوسنے لگی۔ایک دن امراو رنڈیوں کے ہمراہ بخشی کے تال کی سیر کو گئی۔وہ سب الگ ایک سڑک پر چلی جا رہی تھی کہ اس کی نظر ایک شخص پر پڑی جو ایک ٹک اسے گھورے جا رہا تھا وہ سہم گئی۔ یہ وہی دلاور خان تھا جو اسے اغوا کر کے لایا تھا۔ پولیس کو رپوٹ دی گئی وہ گرفتار ہو کر اپنے کیفر کردار کو پہنچا۔ ناول میں ان واقعات کو اس انداز سے پیش کیا گیا ہے کہ کہیں دلچسپی اور تاثر میں کمی نہیں ہوتی۔ پلاٹ کی تعمیر اور اس کی پیش کش میں رسوا نے اپنی فنکارانہ مہارت کا ثبوت دیا ہے۔

ایک اچھے ناول نگار کے لیے ناول کے فنی اصولوں کا خاص خیال رکھنا بہت ضروری ہے رسوا نے ناول کے فن کا خاص خیال رکھا ہے جہاں ناول کی کامیابی میں دوسرے اجزائے ترکیبی کا ہونا بہت لازمی ہے وہیں کردار کی پیش کش یا کردار نگاری بھی خاص اہمیت رکھتی ہے۔رسوا کردار نگاری کے فنی اصولوں سے بخوبی واقف تھے انہوں نے ہر کردار کو جملہ کیف وکم کے ساتھ پیش کیا ہے۔امراؤ جان ادا اس کی بہترین مثال ہے۔امراؤ جان کا کردار بہت واضح اور سڈول ہے امیرن یعنی بچپن کی امراؤ جان ایک شریف اور بھولی بھالی لڑکی ہے سب اس کو چاہتے اور لاڈ کرتے ہیں اور وہ اپنے ماحول میں سب سے زیادہ معزز گھرانے کی لڑکی ہے تقدیر نے اسے خانم تک پہونچا دیا۔ جہاں تعلیم وتربیت کے علاوہ ہر طرح کا آرام بھی ملا۔ادب اور موسیقی سے اس کی طبیعت کو خاص مناسبت تھی یہاں آ کر اس کے جوہر کو ترقی ہوئی۔اگر وہ اپنے باپ ہی کے گھر میں رہتی تو ایک معمولی عورت کے سوا کچھ نہ بن سکتی تھی۔بچپن میں گوہر مرزا سے لڑتی جھگڑتی رہی۔ جوان ہونے کے احساس کے ساتھ یہ لڑائی انسیت میں بدل گئی اور گوہر مرزا کے عشق میں اسے لطف آنے لگا۔ یہاں تک کہ ایک دن موقع پا کر گوہر مرزا اس کا گلچین اول بن گیا خانم نے فوراً اس کی مسی کی رسم ادا کر ڈالی۔اب تک اس کا کردار سیدھا سادہ تھا مگر اب اس کی فطرت میں پیچیدگی پیدا ہو گئی وہ پوری رنڈی بنا دئے جانے کے باوجود رنڈی نہیں تھی مگر اس کے ساتھ ساتھ خالص گھویلو عورت بننے کی صلاحیت بھی اس میں نہیں تھی۔رفتہ رفتہ دنیا بھر کے تجربوں سے

اس میں عقل آتی ہے ان میں ادب کا ذوق اور سلیقہ مندی قابل رشک ہے اس کو اپنے مدمقابل کی خواہش ہے جو نواب سلطان کی شخصیت میں اس کو نظر آتا ہے لیکن جو اس کے حصے میں نہیں ہے۔ اس صورت حال سے تنگ آ کر وہ ڈاکو فیضو کے ساتھ بھاگ جاتی ہے۔ غرض اس کی زندگی میں گوناں گوں واقعات رونما ہوتے رہتے ہیں اور وہ بدنصیبی کے ساتھ گردش کرتی رہتی ہے۔

ایک اہم سوال جو امراؤ جان ادا کا مطالعہ کرتے وقت پیدا ہوتا ہے کہ اس ناول کی ہیروئن اگر امراؤ جان ادا ہے تو ہیرو کون ہے تو اس سلسلے میں ناول کے ایک نقاد نے مرزا رسوا کو ہی اس ناول کا ہیرو قرار دیا ہے۔ ڈاکٹر احسن فاروقی لکھتے ہیں:

> ''امراؤ اس ناول کی ہیروئن ہے اور رسوا ہیرو ہیں اس قصہ کے ہر واقعہ میں یہ کسی نہ کسی طرح شامل ضرور ہیں............امراؤ کا روئے سخن ہمیشہ رسوا ہی کی طرف ہے اور وہ قصے کو بالکل ان ہی کے لیے بیان کر رہی ہے ان کی توجہ ان کی دلچسپیوں اور ان کی معلومات کے مطابق قصہ چل رہا ہے وہ اور امراؤ ایک روح اور دو قالب ہیں دونوں کے مذاق ایک ہیں رائیں ایک ہیں اور جہاں کہیں بھی فرق ہے تو ایسا کہ آخر دونوں ایک رائے ہو جاتے ہیں۔''[1]

لیکن اس ناول کے ہیرو رسوا نہیں ہو سکتے رسوا کہیں بھی امراؤ جان ادا کی زندگی میں اثر انداز نہیں ہوتے اور نہ امراؤ کا مقصود نظر ہے اس لیے رسوا اس ناول کے ہیرو نہیں ہو سکتے۔

جہاں تک گوہر مرزا کا سوال ہے وہ بھی امراؤ کا مقصود نظر نہیں ہے وہ صرف ابتدائی دنوں کے تعلق کو اپنے پیشے کی ضرورت کی بنا پر نباہتی ہے اس کے علاوہ امراؤ اور گوہر مرزا میں کوئی تعلق نہیں ہے اس لیے گوہر مرزا بھی اس ناول کا ہیرو نہیں ہوسکتا۔ سلطان مرزا اور فیض علی کچھ عرصہ کے لیے امراؤ جان کی زندگی میں داخل ہوتے ہیں اور اپنا اثر بھی ڈالتے ہیں لیکن اس اثر کی حیثیت وقتی ہے اور یہ دونوں امراؤ جان کے مقصود بننے کے بعد مطمع نظر نہیں بن پاتے اس لیے ان دونوں میں سے بھی کسی کو ہیرو نہیں کہا جا سکتا۔ اگر مذکورہ کرداروں میں

---

[1] ڈاکٹر محمد احسن فاروقی، مقدمہ امراؤ جان ادا، ص 46، مکتبہ شاہراہ دہلی

سے کوئی ہیرو نہیں ہے تو پھر اس ناول کا ہیرو کون ہوسکتا ہے اس سوال کا جواب میرے مطالعے کے مطابق یہ ہے کہ امراؤ جان ادا اس ناول کی ہیروئن ہے اور اس کا ہیرو سماج ہے جس سماج سے ہیروئن متاثر ہوتی ہے وہی اس کا اصل ہیرو ہے اگر اسے بھی تسلیم نہ کیا جائے تو یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس ناول میں کوئی ہیرو نہیں ہے اور کسی ناول میں ہیرو یا ہیروئن کا نہ ہونا کوئی عیب کی بات نہیں ہے۔ اکثر ناول ایسے لکھے گئے ہیں جن میں صرف ہیرو یا ہیروئن ہی ہوتا ہے۔

رسوا کے دوسرے ناول ذات شریف میں بھی لکھنؤ کی سماجی و معاشرتی زندگی کی جھلک ملتی ہے لکھنؤ کے زوال پذیر معاشرے میں سانس لینے والے ایک معزز خاندان کے نوعمر اور نو وارد کا افسانہ اور تباہی کا حال بیان کیا ہے۔ لکھنؤ کے نوابوں کے غدر میں لٹنے، بکھرے ہوئے محروم طبقے کی اخلاقی اور معاشرتی زوال کی کہانی ہے ناول کا قصہ حکیم صاحب اور داروغہ صاحب نبی بخش کی گفتگو سے شروع ہوتا ہے۔ نواب زادہ نواب کی اولاد ہیں جو تعلیم اور تجربے کو ضروری نہیں سمجھتے اور نواب کے بعد خود نواب بن جاتے ہیں نااہلی کی وجہ سے خاندانی دولت سے کھیلتے ہیں ان کی والدہ کلثوم نیک خاتون ہیں ان کا صاحبزادہ شراب اور عورت کے چکر میں گرفتار۔ دوسری جانب حکیم صاحب بیواؤں سے نکاح کرنا شروع کرتے ہیں بیوگی سے زیادہ انھیں دولت کی فکر ہوتی ہے۔ کلثوم کی خادمہ مختار الدولہ جعلیہ عورت ہے۔ جو ان کی دولت پر نظر رکھتی ہے اور اپنے بیٹے مرشد کے ذریعہ ساری خبریں محل کے باہر بھجواتی ہے وہ نواب خلیفہ کی لڑکی کے عشق میں گرفتار ہو جاتا ہے۔ اُدھر نواب صاحب سرخ قبا پری رو سے ملتے ہیں جو ان سے بڑے ڈرامائی انداز میں ملتی ہے اس کے عشق میں گرفتار ہو کر وہ خورشید طوائف اور کاظم علی کو بھی برطرف کر دیتا ہے۔ حکیم صاحب اپنی خادمہ مختار الدولہ اور کلثوم بیگم دونوں سے نکاح کر لیتے ہیں اور شرعی طور سے دو بیویوں کے شوہر بن جاتے ہیں:

> ''دس بجے حکیم صاحب دو بیویوں کے شرعی شوہر بن جاتے ہیں اور گاڑی
> پر سوار ہو کر کچہری گئے۔ اسٹامپ خریدا اقرار نامہ کی نقل لیتے گئے تھے
> اسے اسٹامپ پر صاف کرایا اور مصداق پر رجسٹرڈ کرا دیا۔''[1]

اس کہانی میں نواب اور حکیم دونوں عاشق مزاج ہیں۔ حکیم صاحب کا نکاح اور نواب کی سبز قبا کی کہانی

---

[1] مرزا رسوا، ذات شریف، ص ۱۷۶، شاہی پریس لکھنؤ

قصے میں بڑی دلچسپی سے بیان کی گئی ہے۔ جہاں تک نواب زادہ کی زندگی کا تعلق ہے تو وہ بے حد عیاش کاہل اور سست طبیعت کا ہے۔ بزرگوں کی دولت جس لاپرواہی سے کرچ کرتا ہے یہ اس وقت کے معاشرے کی خاص خرابی تھی۔نواب مالِ مفت سے اپنی صندوقیں بھرلیا کرتے تھے جس کی وجہ سے اس کی اولاد دولت پر عیش کرتی تھی۔دولت کی وجہ سے نواب کچھ سوچتے سمجھتے نہیں اور نابالغ ناتجربہ کار ہونے کی وجہ سے وہ ایسی ایسی حرکتیں کرتے ہیں جس کو محل کے ملازمین کہتے ہوئے شرماتے ہیں:

''ناتجربہ کار امیرزادے مطلق العنان ہوتے ہیں اور مفت کی دولت آتی تو انھیں سوائے اس کے کوئی فکر ہی نہیں ہوتی کہ اس کے لٹانے کا کوئی بہانہ ہاتھ آئے۔''[1]

لکھنؤ کے معاشرے میں کچھ ایسے طبقے بھی تھے جو جسم کا کاروبار کرتے تھے ذات شریف میں کچھ ایسے کردار ہیں جو ایک خاص طبقے کی نمائندگی کرتے ہیں جیسے شاہ صاحب، خلیفہ، نبی بخش وغیرہ نواب کی والدہ تھوڑی دیر کے لیے ہمارے سامنے آتی ہیں ان کی صورت وشکل سے امیرانہ شان جھلکتی ہے شوہر کے انتقال کے بعد وہ بے حد کمزور ہوگئیں ہیں۔ یہاں تک کہ ان کی آواز میں رقت طاری ہوجاتی ہے۔ناچ رنگ کی محفلیں ختم ہو رہی ہیں۔ یعنی اس دور کا خاتمہ ہو رہا ہے وہ کربلا زیارت کے لیے جاتی ہیں اور لوٹ کر واپس نہیں آتیں۔امام مہدی کو زندگی کا خاص تجربہ ہے وہ سماج کی جعل سازیوں سے اچھی طرح واقف ہے اور ملازم ہوتے ہوئے بھی وہ لکھنؤ کی معاشرت میں کافی گھل مل چکا ہے۔

ذات شریف کا ہر کردار ایک ایسا کارٹون ہے جس پر ہنسی تو کم آتی ہے لیکن تضحیک کا جذبہ ضرور پیدا ہو جاتا ہے زندہ کرداروں میں اس طبقے کے افراد ہیں جس سے امراؤ جان ادا کو زندگی ملی ہے۔ان کے علاوہ رجب کی نوچندی کے غریب تماشائی پھنکی بیچنے والا نواب کا بوڑھا وفادار نوکر کریم غریب گھرانے کے میر کاظم علی حکیم صاحب کی باغی بیوی اور خود نبی بخش کے کردار بھی جاندار اور اہم ہیں۔

رسوا کا ایک اور ناول شریف زادہ ہے جو ذات شریف کے جواب میں لکھا گیا ہے۔اس ناول کا پلاٹ سیدھا سادہ ہے اس میں ایک شریف میاں بیوی عابد حسین اور ان کی اہلیہ کی داستان حیات پیش کی گئی ہے۔

---

[1] مرزا رسوا، ذات شریف، ص 51

عابد حسین ایک اچھے گھرانے سے تعلق رکھتے ہیں لیکن حالات نے انھیں مفلس بنا دیا ہے وہ اپنی محنت اور تدبیر سے اپنی زندگی کو سنوارتے ہیں اس کام میں ان کی اہلیہ بھی ان کا ہاتھ بٹاتی ہے۔ رسوا نے اس ناول کے طویل دیباچے میں کئی باتوں کی وضاحت کی ہے۔ مثلاً وہ لکھتے ہیں کہ:

''اگرچہ میری تالیفات میں شریف زادہ یعنی مرزا عابد حسین کی سوانح عمری کا تیسرا نمبر ہے لیکن میرے خیالات کے سلسلے میں یہ پہلا ناول ہے جو میں نے بطور سوانح عمری کے تحریر کیا ہے۔''[1]

اس پلاٹ کو ابھارنے کے لیے بعض جگہ حادثات اور واقعات سے بھی کام لیا گیا ہے جس کا مقصد آئڈیل لائف کی پیش کش ہے یہ آئڈیل لائف متوسط طبقے کے افراد کی وہ زندگی ہے جو کبھی حالات سے شکست نہیں کھاتی۔ اس ناول کی تصنیف کے محرکات کی طرف رسوا نے چند اشارے کئے ہیں۔ مثلاً وہ لکھتے ہیں:

''حرفت کو عار سمجھنا بڑے بڑے شہروں خصوصاً لکھنؤ میں عام ہے اور یہ امر ہماری ترقی میں خارج ہے۔''[2]

عورتوں کی جہالت سے سماج کو جو نقصان پہنچتا ہے اس کا تدراک بھی رسوا نے یوں کیا ہے:

''عورتوں کے جہل اور بد اخلاقیوں سے جو نقصان سوسائٹی کو پہنچ رہا ہے وہ بھی ظاہر ہے اور سبب ان سب مانعات کا یہ امر ہے کہ ابھی تک اعلیٰ درجے کے خیالات ملک میں شائع نہیں ہوئے مفید محنت کو عبادت سمجھ کر اس سے لذت اٹھانے کا خیال ابھی پیدا ہی نہیں ہوا ہے۔''[3]

اس طرح ناول شریف زادہ کے ذریعے ایسے سماج کا تصور پیش کرتے ہیں جس میں بیک وقت مادیت اور روحانیت دونوں کی کارفرمائی ہو۔ صنعتیں اور مشینی نظام زندگی کی داغ بیل رسوا کے زمانے میں پڑ چکی تھی۔ وہ خود ادیب اور فلسفی ہونے کے علاوہ ایک کامیاب طبیب اور انجینئرنگ کے اچھے طالب علم بھی تھے۔ لہٰذا

---

[1] مرزا رسوا، دیباچہ شریف زادہ، ص۹، مکتبہ جامعہ نئی دہلی ۲۰۱۱ء

[2] مرزا رسوا، دیباچہ شریف زادہ، ص۱۰، مکتبہ جامعہ نئی دہلی، ۲۰۱۱ء

[3] مرزا رسوا، دیباچہ شریف زادہ، ص۱۰، مکتبہ جامعہ نئی دہلی، ۲۰۱۱ء

روحانیت اور مادیت کے امتزاج کا تصور ان کے فلسفۂ حیات کی ترجمانی کرتا ہے۔

ناول میں جس عہد کی ترجمانی ہے وہ طرح طرح کی خرابیوں کے باوجود ایک زریں عہد تھا۔ عابد حسین کے باپ دس روپئے ماہوار پاتے تھے اور ٹھاٹ کی زندگی گزارتے تھے۔ ایک انٹرنس پاس نوجوان کے لیے پانچ روپئے کی ملازمت بھی بڑا سہارا سمجھی جاتی تھی۔ چنانچہ عابد حسین کی بیوی ایک روپئے میں تین جانوں کے لیے چار دن کا آذوقہ فراہم کرتی ہے۔

رسوا نے زندگی کی بدلتی ہوئی قدروں کو نمایاں کرنے کے لیے لکھنؤ کے دو مختلف طبقوں کی سماجی زندگی کی تفصیلات پیش کی ہیں۔ عابد حسین کو صدر بازار سے امین آباد تک جو لوگ ملے ان کے لباس میں سادگی تھی اور ان چہروں سے غور وفکر ٹپکتا تھا لیکن جب وہ امین آباد سے مولوی گنج پہنچے تو بہت سے لوگ ایسے ملے جن کے ہاتھوں میں بیڑوں کا بکس تھا کوئی گنا چھیلتا ہوا چلا جاتا تھا اور کوئی راہ میں کھڑا پیالیاں اڑاتا تھا یا دوسرے بے معنی مشاغل میں مست تھا۔ شرف زادہ چند اصولوں پر ڈھالا ہوا ناول ہے اس کے واقعات کی ترتیب ریاضی کے مسئلے سے مناسبت رکھتی ہے۔ عابد حسین کی مفلسی تدریجی ترقی پھر انجینئری کے عہدے پر فائز ہونا اور آخر میں ان کے مثالی گھر تمام نقوش ہمارے سامنے اس سلیقے سے آتے ہیں جیسے اقلیدس کا کوئی مسئلہ عابد حسین کے دوست جعفر حسین کے حالات ایک لطیف تضاد کی حیثیت رکھتے ہیں یہ ناول گویا ایک عمدہ مشین ہے جس کا ہر پرزہ اپنی جگہ کام کا ہے۔ عابد حسین کے کردار کی خصوصیات بالکل واضح ہیں۔ اس کی قوت ارادی قابل داد ہے لیکن اس میں زندگی کے آثار کم پائے جاتے ہیں اس میں اکتا دینے والی ہمواری اور یکسانیت ہے کہیں کوئی خاص تبدیلی نہیں۔ اس میں ذہن ہی ذہن ہیں جذبات مفقود ہیں اس لیے یہ کردار زندہ کردار نہیں اس ناول میں زندہ کردار صرف جعفر حسین کی پھوہڑ بیوی کا ہے باقی کردار مشینی معلوم ہوتے ہیں جن کے اقوال واعمال کو رسوا مثالی دنیا سے تعبیر کرتے ہیں۔ بہر حال سماجی زندگی کی ترجمانی، عکاسی اور تنقید وتبصرے کے اعتبار سے رسوا کا یہ ناول بھی کامیاب ہے۔

اختری بیگم رسوا کا آخری طبع زاد ناول ہے یہ ناول بھی سوانحی انداز میں تصنیف کیا گیا ہے اور ایک امیرزادی کی زندگی کے حالات پر مبنی ہے اس ناول کا پلاٹ اتنا سیدھا سادہ اور سپاٹ ہے کہ کہیں کہیں قصے کی ترتیب میں بھی خلل پیدا ہو گیا ہے قدیم داستانوں کی طرح اصل قصے کے درمیان آنے والی غیرضروری

حکایتیں اور بحثیں ناول کی ہیئت کو قدرے مسخ کر دیتی ہیں۔ مثلاً نادرہ کی پندرہویں سالگرہ کے موقع پر اس عمر تک لڑکی کے کنواری رہنے کا نقصان اور شادی بیاہ کے دوسرے مسائل زیر بحث آ گئے ہیں اور اصل موضوع کہیں دور رہ گیا ہے۔ پلاٹ کی ایک کمزوری یہ ہے کہ ناول کے سارے واقعات کا راست تعلق اختری بیگم سے نہیں ہے ناول کا تقریباً آخری نصف حصہ مراد علی کی ریشہ دوانیوں، بوٹن کے ساتھ ان کے معاشقے اور دونوں کے رومانی وارداتوں کے بیانات پر مشتمل ہے بوٹن ایک جذباتی لڑکی ہے جسے ماں باپ کے بے جا لاڈ پیار نے ضدی اور خودسر بنا دیا ہے۔ وہ مراد علی کے بہکاوے میں آ کر ماں باپ کی مرضی کے بغیر اس سے شادی کر لیتی ہے وہ مراد علی کے سلسلے میں بہت پر خلوص اور سنجیدہ ہے مراد علی اختری کی جائداد کے معاملے میں غبن کا مجرم قرار پاتا ہے تو نواب مرزا اسے نصیحت کرتے ہیں کہ وہ ایسے بدمعاش کا ساتھ چھوڑ دے۔ بوٹن اس کے جواب میں کہتی ہے کہ اس نے جو کیا وہ بیشک برا کیا مگر چھوڑ دینا کیا۔ اب چور ہوں، جواری ہوں، شرابی ہوں جو کچھ ہوں نباہ دوں گی، میری قسمت کا یہی لکھا تھا یہ رفاقت کا وہ جذبہ ہے جس میں عیش پسندی کا کوئی دخل نہیں ہے اس لیے بوٹن ایک کم فہم جذباتی لڑکی ہونے کے باوجود ہر مصیبت کا مقابلہ کرنے پر آمادہ ہے۔

افشائے راز رسوا کے ابتدائی کارناموں میں سے ہے ان کے بعض اور ناولوں کی طرف یہ بھی ان کی ذاتی زندگی کے تجربات پر مبنی ہے لیکن وہ اس ناول کو پورا نہ کر سکے پر ناول انہوں نے سید محمد ذکی کے فرضی نام سے لکھا تھا اس کی شانِ نزول یہ بتائی ہے کہ سید محمد ذکی جو مرزا رسوا کے دوست تھے اچانک لاپتہ ہو گئے لیکن اس سے پہلے وہ مرزا رسوا سے اپنی سوانح عمری لکھنے کی فرمائش کر جاتے ہیں اور اس کے متعلق کچھ ہدایتیں بھی دے جاتے ہیں۔

خونی شہزادہ:

یہ ناول رسوا کے دوسرے ناولوں سے اس بنا پر ممتاز ہے کہ اس کا موضوع سر بستہ راز کی سراغ دانی ہے۔ زمرد شاہ عوام میں تیموری شہزادے کی حیثیت سے مشہور تھا۔ اس کا اصلی نام داؤد خان تھا۔ لکھنؤ میں اس کی ڈیوڑھی مختلف جانوروں پرندوں، سانپوں اور نایاب کتابوں کی بدولت ایک چڑیا گھر اور عجائب خانہ بنی ہوئی تھی۔ سلطان مرزا جو خود مرزا رسوا ہیں اس ناول میں منظّم کی حیثیت سے موجود ہیں۔ رمزد شاہ سے ان کی پہلی ملاقات دہلی سے لکھنؤ کے سفر کے دوران ریل میں ہوتی ہے اس کی ہیئت سلطان مرزا کو اپنی جانب متوجہ کر لیتی

ہے۔مختصر سی ملاقات اور تعارف کے بعد لکھنؤ اسٹیشن پر جدا ہو جاتے ہیں لیکن سلطان مرزا کو اس کے حالات کا تجسس رہتا ہے وہ اس کی ڈیوڑھی میں جاتے ہیں جہاں انہیں عجیب وغریب ساز وسامان اور حیوانوں کو دیکھنے کا اتفاق ہوتا ہے وہ ایک سازش کا شکار ہو کر صبح خود کو ایک دریا کے گھاٹ پر پاتے ہیں۔

اس ناول میں سب سے زیادہ جاندار کردار بیگم کا ہے جس سے سلطان مرزا کی شادی ہونے والی تھی۔ وہ موسیقی کی دلدادہ تھی اور رمز دشاہ موسیقی کا بڑا رسیا تھا اور بین بجانے میں بڑی مہارت رکھتا تھا۔جس پر بیگم لٹو تھی بیگم کے معاملے میں ایک بات سلطان مرزا کی مڈبھیڑ رمزدشاہ سے ہوگئی تھی اور انتقاماً اس نے سلطان مرزا کی جان لینے کا ارادہ کرلیا تھا لیکن داؤد خان کی محبوبہ موہنی اور اس کی لونڈی منی کی مدد سے بچ جاتے ہیں۔ زمردشاہ کو جانداروں کو ایذا دے کر مارنے میں بڑی لذت ملتی تھی ان میں انسان بھی شامل تھے۔اس نے اپنے استاد فرہاد شاہ اور لکھنؤ کے ایک مشہور رتاجر عبدالرحیم بیگ کو قتل کیا تھا اور پولیس قاتل کی تلاش میں سرگرم تھی لیکن وہ اتنی ہوشیاری کے ساتھ لوگوں کو قتل کرتا کہ سراغ ملنا بھی مشکل تھا۔آخر سلطان مرزا اور ان کے چند مددگاروں کی کوشش سے زمردشاہ خود اپنے طلسمی فوارے کا شکار ہو کر کیفر کردار کو پہنچ جاتا ہے۔

یہ ناول سماجی حیثیت سے کوئی خاص اہمیت نہیں رکھتا تاہم اس میں جگہ جگہ لکھنؤ کی سماجی زندگی کی تصویریں مل جاتی ہیں۔ جانوروں اور پرندوں کو پالنے کی جوسنک زمردشاہ کو تھی وہ ہم کو واجد علی شاہ کے اس شوق کی یاد دلاتی ہے۔اس زمانے میں لکھنؤ کے عوام اور خواص یہاں تک کہ خواتین میں بھی جو مشغلے اور شوق رائج تھے۔ان کی تفصیلات اس ناول میں مل جاتی ہیں۔ناول کا پلاٹ دوسرے ناولوں کے مقابلے میں زیادہ پیچیدہ ہے اور بظاہر انگریزی کے کسی جاسوسی ناول کا روپ معلوم ہوتا ہے۔

خونی جورو:

رسوا کا یہ ناول فکری اور فنی ہر لحاظ سے سستا، سطحی اور سپاٹ، نہ فن کے ساتھ انصاف ہوا ہے نہ موضوع کو ادبی دیانت داری کے ساتھ برتا گیا ہے یہ ناول ایک نئے سیاسی نظام کی طرف اشارہ کرتا ہے اس ناول کا مرکزی کردار لیڈی ہے جو اپنے آپ کو کرنل لاکوڈ کے دوست کرنل بسٹر و کی بیوی بتاتی ہے۔اس کا حسن ہوش ربا، ادائیں دل ربا اور شباب قیامت خیز ہے۔کرنل اس کے حسن کے خزانے سے دوچار ہو کر اپنی بیوی کو بھول جاتے ہیں لیڈی کے پاس غیر ممالک کا پاس پورٹ نہیں ہے اس لیے وہ کرنل کی بیوی بن کر ان کے ساتھ سفر

کرتی ہے اور فرانس میں ایک خاص طبقے کے مفاد کے لیے شاہی نظام کے خاتمے کی جدوجہد کرتی ہے۔ کرنل اس راز سے ناواقف ہیں۔ لیکن شاہی محل میں رقص کے دوران وہ اس کے ارادوں کو بھانپ لیتے ہیں اور نیند کی دوا دے کر شہزادی اور خاندان کے دیگر افراد کو بچا لیتے ہیں لیڈی ناکامی کے بعد افشائے راز کے خوف سے ملک سے فرار ہو جاتی ہے۔

ناول میں واقعات کی رفتار نہایت تیز ہے لیکن ان میں دلکشی اور دلچسپی کا کوئی خاص پہلو نہیں ہے نہ اس کا کوئی کردار جاذب توجہ ہے۔ کرنل کے اپنے وطن لوٹنے کے بعد مصنوعی لیڈی کرنل سے ایک تھیٹر ہال میں دوبارہ ملاقات کرتی ہے اس وقت لیڈی کا طرز عمل دیکھ کر یہ محسوس ہوتا ہے کہ اس کے انقلابی جوش کو حالات کی مجبوریوں نے معطل کر دیا ہے یہی اس ناول کی انتہا ہے اور ناول کا مجموعی تاثر بھی یہی ہے۔

مختصر یہ کہ رسوا کے ناول مقصدیت کے حامل ہیں وہ حقیقت نگاری کے حامل ہیں اپنے زمانے کی سماجی زندگی کے جملہ پہلوؤں کو انھوں نے اپنے ناولوں میں مہارت اور خوبی کے ساتھ سمو دیا ہے۔ وہ فنکار اور ناصح کے فرق مراتب کو پہچانتے ہیں اس لیے نذیر احمد کی طرح معلم اخلاق بن کر پند و نصیحت کا دفتر نہیں کھولتے۔ بلکہ سماجی مسائل کو حالات و واقعات کے پیرائے میں پیش کرتے ہیں اور ان کے حل کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ ان کی مخصوص فلسفۂ حیات نہ محض مادیت سے عبارت ہے نہ صرف روحانیت پر مبنی بلکہ دونوں کے مناسب امتزاج اور ہم آہنگی کو وہ انسانی سماج کی بقا اور ترقی کے لیے ضروری قرار دیتے ہیں ان کے ناولوں کا یہ سماجی پہلو خاصا جاندار اور اہم ہے جس کو ان کی فنکارانہ مہارت اور تخلیقی بصیرت نے چار چاند لگا دیے ہیں۔ خاص طور پر امراؤ جان ادا ان کا ایسا کارنامہ ہے جو اردو ناول کی تاریخ میں ان کا نام زندہ رکھنے کے لیے کافی ہے۔

باب دوم

ریاست جموں و کشمیر میں اردو زبان ادب کا ارتقا اور ناول کی روایت

(۱) ریاست جموں و کشمیر میں اردو زبان و ادب کا ارتقا

(۲) ریاست جموں و کشمیر میں اردو ناول کی روایت

ریاست جموں و کشمیر میں اردو زبان وادب کا ارتقا

ریاست جموں وکشمیر کا جب بھی ذکر کیا جاتا ہے تو ذہن فوری وہاں کے قدرتی حسن، رعنائی اور فطرت کی جادوگری کی طرف جاتا ہے۔ کشمیر کے باغات، برف کی چادر سے ڈھکی ہوئی خوبصورت سفید پہاڑیاں، ڈل جھیل کا منظر، گلمرگ یا سونامرگ کے وہ خوبصورت مقامات ہر راہگیر کو ہر سیاح کو اپنا گرویدہ بنا لیتے ہیں جس نے بھی اس وادی میں قدم رکھا اس نے اس کی خوبصورتی اور مسحور کن صورتحال کو قبائے سخن بنا کر پیش کیا۔ مصنفین کے لیے ہمیشہ ہی کشمیر ایک محبوب موضوع رہا ہے۔ مختلف شاعروں ادیبوں اور سیاحوں نے کشمیر کو مختلف نام دیئے ہیں کسی نے اسے فردوس بریں کہا، کسی نے خلد عرضی کہا، کسی نے گل پوش وادی کہا، کسی نے وادی جنان کہا اور کسی نے اسے جنت بے نظیر کہا۔ بودھ مت کے دور میں کشمیر کی مداح سرائی کا سلسلہ شروع ہوا۔ تاریخی اعتبار سے کشمیر کے لوگ جب اپنے پڑوسی ممالک کا دورہ کرتے تھے تو وہاں کے روحانی بزرگوں سے کشمیر کے سیاسی اُتھل پتھل اور پریشان شدہ حالات پر توجہ دینے کی درخواست کرتے تھے۔ چنانچہ کشمیر کے لوگوں کی دینی و دنیاوی معاملات کی رہنمائی کے لیے ترکستان کے مشہور صوفی سید اشرف الدین عبدالرحمٰن بلبل اپنے مریدوں اور عقیدت مندوں کے ساتھ ۱۳۳۶ء میں کشمیر تشریف لائے۔ ان دنوں کشمیر کے راجاؤں کے آپسی جھگڑوں اور غلط کاموں کی وجہ سے سارا نظام بگڑ چکا تھا۔ ان حالات کے پیش نظر ہندو راجاؤں کو اقتدار سے ہاتھ دھونا پڑا۔ اور لداخ کا ایک شہزادہ رینچن شاہ کشمیر کا حکمراں بن گیا۔ رینچن شاہ اپنی ہندو بیوی ''کونہ رانی'' اور وزیروں کے ساتھ بلبل شاہ کے ہاتھوں بیعت ہو کر کے مسلمان ہو گیا بلبل شاہ نے نام سلطان صدرالدین رینچن شاہ رکھا۔ رینچن شاہ کا ایک وزیر جو خود بھی مسلمان ہو گیا تھا فارسی زبان سے آشنا تھا وہ بلبل سے دین واسلام کی باتیں سن اور سیکھ کر مقامی لوگوں میں اسلام کی تبلیغ کیا کرتا تھا۔ اس طرح قرآن واحادیث اور اسلامی تعلیمات کی وجہ سے عام کشمیری لوگ فارسی اور عربی زبانوں سے واقف ہونے لگے۔ بلبل شاہ کے بعد ایران کے مشہور صوفی امیر کبیر حضرت میر سید علی ہمدانی متعدد عالموں، مبلغوں اور عبادت گزار مریدوں کے

ہمراہ کشمیر تشریف لائے۔عقیدت اور محبت کی بنا پر شاہ ہمدان کے نام سے مشہور ہوئے۔آپ فارسی کے کہنہ مشق شاعر تھے جن کے اشعار کو تبرک سمجھ کر پڑھا جانے لگا، فارسی زبان سے عام وخاص کو دلچسپی پیدا ہونے لگی اور بحیثیت مسلم قرآن پاک کے فارسی ترجمے کو سننے اور پڑھنے کے شیدائی ہونے لگے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اہل قلم طبقہ فارسی لکھنے اور پڑھنے میں ایک اہم مقام رکھنے لگا۔سلطان زین العابدین بڈشاہ کے عہد میں فارسی نے علمی فارسی نے علمی وادبی زبان کی حیثیت اختیار کر لی۔بڈشاہ نے سنسکرت کتابوں کے ترجمے فارسی میں کرائے،خود بھی فارسی میں شعر کہتے تھے۔عبدالقادر سروری اپنی کتاب ''کشمیر میں اردو'' میں لکھتے ہیں۔

> ''چودہویں صدی میں ایران اور وسط ایشیا سے آنے والے علما کے ساتھ اسلام اور ایرانی تہذیب کشمیر پہنچی اور فارسی زبان کو فروغ ہوا۔ ایک زمانے میں کشمیر پر ایرانی تہذیب کے اثرات اتنے گہرے ہو گئے تھے اور فارسی زبان میں لکھنے والوں کی اتنی کثرت تھی کہ اہل ایران ''کشمیر'' کو ''ایران صغیر'' کہنے لگے تھے۔''[1]

اس تیز رفتاری کے ساتھ فارسی زبان نے عوام الناس میں اپنی جگہ بنائی کہ فارسی سرکاری زبان کا درجہ پا گئی۔سید علی ہمدانی عربی اور فارسی کے عالم تھے اور انھوں نے کشمیر میں میں فارسی زبان وادب کے فروغ میں کارہائے نمایاں انجام دیئے ہیں۔آپ نے بیس سے زیادہ رسالے لکھے ہیں جن کی اہمیت سے انحراف ممکن نہیں ان رسائل کے علاوہ ان کی مناجات،غزلیات،مثنویاں اور دیگری شعری تخلیقات بھی شامل ہیں۔شہمیری حکمرانوں میں سلطان زین العابدین بڈشاہ اور قطب الدین کا الاصل تو کشمیری تھا لیکن عہد دستور کے مطابق مقامی زبان کے بجائے یہ بھی فارسی میں ہی شعر موزوں کرتے تھے۔شاعری کے علاوہ دینی و تعلیمی مراکز بھی قائم کئے۔اپنے درباروں اور درسگاہوں میں علما کو دعوت دی۔مثلاً سلطان زین العابدین کے دربار میں ملا احمد کشمیری (ملک الشعرا) تھے جنھوں نے دارالترجمہ کے لیے کلہن کی ''راج ترنگنی'' کا فارسی میں ترجمہ ''بحرالاسمار'' کے نام سے کیا تھا۔آپ کے علاوہ دیگر صوفیا، ادبا اور شعرا جن میں مرزا حیدر دوغلوت، بابا طالب اصفہانی، میر علی مولانا مہدی اور مولانا احمد خاص طور پر مشہور ہیں۔اپنے دینی علمی ادبی اور شعری افکار وخیالات کے اظہار کے لیے فارسی کو وسیلہ بنایا۔

[1] عبدالقادر سروری، کشمیر میں اردو، ص۱۹، ناشر جموں وکشمیر، اکیڈمی آف آرٹ کلچر اینڈ لینگویجز ۱۹۹۳ء

شہمیری اور چک حکمرانی کے انحطاط کے بعد جب کشمیر پر مغلوں کا تسلط ہوا تو اکبر اور جہانگیر کے عہد کے سربرآوردہ فارسی شعرا، عرفی، فیضی اور انشا پرداز ابوالفضل کا بھی کشمیر سے تعلق رہا۔ جس عہد میں ہندوستان کے دیگر حصوں میں اردو جوبن پر آرہی تھی اس کے پیش نظر کشمیر کی سرزمین بھی اردو کی نشوونما کے لیے ہموار ہوئی۔ صرف فارسی ہی نہیں بلکہ عربی زبان نے بھی اردو کے پھلنے پھولنے میں کلیدی کام کیا ہے چونکہ عربی زبان راجہ ہرش کے عہد میں ہی داخل ہو چکی تھی۔ چودہویں صدی سے سولہویں صدی تک اسلام نے اہل کشمیر کو اپنے دائرے میں لے لیا اور اٹھارہویں صدی میں بیرون ریاست سے لوگوں کی آمد و رفت بڑھ گئی تھی۔ اس صدی میں آپسی تعلقات کی بنا پر جموں و کشمیر پنجاب کے مہاراجہ رنجیت سنگھ کے زیر اقتدار میں آ گیا تھا۔ اس دور حکومت میں کشمیر کے لوگوں کے حق میں مثبت نتائج ثابت نہیں ہوئے۔ بہت زیادتیاں ہوئیں جن شہروں میں آنا جانا عام تھا ان میں خاص طور سے لاہور، جالندھر اور امرتسر ہیں جو اس وقت اردو ترویج و تالیف کے ادبی مراکز تھے۔ عام لوگوں کی تال میل کی وجہ سے اس وقت کے اردو شعرا و ادبا نے بھی کشمیر کے فطری حسن سے اپنے ادب کو حسین موضوعات دینے کے لیے رخ کیا۔ عربی، فارسی اور اردو کی طرح کشمیر کی مقامی زبانیں کشمیری گوجری پہاڑی اور گریزی وغیرہ بھی دائیں سے بائیں لکھی جاتی ہیں ان زبانوں کی لسانی ساخت اور املا ذرا سے فرق کے ساتھ اردو کی لسانی ساخت اور املا سے مماثلت رکھتا ہے۔ بیرون جموں و کشمیر سے آنے والے لوگ مقامی زبانوں سے ناواقف تھے۔ رابطے کی غایت دوطرفہ تھی۔ اس مقام پر سامنے اردو موجود تھی۔ جموں و کشمیر والوں کو اردو زبان سے دلچسپی بھی تھی تو انھوں نے نہ صرف اردو زبان اختیار کی بلکہ اس کے پھیلانے میں اہم کردار بھی نبھایا۔ جس کی وجہ سے اتنے محیط عرصے میں ہی اردو مضبوط اور مستحکم حیثیت اختیار کر گئی۔ جموں و کشمیر کے نظم و نسق میں اُتھل پتھل اور بگاڑ کے سبب سے مہاراجہ رنجیت سنگھ نے اپنی حکمرانی کی باگ ڈور بہادر ڈوگرہ افسر گلاب سنگھ کو سونپ دی تھی۔ گلاب سنگھ نے صرف سیاسی مصلحتوں اور کاروباری ضرورتوں کے تحت دہلی اور لاہور کی حکومتوں کے ساتھ تعلقات ہی قائم نہیں کئے بلکہ اپنے دربار میں مختلف علوم و فنون میں مہارت رکھنے والے غیر ریاستی ماہرین اور افسران کو بھی ملازم رکھا جو اردو داں تھے۔ اس بات کی تصدیق ڈاکٹر برج پریمی کے اس اقتباس سے ہوتی ہے:

''ڈوگرہ عہد میں کچھ عرصہ تک ''نقیبوں'' کو ہندوستان کے مختلف شہروں

سے بلا کر اپنے دربار میں اس غرض کے لیے تعینات کیا گیا تھا کہ وہ ڈوگرہ دربار میں مغلئی جاہ و جلال کا سا انداز پیدا کریں۔ چنانچہ جب مہاراجہ دربار میں آتا تھا تو اس کی آمد کا اعلان مغلئی (مغل بادشاہوں کے) انداز سے کیا جاتا تھا۔ ان نقیبوں کے ساتھ ان کے پورے پورے خاندان بھی ہوتے تھے جن کی بول چال اردو تھی اس طرح سے بھی اردو زبان کا جموں وکشمیر میں عمل دخل شروع ہوا۔''

مہاراجہ گلاب سنگھ کے سامنے مغلیہ حکومت کا نقشہ تھا۔ جس کا اتباع کرنا راجا کے لیے باعث فخر تھا۔ فارسی کو درباری زبان کا درجہ دیتا، مغلوں کے رسوم ورواج اور تہواروں کو ویسے ہی منانا، دربار سجانا اس بات کی دلیل ہے۔ ان موقعوں پر بیرونِ ریاست کے فنکاروں، گانے بجانے والوں رقاص وبازیگروں کو دعوتِ شرکت دیتے تھے جو اردو زبان بولتے تھے اور باہم تبادلہ خیال بھی اردو میں ہی کرتے تھے۔ گلاب سنگھ کے عہد حکمرانی میں زیادہ تر افسران اردو سے نہ صرف آشنا تھے بلکہ دفتری کام فارسی کے ساتھ ساتھ اردو میں بھی کرتے تھے۔ لاہور چونکہ اردو کا ایک مرکز تھا کے علاوہ ہندوستان کے دیگر حصوں سے اخبارات ورسائل جموں وکشمیر پہنچتے تھے۔ جموں وکشمیر کے نوآموز اردو شعرا وادبا کی تخلیقات کے شائع ہونے کا ذریعہ بھی یہی اخبارات ورسائل بنے۔ ہندوستان کے دیگر شہروں میں تھیٹریکل کمپنیوں کا چلن عام تھا تو گلاب سنگھ نے بھی ان کمپنیوں کو جموں و کشمیر میں ڈرامے پیش کرنے کے لیے اجازت دی۔ کمپنیوں نے گلی گلی میں جا کر اپنے ڈرامے پیش کیے۔ لوگ نہ صرف ان کے قریب ہوئے بلکہ ڈرامے دیکھنے کا ذوق وشوق بھی رکھتے تھے۔ قوالی گانے کا رواج بھی عام ہونے لگا تو لوگ بے ساختگی میں اشعار گنگناتے تھے۔ اہم بات یہ کہ اس وقت فورٹ ولیم کالج اور دلی کالج میں بہت سارا ترجمہ شدہ مواد بھی جموں کشمیر پہنچا۔ جس سے تعلیم یافتہ طبقہ میرؔ و غالبؔ کی شاعری اور میرامنؔ اور رجب علی بیگ سرورؔ کی نثر سے بھی واقف ہوئے۔ بالآخر ۱۴؍ مارچ ۱۸۴۶ء میں برطانوی حکومت کے زیر اثر آ کر گلاب سنگھ نے جموں وکشمیر کو ۷۵ لاکھ کے عوض خرید لیا تھا۔ جس کا اظہار علامہ اقبال نے اپنی شاعری میں بھی کیا ہے۔ علامہ اقبال کا تو تعلق ہی اس سرزمین سے تھا تو اس سودے سے فطری متاثر ہونا ان کے لیے بجا بھی تھا لیکن اردو ادب کے دیگر شعرا بھی متاثر نظر آتے ہیں۔ حفیظ جالندھری اس طرح اظہار کرتے ہیں۔

لوٹ لی انسان کی قسمت پچھتر لاکھ میں
بک گئی کشمیر کی جنت پچھتر لاکھ میں
مرد کا سرمایہ محنت پچھتر لاکھ میں
عورتوں کا جوہر عصمت پچھتر لاکھ میں

(انتخاب کلام، حفیظ جالندھری، ص۲۶۵)

گلاب سنگھ نے حکومت سے دست برداری کے بعد ۱۸۵۶ء میں مہاراجہ رنبیر سنگھ کو حکومت سونپ دی۔ رنبیر سنگھ تقریباً ۲۹ برس حاکم رہے رنبیر سنگھ کے دور ۱۸۵۷ء سے ۱۸۸۵ء میں گرچہ سرکاری زبان فارسی ہی رہی لیکن اس دور میں اردو زبان نے اپنے قدم مظبوط کیئے۔آپ ایک علم دوست حکمران تھے اپنے عہدِ حکمرانی میں انتظامی معلومات کے لیے شیر سنگھ مہتہ سے اردو زبان میں رپورٹیں تیار کروائیں۔اس کے علاوہ جب شیر سنگھ مہتہ نے بلخ کا سفر کیا تو واپس آ کر اپنا سفر نامہ اردو میں ہی لکھا۔بقول برج پریمی:

''چودھری مہتہ سنگھ نے ۱۸۶۴ء تا ۱۸۶۶ء کے دوران بخارا کا سفر کیا۔ واپسی پر اس نے اردو میں اپنا سفر نامہ قلمبند کیا۔ یہ ریاست میں سرکاری طور پر پہلی اردو تحریر تسلیم کی گئی ہے۔ ۱۵۰ صفحات پر مشتمل یہ سفر نامہ بڑا دلچسپ ہے۔''[۱]

لیکن شیر سنگھ مہتہ نے سفر نامہ کے علاوہ بھی اور کئی کتابیں اردو میں لکھیں جو اس طرح ہیں:

(۱) احوال ملک لداخ۔
(۲) ترجمہ بھگوت گیتا۔
(۳) ترجمہ۔تاریخ انگلستان۔

رنبیر سنگھ کے زمانے میں اردو عوامی رابطے کی زبان بن چکی تھی لہٰذا اردو کی علمی ادبی اور انتظامی افادیت کے پیش نظر ریاست میں اردو کو ذریعہ تعلیم بنا دیا گیا تھا۔کشمیر کے ایک مشہور شاعر نے اپنے مضمون میں اس بات کی تصدیق کی ہے کہ:

[۱] ڈاکٹر برج پریمی، جموں و کشمیر میں اردو ادب کی نشو و نما، ص۲۰، ناشر دیپ پبلی کیشنز، ۱۹۹۲ء

''مہاراجہ رنبیر سنگھ کے عہد حکومت سے آج تک اردو زبان اسکولوں میں ذریعہ تعلیم رہی ہے۔''[۱]

مہاراجہ رنبیر سنگھ نے سنسکرت کالج، رنبیر لائبریری اور دارالترجمہ قائم کیا۔ان میں ''دارالترجمہ'' نے کارہائے نمایاں انجام دئے۔دارالترجمہ کے متعلق اختر الدولہ اپنی کتاب میں لکھتے ہیں:

''اس دارالترجمہ کے ناظم پنڈت گنیش کول مقرر ہوئے تھے۔دارالترجمہ کے انتظام کے بارے میں اب تک کوئی تفصیلات دستیاب نہیں ہوئیں۔ اتفاق سے حکومت کی نظم ونسق کی ایک رپورٹ میں جو۱۸۸۲ء اور ۱۸۸۳ء میں لکھی گئی ہے ایک اندراج ملتا ہے جس سے اس کے ایک سال کے اخراجات سے ترجمہ کا اندازہ ہوتا ہے۔۴۵۰۲ روپیہ اجرت ترجمہ پر اس سال صرف ہوا اور سال حال میں کوئی کتاب جو انگریزی سے شاستر اور شاستری سے بھاشا اور عربی سے اردو میں ترجمہ ہوئی ہیں ختم نہیں ہوئی ہیں۔لہٰذا ان کی تفصیلی رپورٹ سال آئندہ میں درج ہوگی۔''[۲]

جب یہ ادارہ بند ہو گیا تو سارا ادبی سرمایہ ریسرچ لائبریری سرینگر میں شفٹ کیا گیا۔انتظامیہ کی عدم دلچسپی سے متعدد مخطوطے اِدھر اُدھر ہو گئے ہیں جو موجود ہیں انھیں اب اقبال لائبریری کشمیر یونیورسٹی میں منتقل کیا گیا ہے۔

اس کے علاوہ رنبیر سنگھ نے ''بدیا بلاس پریس'' کے نام سے ایک چھاپہ خانہ بھی قائم کیا۔جس سے دارالترجمہ میں ترجمہ شدہ کئی کتابیں شائع کی گئیں۔ان کتابوں کے تراجم اور مسودوں کی تیاری میں غلام غوث خان، پنڈت بخشی رام، مولوی فضل الدین، لالہ بسنت رائے وغیرہ کے نام اہم ہیں۔۱۸۸۵ء میں جب مہاراجہ

---

۱ عبدالقادر سروری، مہاراجہ رنبیر سنگھ اور ان کا دارالترجمہ، مشمولہ ترجمہ کا فن اور روایت، از ڈاکٹر قمر رئیس، ص ۲۹۶ ناشر ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ، ۲۰۱۱ء

۲ اختر الدولہ، اختر شہنشاہی، مطبوعہ اختر پریس لکھنؤ ۱۸۸۸ء

رنبیر سنگھ فوت ہو گئے تو مہاراجہ پرتاپ سنگھ ان کے جائے نشین ہوئے ان کے عہد تک فارسی ہی سرکاری زبان تھی لیکن مہاراجہ پرتاپ سنگھ نے اپنے دورِ حکومت میں اردو کو سرکاری زبان کا درجہ دیا جس کے صحیح سال تاریخ کا اختلاف ہے۔ محمد یوسف ٹینگ نے ۱۸۸۵ء برج پریمی نے ۱۸۸۹ء بلدیو پرشاد ۱۸۸۶ء لکھتے ہیں لیکن ۱۸۸۸ء کو زیادہ تر تسلیم کیا جاتا ہے۔

پرتاب سنگھ نے عیسائیت تبلیغ کے ردِعمل میں ''سناتن دھرم سبھا'' قائم کی تو سالک رام سالک نے کئی کتابچے لکھے جو حسب ذیل ہیں:

(۱) مورتی منڈن

(۲) دھرم اُپدیش

(۳) ارتھ شاستر

(۴) لغت اردو

(۵) محاورات اردو

(۶) داستان جگت روپ وغیرہ

سالک رام سالک کے بڑے بھائی پنڈت ہرگوپال خستہ جو ہجرت کر کے لاہور چلے گئے تھے اور کتاب ''گلدستہ کشمیر'' لکھی جس کو پروفیسر قدوس جاوید نے اپنے ایک مضمون میں جموں و کشمیر کی پہلی نثری تصنیف قرار دیا۔ اس کے علاوہ ہرگوپال کول خستہ نے ڈپٹی نذیر احمد کے ناول ''مراۃ العروس'' کے تتبع میں ایک قصہ ''گلزار قواعد'' بھی لکھا۔

اس دورِ حکومت یعنی ڈوگرہ حکومت میں پریس قائم کرنے اور اخبار و رسائل جاری کرنے کی پابندی تھی تو اہل کشمیر بیرونِ کشمیر کے دوسرے شہروں سے اخبارات و رسائل جاری کرتے تھے جن میں ''اخبار عام''، ''خیر خواہ کشمیر''، ''ہمدرد ہند''، ''کشمیری گزٹ''، ''کشمیری میگزین''، ''کشمیری مخزن''، ''صبح کشمیر''، ''بہار کشمیر'' اور پنجہ فولاد وغیرہ اہم ہیں۔ لیکن بیسویں صدی میں جموں و کشمیر سے ڈوگرہ حکومت کی اجازت کے مطابق پہلا اخبار رنبیر ۱۹۲۴ء میں جاری ہوا جس کے اڈیٹر ملک راج صراف تھے۔ اس کے بعد کشمیر سے ''وتستا''، ''ہمدرد''، ''صداقت''، ''مارتنڈ''، ''وکیل''، ''حقیقت''، ''خالد'' اور ''خدمت'' وغیرہ اخبارات شائع ہوتے رہے جن میں

مقامی ادباء وشعرا کی تخلیقات کوشائع کیا جاتا تھا۔ ۱۹۴۷ء کی تقسیم اور آزادی کے بعد متعدد اخبارات اور رسائل کا سلسلہ جاری ہوا۔ جو آج بھی برقرار ہے۔ آج کی تاریخ میں جموں وکشمیر سے ''شیرازہ''، ''حکیم الامت''، ''تعمیر''، ''بزم ادب'' اور ''تفہیم'' وغیرہ ادبی رسالے شائع ہو رہے ہیں اور ''آفتاب''، ''کشمیر عظمیٰ''، ''اُڑان''، ''سرینگر ٹائمنز''، ''تسکین''، ''اذان سحر'' وغیرہ سینکڑوں روز نامے اور ہفتہ وار اخبارات شائع ہو رہے ہیں ان اخباروں میں ادبی تخلیقات تحقیقی وتنقیدی مضامین کالم وغیرہ بھی شائع ہوتے ہیں۔ حامدی کاشمیری محمد یوسف ٹینگ، پروفیسر ظہور الدین، عرش صہبائی، سلطان الحق شہیدی، ہمدم کاشمیری، رفیق راز، مظفر ایرج، شبیب رضوی کے علاوہ سینکڑوں شاعر اور ادیب اپنی نگارشات کے ذریعہ ریاست جموں وکشمیر میں اردو زبان اور شعر وادب کو پروان چڑھانے میں مصروف ہیں اور چونکہ اردو ریاست کی سرکاری، درباری، دفتری اور کاروباری زبان بھی ہے اور ذریعہ تعلیم بھی ہے۔ پوری ریاست میں ہزاروں اسکولوں اور کالجوں میں اور ریاست کی یونیورسٹیوں میں اردو تعلیم کا انتظام ہے۔ کشمیر، جموں اور لداخ میں ریڈیو اسٹیشن ہیں ٹیلی ویژن سینٹر ہیں جن سے اردو پروگرام نشر کئے جاتے ہیں۔

ایک اندازے کے مطابق اردو زبان وادب نے ڈیڑھ دوسو برسوں میں ہی ریاست جموں وکشمیر میں اتنی ہی ترقی کر لی ہے جتنی کہ برصغیر ہند کے دوسرے ادبی مراکز لاہور، حیدرآباد، دہلی، لکھنؤ وغیرہ میں۔ اردو زبان وادب کے فروغ وارتقا کے لیے ہندوستان کے تمام ادبی مراکز اور اداروں میں اردو زبان کی ساخت، اسالیب، اصناف، مزاج اور معیار کے نثر نگاروں نے پورا پورا فائدہ اٹھایا اسی لیے جموں وکشمیر میں اردو زبان وادب کے ارتقا کی رفتار تیز رہی۔ ریاست جموں وکشمیر میں اردو کو بعض مسائل کا سامنا ضرور ہے لیکن اس ریاست میں اردو کی جڑیں اتنی مضبوط ہیں کہ جموں وکشمیر میں اردو کا مستقبل شاندار اور محفوظ ہی نظر آتا ہے۔

کشمیر میں اردو شاعری کا آغاز ان کشمیری النسل فارسی شعرا کے ہاتھوں ہوا تھا جو اپنے علم وفضل کی بنا پر مغل درباروں سے وابستہ تھے۔ ان شعرا میں ملا محسن فانی، رسوا، قبول اور حشمت وغیرہ کا ذکر گذشتہ صفحات پر کیا جا چکا ہے۔ البتہ کشمیر (متحدہ) میں ہی سکونت پذیر جن شعرائے کشمیر میں اردو شاعری کی داغ بیل ڈالی ان میں شیخ غلام محی الدین کو اولیت حاصل ہے ان کی لکھی ہوئی مثنوی گلزار فقیر کشمیر کی پہلی شعری تخلیق مانی جاتی ہے اردو نثر کے آغاز وارتقا کے حوالے سے لالہ بوٹا، پنڈت ہرگوپال خستہ اور چودھری شیر سنگھ مہتہ کی نثری تحریروں کا ذکر

آتا ہےلیکن یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آیا جموں میں اردو کو ترقی کے مواقع زیادہ ملے۔اردو نثر کے آغاز و ارتقا کا تحقیقی جائزہ تفصیل چاہتا ہےاور یہ جائزہ شمالی ہند میں اردو نثر کے ارتقاء کے بعد ہی جموں وکشمیر میں اردو نثر کا آغاز ہوتا ہےاور دیگر ریاستوں میں سترہویں اٹھارہویں صدی میں اردو شاعری کے ساتھ ساتھ اردو نثر بھی ترقی کی منزلیں بڑی تیزی سے طے کرتی رہی تھی۔فورٹ ولیم کالج میں مختلف موضوعات پر تصنیف وتالیف اور ترجمہ کا کام بڑے پیمانے پر ہو چکا تھا اور اردو نثر کے ارتقا میں برق رفتاری آ چکی تھی۔میر امن کی ''باغ و بہار'' اور حیدر بخش حیدری کی ''آرائش محفل'' فورٹ ولیم کالج کے شاہکار کارنامے ہیں۔بعض اسباب کی بنا پر ۱۸۲۰ء میں فورٹ ولیم کالج بند ہو گیا لیکن سات سال کے بعد ۱۸۲۷ء میں ہندوستانیوں کو انگریزی علوم وفنون اور تہذیب وتمدن سے آشنا کرنے کے لیے کالج کا قیام عمل میں لایا گیا۔دلی کالج میں اردو نثر میں مختلف موضوعات پر مضامین اور کتابیں لکھوانے کا سلسلہ شروع ہوا۔حالی،محمد حسین آزاد، ڈپٹی نذیر احمد اور منشی ذکاءاللہ کی تربیت دلی کالج میں ہی ہوئی تھی جن کا شمار اردو کے چوٹی کے نثر نگاروں میں ہوتا ہے۔دلی کالج نے ارد صحافت کو بھی فروغ دیا۔۱۸۴۲ء میں دلی کالج میں ایک شعبہ ترجمے کا بھی قائم کیا گیا تھا جس کا نام ورنا کولر ٹرانسلیشن سوسائٹی تھا۔اس شعبہ کے تحت مختلف علوم وفنون سے متعلق جدید وقدیم سینکڑوں انگریزی،عربی فارسی اور سنسکرت کتابوں کا اردو نثر میں ترجمہ کیا گیا۔دلی کالج کے ماسٹر رام چندر اور منشی ذکاءاللہ نے علم ہیت، علم ریاضی اور دیگر موضوعات پر لکھی گئی انگریزی، فارسی کتابوں کے ترجمے کئے۔۱۸۵۷ء کے بعد سرسید تحریک کے تحت خود سرسید اور ان کے رفقائے کار حالی،شبلی،مولوی چراغ علی،منشی سجاد حسین،کرامت حسین وغیرہ اردو نثر کو ارتقا کی بلندیوں پر پہنچا چکے تھے۔اس عہد میں ریاست جموں وکشمیر کے مہاراجہ رنبیر سنگھ نہ صرف خود تعلیم یافتہ تھے بلکہ انگریزوں کے ساتھ ان کے اچھے تعلقات بھی تھے۔انھیں ہندوستان کے سیاسی حالات کے ساتھ ہی لسانی صورتحال کا بھی اندازہ تھا۔مہاراجہ رنبیر سنگھ ریاست جموں وکشمیر کے لوگوں کو بھی تعلیم یافتہ اور جدید علوم وفنون سے آشنا کروانے کے خواہش مند تھے۔قیاس ہے کہ وہ فورٹ ولیم کالج اور دلی کالج کے علمی وادبی کارناموں سے بھی واقف تھے۔مہاراجہ رنبیر سنگھ کا وزیر عظیم دیوان کرپا رام کئی فارسی کتب کا مصنف تھا اور انگریزی کے علاوہ اردو زبان میں بھی دسترس رکھتا تھا۔دیوان کرپا رام نے ہی ریاست کی انتظامی صورتحال کے بارے میں اردو میں رپورٹیں تیار کروائیں اور ان کی اشاعت کا اہتمام بھی کیا۔ان رپورٹوں کو ہی ریاست میں

اردو کے ابتدائی نثری نمونے کہا جاتا رہا ہے لیکن جدید تحقیق کے مطابق ''گلاب سنگھ کے عہد کے خاتمے سے پہلے بوٹا مل نامی ایک شخص نے ''چائے کی کاشت'' کے بارے میں ایک رسالہ ۱۸۵۷ء میں اردو میں لکھا تھا جو اردو کی پہلی نثری تحریر قرار دی جا سکتی ہے۔ مہاراجہ رنبیر سنگھ نے پریس قائم کیا۔ اسی نام سے پہلے اخبار سرکاری گزٹ کے طور پر جاری کیا گیا جو اردو اور دیوناگری زبانوں میں شائع ہوتا تھا۔ یہ اخبار اردو کی ترقی و ترویج کے لیے ایک اہم قدم تھا۔ بدیا بلاس پریس کے مالکان پنڈت بنکٹ رام شاستری اور پنڈت کھوجوشاہ تھے اور اخبار کے مدیر گوپی ناتھ گرٹو تھے یہ اخبار ہندی اور اردو میں نکلتا تھا۔ اختر الدولہ سیتاپوری ''اختر شہنشاہی'' میں اخبار بدیا بلاس کے بارے میں لکھتے ہیں:

> ''بدیا بلاس، جموں، ریاست کشمیر، ہفتہ وار، آٹھ ورق اوسط، یوم (اشاعت) شنبہ (اردو) ناگری مشترق، قیمت (سالانہ) بارہ روپے، مالک پنڈت بنکٹ رام شاستری مہتمم کھوجوشاہ از مطبع بدیا بلاس اجرا ۱۸۶۷ء۔''[1]

اُدھر سرکاری دارالترجمہ کے ذریعے سے سنسکرت اور فارسی میں ترجمہ شدہ کئی کتابیں شائع ہوئیں اور کئی کتابیں سنسکرت اور عربی فارسی سے اردو ہندی میں ترجمہ کروائی گئیں اس عہد کے کئی مسودے رنبیر لائبریری جموں میں موجود ہیں ان مسودات کی تیاری میں غلام غوث خاں، پنڈت بخشی رام، مولوی فضل الدین، لالہ بسنت رائے وغیرہ کے نام اہم ہیں۔ ان حضرات نے فن طب انجینئرنگ منطق، تاریخ، مذہبیات، کاغذ سازی اور اناٹومی جیسے موضوعات پر مسودات تیار کئے۔ یہ بات قابل ذکر ہے کہ مہاراجہ رنبیر سنگھ کے عہد تک ریاست جموں و کشمیر میں اردو عوامی زبان کی حیثیت حاصل کر چکی تھی۔ چنانچہ رنبیر سنگھ کے ایک عہد دار چودھری شیر سنگھ نے ۶۵-۱۸۶۴ء کے دوران بخارا اور سمرقند وغیرہ کا سفر کیا اور واپسی پر اس نے اپنا سفرنامہ اردو میں ہی تحریر کیا اس سفرنامہ کا شمار ریاست کی ابتدائی نثری تحریروں میں کیا جاتا ہے۔ ۱۵۰ صفحات پر مشتمل یہ سفرنامہ معلوماتی بھی ہے اور دلچسپ بھی۔ مہاراجہ رنبیر سنگھ ۱۸۸۵ء میں فوت ہو گیا اور مہاراجہ پرتاب سنگھ تخت نشین ہوئے۔ اس

---

[1] اختر الدولہ، اختر شہنشاہی، مطبوعہ اختر پریس لکھنؤ ۱۸۸۸ء بحوالہ کشمیری پر اردو کے اثرات از ڈاکٹر نذیر آزاد، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی، ۲۰۱۱ء

وقت تک اردو زبان لنگوافرینکا بن چکی تھی۔ چنانچہ پرتاب سنگھ نے اردو کی مقبولیت اورعوامی اور دفتری ضروریات کے پیش نظر ۱۸۸۹ء میں اردو کو ریاست کی سرکاری زبان کے منصب پر فائز کردیا۔ پرتاب سنگھ کے عہد کے ادیبوں میں اردو نثر کے حوالے سے پنڈت ہرگوپال خستہ کا نام سرفہرست ہے جس کا ذکر گذشتہ صفحات پر کیا جا چکا ہے۔لیکن چونکہ خستہ کشمیر میں اردو زبان وادب کے بنیادگزاروں میں سے ایک ہیں اس لیے ان کی ادبی کاوشوں کے بارے جاننا بھی ضروری ہے۔ ہرگوپال خستہ کشمیر الاصل تھے۔ملازمت کے حوالے سے خستہ کو لاہور، پٹیالہ اور شملہ میں رہنے کا موقع ملا۔ پنڈت ہرگوپال نے اپنا تخلص ''خستہ'' غالب کے شاگرد مرزا تفتہ کے اتباع میں اختیار کیا تھا۔ان کے پردادا پنڈت گواشہ کول سکھ دور میں کشمیر سے پنجاب چلے گئے تھے۔خستہ کے دادا پنڈت مہادیو کا شمار بھی شرفا میں ہوتا تھا۔والد پنڈت رام چندر کول شیو فلسفہ کے جانے مانے عالم تھے جن دنوں خستہ لاہور میں تھے ان کا رابطہ پنجاب کے ڈائریکٹر تعلیمات کرنل ہالرائڈ سے ہوا۔گلدستہ کشمیر کی اشاعت میں کرنل ہالرائیڈ کے تعاون کا اعتراف خستہ نے مذکورہ تصنیف کے آخیر میں ''خاتمۃ الکتاب'' کے عنوان سے مختلف افراد کا شکریہ ان الفاظ میں کیا ہے:

> ''گلدستہ کشمیر بہ نظر فیض اثر قدردان اہل علم و ہنر، فیض رساں......سخن پرور، فاضل اجل عالم اکمل، امیر دریا دل جناب فضیلت ماب لفٹنٹ کرنل ڈبلیو اہم ہالرائیڈ صاحب، ڈائریکٹر سرشتہ تعلیم پنجاب کی مدد سے زیور طبع سے آراستہ وپیراستہ ہوئی۔''[1]

کرنل ہالرائیڈ اردو دوست انگریز افسر تھے۔انھیں کی ایما پر محمد حسین آزاد نے ۱۵راگست ۱۸۶۷ء میں لاہور میں انجمن پنجاب قائم کی تھی۔ پروفیسر عبدالقادر سروری اور پروفیسر حامدی کاشمیری نے انجمن پنجاب کے قیام کا سال ۱۸۶۷ء ہی بتایا ہے لیکن بعض لوگوں نے ۸مئی ۱۸۶۴ء کو ہونے والے انجمن کے پہلے اجلاس کو ہی اس کی تاریخ قرار دیا ہے۔انجمن کا جو پہلا بڑا اجلاس ہوا اس میں کرنل ہالرائیڈ، مسٹر تھارنٹن سیکریٹری پنجاب گورنمنٹ، کرنل میکلاگن اور مسٹر مینگ وغیرہ انگریز افسران کے علاوہ اردو کے قلم کاروں میں صرف مولوی سیداحمد (مصنف فرہنگ آصفیہ) مولوی کریم الدین (مصنف خط تقدیر) رائے بہادر پیارے لال آشوب،

---

[1] دیباچہ گلدستہ کشمیر، از ہرگوپال خستہ، ص ۱۰، شاہین پبلشرز سرینگر، ۱۹۸۶ء

منشی درگاہ پرشاد نادر، پنڈت من پھول نواب عبدالمجید خاں اور فقیر سید قمرالدین کے نام دیے گئے ہیں۔ پنڈت ہرگوپال خستہ ان دنوں لاہور میں تھے لیکن انجمن پنجاب کے مذکورہ اجلاس میں شرکت کی تھی یا نہیں اس کا کوئی سراغ نہیں ملتا۔ البتہ ڈاکٹر برج پریمی کے مطابق قیام لاہور کے دوران وہ (خستہ) راوی ریفارمر، خیر خواہ کشمیر اور دیش کی پکار جیسے اخبارات ورسائل سے وابستہ رہ چکے تھے۔ وہ انجمن کی کارکردگیوں اور اس عہد کے نئے خیالات وتصورات سے واقف تھے۔ اس زمانے میں سرسید تحریک کے زیر اثر اردو میں تعمیری شاعری کے ساتھ ساتھ نثر میں تاریخ، جغرافیہ، سوانح عمری، تنقید وتحقیق سائنس، زراعت اور فلسفہ جیسے موضوعات کو ترجیح دینے کا رجحان عام ہو چکا تھا۔ مقصد عوام میں روشن خیالی پیدا کرنا تھا۔ اس مقصد کے تحت سوامی دیانند سرسوتی نے بھی ۱۸۷۵ء میں آریہ سماجی تحریک شروع کی تھی۔ چنانچہ ان دونوں تحریکات نے ہندوستانی معاشرت ثقافت اور شعرو ادب میں جو جدید رجحانات پیدا کیے اس کا اندازہ اس زمانے کے اردو، ہندی اور بنگلہ شعروادب سے بخوبی لگایا جا سکتا ہے۔ چنانچہ اسی جدید ادبی وثقافتی صورت حال میں کشمیر کے اردو ادیب ہرگوپال خستہ نے بھی جغرافیہ، تاریخ، سوانح عمری اور اصلاحی قصہ نویسی کی جانب توجہ دی حالانکہ بقول مرتب ''بہار گلشن کشمیر'' خستہ بنیادی طور پر شاعر تھے۔ ان کی شاعری کا ذکر پروفیسر عبدالقادر سروری نے اپنے ایک مضمون مطبوعہ ''نیا دور'' ۱۹۶۵ء لکھنؤ میں کیا ہے، لیکن خستہ نے تقاضائے وقت کے مطابق نثر نگاری کو اپنا شعار بنایا۔ اپنی نثری تصنیفات کے بارے میں پنڈت ہرگوپال خستہ نے ''گلدستہ کشمیر'' کے دیباچے میں خود لکھا ہے:

> ''۱۹۳۱ء بکرمی (مطابق ۱۸۷۴ء) میں اس ناچیز نے ایک مختصر جغرافیہ کشمیر کا لکھا تھا جو کہ مطبع بہار کشمیر لکھنؤ میں چھپا تھا اس کے نامکتفی ہونے کے باعث دل کو یہ شوق پیدا ہوا کہ ''تواریخ کشمیر'' زبان اردو میں جو کہ فی زمانہ مروج اور زود فہم ہے۔ بشمول جغرافیہ کشمیر جواب تک ہندوستانی زبانوں یا فارسی میں کسی نے نہیں لکھا، ایسا تیار کروں جس کے پڑھنے سے ناظرین کو سطح کشمیر کا حال اس طرح پر معلوم ہو سکے گویا وہ کشمیر میں پھر کر میسر کر رہے ہیں۔ اسی غرض سے بامداد پنڈت وامودر صاحب (جو اس وقت فضیلت ولیاقت کے باعث سپہر علم سنسکرت کے آفتاب

ہیں) کتاب لاجواب راج ترنگنی مصنفہ کلہن پنڈت کو جو کہ معتبر اور پرانی تواریخ کشمیر نارائن کول اور بیربل کاچرو ومرزا حیدر وگلزار کشمیر وسفر نامہ داین صاحب مورکرافٹ صاحب سانسز گائڈ جموں وکشمیر مصنفہ ڈریو صاحب ونار درن باربر و تاریخ فرشتہ وغیرہ کتب از سرتا پا دیکھا اور بعض ضروری مقامات ''نیل مت پران'' وشارکا مہاتم'' وتستا مہاتم وسوئم مہاتم کو پنڈت صاحب موصوف کی زبانی بخوبی سنا بہت سے اطراف و اکناف کو بچشم خود دیکھا اور محسن آدمیوں سے بہت سی باتیں تحقیق کیں اور ۱۸۳۴ء بکرمی (۱۸۷۷ء) میں بڑی احتیاط کے ساتھ بلا مبالغہ بہ ترک فضول نسخہ ہذا لکھ کر تین حصوں میں تقسیم کیا اور نام ''گلدستہ کشمیر'' رکھا۔ باقی احوال مفصل اس عبودیت کا کتب مولفہ بندہ گو پاہ نامہ چہار گلزار شگفتہ بہار۔ مخزن خستہ معروف بہ 'گل بہار' سوانح عمری خستہ وغیرہ میں درج ہیں۔''[1]

مندرجہ بالا اقتباس جو ''گلدستہ کشمیر'' کے دیباچے سے ماخوذ ہے اس سے کئی اہم باتیں سامنے آتی ہیں:

(۱) اس زمانے (۱۸۷۳ء) کے آس پاس اردو دوسری زبانوں کے مقابلے میں زیادہ ''مروج'' اور زود فہم زبان تھی۔

(۲) ''گلدستہ کشمیر'' محض تاریخ نہیں بلکہ کشمیر کی جغرافیائی تاریخ ہے اس اعتبار سے ایک منفرد تصنیف ہے Geography of Jammu کے نام سے پروفیسر ماجد حسین نے ۱۹۸۵ء میں جو کتاب ترتیب دی ہے اس کے اکثر مضامین سے گلدستہ کشمیر میں فراہم کردہ معلومات کی تصدیق ہوتی ہے۔

(۳) گلدستہ کشمیر کی تخلیق کے وقت خستہ نے اس وقت تک دستیاب کشمیر کی تمام اہم تاریخی کتابوں، سفر ناموں اور رپورٹوں سے استفادہ کیا ہے۔ گر چہ خستہ نے اپنے دیباچے میں اس کا اعتراف نہیں کیا

---

[1] دیباچہ گلدستہ کشمیر از ہر گوپال خستہ، ص ۱۱، ناشر شاہین پبلشرز سری نگر، ۱۹۸۶ء

ہے لیکن گلدستہ کشمیر میں فریڈرک ڈریو کی کتاب Jammu and Kashmir Terretoria (مطبوعہ ۱۸۵۷ء) میں جموں وکشمیر کے جغرافیہ آب و ہوا، موسم، کوہ بیاباں، جھیلوں اور چشموں سے لے کر ریاست کی مختلف قوموں اوران کے رسوم ورواج تہوار اوراہل کشمیر کے مزاج، فطرت اور خط وخال وغیرہ کے بارے میں جوتفصیلات بیان کی ہیں کہا جا سکتا ہے کہ خستہ نے ان سے خوب خوب استفادہ کیا ہے لیکن چونکہ یہ تفصیلات عمومی ہیں اور اکثر و بیشتر مورخین نے ان کا ذکر کیا ہے اس لیے سرقہ تو نہیں کہا جا سکتا البتہ اظہار و بیان میں مبالغہ اور تعصب کے عناصر کی نشاندہی کی جا سکتی ہے۔

(۴) خستہ نے راج ترنگنی کو معتبر تواریخ کشمیر قرار دیا ہے جب کہ کئی دانشوروں نے راج ترنگنی کو تصورات اور مفروضات پر مبنی افسانوی تاریخ بھی قرار دیا ہے۔

(۵) عام طور پر گوپال خستہ کی اردو تصنیف کے طور پر صرف گلدستہ کشمیر کا نام لیا جاتا ہے۔ لیکن خستہ کے مذکورہ بالا اقتباس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کی تصنیفات کئی ہیں۔ مختصر جغرافیہ کشمیر، گلدستہ کشمیر، گوپال نامہ، چہار گلزار، شگفتہ بہار، مخزن خستہ معروف بہ گل بہار۔ سوانح عمری خستہ ڈاکٹر برج پریمی نے اپنی کتاب ''جموں کشمیر میں اردو ادب کی نشوونما'' میں ہرگوپال خستہ کی ایک اور تصنیف ''گلزار فوائد'' کا ذکر کیا ہے اور لکھا ہے کہ یہ دراصل ایک قصہ جس میں ڈپٹی نذیر احمد کے مراۃ العروس کا تتبع کیا گیا ہے۔ اسلوب سلیس اور واضح ہے کہیں کہیں مقفیٰ اور مسجع عبارت کا التزام کیا گیا ہے۔

اس اعتبار سے ہرگوپال خستہ ریاست جموں وکشمیر کے پہلے ادیب ہیں جنھوں نے اردو کے نثری سرمایہ میں مستقل اضافہ کیا۔ ''گلدستہ کشمیر'' میں زمانہ قدیم سے لے کر مہاراجہ پرتاب سنگھ کے عہد تک کی ریاست کی تاریخ پیش کی گئی ہے۔

ہرگوپال خستہ کے نثری کارناموں میں ان کے انشائیے اور تحقیقی وتنقیدی مضامین بھی شامل ہیں۔ خستہ چونکہ ایک طویل عرصہ تک ریاست سے باہر لاہور میں قیام پذیر رہے اس لیے انہوں نے لاہور میں ہی رہ کر کئی اخبارات اور رسالے بھی جاری کئے اور کئی پرچوں کے ساتھ وابستہ بھی رہے۔ مثلاً ''ریفارمر''، ''خیر خواہ کشمیر'' اور ''دیش کی پکار'' وغیرہ۔ آخری عمر میں خستہ کشمیر واپس آ کر پہلے مہاراجہ رنبیر سنگھ اور پھر پرتاب سنگھ کے ساتھ

وابستہ ہو گئے۔ افسوس کا مقام ہے کہ خستہ کے نثری کارناموں پر پروفیسر عبدالقادر سروری اور پروفیسر قدوس جاوید کے علاوہ کسی نے توجہ نہیں دی ہے۔

اردو نثر کے حوالے سے ابتدائی دور میں ہرگوپال خستہ کے بعد ان کے چھوٹے بھائی پنڈت سالک رام سالک کا نام آتا ہے۔ سالک بھی اپنے بھائی کی طرح صاحب قلم تھے اور لاہور میں ہی رہتے تھے۔ سالک ''خیر خواہ کشمیر'' اور ''اودھ اخبار'' لکھنؤ اور اس دور کے دیگر اخبارات و رسائل میں تواتر کے ساتھ مضامین شائع کرواتے تھے۔ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے بعد چونکہ انگریزوں کے حوصلے بلند ہو گئے تھے اور وہ پورے ہندوستان میں اپنی تہذیب، زبان اور مذہب کی توسیع کے لیے اقدامات کرنے لگے تھے۔ لہٰذا اس عہد میں عیسائی مشنریوں اور مبلغوں کی آمد کا سلسلہ بھی شروع ہو گیا۔ عیسائیت کی تبلیغ کے عمل نے ہندوستان کے تعلیم یافتہ ہندوؤں اور مسلمانوں میں تشویش پیدا کر دی تھی اور عوام کو گمراہ ہونے سے روکنے کے لیے ادیبوں اور دانشوروں نے عیسائیت کے خلاف مضامین اور کتابچوں کی اشاعت شروع کی اور مغربیت کی آندھی کو روکنے کے لیے مشرقیت کی عظمت اور انفرادیت سے عوام کو آشنا کرنے کی کوششیں شروع کیں۔ ہندوستان میں سرسید تحریک آریہ سماجی تحریک وغیرہ اسی صورت حال کی پیداوار ہیں سالک رام سالک نے بھی عیسائیت کی مخالفت اور ہندو دھرم کی حمایت میں متعدد مضامین لکھے اور کتابیں تصنیف کیں۔ رنبیر سنگھ کے دور حکومت میں سالک بھی اپنے بھائی ہرگوپال خستہ کے ساتھ کشمیر آ گئے تھے۔ مہاراجہ پرتاب سنگھ کے برسر اقتدار آنے کے بعد جموں میں سرکاری سرپرستی میں ''سناتن دھرم سبھا'' قائم ہوئی جس کے زیر اہتمام عیسائیت کے خلاف کئی کتابچے لکھے گئے۔ سالک نے بھی کئی کتابیں اور کتابچے اردو میں ہی ترتیب دئے جن کا ذکر گذشتہ صفحات پر کیا چکا ہے۔

اس کے علاوہ سالک نے بڑی تعداد میں مضامین لکھے۔ جن کا ذکر تو ملتا ہے لیکن دستیاب نہیں ہیں سالک کا ایک قصہ ''داستان جگت روپ'' کے نام سے ہے جو شائع نہ ہو سکا اور جسے کچھ لوگوں نے ناول بھی مانا ہے۔ سالک کی ایک اور ادبی تصنیف ''گنجینۂ فطرت'' کے نام سے بھی شائع ہوئی۔ ''تحفۂ سالک'' نام کا ایک سفرنامہ بھی سالک سے منسوب ہے سالک رام سالک کی ایک یادگار تصنیف ''رنبیر پینل کوڈ'' قانون تعزیرات جموں وکشمیر آج بھی مقبول ہے اس کے علاوہ مجموعہ ضابطہ دیوانی قانون رجسٹری اور کئی دیگر قانونی دستاویزات کی شرحیں بھی سالک نے لکھی ہیں۔ سالک رام سالک کے مضامین انقلاب اور اودھ اخبار میں بھی شائع ہوتے رہتے تھے۔

انیسویں صدی کے آخر اور بیسویں صدی کے اوائل میں ریاست جموں وکشمیر کے کئی شاعروں اور نثر نگاروں کی تخلیقات لاہور، امرتسر، الہ آباد اور لکھنؤ کے اخبارات میں شائع ہوتی تھیں۔ جموں وکشمیر کے حالات کے بارے میں خبریں بھی لاہور کے اخبارات میں لگاتار شائع ہوتی تھیں۔ اس ضمن میں خاص طور پر مولانا غلام رسول مہر اور عبدالمجید سالک کا اخبار ''انقلاب'' سب سے آگے تھا۔ روزنامہ ''انقلاب'' ۱۹۲۷ء میں مولانا مہر اور سالک نے لاہور سے جاری کیا تھا اور جب ۱۹۳۱ء میں شیخ محمد عبداللہ کی قیادت میں کشمیر (متحدہ) کی آزادی کی تحریک شروع ہوئی تو ''انقلاب'' کے صفحات کشمیر کے حالات وکوائف کے لیے وقف رہنے لگے۔ انگریزی حکومت نے انقلاب کے مدیران کو ان کی کشمیر نوازی کے لیے طرح طرح سے تنگ کرنا شروع کیا۔ پانچ ہزار کی ضمانت طلب کی اور پھر کشمیر میں اخبار ''انقلاب'' کا داخلہ بند کر دیا گیا۔ اس پر ادارہ انقلاب نے ''مظلوم کشمیری''، ''مکتوب کشمیر'' اور ''مظلوم'' کے نام سے اخبار نکالے لیکن ڈوگرہ حکومت ان پر پابندیاں عائد کرتی چلی گئی۔ ان اخبارات میں کشمیر، جموں اور لاہور کے کشمیری ادیبوں اور دانشوروں کے مضامین لگاتار شائع ہوتے رہتے تھے۔ لاہور میں مقیم مشہور کشمیری ادیب اور دانشور محمد الدین فوق نے اردو نثر میں کئی یادگار تصانیف چھوڑی ہیں مثلاً تاریخ اقوام کشمیر، اکبر، انارکلی، خواتین کشمیر وغیرہ۔ محمد الدین فوق نے مہاراجہ رنبیر سنگھ کے زمانے میں ریاست سے اخبار نکالنے کی اجازت کئی بار مانگی لیکن انہیں اجازت نہیں ملی۔ فوق نے لاہور سے ایک اخبار ''کشمیری'' کے نام سے جاری کیا جس میں وہ خود بھی لکھتے تھے اور دوسروں سے بھی لکھواتے تھے۔ اخبار ''کشمیری'' میں اکثر علامہ اقبال کا کلام بھی شائع ہوتا تھا۔ کشمیر کے عظیم شاعر مہجور اپنی اردو نثری تصنیف ''حیات رحیم'' (مطبوعہ ۱۹۲۲ء) میں فوق کے بارے میں لکھتے ہیں:

> ''فوق کا نام کشمیر جدید کی تاریخ میں مورخ آب زر سے لکھیں گے جس نے صدہا میل اپنے وطن ''قدیم کشمیر'' سے دور رہ کر اپنے پس ماندہ اہل خطہ بھائیوں کو خواب غفلت سے بیدار کرنے اور اس خطہ مہر یر کے منجمد اور ساکن خون کو حرکت وحرارت میں لانے کے لیے اخبار ''کشمیری'' جاری کیا۔''[1]

[1] مہجور، حیات رحیم ۱۹۲۲ء، ص ۹

محمد یوسف ٹینگ نے ''حیات رحیم'' کو اہل کشمیر کی پہلی اردو نثری تخلیق قرار دیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''ہر گوپال خستہ کی تصنیف ''گلدستہ کشمیر'' کو اس لحاظ سے پہلی اردو کتاب تسلیم نہیں کیا جا سکتا۔ کیونکہ خستہ نے اپنی زندگی کا بیشتر حصہ پٹیالہ میں بسر کیا تھا۔ پھر وہ کشمیری زبان بے ساختگی سے بولنے کا بھی متحمل نہیں تھا اسی طرح فوق اگرچہ کشمیری تھے لیکن ان کی پیدائش پنجاب میں ہوئی تھی وہ بھی بعض روایات کے مطابق کشمیری زبان بولنے کی اہلیت سے محروم تھے۔ لہٰذا مہجور کو یہ سعادت نصیب ہوئی وہ وطن عزیز کا پہلا فرزند تھا جس نے ایک مکمل اور مدلل اردو کتاب تحریر کی۔[1]

یہاں یہ بات بھی قابل توجہ ہے کہ علامہ اقبال بھی کشمیری نژاد تھے۔ ان کی پیدائش بھی کشمیر میں نہیں پنجاب کے شہر سیالکوٹ میں ہوئی تھی اور یہ بھی طے ہے کہ علامہ اقبال کو کشمیری نہیں آتی تھی اس کے باوجود ہر کشمیری اقبال کو نہ سرف کشمیری مانتا ہے بلکہ اس پر فخر بھی کرتا ہے یہاں تک کہ جموں و کشمیر کا تعلیم یافتہ طبقہ منٹو، ساحر لدھیانوی اور میرا جی کے کشمیر النسل ہونے پر ناز کرتا ہے۔ گلوبلائزیشن اور کمپیوٹر لینگوتیج کے اس دور میں کسی کشمیری نژاد شخص کو محض اس وجہ سے کشمیری ماننے سے انکار کرنا کہ وہ کشمیر میں پیدا نہیں ہوا اور وہ کشمیری بولنے کی اہلیت نہیں رکھتا ہے ایک نا قابل قبول عمل ہوگا دنیا کے مختلف ممالک میں لاکھوں ایسے کشمیر النسل لوگ ہیں جو نہ تو کشمیر میں پیدا ہوئے اور نہ ہی وہ کشمیری زبان بے ساختگی سے بولنے کی اہلیت رکھتے ہیں پھر بھی سوال یہ ہے کہ کیا ان کو کشمیری ماننے سے انکار کرنا مناسب ہوگا۔

اگر غیر افسانوی نثر پر نظر ڈالیں تو بیسویں صدی کے اوائل میں جموں کشمیر سے ایک اہم نام غلام احمد مہجور کا آتا ہے۔ مہجور نے ۱۲۸ صفحات پر مشتمل صفاپور کے ایک بزرگ ولی رحیم صاحب قلندر کی سوانح عمری ''حیات رحیم'' کے نام سے لکھی جو ۱۹۲۲ء میں شائع ہوئی۔ ''تذکرہ شعرائے اردو'' مہجور کا ایک اور نثری کارنامہ ہے لیکن یہ کتاب شائع نہ ہو سکی۔ مہجور کے پوتے ابدال مہجور دعویٰ کرتے ہیں کہ اس کتاب کا قلمی نسخہ ان کے پاس محفوظ ہے۔ اس مسودے میں چار سو دس صفحات ہیں اس میں کشمیری شاعری کو تین ادوار میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔

---

[1] محمد یوسف ٹینگ، مہجور شناسی، ص ۲۹، ناچر کلچرل اکادمی سرینگر ۱۹۸۷ء

(۱) ایک ہزار ہجری تک کے شعراء کا عہد

(۲) ۱۰۰۰ھ سے ۱۲۲۹ھ تک کے شعرا کا عہد۔

(۳) ۱۲۳۰ھ سے ۱۳۱۳ھ تک کے شعرا کا عہد۔

مہجور کا ایک اور مختصر مسودہ ''آئینہ اتحاد'' بھی ہے جس میں ۱۹۳۱ء میں ریاست کے بعض علاقوں میں پھوٹ پڑنے والی فرقہ واریت کی مذمت کی گئی ہے اور فرقہ وارانہ اتحاد پر زور دیا گیا ہے۔ مہجور نے ''کلام شیخ نورالدین ریشی کا مسودہ بھی تیار کیا اور مسودے کے آغاز میں لکھا ہے کہ خدا کا شکر ہے کہ راقم الحروف کو خدا نے شیخ نورالدین ریشی کے کلام کو جمع کرنے کی توفیق بخشی اور آج مورخہ اول ماگھ ۲۰۱۸ء مسودہ مکمل کرتا ہوں۔

مہجور نے ''سفر نامہ لداخ'' کے عنوان سے بھی ایک مسودہ تیار کیا تھا۔ محمد یوسف ٹینگ نے اپنی کتاب ''مہجور شناسی'' میں لکھا ہے کہ یہ سفر نامہ لداخ اور کرگل کے ۱۹۰۹ء کے بندوبست سے متعلق ہے اور یہ مسودہ سفر نامہ بلستان کے عنوان سے شائع ہو چکا ہے۔ ابدال مہجور شاعر کشمیر کے ایک اور غیر مطبوعہ مسودے کا ذکر کرتے ہیں جس کا عنوان ''انقلاب کشمیر'' ہے۔ یہ مسودہ جان محمد آزاد کے مطابق چالیس صفحات پر مشتمل ہے۔

اس کے علاوہ مہجور نے ''سوانح حبہ خاتون'' کے عنوان سے بھی ایک کتاب تیار کی تھی۔ اس کے علاوہ بیسویں صدی کے اوائل میں ریاستی حکمرانوں کے ظلم و جبر اور عوام کے عبرتناک مسائل سے متعلق مہجور نے ایک روائداد بھی لکھی تھی۔ ۱۹۳۱ء میں کشمیر میں تحریک آزادی کی شروعات میں اس روائداد کا بھی بڑا ہاتھ دیا ہے اس روائداد کی نثر صاحب شستہ اور عام فہم ہے مہجور نے کشمیری زبان و ادب سے متعلق ایک مضمون ہفت روزہ ''البراق'' میں ابو رشید کاشمیری کے نام سے شائع کروایا تھا۔ جان محمد آزاد کے مطابق مہجور نے ''پٹواری'' کے نام سے ایک کتابچہ بھی لکھا تھا اور ایک ناول ''عزیز'' (نام سے) بھی مہجور سے منسوب ہے غرض یہ کہ کشمیر میں شاعر کشمیر مہجور کے اردو نثر کے فروغ و ارتقا میں اہم کردار کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

ریاست جموں و کشمیر میں غیر اردو نثر کے حوالے سے شورش کاشمیری کا ذکر بھی ناگزیر ہے شورش بنیادی طور پر شاعر تھے لیکن تحریک کشمیری کے آغاز کے دنوں میں لاہور سے اخبار چٹان نکالتے تھے کشمیر سے متعلق ان کی نظموں اداریوں اور مضامین کو فراموش نہیں کیا جا سکتا شیخ محمد عبداللہ نے آتش چنار میں شورش کاشمیری کو بڑی محبت اور عقیدت سے یاد کیا ہے۔

کشمیر میں اردو کو فروغ دینے میں یہاں کی کئی ادبی انجمنوں اور ریاستی یونیورسٹیوں (جموں یونیورسٹی، کشمیر یونیورسٹی) کا بھی ہاتھ رہا ہے اس کے لیے حقیقت کا علم ہونا ضروری ہے کہ سرکاری سرپرستی کے ساتھ ساتھ اردو کو عوامی سطح پر بھی مقبولیت حاصل رہی ہے۔ یہ وہ واحد زبان تھی جس میں عام پڑھے لکھے لوگ نہ صرف اپنے خیالات پیش کرتے تھے بلکہ زبان اور اسی زبان کا ادب بھی ان کے مطالعہ میں رہتا تھا۔

آزادی سے پہلے وادی کے ساتھ ساتھ جموں میں جن شاعروں اور ادیبوں کے نام برصغیر کے اردوداں طبقوں میں جانے پہچانے تھے وہ بھی اردو ہی لکھا کرتے تھے۔ان میں رامانند ساگر، پروفیسر نندکول طالب، پریم ناتھ پردیسی، پریم ناتھ در، کنول نین پرواز، شہہ زور کاشمیری، شوریدہ کاشمیری، محمد الدین فوق، محمد عمر نورالہٰی۔ غ۔م۔ طاؤس، غلام رسول نازکی، عبدالحق برق قیصر قلندر اور کئی شعراء اور ادبا نے آزادی سے پہلے ریاست جموں وکشمیر میں اردو کو فروغ ہی نہیں دیا بلکہ کم از کم مذکورہ فنکار پنجاب اور دلی کے اردوداں طبقوں میں بھی مقبول ہو چکے تھے۔

جب تک تقسیم ملک کے بعد ابھرنے والے اردو شعرا و ادباء کا ذکر نہ کیا جائے تو جموں وکشمیر میں اردو زبان وادب کے فروغ وارتقاء کا کوئی بھی مکمل جائزہ نہ ہوگا۔اس دور مین شمیم احمد شمیم، حامدی کاشمیری، محمد یوسف ٹینگ، اکبری حیدری، اکبر لداخی، پشکر ناتھ، تیج بہادر بھان مخمور بدخشی، غلام نبی خیال سلطان الحق شہیدی، حکیم منظور، ہمدم کاشمیری، پرتپال سنگھ بیتاب، آنند لہر، خالد حسین، نور شاہ، رفیق راز، بلراج بخشی، اکبر جے پوری، وریندر پٹواری، محمد زماں آزردہ اور دوسرے فنکاروں نے اردو کی آبرو بنائے رکھی اور اپنی لگن، محنت اور خلوص سے چند ہی برسوں میں ریاست کی اردو ادب کی تاریخ میں اپنے نئے انداز بیان، نئے افکار، نئے موضوعات اور نئے ولولوں کے ساتھ جموں وکشمیر کے اردو ادب کو ملک کے دوسرے حصوں کے ہم عصر اردو ادب کے قریب لا کھڑا کیا یہ فضا ۱۹۶۰ تک اپنے شباب پر رہی بعد میں ملک گیر پیمانے پر ادب میں تحریکوں کے ابھرنے کے ساتھ ساتھ وادی کے لکھنے والوں پر بھی براہ راست اثر ہوا۔ یوں کہنہ مشق لکھنے والوں کے ساتھ ساتھ کچھ نئے نام سامنے آنے لگے ان میں فاروق نازکی، فرحت گیلانی، صادق علی سیر، ہردے کول بھارتی، نور شاہ، بنسی نردوش وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

موجودہ دور کے شعراء وادباء اور محققین وناقدین میں ریاست جموں وکشمیر میں اردو زبان وادب کی

آبیاری کرنے والوں کے یہاں سینکڑوں نام ہیں جن کو اس باب میں تفصیلاً بیان کرنا مشکل ہے البتہ مذکورہ قلم کاروں کے تذکرے کے بغیر یہ کام کسی بھی طرح مکمل تصور نہیں کیا جائے گا۔ ان میں کئی کہنہ مشق نام آور اور نوجوان مصنفین کی ایک دلفریب کہکشاں (فہرست) ہے جو بیسوی صدی کی آخری دہائیوں سے لے کر آج اکیسویں صدی کی پہلی اور دوسری دہائی میں بھی اردو زبان اور ادب کی آبیاری اپنے خون جگر سے کر رہے ہیں۔ موجودہ دور میں ریاستی زبان و ادب کے فروغ دینے والوں میں سیفی سوپوری، مظفر ایرج، ہمدم کاشمیری، مخمور بدخشی، طاہر مضطر، غلام نبی خیال، عرش صہبائی، عابد مناوری، حامدی کاشمیری، قاضی غلام، ریاض پنجابی، بشیر کلد یپ، شجاع سلطان، ظہور الدین، محمد علی حسینی، غلام رسول ملک، شہباز راجوری، صابر مرزا، شبنم قیوم، ترنم ریاض، قدوس جاوید، رخسانہ جبیں، شفیقہ پروین، عارفہ بشریٰ، نور شاہ، محمد یوسف ٹینگ، فرید پربتی، شفق سوپوری، قاسم سجاد یوسف عاجز، جی۔ ایم آجر، نذیر ملک، شہاب عنایت ملک، محمد ریاض احمد، ضیاء الدین احمد وغیرہ کے نام سرفہرست ہیں۔

غرض یہ کہ جموں وکشمیر میں اردو زبان کی تشکیل کا عمل اس ریاست میں مسلم دور حکومت کے قیام اور فارسی داں اولیا کرام کی آمد کے بعد شروع ہو گیا تھا اور ڈوگرہ حکومت کے قیام تک آکر اردو میں شعری اور نثری تخلیقات کی پیش کش کا سلسلہ بھی شروع ہو گیا۔ ۱۸۸۸ء میں اردو کو ریاست کی سرکاری زبان کا درجہ دیئے جانے کے بعد سے ۱۹۴۷ء تک کشمیر کے شاعروں اور ادیبوں نے اردو شعر و ادب کے سرمائے میں ہر پہلو سے اضافہ کیا اور آج ریاست میں اردو زبان و ادب کی صورت حال بعض خامیوں کے باوجود اتنی ہمہ جہت اور اطمینان بخش ہے کہ جموں وکشمیر کو بھی دہلی، لکھنؤ، لاہور، کراچی، عظیم آباد وغیرہ کی طرح اردو کا ایک اہم مرکز مانا جاتا ہے۔ اور یہاں اب دیگر ریاستوں کی طرح تیز رفتاری سے اردو زبان و ادب کی ترقی اور فروغ کے لئے کام ہو رہا ہے

ریاست جموں وکشمیر میں اردو ناول کی روایت

ریاست جموں وکشمیر اپنے قدرتی حسن، رعنائی اور فطرت کی جادوگری کی بدولت سارے عالم میں مشہور ہی نہیں بلکہ منفرد مقام ومرتبہ بھی رکھتی ہے اس خطہ کو جنت ارضی یا خلد ارضی کا نام دیا جاتا ہے۔ جموں وکشمیر اپنے دلفریب حسن اور فطری دلکشی کے باعث اردو ادب کا ایک مستقل موضوع ہے یہاں صدیوں سے ہونے والے ظلم وجبر اور خطۂ رنگ ونور کے باسیوں کی ناقابل بیاں حالت نے حساس ادیبوں اور شاعروں کو سوچنے پر مجبور کیا ہے ایک کامیاب ناول نگار کی یہ خاصیت بھی ہوتی ہے کہ وہ زندگی اور سماج سے قریب تر ہو سرزمین کشمیر ان موضوعات کو اپنے دامن میں بحسن وخوبی سمیٹے ہوئے ہے جو ہر احساس ادیب کے ذہن وقلم کا سبب بنتے آئے ہیں اردو ناول چونکہ ایک وسیع کینوس کا حامل ہے تو زندگی کے تمام پہلوؤں کا احاطہ بھی کرتا ہے ادب سے وابستگی رکھنے والے مقامی ادیبوں نے بھی اس صنف کو ذریعہ اظہار بنایا اور کامیاب ناول دیئے۔ یہاں کے شعراء وادباء نے ابتداء سے ہی قریب قریب تمام ادبی اصناف میں اپنے قلم کے جوہر دکھائے ہیں۔ اس کے علاوہ اردو کی تمام تحریکوں اور رجحانوں کا بھی خیال رکھا۔ جموں وکشمیر میں اردو ناول نگاری پر طبع آزمائی کرنے والوں کی بھی اچھی تعداد ہے جنھوں نے اردو ادب کو عمدہ ناول عطا کئے ہیں۔

ریاست جموں وکشمیر میں اردو زبان جس طرح بہت تاخیر سے قدم رکھتی ہے اس طرح اردو ناول بھی بیسویں صدی میں اور تاخیر سے جنم لیتا ہے ریاست جموں وکشمیر میں اردو ناول کی تاریخ بہت زیادہ پرانی نہیں ہے اس کی کئی وجوہات ہوسکتی ہیں زیادہ تر ادیب پریم چند سے متاثر ہوکر افسانے لکھتے رہتے اور افسانے ہی میں ان کی دلچسپی بنی رہی۔ پھر جس طرح ہندوستان انگریزوں کے قبضے میں تھا اور یہاں کے لوگ انگریزوں اور جاگیردارانہ طبقے کے ظلم کے خلاف لڑ رہے تھے کچھ ایسی ہی صورتحال کشمیر کی بھی تھی۔ جہاں ہندوستان پر انگریزوں کا ظلم حاوی تھا وہیں کشمیر میں ڈوگرہ خاندان اپنی قوت کا استعمال کر سکا کشمیریوں کو تشدد کا نشانہ بنا رہے تھے۔ اس ظلم کے خلاف آواز اٹھانے کے لئے ادب میں افسانے سے بہتر کوئی صنف نہیں۔ اس لئے یہاں کے

ادیبوں کا رجحان ناول کی بہ نسبت افسانے کی طرف زیادہ رہا۔ پھر یہاں سے کوئی اخبار بھی شائع نہیں ہوتا تھا جس میں ریاست جموں وکشمیر کے ناول نگار اپنے ناول لکھ کر شائع کرواتے۔ اخبارات ورسائل ہی کے ذریعے اس وقت ناولوں کی قسط وار اشاعت ہوتی تھی لیکن چونکہ جموں کشمیر میں اس وقت تک اخبارات ورسائل نہیں نکلتے تھے اس لئے ادیبوں نے اس صنف کی طرف توجہ نہیں کی۔ پھر جب یہاں سے اخبارات ورسائل شائع ہونے کا سلسلہ شروع ہوا تو یہاں کے ادیبوں نے ناول بھی قسط وار شائع کروانا شروع کیا ڈاکٹر برج پریمی لکھتے ہیں:

''اردو کے بیشتر ناول نگاروں کے ناول عرصہ دراز تک اخبارات اور رسائل میں قسط وار چھپتے رہے ہیں...... کتنے ہی رسائل نے کتنے ہی ناولوں کو کتابی صورت میں شائع ہونے سے قبل اپنے دامن میں سمیٹ لیا۔ ہمارے فنکار اس وقت اس صنف کی طرف متوجہ ہوئے جب جموں خطے سے ریاست کا پہلا اخبار ''رنبیر'' شائع ہونے لگا۔''[1]

بے شک ریاست جموں وکشمیر میں اردو ناول کا آغاز بہت بعد میں ہوا ہے یہاں ناول کی روایت کوئی زیادہ پرانی نہیں ہے لیکن یہاں پھر بھی ناول نگاروں نے جو ناول تخلیق کئے ہیں وہ کئی اعتبار سے اہمیت کے حامل ہیں اگر چہ فن کے اعتبار سے جموں وکشمیر میں لکھے گئے اردو ناول اتنے معیاری نہیں ہیں لیکن پھر بھی جس فنکاری اور انداز سے یہاں کے ناول نگاروں نے ناول لکھے ہیں وہ کشمیر کی ناول نگاری کی تاریخ میں بیش قیمت اضافہ ہے اگر تعداد کے اعتبار سے دیکھا جائے تو بھی انہیں انگلیوں پر شمار کیا جاسکتا ہے لیکن خوبی کے لحاظ سے یہ ناول مایوس کن نہیں ہیں۔ ریاست جموں وکشمیر میں لکھے گئے ناولوں کے فن کی طرف اشارہ کرتے ہوئے منصور احمد لکھتے ہیں:

''یہاں کے ناول نگار بلاشبہ ان فنی معیاروں کو چھونے سے قاصر ہیں جو اردو میں کرشن چندر، عصمت چغتائی، قرۃ العین حیدر اور انتظار حسین وغیرہ نے قائم کئے ہیں لیکن یہاں کے ناول نگار جس فنی مہارت اور ریاضت کا ثبوت بہم پہنچا رہے ہیں وہ امید افزا بھی ہے اور قابل ستائش بھی۔''[2]

---

[1] ڈاکٹر برج پریمی۔ جموں کشمیر میں اردو ادب کی نشو ونما ص۔۴۰۔ دیپ پبلی کیشنز ۱۹۹۲ء

[2] شیرازہ، جموں وکشمیر میں اردو ادب کے پچاس سال، ص، ۱۴۷، جموں وکشمیر کا کلچرل اکاڈمی

ریاست جموں وکشمیر کے ناول نگاروں نے جس خوبصورتی سے کشمیر کو اپنے ناولوں میں پیش کیا وہ لائق تحسین ہے ناول نگاروں کے علاوہ دوسرے شعراء وادباء نے بھی کشمیر کی وادیوں، سرسبز وشاداب میدانوں، گھنے جنگلوں قدرت کے دل کش نظاروں کو اپنی تخلیقات کا موضوع بنایا ہے اور خوبصورت تصویر کشی کی ہے لیکن ان تخلیقات میں صرف کشمیر کی خوبصورتی کو یعنی ظاہری نمود ونمائش کو ہی دکھایا ہے جب کہ یہاں کے لوگوں کے رہن سہن معاشی، سیاسی، سماجی اور اقتصادی خستہ حالی ان کی نظروں سے اوجھل رہی کشمیر کی رنگینی اور خوبصورتی کا ان پر ایسا جادو پڑا کہ وہ یہاں کے لوگوں کی درد بھری زندگی کا تصور بھی ذہن میں نہیں لا سکے۔ جب کہ یہاں کے ناول نگاروں نے کشمیر کے ظاہر و باطن دونوں کو اپنے ناولوں میں بہت خوبصورتی سے پیش کرنے کی سعی کی اور وہاں کے لوگوں کی زندگی کی سچی تصویریں اپنے ناولوں میں ہو بہو پیش کر دی ہیں ناول پڑھتے وقت ایسے محسوس ہوتا ہے کہ قاری سات سمندر پار سے کشمیر کو اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا ہے ناول چونکہ حقیقت پر مبنی ہوتا ہے اس لئے جو حقیقی تصویر کشی ناولوں میں کی گئی ہے وہ دیگر اصناف سخن میں اتنی واضح نہیں ہو سکتی۔ یہاں کے ناول نگاروں نے جموں وکشمیر کی مکمل تصویر کشی اپنے ناولوں میں کی ہے جن کے مطالعے سے قاری جموں وکشمیر کو ہر اعتبار سے آسانی سے سمجھ سکتا ہے چاہے وہ ماضی ہو یا حال ہر زمانے کے تاریخی واقعات ناولوں میں مل جاتے ہیں۔

ریاست جموں وکشمیر میں اردو ناول کا با قاعدہ آغاز کب ہوا یہ ایک اہم سوال ہے اور اس سوال کا جواب تلاشنے کے لیے مجھے مختلف لائبریریوں، کتب خانوں، مصنفوں اور ادیبوں سے رجوع کرنا پڑا۔ مختلف لوگوں کو متفقہ رائے یہی ہے کہ ریاست جموں وکشمیر میں اردو ناول کے ابتدائی نقوش سالک رام سالک کی تصانیف ہیں ڈاکٹر برج پریمی اپنی کتاب ''جموں وکشمیر میں اردو ادب کی نشو ونما'' میں لکھتے ہیں:

> ''انیسویں صدی کے اواخر اور بیسویں صدی کے شروع میں سب سے پہلے ناول نگاری کی شروعات پنڈت سالک رام سالک اور مولوی محمد الدین فوق نے کی۔ سالک رام نے ''داستان جگت روپ'' اور ''تحفۂ سالک'' تصنیف کر کے اس شعبے کی طرف خاص توجہ دی۔''[1]

دوسرے ایک مضمون میں جموں وکشمیر کی ناول نگاری کی ابتدا کے بارے میں لکھتے ہیں:

[1] ڈاکٹر برج پریمی، جموں وکشمیر میں اردو ادب کی نشو ونما، ص ۴۰

''کشمیر میں اردو ناول کی طرف کافی تاخیر سے توجہ ہوئی۔ اگر چہ بہت پہلے پنڈت سالک رام سالک اور مولانا محمد الدین فوق نے اس صنف میں شروعات کی تھی لیکن ابتدائی واضح نقوس پنڈت نندلال اور بے غرض کے یہاں نظر آتے ہیں۔ جب انہوں نے موجودہ صدی کے تیسرے دہے کے دوران اپنا ناول ''تازیانہ عبرت'' کے عنوان سے لکھا جس کے کچھ حصے مقامی اخبارات میں شائع ہوئے۔ یہ ناول رتن ناتھ سرشار کے ضخیم ناول ''فسانہ آزاد'' کے تتبع میں لکھا گیا ہے اور اس میں آغاز سے انجام تک داستانی رنگ چھایا ہوا ہے۔''[1]

ڈاکٹر مشتاق احمد وانی یہاں کے ناول نگاری کے آغاز کے متعلق یوں لکھتے ہیں:

''پنڈت سالک رام سالک اور مولوی محمد الدین فوق کی نیم ادبی تخلیقات کو اگر چہ مکمل طور پر ناول نہیں کہا جاسکتا ہے لیکن انھیں ریاست میں ناول نگاری کا نقش اولین کہنا بے جانہ ہوگا۔''[2]

مندرجہ بالا آراء کو مدِ نظر رکھتے ہوئے ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ جموں و کشمیر میں اردو ناول نگاری کی ابتدا سالک رام سالک کے ناول سے ہوئی ان کے ناول ''داستانِ جگت روپ'' اور ''تحفہ سالک'' سے کشمیر میں اردو ناول کی بنیاد پڑی سالک رام سالک کا بچپن سے ہی ادب سے گہرا رشتہ تھا اور انہیں ادبی سے دلی لگاؤ تھا۔ انہوں نے متعدد نثری تخلیقات کے علاوہ شاعری کے بھی اچھے نمونے پیش کئے ہیں ان کا دور ۱۸۵۷ سے ۱۹۲۹ء تک رہا ہے سالک کے وہ ابتدائی نثری کارنامے جنہیں بعض ناقدین نے ناول قرار دیا ہے اور بعض نے انہیں ناول ماننے سے انکار کیا کیونکہ ان میں داستانوی طرز پر پلاٹ در پلاٹ کی تکنیک ملتی ہے اور مافوق الفطرت عناصر کی کارفرمائی بھی ہے اس بات کا ذکر ڈاکٹر برج پریمی کے الفاظ میں:

''داستان جگت روپ ناول سے زیادہ ایک داستان ہے اس میں پلاٹ

---

[1] جان محمد آزاد، کشمیر جاگ اٹھا، ص ۸

[2] دربھنگہ ٹائمز، ڈاکٹر مشتاق احمد وانی، جموں و کشمیر میں معاصر اردو ناول، ص ۳۳، جنوری تا مارچ ۲۰۱۸ء

در پلاٹ کی تکنیک کا التزام کیا گیا ہے کئی مقامات پر فوق الفطرت عناصر
کی کارفرمائی بھی نظر آتی ہے۔''[1]

اس بات میں کوئی دورائے نہیں کہ سالک کے اس ناول میں داستانی انداز نظر آتا ہے لیکن چونکہ جموں و کشمیر میں ان سے پہلے کسی نے ناول جیسی صنف پر توجہ نہیں دی تھی لہٰذا سالک کے سامنے کوئی ایسا نمونہ نہیں تھا جس کو مدنظر رکھ کر وہ اپنا ناول تخلیق کرتے۔ ابتدا میں ایسی غلطیوں کا در آنا کوئی مضائقہ نہیں تھا۔ سالک رام سالک نے اپنے دوسرے ناول ''تحفۂ سالک'' میں ان غلطیوں یا خامیوں کا ازالہ کیا ہے جو ان کے پہلے ناول میں مل جاتی ہیں۔ ان کے اس ناول میں لگ بھگ وہ تمام عناصر پائے جاتے ہیں جو ناول کے لئے ضروری خیال کئے جاتے ہیں اس طرح ریاست جموں و کشمیر میں سالک رام سالک کے ان ناولوں سے ناول نگاری کی بنیاد پڑی اور دوسرے ادیبوں کو بھی اس صنف کی طرف توجہ مبذول کرنے پر مجبور کیا۔ سالک کے بعد جموں و کشمیر میں اردو ناول کی ابتدا کے سلسلے میں محمد الدین فوق کا نام کافی اہمیت کا حامل ہے۔ محمد الدین فوق نے سالک سے بہترین ناول لکھے۔ ریاست جموں و کشمیر کے اردو ادب کی تاریخ میں منشی محمد الدین فوق کا نام نہ صرف ناول نگار ہی کی حیثیت سے اہم ہے بلکہ انھوں نے افسانہ نگاری، اردو صحافت نگار اور تاریخ نویس کی حیثیت سے بھی اہم ہے محمد الدین فوق نے عام روش سے ہٹ کر اپنی تخلیقات میں کشمیر عوام کی زندگی کے مسائل کو موضوع بنایا۔ ان کی تصانیف میں ''تاریخ، اقوامِ کشمیر'' (تین جلد) کے علاوہ ''خواتین کشمیر'' اور ''مکمل تاریخ کشمیر'' وغیرہ اہم ہیں۔ اس کے علاوہ ان کے افسانوں اور ناولوں کی بھی طویل فہرست ہے فوق کے ناولوں میں انارکلی، اکبر، ناکام۔ ناصح مشفق، غریب الدیار ارنیم حکیم خاص طور سے قابل ذکر ہیں انہوں نے اپنے ناولوں میں کشمیر کی خوبصورتی کے بجائے وہاں کی عوام کی زندگی کے گونا گوں مسائل کو پیش کرنے کی کوشش کی۔ محمد الدین فوق کے ناولوں میں ''اکبر'' کو سب سے زیادہ پسند کیا۔ یہ تاریخی ناولوں میں امتیازی درجہ رکھتا ہے اس ناول کے واقعات حقیقت پر مبنی ہیں غرض یہ کہ محمد الدین فوق نے ناول کے فن کو مدنظر رکھتے ہوئے کشمیری عوام کی زندگی کے مصائب کو اپنے ناولوں کا موضوع بنا کر پیش کیا اس طرح سالک رام سالک اور محمد الدین فوق جموں و کشمیر میں اردو ناول نگاری کے سلسلے میں بہت اہم ہیں جن کی بدولت جموں و کشمیر میں ناول جیسی صنف کی بنیاد پڑتی ہے۔

---

[1] ڈاکٹر برج پریمی، جموں و کشمیر میں اردو ادب کی نشو ونما، ص ۴

مذکورہ ناول نگاروں کے بعد جن ناول نگاروں نے ناول لکھے ان میں موہن لال مروہ۔ وشوا ناتھ ورما اور شمبھو ناتھ ناظر کے قابلِ ذکر ہیں موہن لال مروہ کا تعلق صوبہ جموں سے تھا انہوں نے ایک ناول ''داستانِ محبت'' کے نام سے لکھا۔ وشوا ناتھ ورما نے ایک قصہ ''تلاش حقیقت'' کے نام سے لکھا جس پر ناول کا اطلاق کیا جا سکتا ہے پنڈت نندلال دھر بھی جموں وکشمیر کے ناول نگاروں میں آتے ہیں جنہوں نے اپنا ایک ناول ''تازیانہ عبرت'' کے نام سے لکھ کر ریاست میں ناول نگاری کی بنیاد کو وسعت بخشی۔ ''تازیانہ عبرت'' کا انداز فسانہ آزاد سے ملتا جلتا ہے نندلال کا یہ ناول جموں وکشمیر میں ناول کی تاریخ میں ایک اہم ادبی اضافہ اور اثاثہ ہے جموں وکشمیر میں اردو ناول نگاری کی تاریخ میں ایک اہم نام پریم ناتھ پردیسی کا ہے جنھوں نے افسانے کے علاوہ ناول کی طرف خاص توجہ دی اور ناول نگاری کے میدان میں وسعت پیدا کی۔ بنیادی طور پر وہ ایک بڑے افسانہ نگار تھے افسانے سے انہیں خاص لگاؤ تھا وہ ایک شاعر بھی تھے۔ انہوں نے اپنی شاعری میں کشمیر اور کشمیر کے لوگوں کی خستہ حالی کی بہترین عکاسی کی ہے آزادی کی متوالی کشمیری عوام کے لئے پریم ناتھ پردیسی کی شاعری ایک نئی توانائی فراہم کرتی ہے محی الدین زور کشمیری پریم ناتھ پردیسی کے متعلق لکھتے ہیں:

> ''پریم ناتھ پردیسی اصل میں ایک افسانہ نگار تھے لیکن انہوں نے اپنی ادبی زندگی کا آغاز شاعری سے ہی کیا تھا۔ شاعری میں وہ رونق تخلص کرتے تھے وہ ڈوگروں سے کشمیری آزادی کے خواہاں تھے۔''[1]

پریم ناتھ نے اپنا ایک ناول ''پوتی'' کے عنوان سے لکھا جو ۱۹۴۷ء کے ہنگاموں میں تلف ہوا۔ یہ ناول شائع ہوتے ہوتے رہ گیا کیوں کہ تقسیم ملک کے وقت اس کا مسودہ ضائع ہو گیا۔ ڈاکٹر برج پریمی اس ناول کے متعلق یوں رقم طراز ہیں:

> ''1947ء سے قبل پریم ناتھ پردیسی نے افسانہ نگاری کے علاوہ ناول کو بھی اپنی جولاں گاہ بنایا۔ انہوں نے ایک بھرپور ناول پوتی کے عنوان سے لکھا لیکن قبل اس کے کہ اس ناول کا کوئی حصہ شائع ہوتا۔ انہوں نے یہ مسودہ لاہور کے ایک پبلشر ''ناجو'' کو بھیج دیا تھا۔ جنھوں نے قومی کتب

[1] فکر و تحقیق سہ ماہی جولائی تا ستمبر ۲۰۱۳ء، ص ۶۸، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان ۲۰۱۳ء

خانہ لاہور سے اسے شائع بھی کیا تھا لیکن تقسیم ملک کے دوران تلف ہوا۔
اس طرح سے ہم ایک اچھے ناول کے مطالعے سے محروم رہے جس کی
توقع پریم ناتھ پردیسی جیسے قلم کار سے ہوسکتی تھی۔''[1]

جیسا کہ اوپر ذکر ہو چکا ہے کہ ریاست جموں وکشمیر میں ناول نگاری کی طرف بہت تاخیر سے توجہ دی گئی تھی اس لئے یہاں ناول کی روایت زیادہ پرانی نہیں ہے سالک رام سالک اور محمد الدین فوق سے ہوتا ہوا یہ 1947ء تک پریم ناتھ پردیسی تک پہنچتی ہے چونکہ اگلا باب 1947ء کے بعد کے ناولوں پہ مشتمل ہے اس لئے یہاں 1947ء تک کے گنے چنے ناولوں کا ذکر کیا گیا ہے ناول کی روایت کو سمجھنے کے لئے یہ مختصر سا جائزہ بھی کافی ہے کیوں کہ 1947ء سے پہلے لکھے گئے ناولوں کے مسودوں کا اب کوئی سراغ نہیں ملتا ہے یہ ناول اب ناپید ہیں ان کے لکھے جانے کا تذکرہ کئی کتابوں میں مل جاتا ہے۔

بہر حال جموں وکشمیر میں ابتدائی دور میں لکھنے والوں میں سالک رام سالک محمد الدین فوق موہن لال مروہ۔ وشواناتھ ورماشنبھو ناتھ ناظر پنڈت نندلال دھراور پریم ناتھ پردیسی کے نام قابل ذکر ہیں جنھوں نے ناول کے ذریعے اپنی صلاحیتوں کے جوہر دکھلانے اور جموں وکشمیر میں اردو ناول کی رایت کو مضبوط کرنے میں اہم کردارادا کیا۔ الختصر جب جب جموں وکشمیر میں اردو ناول نگاری کی جب بھی بات کی جائے گی ان ابتدائی دور کے ناول نگاروں کوضرور یاد کیا جائے گا۔ غرض کہ پریم ناتھ پردیسی تک جتنے بھی ناول لکھے گئے ان کے ابتدائی نقوش کا ذکر مختلف کتابوں میں ملتا ہے لیکن ۱۹۴۷ء سے قبل لکھے گئے ناول اب دستیاب نہیں ہیں دستیاب شدہ ناولوں کے اعتبار سے ریاست جموں وکشمیر کے ناولوں میں سب سے پہلا ناول رامانند ساگر کا ''اور انسان مرگیا'' ہے جس کی اشاعت ۱۹۴۸ء میں ہوئی۔ اسی ناول سے ریاست جموں وکشمیر میں باقاعدہ اردو ناول کا آغاز ہوتا ہے اور یہ صنف آزادی کے بعد ہی بڑی تیزی سے پروان چڑھتی ہے آزادی کے بعد لکھنے والے ناول نگاروں میں رامانند ساگر، حامدی کاشمیری، ٹھاکر پونچھی وغیرہ کے نام قابل ذکر ہیں جنھوں نے اس صنف کی ترقی کے لئے کام کیا۔

---

[1] ڈاکٹر برج پریمی، جموں وکشمیر میں اردو ادب کی نشو ونما، ص۴۲۔۴۳، دیپ پبلیکیشنز، سری نگر، ۱۹۹۲ء

باب سوم

ریاست جموں و کشمیر میں اردو ناول

۱۹۴۷ء سے ۱۹۷۰ء تک

(۱) رامانند ساگر

(۲) ٹھاکر پونچھی

(۳) علی محمد لون

(۴) غلام رسول سنتوش

(۵) حامدی کاشمیری

(۶) وجے سوری

رامانند ساگر

ریاست جموں وکشمیر میں ۱۹۴۷ء کے بعد ہی ناول نگاری کی طرف خصوصی توجہ دی گئی اور اس صنف کو پروان چڑھایا گیا۔ ۱۹۴۷ء کے بعد سب سے پہلا ناول رامانند ساگر کا ہے رامانند ساگر کی پیدائش ۲۹ دسمبر ۱۹۱۷ء میں لاہور کے قریب ''اصل گورکے'' گاؤں میں ہوئی۔ رامانند ساگر کا اصل نام چندرا رام تھا۔ ان کے آباء واجداد پشاور سے ہجرت کر کے کشمیر میں رہائش پذیر ہوئے تھے۔ ان کے دادا نے سرینگر میں تجارت کا پیشہ اختیار کیا اور جلد ہی شہر سرینگر کے بڑے تاجروں میں شمار کئے جانے لگے۔ رامانند ساگر بچپن میں ہی والدین کی محبت سے محروم ہو گئے جس کی وجہ سے انہیں زندگی میں مختلف مشکلات سے سابقہ پڑتا رہا جن کا رامانند ساگر نے ڈٹ کر مقابلہ کیا۔ رامانند ساگر بچپن سے ہی بہت ذہین تھے۔ انھوں نے اپنے ادبی سفر کا آغاز ''پریتم پرتیکھشا'' لکھ کر کیا جو شری پرتاب سنگھ کالج سرینگر کے سالانہ ادبی رسالے میں شائع ہوا پڑھائی کے دوران رامانند ساگر مختلف چھوٹے موٹے کام کرتے رہے جن سے ان کی زندگی کا گذر بسر ہو رہا تھا۔ پنجاب یونیورسٹی سے فارسی اور سنسکرت گولڈ میڈلسٹ رہے اس کے بعد روزنامہ ''ملاپ'' کے مدیر بھی رہے اس بیچ انہوں نے تقریباً ۱۴۰ مختصر اور طویل افسانے لکھے وہ شروع شروع میں رامانند چوپڑا کے نام سے لکھتے تھے لیکن بعد میں رامانند ساگر کے نام سے لکھنا شروع کیا اور اسی نام سے مشہور ہوئے۔

رامانند ساگر نے اپنے کیریئر کا آغاز بطورِ فلم ٹیکنیشن کے تھا اور ممبئی کی فلم نگری میں ترقی کرتے کرتے وہ ایک کہنہ مشق فلمساز بن گئے تھے رامانند ساگر نے پچیس سے زیادہ فلمیں اور ایک درجن سے زیادہ ٹی وی ڈرامے بنائے۔ ان کی چند یادگار فلموں میں انسانیت کوہ نور، پیغام، گھونگھٹ، زندگی، آنکھیں، للکار، آرزو، گیت اور بغاوت کے نام آتے ہیں۔ رامانند ساگر کی شہرت ایک ادیب سے زیادہ ایک ہدایت کار اور کہانی نویس کے طور پر ہوئی۔ انہوں نے ہندوستان کی مشہور اساطیر ''رامائن'' سیریل بنا کر بہت شہرت حاصل کی وہ ایک بہترین فلم ساز کے طور پر اپنی ایک انفرادی پہچان رکھتے ہیں۔ چالیس سال تک وہ سنیما سے وابستہ رہے

انہوں نے کئی نئی طرز کی فلمیں تیار کیں جن کی نہ صرف قومی سطح پر بلکہ بین الاقوامی سطح پر کافی پذیرائی ہوئی۔

راما نند ساگر کو اردو زبان سے بہت لگاؤ تھا۔ وہ ایک اچھے ناول نگار اور افسانہ نگار بھی تھے۔ برصغیر کی تقسیم پر ان کا ایک ناول ''اور انسان مر گیا'' کے عنوان سے ہے جسے کافی شہرت حاصل ہوئی اس کے علاوہ ان کے کئی افسانے اردو کے رسائل اور جرائد میں شائع ہو چکے ہیں:

''اور انسان مر گیا'' فسادات کے موضوع پر لکھا ہوا ایک ناول ہے جس نے خاص طور پر شہرت پائی۔ اس کی شہرت اور مقبولیت کی وجہ یہ بھی ہے کہ ناول نگار نے اس میں جو واقعات اور حالات پیش کئے ہیں وہ بڑی تک وہی ہیں جن سے وہ خود دوچار ہوا تھا۔ ''اور انسان مر گیا'' یہ ناول ۱۹۴۸ء میں نو ہند پبلیشرز لمیٹیڈ بمبئی سے شائع ہوا۔ ادبی حلقوں میں اس کی بہت پذیرائی ہوئی۔ ناول ۱۹۴۷ء کے دردناک حادثات و واقعات کی بھرپور عکاسی کرتا ہے۔ تقسیم کے نتیجے میں ایک انسان پر کیا گذری ان حالات کی روداد راما نند ساگر نے اپنے ناول میں پیش کرنے کی سعی کی ہے۔ ناول اب تک مختلف زبانوں میں ترجمہ ہو چکا ہے انگریزی زبان میں اس ناول کا ترجمہ ''دی بلیڈنگ پارٹیشن'' کے عنوان سے دہلی سے شائع ہوا۔

''اور انسان مر گیا'' ناول کا عنوان بجائے خود یاس، تلخی اور قنوطیت کا مظہر ہے لیکن قومیت کے نام پر ہندوستان اور پاکستان میں جو کچھ ہوا وہ ایسا بھیانک اور اتنا گھناؤنا تھا کہ ان حالات میں رہ کر بھی حساس انسان کا قنوطی یا پاگل ہو جانا عین ممکن تھا یہ ناول چار حصوں اور سترہ ابواب پر مشتمل ہے۔

ناول کا پہلا حصہ سرخ فوارے ہے جس میں لاہور کے کشت وخون کی تفصیلات ہیں۔ ناول کا مرکزی کردار آنند ایک حد درجہ حساس شاعر ہے جو قومیت کے نام پر روا رکھی جانے والی تباہ اور غارت گری پر ملول، افسردہ اور دکھی ہے ناول کے دوسرے حصے میں جس کا عنوان رقص شرر ہے اس حقیقت کو پیش کیا گیا ہے کہ کس طرح آگ اور خون کا بازار گرم کر کے یورپ ہندوستان کو جہنم بنا دیا گیا تھا۔ مسلمان ہندوؤں کے گھر جلا رہے تھے اور ہندو مسلمان کے ناول نگار کو حیوانوں کے اس ہجوم میں ایک آدھ انسان بھی نظر آتا ہے چنانچہ جب شمس الدین کا گھر جلایا جاتا ہے تو آنند اپنی جان خطرے میں ڈال کر جلتے ہوئے گھر میں گھس جاتا ہے اس طرح مولانا اپنی جان کی پرواہ کئے بغیر آنند کو بچاتے ہیں اور آنند کی محبوبہ دوسری اغوا کی ہوئی لڑکیوں کو چھڑاتے۔ مولانا کے الفاظ ان کے سچے مذہبی جذبے اور انسان دوستی کا ثبوت دیتے ہیں:

''میں ان مرنے والوں کے لئے نہیں بلکہ مارنے والوں کے روتا ہوں
جنھوں نے ہندوؤں کو اس طرح قتل کر کے اسلام کو خطرے میں ڈال دیا
ہے مجھے اس آگ میں مذہب کی جلتی ہوئی روح دکھائی دیتی ہے اے
کاش وہ دیوانے جان سکیں کہ وہ کیا کر رہے ہیں۔''[1]

اس ناول میں فسادات کے ایسے بے شمار المیے پیش کئے گئے ہیں جن کے تصور سے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں اس نفسیاتی حقیقت کو بھی پیش کیا گیا ہے کہ جو لوگ ان فسادات سے کسی طرح بچ نکلے تھے دراصل وہ بھی بچے نہیں تھے۔

ناول کے تیسرے حصے ''میں بچ گیا'' کا نعرہ لگاتا پھرتا ہے وہ زندگی سے مایوس ہو کر اپنے ہاتھوں سے اپنے بیوی بچوں کو ہلاک کرتا ہے اور لڑتے ہوئے جان دینے کے لئے نکل جاتا ہے لیکن جب وہ بچ جاتا ہے تو اس صلاح سے اپنا ذہنی توازن کھو بیٹھتا ہے اس ناول کا ایک کردار انتی بھی ہے جو اپنی آنکھوں سے ان واقعات کو دیکھتی ہے جن میں عورتوں کو زبردستی برہنہ کیا جاتا ہے اور بے دردی سے ان کو قتل کیا جاتا ہے اس لئے وہ پاگل پن کی حالت میں بھی کپڑے اتار کر ''لو دیکھ لو'' کہتی پھرتی ہے ناول کے ایک حصے میں ایک ڈاکٹر بھی ہے جو چوبیس گھنٹے فسادیوں کا مقابلہ کرتا ہے اور آخر میں مجبور ہو کر ہتھیار ڈال دیتا ہے اس کو بے دردی سے قتل کیا جاتا اور اس کی جوان بیوہ کو برہنہ حالت میں جلوس کے ساتھ چلنے کو کہا جاتا ہے اس کے انکار کرنے پر اس کی شرمگاہ میں تلوار بھونک دی جاتی ہے ناول نگار کو ان واقعات میں انسان کی دردناک موت دکھائی دیتی ہے وہ یہ کہنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ ''انسان مر گیا''۔ چنانچہ ناول کے چوتھے یعنی آخری حصے کا عنوان یہی ہے اس طرح انسانیت کی موت پر ناول ختم ہو جاتا ہے۔

ناول ''اور انسان مر گیا'' کے دیباچے میں خواجہ احمد عباس نے اس بات کی طرف اشارہ کیا ہے کہ رامانند ساگر کسی سیاسی غرض یا سیاسی مقصد کے لئے قلم کا استعمال کرنا نہیں جانتے تھے انھوں نے کسی بھی نظریے یا سیاسی پارٹی کی نمائندگی نہیں کی ان کے مطابق وہ ایک انسان بنے رہے اور انسانیت کے مرنے پر تلملا اٹھے ہیں یہ ناول انسانی دردمندی کی ایک واضح مثال ہے خواجہ احمد عباس ناول کے دیباچے میں لکھتے ہیں:

[1] رامانند لے ساگر، اور انسان مر گیا، ص ۱۲۹، نو ہند پبلیکیشنز لمیٹیڈ بمبئی ۱۹۴۸ء)

''مگر خوش قسمتی سے یا بدقسمتی سے وہ کسی پارٹی کا ممبر نہیں صرف انسان پارٹی سے تعلق رکھتا ہے۔ وہ انسانیت کے علمبردار فن کاروں کی اس بلند مرتبت صفت کا ایک رکن ہے۔ اس لئے وہ سیاسی اور ہنگامی تاویلیں تلاش نہیں کرتا۔ اس نے انسانیت کو بہیمت میں ہوتے دیکھا ہے اور وہ تڑپ اٹھا ہے اور اس درندگی کے لئے وہ ذمہ دار ٹھہراتا ہے انسان کو، ہندوستانی کو، ہندو اور مسلمان اور سکھ کو، اونچے طبقے والوں کو اور نیچے طبقے والوں کو۔ آخر نفرت اور خون کے اس سیلاب میں کروڑ پتی سیٹھ اور بھوکے کسان سب ہی تو بہہ گئے تھے۔''[1]

رامانند ساگر کے اس ناول پر اظہار خیال کرتے ہوئے خواجہ احمد عباس نے اسے کلاسک کا درجہ دیا ہے کیوں کہ ان کے نزدیک اس ناول کا موضوع ہو یا کردار وہ ہماری سماجی وتہذیبی صورتحال کی سچی تصویریں پیش کرتے ہیں۔ جس کے آئینہ میں ہم اس عہد کو دیکھ سکتے ہیں چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

''اس سے بھی خوفناک واقعات آپ نے پہلے بھی سنے ہیں اور پڑھے ہیں لیکن ایسا اثر آپ پر پہلے کبھی نہیں ہوا۔
یہ فنکار کا نہ صرف ادبی کمال ہے بلکہ اس کے خلوص اور انسان دوستی کا نتیجہ ہے یہ ہنگامی لٹریچر نہیں ایک کلاسیک ہے اس کے قلم سے نکلے ہوئے الفاظ مرتی ہوئی انسانیت کی صدائے بازگشت ہیں۔ وہ ناول کے ذریعے، اس کے کرداروں کے ذریعے آپ کو آئینہ دکھا رہا ہے کہ اس میں انسان کے یعنی اپنے مسخ شدہ خدوخال دیکھ لیں۔ خوب پہچان لیں کہ انسانیت کی مرنے کے بعد کیا شکل ہوجاتی ہے۔''[2]

''اور انسان مر گیا'' ناول کا پلاٹ کمزور سا ہے ناول کے مطالعہ کے دوران کوئی خاص مضبوط ڈھانچہ

---

[1] رامانند لے ساگر، اور انسان مر گیا، ص ۱۳۔۱۴، نو ہند پبلیکیشنز لمیٹیڈ بمبئی ۱۹۴۸ء)

[2] رامانند لے ساگر، اور انسان مر گیا، ص ۲۶، نو ہند پبلیکیشنز لمیٹیڈ بمبئی ۱۹۴۸ء)

نہیں ابھرتا۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ ناول جذبات کی رو میں بہہ کر لکھا گیا ہے واقعات اور حالات کی یہی جذبات نگاری ناول کی بنیادی خوبی بھی ہے لیکن فنی اعتبار سے اس میں خامی درآئی ہے چنانچہ اس خامی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اسلم آزاد لکھتے ہیں:

''جذباتی بیانات اور جذباتی تفصیلات نے ناول کو اثر انگیز تو بنا دیا ہے تو لیکن فنی سطح پر کوئی ندرت اور فکری سطح پر گہرائی نہیں ملتی بہرحال یہ نقص اس طرح کے تمام ناولوں میں موجود ہے۔''[1]

ناول میں ناول نگار نے ہندوؤں اور سکھوں پر مسلمانوں کے روا رکھے ہوئے دکھوں کو پیش کیا ہے ناول کی کہانی آنند کے گرد گھومتی ہے جو لاہور کا رہنے والا ہے وہ موت وحیات کی کشمکش میں ہے وہ یہاں سے دور جانا چاہتا ہے لیکن یہاں سے بھاگنے کے تمام راستوں پر موت کھڑی ہے آنند جو ایک شاعر عاشق اور انسان دوست ہے فسادات نے اسے دیوانہ بنا دیا ہے آنند کی لاچاری اور محرومی ہمیں اس دور کے انسانوں کی اندرونی کیفیات کو سمجھنے میں مدد دیتی ہے یہ ان انسانوں کی داستان ہے جو تقسیم سے سب سے زیادہ متاثر ہوئے اور تقسیم نے جن کا سب کچھ چھین لیا۔ اس کے علاوہ یہ ان لوگوں کا بھی المیہ ہے جنہوں نے بڑی تعداد میں ہجرت کی اور جو یہاں کی سیاست کا براہِ راست شکار ہوئے۔ آنند پورے ہندوستان میں امن کا خواہاں ہے لیکن ساتھ ہی وہ اپنی برادری میں اپنا سر اونچا رکھنے کے لئے مسلمانوں کو مارنا چاہتا ہے وہ ایک عجیب قسم کی کشمکش میں مبتلا ہے رامانند ساگر نے یہاں آنند کے کردار کے ذریعے ایسے انسانوں کی نمائندگی کی ہے جو فطرتاً امن پسند ہے لیکن حالات انہیں دہشت پسند بننے پر مجبور کر دیتے ہیں مثلاً ایک اقتباس دیکھیں:

''حتیٰ کہ ایک دو کے نیفوں میں ٹنگی ہوئی نئی نئی چھریوں کی چمک دیکھ کر نہ جانے کہاں سے یہ خواہش ایک لمحے کے لئے تو اس کے دل میں بھی پیدا ہوئی کہ ایک ایسی ہی چمک دار چھری ہاتھ میں لے کر وہ باہر نکل جائے اور اسے ہر راہ چلتے ہوئے مسلمان کے سینے میں اتارتا چلا جائے۔ حتیٰ کہ ہر ہندو نوجوان اسے رشک سے دیکھنے لگے۔ اس میں اسے کچھ اس طرح

[1] اسلم آزاد، اردو ناول آزادی کے بعد، ص ۱۵۴

کا ہیرو پن محسوس ہونے لگا جس کے لئے ہر لڑکی اس پر جان چھڑکنے
لگے گی اس وقت اوشا اس پر کتنا فخر کرے گی۔ آخر اس میں زندگی اور
حرکت تو ہے امن اور اہنسا میں بے حرکتی اور ایک مردہ سی شانتی کے علاوہ
کیا رکھا ہے۔"[1]

آنند کے کردار کا ارتقا بھی خوب ہے خصوصاً اس کے سوچنے کا یہ ڈھنگ کہ اس فساد میں نہ ہندو کا کچھ بگڑا نہ مسلمان کا نقصان ہوا، دونوں نے ادھر کا نقصان ادھر سے پورا کرلیا۔ صرف نقصان ہوا تو انسان کا انسانیت لٹ گئی۔ لیکن وہ انسانیت کی مسلسل تذلیل دیکھ کر انسان کی طرف سے مایوس ہو جاتا ہے آنند کے کردار کی یہ تبدیلی فطری انداز میں پیش کی گئی ہے اس کے برخلاف نرملا کے کردار میں ایک طرح کی رجائیت ہے۔

آنند اور نرملا کے کردار کے سلسلے میں راما نند ساگر پر ایک اعتراض یہ کیا جاسکتا ہے کہ دونوں کے حالات لکھنے میں انھوں نے رجائی نقطۂ نظر سے کام نہیں لیا۔ آنند کی ملاقات جب اوشا سے ہوتی ہے اور وہ اسے بتاتی ہے کہ مسلمان اسے اٹھالے گئے تھے تو وہ اس سے نفرت کرنے لگ جاتا ہے۔ اور اس کے نتیجے میں اوشا خودکشی کر لیتی ہے اس طرح نرملا کو بھی ایسے ہی حالات کی وجہ سے شوہر اور سسرال والے گھر سے نکال دیتے ہیں۔

آنند پورے ناول میں ایک متحرک کردار نظر آتا ہے وہ جہاں ایک طرف پہلے اپنی برادری کا سر اونچا کرنے کے لئے مسلمانوں کو مارنا چاہتا ہے وہیں دوسرے پل جب اس کی برادری کے لوگ ایک مسلم شخص شمس الدین کے گھر کو آگ کی نظر کرتے ہیں تو وہ اکیلا ہی آگ پر قابو پانے کی کوشش کرتا ہے۔ وہ اپنی ماضی کی باتوں کو دل سے نکال دیتا ہے کیوں کہ انسان دوستی اس کی خمیر میں شامل تھی اقتباس ملاحظہ ہو:

'آنند نے آؤ دیکھا نہ تاؤ۔ بھاگتا ہوا وہ اپنی گلی میں پہنچ گیا۔ وہاں پہنچتے ہی
اس نے دیکھا کہ واقعی شمس الدین کے مکان کو آگ لگی ہوئی تھی اور کوئی
نوجوان آگ بجھانے والا موجود نہ تھا۔ صرف ایک طرف دو چار بوڑھے
اس آگ کو دیکھ دیکھ کر کچھ اس طرح ہاتھ مل رہے تھے جیسے یہ شمس الدین

[1] راما نند لے ساگر، اور انسان مر گیا، ص ۱۲۵، نو ہند پبلیکیشنز لمیٹڈ بمبئی ۱۹۴۸ء)

کا مکان نہیں بلکہ خود ان کے بچپن کو زندہ جلایا جا رہا تھا۔ اسے دیکھتے ہی
انہوں نے فریاد کے انداز میں پکارا' آنند......اس آگ کو بجھاؤ۔ دیکھو
یہاں کوئی نہیں ہے۔''[1]

''اور انسان مر گیا'' کا ایک اور کردار سیٹھ کشوری لال ہے جو زمیندار طبقے کی نمائندگی کرتا ہے۔ اسے نہ ہندوستان سے کوئی واسطہ نہ پاکستان سے ہے اسے بس ایک ہی فکر ہے کہ دولت کیسے جمع کی جائے۔ وہ بیوی اور بچوں کو دولت کی خاطر قربان کرنے کے لئے تیار رہتا ہے وہ اپنی دولت اور مال، اسباب کی خاطر کوئی بھی مصیبت برداشت کرنے کے لئے تیار ہے چنانچہ ملک کی تقسیم کے ساتھ ہی اسے جب احساس ہوتا ہے کہ نوجوانوں کے ساتھ صلح اور سمجھوتے سے ہی وہ اپنی جمع شدہ دولت کی حفاظت کر سکتا ہے تو اس کے رویے میں اچانک سے تبدیلی رونما ہوتی ہے اقتباس ملاحظہ ہو:

''سیٹھ جی اچانک بے حد خلیق اور ملنسار واقع ہو چکے تھے پچھلے چند دنوں
سے انہوں نے محلے کے ہر ایک آدمی سے بات کرنا شروع کر دیا تھا۔
اب اتنا ہی نہیں کہ وہ نمستے کا جواب بڑی خندہ پیشانی سے دینے لگ گئے
تھے بلکہ کبھی کبھی خود بھی پہلے نمستے کر لیتے تھے جب سے فساد شروع ہوا تھا
خصوصاً محلے کے نوجوانوں کے ساتھ ان کا برتاؤ بالکل تبدیل ہو گیا تھا
پہلے کے بالکل برعکس ......کسی نوجوان کو دیکھتے ہی ان کی آنکھوں میں
خوش آمدید کا سا انداز پیدا ہو جاتا۔ سنا گیا تھا کہ سیٹھ جی کی تجوریوں میں
بلیک مارکیٹ کا دو اڑھائی لاکھ روپیہ نقد پڑا ہوا تھا اور وہ فساد کے باعث
بینک نہ کھلنے کی وجہ سے سخت پریشان تھے۔''[2]

غرض کشوری لال کا کردار ایک اہم کردار ہے جو ناول میں جان پیدا کرتا ہے مذکورہ کردار سے ہمیں خود غرض اور مفاد پرست لوگوں کی خاصیت کا علم ہوتا ہے یہ منفی کردار ہے لیکن اس کردار کے ذریعے اس عہد میں

[1] رامانند لے ساگر، اور انسان مر گیا، ص ۱۲۵، نو ہند پبلیکیشنز لمیٹیڈ بمبئی ۱۹۴۸ء)
[2] رامانند لے ساگر، اور انسان مر گیا، ص ۷۰، نو ہند پبلیکیشنز لمیٹیڈ بمبئی ۱۹۴۸ء)

رائج سماجی حقیقت کا اندازہ ہوتا ہے۔آزادی اور ملک کی تقسیم کے وقت ایسے لوگ تھے جنھوں نے اپنی دولت کو اپنے عزیز و اقارب پر فوقیت دی کشوری لال کا کردار بھی ایسا ہی ہے جو یہاں تک کہتا ہے کہ جب تک جیب میں ٹھوس ہے تو بیویوں کی کیا کمی ہے۔ دراصل یہ اس سماج کی علامت ہے کہ وہ لوگ اپنی دولت کو بچانے کے لئے اپنے اہل وعیال کو حملہ آوروں کے رحم وکرم پر چھوڑ کر فرار ہو گئے۔ یہ برائی آج بھی ہمارے سماجی کا حصہ ہے جب کوئی انسان دولت یا پیسہ کی خاطر اپنے ہی بھائیوں، دوستوں یا رشتہ داروں کا قتل عام کرتا ہے یعنی بے حسی و خودغرضی ہر دور میں رہی ہے۔

سیٹھ کشوری لال عام حالات میں کسی کے سلام کا جواب دینا بھی گوارا نہ کرتا تھا۔اب بدلے ہوئے حالات میں ہر نوجوان کو بہت جھک کر سلام کرتا ہے رامانند ساگر نے سیٹھ ساہوکاروں کے رویوں کو بڑی چابک دستی اور فنکاری کے ساتھ تحریر کیا ہے اس ناول کے تمام کردار جذبات واحساسات کے اسیر نظر آتے ہیں۔ان میں فکر وبصیرت کی خصوصیت برائے نام نظر آتی ہے ناول نگار نے اپنے کرداروں کے جذباتی اور حسی پیکر کو تراشنے میں فنی کمالات کا مظاہرہ کیا ہے:

''اور انسان مرگیا'' ایک ایسا ناول ہے جس میں جذبات واحساسات سے بھرے ہوئے خلوص کے ساتھ ان نقشوں کو پیش کیا ہے معاشرتی سطح پر مسلسل مظالم نے ذہنوں میں جو تبدیلیاں پیدا کی تھیں طرز احساس اور انداز فکر کو جس طرح متاثر کیا تھا اس کے زندہ نقوش یہاں نظر آتے ہیں اس لحاظ سے رامانند کا یہ ناول ایک ممتاز حیثیت کا حامل ہے۔

''اور انسان مرگیا'' ناول ہنگامی موضوع سے وابستہ ہے اس کی بنیاد فرقہ وارانہ فسادات ہیں۔ یہ ناول ان فسادات میں مبتلا ہو کر اور ان فسادات سے متاثر ہو کر لکھا گیا ہے ظاہر ہے کہ اس کی وجہ سے یہاں واقعات کا وہ تنوع وسعت اور پھیلاؤ نہیں ملے گا جو بالعموم دوسری نوعیت کے ناولوں میں ملتا ہے اس میں فرقہ وارانہ فساد ہی سے متعلق واقعے اور حادثے اکٹھے کر دیئے گئے ہیں۔خود ناول نگار نے دیباچے میں اس کی وضاحت کی ہے کہ فسادات کے دوران جو نوٹس تیار کئے گئے انھیں پر اس ناول کی بنیاد رکھی گئی ہے چنانچہ زندگی کے واقعات کی رنگارنگی اور وسعت دامانی فطری طور پر مفقود ہے ایک ہی طرح کے حادثات وواقعات ہیں البتہ واقعہ نگاری کے دوران کہیں کہیں کرداروں کے نظریات وخیالات کے تصادم کے نتیجے میں بعض دوسری باتیں بھی روشنی میں

آ گئی ہیں۔ راما نند ساگر کی سیدھی سادی جذباتی زبان اور فطری انداز کی مکالمہ نگاری نے ان واقعات میں خاطر خواہ اضافہ کیا ہے مثلاً دفاعی ترکیبوں پر غور کرتے ہوئے کچھ لوگ آپس میں یہ گفتگو کرتے ہیں:۔

''یہی تو ہندوؤں میں کمزوری ہے روپئے کے لالچ نے سب کو خودغرض بنا دیا ہے۔''

''وہ ہمارا ابھی تو ایک جج ہے ناہائی کورٹ میں خود اس کے خاندان کے اسی افراد کو مسلمانوں نے قتل کر دیا لیکن اس نے آج تک ایک کو بھی پھانسی پر نہیں لٹکایا۔''

''اگر ہندوؤں میں یہ دیا دھرم والی کمزوری نہ ہوتی تو ان کا راج کیوں چھنتا''

''دیا دھرم نہیں بلکہ ہندو ڈرتا ہے اسے روپئے کا لالچ ہے اسے ملازمت کا لالچ ہے''

ایک ادھیڑ عمر کا شخص ان میں شامل ہو گیا اس نے کہا:۔

''یہ کمزوری صرف ہندو میں نہیں، مسلمان میں بھی ہے کھاتا پیتا مسلمان بھی نہیں لڑتا۔ یہ تو ان کا غنڈہ اور جاہل عنصر ہے جو فساد کر رہا ہے اور چونکہ ان میں ایسے آدمیوں کی تعداد اور زیادہ ہے۔''[1]

راما نند ساگر نے ناول میں واقفیت پسندی کا ثبوت دیا ہے اور طنز کے ہلکے ہلکے نشان مکالموں کی چبھن میں اضافہ کرتے ہیں راما نند ساگر کی زبان، انداز بیان اور مکالمہ نگاری کا سلیقہ اتنا پر اثر ہے کہ اس کے مناظر کو برداشت کرنا، اس کے واقعات کو بغیر کسی احساس کے پڑھ لینا تقریباً ناممکن ہے۔ اس ناول کی پوری کہانی کچھ اس طرح سے ہے۔

ناول کا آغاز تقسیم ہند کے وقت لاہور کے فرقہ وارانہ فسادات سے ہوتا ہے اور اختتام ہندوستانی سرحد روای کے پل پر ہوتا ہے اسی پل پر انسان کی موت واقع ہوتی ہے لاہور میں ہندو مسلم زمیندار اپنی حفاظت کے

[1] راما نند لے ساگر، اور انسان مر گیا، ص ۲۱۸۔۲۱۷، نو ہند پبلیکیشنز لمیٹیڈ بمبئی ۱۹۴۸ء

لئے نوجوانوں کی ٹیم منظّم کر رہے تھے۔ سیٹھ کشوری لال کی ٹیم میں آنند کے شامل ہوتا ہے آنند کو کشوری لال کی بیٹی اوشا سے عشق تھا۔ آنند کے ذریعے لاہور میں رونما ہونے والے سارے حادثات کا بیان کیا گیا ہے چھوٹی چھوٹی افواہوں سے شہر میں بھگدڑ مچ رہی تھی۔ دونوں فرقوں کے لوگ ایک دوسرے پر حملہ کرنے کی تیاری کر رہے تھے۔ بہت سارے لوگ شہر چھوڑ کر بھاگ رہے تھے۔ ایک ہندو سیٹھ نے مسلم تانگے والے سے کہا کہ وہ انہیں مسلم علاقوں سے بچا کر اسٹیشن پہنچا دے۔ اسٹیشن کے قریب ٹانگے والے کو ہندو فسادیوں نے چھرا بھونک کر ہلاک کر دیا اور تانگے میں آگ لگا دی۔ ٹانگے کے ساتھ ٹانگے والا اور گھوڑا دونوں جل رہے تھے عورتوں نے رحم کھا کر گھوڑا بچا لیا اور جس لڑکی نے گھوڑے کی مرہم پٹی کی اسی نے تانگے والے کو جلانے کے لئے پٹرول کا ڈبہ پیش کیا۔ آنند یہ حادثہ دیکھ ہی رہا تھا کہ اس کے محلے میں آگ لگنے کی خبر ملی۔ آنند کے ساتھیوں نے شمس الدین کے گھر میں آگ لگا دی۔ آگ بجھانے کی کوئی ترکیب نہ سوجھی تو آنند جلتے ہوئے گھر میں کود پڑا۔ آنند کو بچانے کے لئے محلے والوں نے آگ بجھا دی۔ اس طرح آنند آگ بجھانے میں کامیاب ہو گیا۔

شہر میں کہرام اس وقت مچا جب لاہور اسٹیشن پر نیم مردہ جسموں اور لاشوں سے بھری ٹرین آ کر رکی۔ ٹرین دیکھتے ہی لوگ پاگل ہو گئے ادھ مرے آدمی کی مدد کون کرتا سبھی ہندوؤں کے قتل عام اور ان کے گھروں کو جلانے پر آمادہ ہو گئے۔ تھوڑی ہی دیر میں سارا شہر شعلے اور دھویں سے گونج اٹھا۔ لاشوں کے انبار لگ گئے آنند کا گھر بھی جلا دیا گیا۔ بچے ہوئے لوگوں کو کمیپ میں منتقل کر دیا گیا۔ کیمپ میں آنند کی ملاقات سیٹھ کشوری لال سے ہوئی۔ کشوری لال اپنی رقم بچانے کے چکر میں اپنی بیٹی اوشا اور بیوی کو چھوڑ کر بھاگ آئے تھے۔ یہ معلوم کر کے آنند اپنی معشوق کی راکھ تلاش کرنے کے لئے کشوری لال کے گھر پر گیا۔ جس کا دروازہ آنند کے لئے بند کر دیا گیا تھا آج کھلا ہوا تھا۔ وہ تلاش کر رہا تھا کہ باہر سے کسی کے رونے کی آواز سنائی دی۔ باہر ایک بزرگ مولانا رو رہے تھے وجہ دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ مولانا مرنے والوں پر نہیں بلکہ مارنے والوں پر رو رہے تھے جنھوں نے اسلام کو خطرے میں ڈال دی تھا۔ آنند کو مولانا مسجد لے گئے۔ اسے شلوار قمیض پہنا کر وہاں لے گئے جہاں اوشا دو لڑکیوں کے ساتھ قید تھی۔ مولانا نے تینوں لڑکیوں کو آنند کے حوالے کیا اور کہا کہ وہ انھیں محفوظ مقام کیمپ تک پہنچا دے چلتے وقت مولانا نے ایک تھیلی بھی پیش کی یہ وہ مورتی تھی جسے جلتی ہوئی مندر سے مولانا بچا لائے تھے۔ راستے میں آنند اور اوشا کی بات نہ ہو سکی کیمپ میں اوشا کا باپ حاضر تھا۔ آنند اوشا کو

بھولنے کے لئے ایک بچے کے ساتھ رہنے لگا تھا لیکن ایک دن اوشا نے کہہ دیا کہ تم مجھ سے اس لئے نفرت کرنے لگے ہو کہ مجھے مسلمان اٹھالے گئے تھے۔ اس رات آنند کو نیند نہ آئی صفائی پیش کرنے کے لئے خط بچے کے ہاتھ بھجوایا لیکن دیر ہو چکی تھی اوشا زہر کھا کر اس دنیا سے جا چکی تھی۔

کچھ دن بعد کیمپ والے مشرقی پنجاب کی جانب روانہ ہوئے اور آنند اکیلا گھومتا ہوا ایک گردوارے کے پاس پہنچا جہاں سردار جی اس کا قتل کرنے ہی والے تھے کہ اس کے ہاتھ پر اوم لکھا دیکھ کر کرپان ہٹا لی۔ سردار جی دو مسلمانوں کو مار چکے تھے آنند زیادہ دیر تک وہاں نہ ٹھہر سکا۔ وہ ندی کی طرف چل دیا وہاں اپنے کو کیمپ میں پایا۔ یہ کیمپ سرکاری نہ تھا بلکہ چند بھٹکے ہوئے لوگوں پر منحصر تھا جن کی کہانیاں ایک دوسرے سے ملتی جلتی تھیں جو انسان تھے انسان کے ستائے ہوئے تھے۔ ان میں نرملا، اجاگر سنگ، انتی اور دیگر لوگوں کی کہانی ایک جیسی تھی۔ پھر مولانا ایک لڑکی کو لئے محفوظ جگہ کی تلاش میں ادھر آ گئے کیمپ والوں نے مسلمان دیکھ کر ان پر حملہ کر دیا۔ آنند اور کشن چندر نے انہیں بچایا اپنے خیمے میں لے آئے ان کو پانی پلایا اور مولانا بولنے لگے ہندو پاک کے دردناک واقعات سنانے لگے۔ رات میں مولانا کو بھیج دیا گیا۔ باڑھ کی وجہ سے کیمپ چاروں طرف سے پانی میں گھر گیا۔ رات میں اس لڑکی کو سانپ نے ڈس لیا جس کو مولانا لے کر آئے تھے۔ محفوظ جگہ کی تلاش میں خیمہ والوں نے یہاں سے کوچ کیا۔

آنند، کشن چند، نرملا، چھوٹا بچہ، اجاگر سنگھ، انتی وغیرہ کے ساتھ یہ قافلہ اس کاروان عظیم میں جا ملا جو ساٹھ میل لمبا تھا اور ہندوستان جا رہا تھا۔ لوگ بھوکے پیاسے چلے جا رہے تھے نرملا کی چھاتی کا دودھ خشک ہو گیا تھا۔ آخر کار چھوٹے بچے نے جان دے دی۔ کچھ گھاس پھوس سے ڈھک کر آنند نے بچے کو چھوڑنا چاہا لیکن اس کو رکھتے ہی ارد گرد کتے اور گدھ منڈلانے لگے آنند نے بچے کو اٹھا لیا اور اور گود میں لے کر چلتا رہا۔ اچانک قافلہ پر حملہ ہوا لیکن کسی میں دم نہ تھا کہ مقابلے کے لئے آگے بڑھے کشن چند نے آگے بڑھ کر حملہ آور کی بندوق پکڑ لی لیکن جب تک گولی لگ چکی تھی فائر کشن یعنی رحمان کے بھائی اسماعیل نے کیا تھا۔ رحمان کہتا رہا میں تمہارا بھائی لیکن اسماعیل اسے کافر کہتا رہا فوج کے آتے آتے اسماعیل بھاگ گیا رحمان نے جان دے دی۔ ہندوستان کے قریب پہنچ کر آنند نے بچے کو نرملا کے دوپٹے سے ڈھک کر لٹا دیا۔ قافلہ دھیرے دھیرے چل رہا تھا۔ راوی ندی کا پل دونوں ملکوں کو تقسیم کرتا ہے پل کے ایک طرف پاکستانی فوجیں دوسری طرف ہندوستانی

تعینات تھیں۔ آنند نرملا کے ساتھ نصف پل پار کر چکا تھا پیچھے سے مولانا نے آواز دی۔ مولانا کی گود میں بچہ تھا۔ مولانا نے کہا یہ آنے والے کل کا انسان ہے۔ آنند پاگل ہو چکا تھا یہ کہتے کہتے کہ میں انسان کو مار ڈالوں گا اس نے مولانا کی گردن دبا دی اور ایک ہنگامہ کھڑا ہو گیا دونوں طرف کی فوجوں نے فائرنگ کی انسان مر گیا۔

نرملا پاکستان میں پرغمال بنالی گئی تھی لیکن بھاگ کر جب اپنے گھر آئی تو شوہر اور سسر نے اپنانے سے انکار کر دیا اور کہا کہ دکھی ہونے کی کوئی بات نہیں ہم نے ان سے پورا پورا بدلہ لیا ہے جتنی عورتیں ہمارے گاؤں کی وہ اٹھا کر لے گئے ہیں ان سے کہیں زیادہ ہم ان کی عورتیں گاؤں میں لے آئے ہیں۔ ایسے اور اس طرح کے بے شمار واقعات کا ذکر ناول میں ملتا ہے جہاں انسان کی انسانیت ختم ہو چکی ہے۔ یہاں مولانا کا ایک مذہبی نظریہ ملاحظہ کریں:

''صرف نماز ہی کا نام مذہب نہیں ہے اور نہ انسان کو محض خدا کی حمد گاتے رہنے کے لئے پیدا کیا گیا ہے اس کام کے لئے ملائکہ اور فرشتے بہت تھے۔ انسان کو انسانیت کی خدمت کرنے اور خدا کی اس کائنات کو خوبصورتی خوشی اور پیار سے بھرنے کے لئے بھیجا گیا ہے اور یہی اس کا حقیقی مذہب ہے۔''[1]

اور انسان مر گیا ناول میں رونما ہونے والے ہر حادثے سے ظاہر ہوتا ہے کہ انسان تہذیب اور انسانیت کے راستے سے بھٹک گیا ہے اور ناول نگار کا مرکزی نقطہ نظر بھی یہی ہے کہ تقسیم کے المیہ نے انسانیت کا خاتمہ کر دیا۔ خواجہ احمد عباس نے ناول کے دیباچے میں تقسیم ہند کی طرف بھی اشارہ کیا ہے جو ناول سے غیر متعلق ہے لیکن ان کا یہ کہنا بالکل صحیح ہے کہ:۔

''رامانند ساگر کا سب سے بڑا کمال یہ ہے کہ اس نے اپنی آنکھوں سے انسان اور انسانیت کو مرتے دیکھا۔ مگر خود ساگر کی انسانیت ختم نہیں ہوئی یہ انسانیت یہ انسان دوستی آپ کو اس ناول کے ہر باب ہر صفحہ ہر سطر میں نظر آئے گی۔ ان کرداروں میں نظر آئے گی جو فرضی ہونے کے باوجود

[1] رامانند ساگر، اور انسان مر گیا، ص ۸۷، نو ہند پبلیکیشنز لمیٹیڈ بمبئی ۱۹۴۸ء

اصلی ہیں جو ناول میں یکے بعد دیگر مرجانے کے بعد بھی زندہ رہتے
ہیں۔"[1]

غرض رامانند ساگر نے پاکستان سے ہندوستان ہجرت کی لاہور کے واقعات انھوں نے دیکھے اور مہاجروں کے قافلے کو بھی دیکھا۔انھوں نے اس المیے کی دردمندانہ عکاسی اس ناول میں کردی ہے۔

مجموعی اعتبار سے ناول بڑی اہمیت کا حامل ہے جذبات نگاری اس ناول کی سب سے بڑی اہم اور نمایاں خصوصیت ہے کرداروں کے اظہارِ جذبات کا اسلوب دلکش بھی ہے اور اثر انگیز بھی۔اگرچہ ناول کے پلاٹ میں ربط وضبط کم ہے چونکہ فسادات سے متعلق واقعات اور حادثات کو قلمبند کر کے ناول کا خاکہ تیار کیا گیا ہے اور اس کی بنیاد پر ناول لکھا گیا ہے اس لئے اس کے قصے میں فطری ارتقا نہیں ملتا تاہم فسادانی ادب میں رامانند ساگر کے اس ناول کو شاہکار کا درجہ حاصل ہے۔

[1] رامانند ساگر،اور انسان مر گیا،ص ۱۸،نو ہند پبلیکیشنز لمیٹیڈ بمبئی ۱۹۴۸ء)

ٹھاکر پونچھی

ریاست جموں وکشمیر کے ضلع پونچھ سے تعلق رکھنے والے ادیبوں میں بڑا نام ٹھاکر پونچھی کا ہے ٹھاکر پونچھی کا اصل نام سوہن لال تھا لیکن ٹھاکر پونچھی کے قلمی نام سے مشہور ہوئے وہ پونچھ کے ایک راجپوت خاندان میں ۳۱ دسمبر ۱۹۲۲ء کو پیدا ہوئے۔ ان کے والد کا نام ٹھاکر بھیم سنگھ تھا انہیں ورزشی کھیلوں جیسے پولو اور نیزہ بازی میں خاص مہارت حاصل تھی۔ یہی وجہ ہے کہ وہ پونچھ کے راجہ جگت دیو کے عزیزوں میں شامل تھے۔ پونچھ جو اس زمانے میں جموں وکشمیر کی ذیلی ریاست تھی اس کے راجہ ٹھاکر پونچھی کو اپنی محفلوں میں شامل کرتے تھے۔ اس طرح ٹھاکر پونچھی کا بچپن سے ہی محل میں آنا جانا ہونے لگا۔ ان کی تربیت اچھے پیمانے پر ہوئی۔ ابتدائی تعلیم وکٹوریہ جوبلی اسکول میں ہوئی۔ بعد میں کالج کی تعلیم کی غرض سے انھیں پرنس آف ویلیز کالج (حال۔ گاندھی میموریل کالج) جموں میں داخل کیا گیا جہاں سے انہوں نے بی۔اے کی ڈگری حاصل کی۔ اس علاقے میں وہ اردو ادب کا سنہری دور تھا۔ اس دور میں یہاں ادب وثقافت نے نمایاں پیش رفت حاصل کی۔ ایسے ماحول نے بعض اردو ادبا کو پروان چڑھانے میں نمایاں کردار ادا کیا۔ جنہوں نے آگے چل کر اردو ادب اور فن کے مختلف شعبوں میں اہم کارنامے انجام دیے جنہیں فراموش نہیں کیا جا سکتا ٹھاکر پونچھی کو بچپن سے ہی سنگیت اور ادب کا شوق تھا۔ پروفیسر عبدالقادر سروری نے اپنی کتاب ''کشمیر میں اردو'' میں لکھا ہے کہ ٹھاکر پونچھی کا پہلا افسانہ ''راجہ کالج کے رسالہ ''قوی'' میں شائع ہوا۔ اس کے علاوہ دوسرے محققین نے ٹھاکر پونچھی کی پہلی کہانی ''کالکی'' کو بتایا ہے یہ کہانی جموں کے ہفت روزہ چاند میں شائع ہوئی تھی۔ اس کے بعد انہوں نے کئی اور افسانے لکھے جو کشمیر اور بمبئی کے رسالوں میں شائع ہوتے رہے۔

تعلیم سے فراغت پانے کے بعد ٹھاکر کو محکمہ سپلائز میں ایک اسامی مل گئی یہ کام ان کی طبیعت کے مناسب نہیں تھا تاہم وہ کچھ عرصہ تک اس سے وابستہ رہے اور بالآخر ۱۹۴۸ء میں ریڈیو کی ملازمت کے سلسلے میں وہ دہلی چلے گئے لیکن جیسا کہ دیوندر ستیارتھی نے اشارہ کیا ہے کہ دہلی کی زندگی سے ان کو وابستگی پیدا نہ ہو سکی

کیوں کہ جنم بھوم کی یاد اسے بری طرح سے ستاتی ہے بات چیت میں ٹھاکر کشمیر کا ذکر لے بیٹھتا ہے اور کشمیر کا ذکر شروع ہوتے ہی اس کی آنکھوں میں چمک سی آجاتی ہے گاؤں گاؤں پہاڑ پہاڑ گھومنے کی باتیں سناتے ٹھاکر پونچھی پر ایک نشہ سا طاری ہو جاتا ہے وطن کے گاؤں اور پہاڑوں کی یہی محبت ان کے اکثر افسانوں اور ناولوں کا پس منظر بھی ہے۔

جیسا کہ اوپر ذکر آیا ہے کہ وہ تعلیم مکمل کرنے کے بعد محکمہ سول سپلائز میں کچھ عرصہ ملازمت کرنے کے بعد وہ دہلی جا کر آل انڈیا ریڈیو میں کام کرنے لگے تھے اس ضمن میں مالک رام ''تذکرہ معاصرین'' میں لکھتے ہیں:

> ''تعلیم ختم کرنے کے بعد وہ اولاً چندے محکمہ سول سپلائز میں ملازم رہے لیکن ان کی طبیعت کی جولانی کے لئے یہ میدان بہت تنگ تھا۔ وہ محض کلرکی اور بے عملی کی زندگی پر قانع نہیں رہ سکتے تھے مشہور ہے کہ بچپن میں وہ گلی محلے کے بچوں کو ساتھ لے کر ڈرامے کھیلا کرتے تھے اور سب لوگ انھیں ''جتھیدار'' کے نام سے پکارتے تھے اس سے ان کے مزاج کے رجحان کا پتہ چلتا ہے۔ وہ واقعی علمی اور ادبی صلاحیت لے کر آئے تھے چنانچہ جب سول سپلائی کے محکمہ سے دل اچاٹ ہو گیا تو 1948ء میں دلی چلے آئے۔ آدمی وجیہہ اور شکل وصورت کے لحاظ سے اچھے تھے کچھ سفارشوں نے بھی کام کیا ہوگا غرض انھیں یہاں جلد ہی آل انڈیا ریڈیو میں ملازمت مل گئی۔ یہاں وہ ڈوگری نیوز سروس میں سب ایڈیٹر مقرر ہوئے تھے۔''[1]

تقسیم کے سبب دلی اس وقت پنجاب سے آئے ہوئے پناہ گزینوں سے بھری پڑی تھی۔ وہ لوگ یہاں اپنی جان کی امان پانے کے لئے آئے تھے اور جن کے پاس سر چھپانے کے لئے آسمان کی چھت کے سوائے ٹھکانہ نہیں تھا۔ ہر طرح کی مدد کے مستحق اور طلبگار تھے۔ ایسے حالات نے ٹھاکر پونچھی کو کچھ کرنے کے لئے اکسایا کیوں کہ وہ ان حالات سے رنجیدہ ہوئے چنانچہ انہوں نے اپنے کچھ اور فنکاروں کے ساتھ اور ساتھیوں

[1] مالک رام، تذکرہ معاصرین، ص ۱۴۲۔۱۴۱

کے ساتھ مل کر مختلف ڈرامے کئے اور مختلف النوع پروگرام بھی پیش کئے۔ یہاں سے ملنے والی آمدنی کو انہوں نے شرنارتھی ریلیف فنڈ میں جمع کیا۔ یہاں ان کے اندر انسان دوستی جیسے عظیم جذبے کا جوش ملتا ہے ان کے اندر انسان دوستی اور ہمدردی نظر آتی ہے انہوں نے خود اپنے ڈرامے بھی تخلیق کئے جن میں ان لوگوں کی مفلسی کو پیش کیا گیا۔

دلی میں وہ دسمبر ۱۹۷۱ء تک رہے بعد میں اسی عہدے پر ان کا تبادلہ ریڈیو اسٹیشن جموں میں آگیا۔ انہوں نے اردو زبان وادب کے فروغ کے ساتھ ساتھ ڈوگری علم وادب اور کلچر کے فروغ میں نمایاں کام کیا وہ ریاستی اکاڈمی کے رکن بھی تھے۔ انہوں نے اردو میں متعدد افسانے اور ناول تخلیق کئے۔ ان کے بعض ناولوں اور افسانوں کا دوسری زبانوں بنگالی، پنجابی، ملیالم، ہندی میں بھی ترجمہ ہوا ان کے ناولوں کے نام کچھ اس طرح سے ہیں۔ ڈیڈی، وادیاں اور ویرانے رات کے گھونگٹ، شمع ہر رنگ میں جلتی ہے، زلف کے سر ہونے تک۔ چاندنی کے سائے، یادوں کے کھنڈر، پیاسے بادل، اداس تنہائیاں، جب پتھر روتے ہیں، یہ رشتے یہ روگ، پت جھڑ کے بچھڑے، بھنور وغیرہ زندگی کے آخر ایام میں انھوں نے ایک نیا ناول لکھنا شروع کیا تھا ''اب میں وہاں نہیں رہتا'' اسے انہوں نے ۱۴ اگست ۱۹۷۴ء کو مکمل کیا اور آخری صفحے پر لکھا:

''اہنسا پرمو دھرمے

''پرنام''

''سلام''

خدا حافظ

''سب کچھ دور ہے سب کچھ پاس ہے صرف احساس کی بات ہے''

یہ آخری الفاظ لکھ کر وہ سہ پہر میز سے اٹھے اور دفتر سے باہر کچھ کھانے پینے کے لئے گئے سڑک پر پہنچے ہی تھے کہ ایک تیز رفتار جیپ ان سے ٹکرا گئی دماغ کو شدید ضرب آئی جس سے بیہوش ہو گئے فوراً شری مہاراجہ گلاب سنگھ ہسپتال پہنچایا گیا جہاں اسی بیہوشی کے عالم میں جمعہ ۱۶ اگست ۱۹۷۴ء صبح طائر روح قفسِ عنصری سے پرواز کر گیا۔ موت سے کوئی تین مہینے پہلے سے انھوں نے ''کہانی ختم'' اور ''مقدمہ ختم'' کے الفاظ کو اپنا تکیۂ کلام بنالیا تھا۔ اس وقت انھیں کیا معلوم ہوگا کہ واقعی اتنی جلد ان کی جیون کہانی یا قصۂ حیات ایسے المناک طریقے پر

اختتام تک پہنچنے والا ہے۔ ۱۹۴۶ء میں پونچھ کے وزیر خاندان میں شادی ہوئی تھی لیکن بیوی سے نبھ نہ سکی اور کوئی ڈیڑھ دو سال میں علیحدگی ہوگئی لا ولد فوت ہوئے وہ ہر کسی کے دوست، ہمدرد اور غمخوار تھے ان کے جنازے کے ساتھ زندگی کے ہر شعبے سے تعلق رکھنے والے لوگوں کا جو ہجوم تھا اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ اپنے اخلاق، کردار۔ سیرت اور ادبی کارناموں کی وجہ سے بے پناہ عوامی مقبولیت رکھتے تھے۔

رات کے گھونگھٹ:

ٹھاکر پونچھی کا پہلا ناول ہے یہ ناول ۱۹۶۰ء میں شائع ہوا۔ ریاست کے ادبی حلقوں میں اس کی کافی پذیرائی ہوئی یہ ناول شروع سے آخر تک دلچسپیوں کا مرقع ہے سماج کے ٹھیکیداروں کے راز فاش کئے گئے ہیں ٹھاکر پونچھی نے حقیقت کو ہو بہو نقل کیا ہے ٹھاکر پونچھی کے ناولوں کی اس خصوصیت پر روشنی ڈالتے ہوئے جان محمد آزاد لکھتے ہیں:

> ''ٹھاکر پونچھی نے اس ناول میں سماج کے حسین چہرے سے پارسائی کے رنگین گھونگھٹ الٹ دیئے ہیں۔ ناول کا ہر باب ایک ایسی شوخی رومانی داستان ہے جسے پڑھ کر عش عش کر اٹھتے ہیں مصنف نے حقائق کو عدیم المثال فن کاری اور بے باکی سے پیش کیا ہے۔''[۱]
>
> ''رات کے گھونگھٹ'' ان فرشتوں کی کہانی ہے جنھیں نئے نظام کی تاریک راتوں نے جنم دیا ان انسانوں کی کہانی ہے جنہیں نئے نظام کے اجیالے دنوں نے موت کے گھاٹ اتارا۔ رات کو جو گھونگھٹ اوڑھے پھرتے ہیں ان ہی کے خدوخال ابھارے ہیں۔''[۲]

رات کے گھونگھٹ ناول 55 ابواب پر مشتمل ہے اس ناول میں ٹھاکر پونچھی نے سماج کے چہرے سے پارسائی کے پردوں کی نقاب کشائی کرنے کی کوشش کی ہے ناول میں مختلف کردار ہوتے ہیں جو بظاہر دن میں نیکی اور شرافت کا لبادہ اوڑھے رہتے ہیں اور رات میں وہ اپنے اصلی رنگ و روپ میں نظر آتے ہیں۔ اس طرح

۱؎ جان محمد آزاد، ریاست جموں وکشمیر کے اردو مصنفین، ص ۴۴۰

۲؎ ٹھاکر پونچھی، رات کے گھونگھٹ، ص ۱۲

کہانی آگے بڑھتی ہے یہ ناول سجاد ظہیر کے مشہور ومعروف ناول کی طرح ایک رات کے واقعے پر مبنی ہے اس ناول کے ہر باب سے رومانیت کا رنگ جھلکتا ہے سماجی حقائق کو سامنے لانے کے لئے ٹھاکر پونچھی نے بہت ہی بے با کی اور فنکارانہ طریقے سے کام لیا ہے اس ناول کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ اس میں مرزا محمد ہادی کے مشہور ناول ''امراؤ جان ادا'' کی تکنیک سے بھی فائدہ اٹھایا گیا ہے ہادی رسوا نے جس طرح اپنے ناول کے مختلف کرداروں کو امراؤ جان ادا کے کوٹھے پر جمع کیا ہے اسی طرح ٹھاکر پونچھی نے اس ناول کے کرداروں کو کاسمو ہوٹل میں جمع کر کے کہانی کا تانا بانا تیار کیا ہے۔ٹھاکر پونچھی نے خود لکھا ہے:

> ''اس ناول میں مختلف کرداروں کی کہانیاں ہیں۔ان کا مرکز ایک ہے
> لیکن راستے مختلف ہیں۔ یہ صرف ایک رات کی بات نہیں بلکہ پورے
> سماج کی بات ہے۔ پورے ماحول کا داغ ہے پوری تہذیب کا سہاگ
> اجلے سفید ریشمی گھونگھٹ میں سیاہ چہرے ہیں۔''[1]

ٹھاکر پونچھی نے کاسمو ہوٹل کے پس منظر میں مختلف کرداروں کے ذریعے سے نئے سماج میں پنپ رہے ناسور کی طرف اشارہ کیا ہے شہر کے جس مقام پر ہوٹل واقع ہے ناول نگار نے اس کے پس منظر میں جن چیزوں کو ابھارا ہے وہ پورے سماج کا ترجمان بن جاتا ہے۔اس ناول میں ٹھاکر پونچھی نے واحد متکلم کی تکنیک کا استعمال کیا ہے ناول نگار نے سماج کے عزت دار اور دولت مند لوگوں کے چہرے سے نقاب ہٹانے کی کوشش کی ہے تا کہ ان کے اصلی چہروں سے بھی لوگ واقف ہو جائیں۔ ناول نگار یہ دکھانا چاہتے ہیں کہ کس طرح ایک انسان دن رات میں مختلف نظر آتا ہے دن کے اجالے میں جو لوگ فرشتہ صفت نظر آتے ہیں وہ کاسمو ہوٹل میں داخل ہو کر کس طرح سے انسانیت کے منصب سے گر کر جانور بن جاتے ہیں اور رات ختم ہونے کے ساتھ ہی وہ پھر فرشتہ صفت بن جاتے ہیں۔ ناول میں سب سے پہلے کنور صاحب کا کردار آتا ہے جو جاگیر دارانہ ماحول کی ترجمانی کرتا ہے جاگیرداروں کے یہاں جو دولت کی ریل پیل اور فراوانی دکھائی دیتی ہے وہ سب کنور صاحب کے ہاں بھی نظر آتی ہے۔دولت اور جاگیر کے علاوہ ایسے لوگوں کے پاس رقص وموسیقی اور عیش وعشرت کے تمام سامان بھی موجود ہوتے ہیں ٹھاکر پونچھی نے کنور صاحب کا تعارف کچھ یوں کرایا ہے:

---

[1] ٹھاکر پونچھی، رات کے گھونگھٹ، ص۱۲

''شہر میں ان کے بہت سے ٹھکانے تھے۔ بہت سے اڈے تھے۔ جن
کے چراغ ان ہی کے ہاتھوں جلتے جوا ہوتا، رقص و موسیقی کی محفلیں
جمتیں۔خرید وفروخت ہوتی۔ پرانے اڈے اجاڑ کر نئے تعمیر کئے جاتے
جا گیردارانہ ماحول میں شراب اور عورت رقص وموسیقی لازم وملزوم ہیں
کنور صاحب جنوں کی حد تک ان کے شیدائی تھے۔''[1]

''رات کے گھونگھٹ'' ناول میں ٹھا کر پونچھی نے کنور صاحب کا کردار تراش کر ناول میں ان تمام جا گیرداروں کی ترجمانی کی ہے۔ جنھوں نے مال و دولت کی غرض سے مفلس اور غریب عوام کا خون چوسا غریب مزدور اور مفلس لوگ دن بھر ان جا گیرداروں کے کھیتوں میں کام کرتے اور بدلے میں انہیں دو وقت کی روٹی بھی پیٹ بھر کر نصیب نہیں ہوتی تھی ہوٹل میں داخل ہونے والے پہلے آدمی کنور صاحب ہی ہیں ان کے آنے کے ساتھ ہی زندگی کروٹ لینے لگتی ہے رقص و سرور کی محفل شروع ہوتی ہے جن سے کنور صاحب بھر پور لطف لیتے ہیں کنور صاحب اور ان جیسے ہزاروں جا گیرداروں کا یہی معاملہ ہے انہیں ان لوگوں کے دکھ درد میں کوئی دلچسپی نہیں۔ بس وہ دولت کو ترجیح دیتے ہیں ناول میں پروفیسر نارائن دت بھی اسی شکستہ تہذیب کا نمائندہ ہے پروفیسر کی عمر تیس سال کی ہے یہ پروفیسر کالج کی چار دیواری میں مکمل طور پر پروفیسر نظر آتا ہے کالج کے اندرونی حصے میں وہ ہر ایک سے گھل مل جاتا ہے وہ کسی کو نہیں پہچانتا اور ہر روز وہ سورج ڈھلتے ہی بھاگ کر اسی ہوٹل میں داخل ہوتا ہے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یہ پروفیسر بھی تقسیم کے سانحے کا شکار ہے کیوں کہ وہ اپنا سب کچھ کھو بیٹھا ہے جب وہ گھر سے بھاگا تھا تو صرف اپنی بیوی کو اپنے ساتھ لے کر آیا تھا لیکن وہ بیوی پروفیسر کی شخصیت میں کوئی کشش نہ پا کر کسی اور کے ساتھ بھاگ جاتا ہے جس سے پروفیسر پر کوئی گہرا اثر نہیں ہوتا۔ اقتباس ملاحظہ ہو:

''باپ بھاگ گیا۔لکڑی کی منڈی بھاگ گئی۔ لاکھوں کا کاروبار بھاگ
گیا۔ وہ کالج بھاگ گیا جس میں وہ پروفیسر تھا وہ لوگ بھاگ گئے جن
میں رہتا تھا۔ وہ سڑکیں بھاگ گئیں جن پر گھوما پھرا کرتا تھا تو پھر بیوی

[1] ٹھا کر پونچھی۔رات کے گھونگھٹ،ص ۲۰

بھاگ جانے پر کون سی حیرت کی بات ہے۔''[1]

''رات کے گھونگھٹ'' ناول میں اور بھی کئی نئی تہذیب کے نمائندے نظر آتے ہیں جو اپنے کرتو توں اور اعمالوں کی وجہ سے کئی چہرے لے کر چلتے پھرتے اس ہوٹل میں آتے جاتے رہتے ہیں مسٹر کپاہی اور لالہ گھسیٹ رام چونے والے جو پیشے سے ٹھیکیدار ہیں اور سرکاری کاموں میں اتنا لوٹ کھسوٹ کرتے ہیں کہ ان کا شمار شہر کے امیر ترین اور ذی عزت ٹھیکداروں میں ہوتا ہے ناول میں ایسے ٹھیکیداروں اور سیاست دانوں کے چہرے سے بھی پردے ہٹانے کی کامیاب کوشش کی گئی ہے دراصل ٹھیکدار اور سیاست دان کا آپس میں چولی دامن کا ساتھ ہے ٹھیکدار سیاسی لیڈروں سے مل کر کمیشن پر ٹھیکہ لیتے ہیں اقتباس دیکھئے:

''یہ رئیس لوگ ہیں شہر کے بہت بڑے ٹھیکیدار۔ نئی سڑکیں، نئی عمارتیں اور نئے پل ان ہی کے زیر سایہ بن رہے ہیں ان کے کام کی بنیادیں اشترا کی اصولوں پر رکھی گئی ہیں۔ مل بانٹ کر کھاتے ہیں ان کی اپنی نئی پرانی گاڑیاں ہیں اپنے بینک ہیں۔ اپنے اخبار ہیں۔ اپنے انجینئر ہیں دفتروں میں خوبصورت لڑکیاں کام کرتی ہیں یہ شہر کے بہت بڑے آدمی ہیں۔ شہر ان کے بغیر خالی ہے اور یہ شہر کے بغیر کھوکھلے۔ آج کے دور میں سیاست اور ٹھیکداری کا چولی دامن کا ساتھ ہے دونوں لازم وملزوم سیاست بذات خود ٹھیکداری ہے اور ٹھیکیداری سیاست اسی لئے ان میں سے ہر کوئی کسی نہ کسی سیاسی حماقت سے ضرور منسلک ہے۔''[2]

اس ناول میں مہاشہ دیال سرن کا کردار سیاستدانوں کے مکروفریب والے چہروں کی نقاب کشائی کے لئے تراشا گیا ہے مہاشہ دیال سرن لالہ گھسیٹا رام چونے والے کی طرح ہی سادہ لباس پہنتے ہوئے نظر آتے ہیں لیکن وہ اپنی سیاسی چالوں سے عوام کو خوب دھوکہ دیتے ہیں وہ ہر الیکشن میں موجودہ سیاست دانوں کی طرح عوام کو مختلف قسم کی لالچ اور وعدے کر کے کامیاب ہوتا ہے لیکن عوام اور عام انسان کی حالت میں کوئی فرق اور

[1] ٹھاکر پونچھی، رات کے گھونگھٹ، ص ۴۳

[2] ٹھاکر پونچھی۔ رات کے گھونگھٹ، ص ۴۷

بہتری نہیں آتی اس کے علاوہ ہوٹل میں آنے جانے والے لوگوں میں شاعر اور افسانہ نگار بھی شامل ہیں لیکن یہاں پر آنے والے سب لوگ ان کے منہ نہیں لگتے۔ ان سے ہر کوئی دوری بنائے رکھنا چاہتا ہے کیوں کہ وہ اپنے الفاظ کی جادوگری سے حقیقت کو لوگوں کے سامنے لا سکتے ہیں ساتھ ہی ناول میں ایسے کئی صحافی بھی ہیں جو پیسے کی خاطر اپنے فن اور ذمہ داریوں کو بالائے طاق رکھ دیتے ہیں۔

ہوٹل میں ہونے والے کرداروں میں کئی نسوانی کردار بھی شامل ہیں رانی ہوٹل میں داخل ہونے والی پہلی لڑکی ہے رانی ایسی لڑکیوں کی ترجمانی کرتی ہے جو عام اور سیدھی سادی تو نظر آتی ہیں لیکن زمانے نے جنھیں خودغرض اور جسم فروش بنا دیا ہے رانی محبت بھی کرتی ہے اور دھوکہ بھی کھاتی ہے۔ رانی کی محبت موجودہ دور کی محبت ہے جو ہوٹلوں میں پروان چڑھتی ہے رات کی سیاہی جس کی گواہ ہوتی ہے جسے سماج کے ظالم ہاتھ مجبور کرتے ہیں کہ وہ محبت کے جال میں پھنس جائے اور پھر لوگ اسے دھوکہ دے کر اس کی زندگی کو ویران کر جاتے ہیں غرض ''رات کے گھونگھٹ'' میں ٹھاکر پونچھی نے ایک ایسے سماج کی عکاسی کی ہے جس میں ذی عزت اور نفاست پسند لوگوں کے چہروں کی نقاب کشائی کی گئی ہے۔ اور ان کے اصلی روپ ظاہر ہو جاتے ہیں۔ جاگیرداروں کی طرف سے غریب اور مفلس عوام پر کئے جانے والے ظلم اور لوٹ مار کی ایک مکمل تصویر کشی کر کے ٹھاکر پونچھی نے حقیقت واضح کی ہے۔

شمع ہر رنگ میں جلتی ہے:

ٹھاکر پونچھی کا دوسرا ناول ہے یہ ناول ایک مصور کی کہانی ہے اس مصور کا نام ویریندر بابو ہے اس کے ساتھ ہی راجیش بھی کہانی کا اہم کردار ہے وہ ویریندر بابو سے پہلی ہی ملاقات میں اس کا دوست بن جاتا ہے یہ ناول دراصل ایک مصور کا المیہ ہے اس میں ان کا درد و کرب اور سماج کے ہاتھوں ان پر روا رکھے جانے والے سلوک کی کہانی کو بہترین انداز میں پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے اس ناول کے موضوع کے متعلق جان محمد آزاد اپنی کتاب میں لکھتے ہیں:

> ''یہ ان مردوں کی کہانی ہے جو عورت کو ایسے عریاں انداز میں دیکھنے کی تمنا کرتے ہیں جس پر سے نظریں پھسل پھسل جائیں اس تخلیق میں ایک اجڑی ہوئی تہذیب کا سارا درد سمٹ آیا ہے یہ ایک نوجوان کا قصہ ہے

جس کے ہاتھوں نے عورت کو حسن بخشا اسے خاتون خانہ بنادیا۔‘‘[1]

مصور اور کہانی کار جب تک اپنے فن میں حقیقی زندگی اور داخلی احساسات و جذبات کی ترجمانی کرتے رہے انہیں کوئی بھی مدح یا خریدار نہیں ملتا ہے جب یہی مصور اور کہانی کار سچائی اور فن برائے فن کے نظرئے کے نظرئے کو قربان کرتے ہیں بناوٹ اور تصنع کا لباس اوڑھ لیتے ہیں اور اپنے فن میں ظاہری نمائش اور عورت کے حسن کو عریاں کرتے ہیں تو پوری دنیا ان کے لئے زندہ ہو جاتی ہے پوری دنیا ان کی تعریف کرتی ہے ان کے فن کی داد اور تعریف میں زمین و آسماں ایک کر دیتے ہیں فن کاروں کی یہ حالت آج بھی ہمارے سامنے موجود ہے کتنے ہی بہترین فنکار گمنامی کی زندگی گزار رہے ہیں۔ دنیا ان کے کام اور فن پاروں کی کوئی قدر نہیں کرتی کیوں کہ ان میں حقیقت اور تقدس ہوتا ہے۔ ان میں سطحی جذباتیت نہیں ہوتی جب کہ سطحی اور بناوٹی فنکاروں کو دنیا کے لوگ ترجیح دیتے ہیں اور انہیں کے قائل ہو جاتے ہیں۔

ناول کی شروعات سے ہی مصور اور کہانی کار کے فلسفۂ فن اور فلسفۂ حیات پر سیر حاصل بحث کرتے ہیں کہانی کار جب تک اپنی کہانیوں کو خون جگر سے سینچتا ہے اس کا کوئی بھی مداح یا خریدار نہیں بنتا اور جیسے ہی داخلی دنیا سے نکل کر خارجی دنیا میں قدم رکھتا ہے تو عریانیت و شہوانیت ان کی کہانیوں کا مرکز بن جاتی ہے ساری دنیا ان کی کہانیوں کو بڑے شوق سے خریدتی ہے یوں وہ کچھ مدت میں ایک کامیاب کہانی کار بن جاتا ہے۔ لیکن اسے سکون کی زندگی میسر نہیں آتی ہے اسی فلسفے کو اس میں ان کرداروں کے ذریعے پیش کیا گیا ہے اقتباس ملاحظہ ہو:

> ’’ایک دن تم اپنی کہانیاں بیچ کر گزارہ کرتے تھے ویریندر بابو نے زبان سے کہنا شروع کیا لیکن خوش تھے فٹ پات پر سویا کرتے تھے لیکن آرام کی نیند سوتے تھے۔ میلا کچیلا لباس پہنتے تھے لیکن دھلے دھلے سے دکھائی دیتے تھے۔ آج تمہارے پاس نوٹوں کے بنڈل ہیں۔ بہت بڑی کوٹھی ہے۔ سفید اجلا لباس ہے ہر طرف کی بھوک مٹانے کا سامان ہے پھر بھی تم خوش ہو، نہ تمہیں نیند آتی ہے اور نہ چہرے پر پہلی سی شگفتگی ہے۔‘‘[2]

---

[1] جان محمد آزاد جموں و کشمیر کے اردو مصنفین، ص ۴۴۰

[2] ٹھاکر پونچھی، شمع ہر رنگ میں جلتی ہے، سحر ہونے تک، ص ۲۶

مصور اور کہانی کار مختلف مسائل جیسے فن کے لوازمات، ادب پر بحث کرتے ہیں دونوں کے خیالات میں قطبین کا فرق ہے چتر کار اپنی زندگی کی آخری سانس تک فن کو پیسے اور دولت وشہرت کے لئے قربان کرنے کے حق میں بالکل بھی نہیں ہے جب کہ کہانی کار اپنے فن کو اپنے پیٹ کی آگ بجھانے اور دنیا میں دولت وشہرت کمانے کا ذریعہ سمجھتا ہے دونوں کردار اس سماج کے ٹھکرائے ہوئے ہیں جہاں ظاہری اور بناوٹی چیزوں کی اہمیت ہے کہانی کار پہلے ہی اپنے فن سے سمجھوتہ کرلیتا ہے جب کہ مصور ویریندر بابو آخر وقت تک اپنے فن کے ساتھ کسی بھی طرح کا سمجھوتہ کرنے کے لئے تیار نظر نہیں آتا ہے وہ اس معاملے میں سنجیدگی کا مظاہرہ کرتا ہے۔

ٹھاکر پونچھی نے اس ناول میں جذبات نگاری سے بھی کام لیا ہے دونوں کردار وقت کے ہاتھوں کس طرح مجبور ہوجاتے ہیں کہانی کار راجیش کے خیال میں پیٹ کی بھوک سب سے بڑا مسئلہ ہے اس لئے کھانے کے لئے مرد اپنا ضمیر بھی بیچ دیتا ہے جب کہ ویریندر بابو اس کے برعکس سوچتا ہے کیوں کہ وہ ایک آرٹسٹ ہے اس لئے چاہتا ہے کہ کاش پورے ملک کے لوگ آرٹ اور آرٹسٹ کی قدر کرتے اور سماج میں آرٹ کی اہمیت سے آگاہ ہوجاتے اس کے جذبات کی یہاں یہ مثال دلیل کے لئے پیش کی جاتی ہے:

''آرٹ کی کتنی قدر و قیمت تھی۔ وہ سوچتا، کاش، وہ قدر و قیمت سارے ملک میں آرٹ کی اجیالی دھوپ کھلی ہوتی۔ گوشے گوشے میں اس کے قدر دان ہوتے اور پھر ملک کا کلا کار پانی کلا پر زندہ رہتا کہانی کار اپنی کہانی پر اور شاعر اپنی شاعری پر زندہ رہتا۔''[1]

ویریندر بابو آرٹ اور فن سے دیوانگی کی حد تک محبت اور لگاؤ کے علاوہ روپ نامی لڑکی سے محبت بھی کرتے ہیں۔ ناول میں کئی ایسے مواقع آتے ہیں جہاں پر وہ اپنی محبت کو حاصل کر سکتے تھے لیکن ناول نگار نے اس مرکزی کردار کو روپ کے ساتھ زندگی گزارنے سے باز رکھا۔ روپ کے کردار کو ناول نگار نے کافی محنت اور لگن سے تراشا ہے۔ وہ محبت کرتی ہے اور اپنی محبت کو حاصل بھی کرنا چاہتی ہے وہ اپنے والد سے ویریندر بابو کے فن کی تعریف اس لئے کرتی ہے کہ وہ اپنی محبت کو پا سکے۔ اگرچہ کچھ دیر کے لئے اس کے والد منع کرتے ہیں لیکن روپ کی ضد کے سامنے وہ ہار مانتے ہیں لیکن ناول کا ہیرو اپنی محبت کی ناکامی کا ذمہ دار خود ہوتا ہے وہ

[1] ٹھاکر پونچھی، شمع ہر رنگ میں جلتی ہے، ص۴۰

روپ کے گھر جانے اوران کے والدین سے ملاقات کرنے کے بجائے کسی نامعلوم جگہ فرار ہو جاتا ہے کیوں کہ اسے ڈر ہوتا ہے کہ کہیں روپ اسے ٹھکرانہ دے۔روپ کا کردار بہت اہم ہے روپ کی نفسیاتی کیفیات کا بیان اہمیت کا حامل ہے کیوں کہ اس نے آج تک جتنے بھی کلاکاروں کو دیکھا۔اسے ان کے فن اوران کی زندگی میں کافی تضادنظر آیا۔معصوم حسین خیالوں کے خالق جسمانی طور پراور روحانی طور پر کتنے بدصورت ہوتے ہیں اس کا تجربہ اسے خوب تھا لیکن ویریندرکواس لئے دل وجان سے چاہتی ہے کہ وہ سب فنکاروں سے الگ تھا۔

اس ناول میں ویریندر کا کردار بھی کافی اہم ہے وہ ایک فن کار ہے تصویر کشی کا فن اسے بخوبی آتا ہے وہ اپنے فن کواپنے خون جگر سے پروان چڑھاتا ہے وہ اپنے فن کے لئے راتوں کی نیند حرام کر دیتا ہے لیکن سماج میں اسے وہ عزت اور وقار نہیں ملتا جس کا وہ مستحق تھا۔اس اعتبار سے وہ خود کو دنیا کا سب سے ناکام فنکار سمجھتا ہے وہ اپنی تصاویرفروخت کرنا چاہتا ہے تاکہ اپنی ضروریات زندگی کو پورا کر سکے لیکن ہر بار دولت مند تاجر سیٹھ اس کی تصویریں خریدنے سے انکارکرتے ہیں۔ایک اقتباس دیکھیں:

> ''ویریندر بابو چاہتا تھا ڈاک گھر بند ہونے سے پہلی ہی اسے اپنی محبت کی قیمت مل جائے۔تاکہ وہ اپنی بہن کی راکھی کے دس روپے بھجوا سکے۔کئی بار وہ سیٹھ کے پاس تصویریں لے کر گیا تھا ہر بار اسے ایک ہی جواب ملا۔ ذرا اور ابھارو۔''[1]

ویریندر بابودراصل فنکاروں کے اس گروہ کی ترجمانی کرتا ہے جوفن کومقصدیت اور روحانیت کا سب سے بہترین آلہ سمجھتے ہیں اسی وجہ سے ایسے فنکاروں کی موجودہ سماج میں کوئی قدر و قیمت نہیں ہوتی۔ناول کا یہ کرداراس کشمکش میں مبتلا ہے کہ وہ دووقت کی روٹی کے لئے اپنے فن کوقربان کر دے یا پھر اپنے ہی فلسفہ پر قائم رہے۔جس فن کے لئے اس نے اپنا خون جگر صرف کیا تھا اسی فن کوسرعام ٹھکرادیا جاتا ہے۔ویریندر بابو کے فن میں پاکیزگی اور سادگی تھی۔وہ شہوانیت اور عریانیت سے بہت دور تھے۔اقتباس دیکھیں:

> ''اب کی بار وہ تینوں تصویروں کو بنا سنوار کے سیٹھ کے پاس گیا تھا اب کی بار بھی وہی جواب ملا۔اس کے جی میں آیا کہ ان تصویروں کوسیٹھ کے گنجے

[1] ٹھاکر پونچھی،شمع ہر رنگ میں جلتی ہے،ص۸۹

سر میں پٹک دے اور اپنے ہاتھوں کو کاٹ کاٹ کر کھا جائے تا کہ دوبارہ
کوئی چند روپیوں کے عوض عورت کے تقدس کو عریاں کرنے کا حکم نہ
دے۔''[1]

سماج میں جب ویریندر بابو سے بار بار اسی طرح کی فرمائش کی جاتی ہے جو ویریندر بابو کے ضمیر کے خلاف ہے تو ایسے میں ویریندر بابو سیٹھ کی بات مان کر اپنے فن کو ذاتی مقاصد کے ہاتھوں قربان کر دیتا ہے اور اس طرح ایک اچھے اور سچے فنکار کی موت ہو جاتی ہے اب وہ اپنے فن میں صرف ان ہی چیزوں کو پیش کرتا ہے جن کو سماج پسند کرتا ہے اس طرح وہ اپنے اندر کے فنکار کو خود اپنے ہی ہاتھوں سے مار دیتا ہے وہ کہانی کار راجیش سے کہتا ہے:

''ہاں، آتما کی بھوک مٹانے کے لئے، ویریندر بابو نے اسی رو میں
جواب دیا۔ میں جانتا تھا تم طنز کرو گے لیکن چلتے چلتے اس دوراہے پر پہنچ
کر میں نے یہی نتیجہ اخذ کیا ہے کہ تمہارا راستہ صحیح ہے۔ آرٹ نام کی چیز
کی ابھی قدر نہیں۔ دو برس کی ٹھوکر نے مجھے سکھایا ہے۔ اپنے آپ کو زندہ
رکھنے کے لئے، اپنے آرٹ کو زندہ رکھنے کے لئے کوئی ایسا راستہ اپنانا ہی
پڑے گا جو ہر لحاظ سے گھٹیا ہو۔''[2]

اس طرح یہ ناول ایک بڑے فنکار کی ناکامی اور نامرادی پر ختم ہو جاتا ہے ناول کی زبان کافی سلیس اور عام فہم ہے ناول کا پلاٹ بھی کافی چست ہے شروع سے آخر تک ناول قاری کو اپنی گرفت میں رکھتا ہے واقعات فطری طور پر رونما ہوتے ہیں بظاہر یہ ناول ایک مصور اور ایک کہانی کار کی ناکامی معلوم ہوتا ہے لیکن اصل میں یہ ناول اس سماج کی عکاسی کرتا ہے جو اندر سے کھوکھلا ہے بناوٹ اور تصنع کو جہاں ترجیح دی جاتی ہے اور اچھے فنکار کی فنکاری کا کوئی خیال نہیں رکھتا۔ سماج کے ہاتھوں ہو کر ایک فنکار فن پر بناوٹ و شہوانیت اور عریانیت کا لبادہ اوڑھ لیتا ہے اسے ٹھاکر پونچھی نے اپنے ناول میں بہت خوبصورتی سے پیش کیا ہے۔

---

[1] ٹھاکر پونچھی۔ شمع ہر رنگ میں جلتی ہے، ص۹۰

[2] ٹھاکر پونچھی۔ شمع ہر رنگ میں جلتی ہے۔ ص۱۰۲

قفس اداس سے:

ٹھاکر پونچھی کا تیسرا ناول ہے ناول میں کہیں بھی سن اشاعت درج نہیں یہ ایک نیم سوانحی ناول ہے جس میں ٹھاکر پونچھی نے اپنے ایک عظیم دوست ملک کے بہترین مصور اور قلم کار غلام رسول سنتوش کی حالات زندگی کو ناول کے روپ میں ڈھالنے کی کوشش کی ہے اور اس بہترین کوشش میں وہ کامیاب بھی نظر آتے ہیں غلام رسول سنتوش کا تعلق بھی ریاست جموں و کشمیر سے ہے جن کا ایک ناول ''سمندر پیاسا ہے'' ان کی اپنی ہی زندگی کے متعلق ہے۔ اس ناول کے بارے میں اگلے باب میں بحث کی جائے گی ٹھاکر پونچھی کے ناول ''قفس اداس ہے'' اور غلام رسول سنتوش کے ناول ''سمندر پیاسا ہے'' دونوں کے مطالعے کے بعد یہ کہا جا سکتا ہے کہ ٹھاکر پونچھی نے اپنا ناول ''قفس اداس ہے'' ''سمندر پیاسا ہے'' کو سامنے رکھ کر لکھا ہے دونوں ناولوں میں پلاٹ کی ترتیب اور کہانی قریب قریب ایک جیسی ہے اس کے ساتھ ہی دونوں ناولوں میں واحد متکلم کی تکنیک کے سہارے کہانی بڑھتی جاتی ہے مرکزی اور دوسرے کردار بھی ایک جیسے ہیں ناول میں جو واقعات پیش کئے گئے ہیں وہ بھی قریب قریب زماں و مکاں کے اعتبار سے ایک ہیں۔ ''قفس اداس ہے'' ناول کی کہانی کچھ اس طرح سے ہے کہ ایک سنتوش نامی کردار بچپن سے ہی باپ کی محبت اور شفقت سے محروم رہا ہے کیوں کہ گھر کے حالات ایسے تھے کہ باپ کو اپنے بچوں کا پیٹ پالنے سے فرصت نہیں ملتی تھی۔ اس میں کوئی دورائے بھی نہیں کہ غریبی میں انسان کو اپنے بیوی بچوں کا خیال نہیں رہتا ناول کا یہ کردار بھی غریبی کا شکار ہے اور پیار و محبت سے کوسوں دور یہی وجہ ہے کہ وہ اپنے بچوں کو ان کے جائز حق سے محروم رکھتا ہے جس کی وجہ سے اس کے بیٹے سنتوش کے کرادر میں تلخی پیدا ہو جاتی ہے اس کردار کے متعلق اقتباس دیکھیں:

> ''میں نے اپنے باپ کو حقیقی باپ کے روپ میں کبھی بھی نہیں دیکھا جب بھی دیکھا پولیس کی وردی میں سپاہی یا تھانیدار ہی دیکھا۔ مجھے اپنے باپ کی مہربان گود نہیں ملی جس کے لئے بچپن روتا ہے لڑکپن ترستا ہے پھر بھی مجھے اس سے بے حد پیار تھا۔ آج تک ہے۔ اس کی موت میری زندگی کا ایک ایسا المیہ ہے جسے آج تک نہ بھول سکا اس لئے نہیں کہ وہ ایک باپ کی موت تھی۔ ایک چھوٹے سے پریوار کی موت تھی بلکہ اس

لئے کہ وہ ایک غریب معصوم باپ کی اپنے حالات کی طرح ایک
بدصورت موت تھی جس نے مجھے غربت کا احساس دلوایا جس نے مجھے
ہمیشہ کے لئے زندگی کی حقیقی حسرتوں سے دور رکھا۔''

اگلے اقتباس میں بات جاری رکھتے ہوئے:

''وہ اپنی مجبوریوں کا انسان تھا، ایک غریب باپ تھا۔ چاہتے ہوئے بھی
اپنے بچوں سے پیار نہ کرسکتا تھا۔ مجھے معلوم نہ تھا۔ ماں باپ مر بھی
جاتے ہیں کافی مدت کے بعد معلوم ہوا میں نے سوچ رکھا تھا کہ خالق کبھی
نہیں مرتا ہمیشہ زندہ رہتا ہے کتنی بڑی بھول تھی۔''

ا ٹھاکر پونچھی۔ قفس اداس ہے، ص ۹، ۸۔ مشورہ بک ڈپو دہلی

یہ ناول دراصل ایک دکھ بھری کہانی ہے جس کے لفظ لفظ میں مصنف کا حساس اور دردمند دل دھڑک رہا ہے اور جس کی دھڑکن مصنف کی لازوال انسانیت کی ضامن ہے سنتوش کی زندگی کے دکھ درد کو مصائب و آلام کو ٹھاکر پونچھی نے خوبصورت اور بہترین تصویر کشی کی ہے سنتوش جو باپ کی محبت سے باپ کی زندگی میں بھی محروم رہا باپ کی موت کے بعد اور بھی مصیبتوں اور پریشانیوں نے اسے گھیر لیا۔ اپنی ماں اور بھائیوں کے لئے کافی محنت ومشقت کے بعد کام شروع کرتا ہے لیکن وہ محبت میں ہمیشہ ناکامی پاتا ہے جوان ہوکر وہ کسی لڑکی سے محبت کرتا ہے جسے سماج کے ظالم ہاتھ چھین لیتے ہیں گویا سنتوش میں اس سماج سے بغاوت کے جذبات جنم لیتے ہیں اسے مجبور کیا جاتا ہے کہ وہ اپنی محبت کو بھول کر اپنی ماں، بھائی اور وادی کو چھوڑ کر کسی جگہ چلا جائے۔ اس کی غلطی صرف یہ ہوتی ہے کہ وہ ایک ہندو لڑکی کی جو اسی کے محلے میں رہتی ہے اس سے محبت کرتا ہے لیکن سماجی بندشوں کے آگے وہ مجبور ہوتا ہے سماج کے تناظر میں یہ اقتباس دیکھیں:

''میں نے ایسا ہی سنا اور سمجھا تھا لیکن اب معلوم ہوگیا کہ نام ہماری
زندگیوں کے لئے کتنا بڑا بوجھ ہیں نام نہ ہوتا تو سماج نہ ہوتا۔ نام نہ ہوتا تو
کوئی مذہب نہ ہوتا کوئی دنیاوی بکھیڑا نہ ہوتا۔ ہم ہر چیز کو نام دے دیتے
ہیں۔ آزاد روحوں پر مختلف اور مخصوص نام چسپاں کرکے انہیں آہنی

زنجیروں میں جکڑ دیتے ہیں انسان میں تفریق اورنفرت کی طرح ڈال
دیتے ہیں۔انسان کتنا ایک جیسا ہےلیکن نام کتنے مختلف ہیں۔اب میں
جانتا ہوں اب میں اس بات کا قائل ہوگیا ہوں کہ نام میں ہی سب کچھ
رکھا ہے دنیا میں نام ہے۔''[1]

ناول کا ہیرو کہیں اپنے وجود پر بھی سوال اٹھاتا ہے خود کو منحوس کا نام دیتا ہے کیوں کہ جس طرح سے بھی وہ اپنے درد کو مٹانے کی کوشش کرتا ہے سب رائیگاں جاتا ہے۔

''میں نے مصور بننا چاہا ناکام رہا میں نے اپنے دل کا درد بیان کرنے
کے لئے شاعری کا سہارا لیا وہ بھی ایک دردناک چیخ کے سوا کچھ نہ نکلی۔
اب میں ایک مایوس اور ناامید انسان ہوں میں بہت کچھ بننا چاہتا تھا بن
سکتا تھا نہ جانے کیوں، خوش آئند زندگی کا آنچل ہی ہاتھ نہیں آتا۔اب
دوڑ بھاگ کر تھک ہار گیا ہوں۔درحقیقت میرا وجود ہی منحوس ہے میرا نام
ہی منحوس ہے کیا کروں۔''[2]

ناول میں دراصل جس لڑکی سے ناول کا ہیرو محبت کرتا ہے اسی کا نام سنتوش ہے دونوں کے مذہب الگ الگ ہیں اس لئے سنتوش کی شادی کسی اور سے ہوجاتی ہے لیکن ناول کا ہیرو اس لڑکی سے (سنتوش سے) نشانی کے طور پر نام مانگ لیتا ہے یوں یہ نام مصور اختیار کر لیتا ہے اس پورے منظر کے لئے یہ چند نمونے دیکھئے:

''جب لڑکپن کے ساتھی بچھڑتے ہیں تو اپنی یادوں کو بنائے رکھنے کے
لئے کوئی نہ کوئی چیز بطور نشانی دے جاتے ہیں، میں تمہیں......''
میرے منہ سے بے ساختہ نکل گیا
''اپنا نام مجھے دے دو''

اس کے جسم میں جیسے برقی رو دوڑ گئی یکبارگی آنکھوں سے آنسو چھلک پڑے چھلکتی آنکھوں سے دیر تک

---

[1] ٹھاکر پونچھی، قفس اداس ہے، ص ۳۶، مشورہ بک ڈپو، دہلی

[2] ٹھاکر پونچھی، قفس اداس ہے، ص ۴۸، مشورہ بک ڈپو دہلی

مجھے دیکھتی رہی میری آنکھوں میں کچھ ڈھونڈتی رہی کانپتے ہوئے ہاتھوں سے برش اٹھالیا۔اپنی بھیگی ہوئی پلکوں سے لگایا جیسے اسے اپنے آنسوؤں کا رنگ دینا چاہتی ہو۔مختلف رنگوں کو برش سے چھوا۔ہونٹوں پر ایک حسین سی مسکراہٹ ابھری اور میرے ایک ادھورے خاکے کے نیچے اپنا نام لکھ دیا۔

............سنتوش............

میں نے رندھی ہوئی آواز میں پوچھا

اپنا نام مجھے دے دیا۔اب تمہیں کس نام سے پکارا کروں گا''

روتے روتے اس کی ہچکی بندگئی

''تمہارے لئے اب میرا نام زونہ گاش ہی ہے چاندی ہی ہے جو اپنے چاند سے ہمیشہ دور رہے گی۔

لڑکپن کا مذاق جوانی کی ایک حقیقت بن جائے گا میں نے کبھی نہ سوچا تھا میری آنکھوں سے آنسو چھلک پڑے

''زونہ گاش''

وہ آنسو پونچھتی کمرے سے باہر نکل گئی۔

میں نے آگے بڑھ کر اس کا نام اپنی چھلکتی ہوئی آنکھوں سے چوم لیا اسے ہمیشہ کے لئے اپنالیا۔

سنتوش

وہ جا چکی تھی![1]

ناول کا ہیرو یاداشت کے لئے اپنی محبوبہ کی نشانی یعنی نام (سنتوش) اختیار تو کرلیتا ہے لیکن یہ اس کی محبوبہ پر بھاری پڑ جاتا ہے جب اس کے شوہر کو ان کی بچپن کی محبت کا علم ہوتا ہے تو وہ اسے کافی مارتا ہے اور گھر سے نکال دیتا ہے ناول کا ہیرو اب مشہور آرٹسٹ بن چکا ہوتا ہے وہ سنتوش آرٹسٹ کے نام سے پوری دنیا میں جانا جاتا ہے اسی دوران جب اس آرٹسٹ کو معلوم ہوتا ہے کہ اس کی محبوبہ کو اس سے دور ہونے کے باوجود ستایا جارہا ہے۔وہ دردر کی ٹھوکریں کھارہی ہے تو وہ اسے اپنے پاس بلاکر علاج ومعالجہ کرتا ہے لیکن صحت یاب ہونے پر بھی سنتوش کا باپ، بھائی اور شوہر کوئی بھی اسے اپنے گھر میں جگہ نہیں دیتے تو مصور سنتوش اپنی محبوبہ کو اپنے

---

[1] ٹھاکر پونچھی، قفس اداس ہے، مشورہ بک ڈپو دہلی

پاس رکھتا ہے اس طرح وہ ہمیشہ ایک دوسرے کے ہوجاتے ہیں اقتباسات دیکھیں:

''میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا ایسے حالات بھی پیدا ہوں گے کہ مجبور ہوکر ہمیں ایک دوسرے کا سہارا بننا پڑے گا میرے وہم وگمان میں بھی نہ تھا۔ آج بھی مجھے یہ سب کچھ ایک خواب ہی معلوم ہوتا ہے ویسے بھی زندگی ایک خواب ہی ہے۔''

ماضی، حال، مستقبل، وہ چیزیں بھی جنہیں میں حاصل کرنا چاہتا تھا وہ بھی جنہیں پانے کی مجھے کبھی تمنا نہیں رہی۔ مجھے ابدی بہاریں ملیں۔ ابدی مسرتیں ملیں۔ ابدی ساتھی ملے۔ میں اپنے لوگوں کا محبوب آرٹسٹ بنا محبوب شاعر بنا۔ کامرانیوں نے میرے قدم چومے۔ میں نے بجھے ہوئے مایوس دلوں میں زندگی بخشی۔ دھڑکنیں جگائیں پژمردہ ہونٹوں پر امید زندگی کی شوخیاں بکھیریں۔ روتی ہوئی آنکھوں میں نقرئی مسکراہٹوں کے دیئے جلائے۔ پھر میرے اپنے ہونٹ مسکراتے نہیں۔ میرا اپنا دل ہنستا نہیں۔ ایک چاند کی سی زردی ہے جو میری آنکھوں میں تیرتی ہے۔ ایک قفس کی سی اداسی ہے جو ہمیشہ میں۔ میں اپنی یادوں بھری تنہائیوں میں اپنے روٹھے ہوئے اداس لمحوں میں اپنے کونگ پوش اپنے مستقبل کو سینے سے لگائے سوچتا ہوں۔ گھنٹوں سوچتا رہتا ہوں ...... کیا میں گنہ گار ہوں؟''[1]

''قفس اداس ہے'' ناول کا پلاٹ کسی حد تک چست ہے اول تا آخر ناول قاری کو تجسس میں رکھتا ہے واقعات فطری انداز میں رونما ہوتے ہیں کردار نگاری میں بھی ٹھاکر پونچھی نے کمال دکھایا ہے ناول میں زیادہ کردار نہیں ہیں ناول میں سنتوش کا کردار مرکزی حیثیت رکھتا ہے جو شروع سے آخر تک ناول میں چھایا رہتا ہے وہ ایک مصور ہے اور کافی اہمیت کا حامل ہے ناول میں کئی ایسے مواقعے آتے ہیں جہاں پر وہ کچھ کر سکتا تھا لیکن وہ

[1] ٹھاکر پونچھی، قفس اداس ہے، ص ۲۰۸، مشورہ بک ڈپو، دہلی

ہمیشہ سماج اور خاندانی اصولوں کوملحوظ رکھتا ہے کہیں پر یہ کردار بے عملی کا شکار بھی نظر آتا ہے وہ سنتوش کی شادی کے وقت ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھ جاتا ہے۔سنتوش کی شادی کے بعد وہ اس کا نام اپنی تصویروں پر لکھتا ہے وہ ذرا سا بھی اس کے انجام کے بارے میں نہیں سوچتا جس کے نتیجے میں اس کی محبت سنتوش رسوا ہوسکتی ہے اور اس طرح اسے گھر سے نکال دیا جاتا ہے یہ ناول حقیقی واقعات پرمبنی ہے غلام رسول سنتوش جو ناول نویس تھے ان کی زندگی سے متاثر ہوکر یہ ناول لکھا گیا تھا اور ٹھاکر پونچھی نے اس ناول کے ذریعے سنتوش کی زندگی کا خلاصہ بیان کر دیا ہے ناول کے ہیرو مصور کے علاوہ اس کی محبت سنتوش کا کردار بھی اہمیت کا حامل ہے وہ بھی سماج کے ہاتھوں مجبور ہو جاتی ہے مار کھاتی ہے گھر سے نکال دی جاتی ہے لیکن امید کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑتی وہ مصور کو ڈھونڈ کر اس کے گھر جاتی ہے وہ اس بات کا اقرار کرتی ہے کہ اگر اسے وہ نہیں اپنائے گا تو وہ اپنی جان دے دی گی۔

ناول میں زبان سادہ و سلیس استعمال ہوئی ہے۔ناول نگار نے منظر نگاری میں اپنا کمال دکھایا ہے منظر نگاری کے اعلیٰ نمونے ملتے ہیں ناول موضوع وفن دونوں اعتبار سے بہت کامیاب ہے۔

چاندنی کے سائے:

ٹھاکر پونچھی کا مشہور و معروف ناول ہے ٹھاکر پونچھی نے چاندنی کے سائے ناول میں بعض اہم سماجی اور جاگیردارانہ نظام کے مسائل کو موضوع بنایا ہے یہ ناول رسالہ بیسویں صدی میں دہلی سے شائع ہوتا رہا۔ناول میں طبقاتی کشمکش اور سماج کے قائم کردہ فرسودہ روایات کو بھی نشانہ بنایا گیا ہے۔امیر وغریب کی تفریق کو بھی ٹھاکر پونچھی نے کامیابی کے ساتھ واضح کیا ہے۔ناول کی ابتدا سے ہی علم ہوتا ہے کہ ناول نگار کے سامنے سماجی تفریق کے مسائل ہیں ناول نے کئی ایسے کردار تراشے ہیں جو ان سماجی مسائل سے جوجتے دکھائی دیتے ہیں۔

ناول کا مرکزی کردار راج ناتھ ہے پوری کہانی اس کے گرد گھومتی ہے ہر چھوٹے بڑے واقعات جو ناول میں رونما ہوتے ہیں ان میں راج ناتھ نظر آتا ہے۔راج ناتھ خود بے سہارا ہے لاوارث ہے لیکن وہ ہر کسی کا سہارا اور وارث بن جاتا ہے وہ ایک جانب زمانے کے ہاتھوں مجبور ہے اور دوسری جانب محبت میں بھی کئی بار ناکامی مل چکی ہے جوانی میں وہ فلورنس کی محبت میں گرفتار ہو جاتا ہے لیکن یہاں پر بھی ناکامی اس کے ہاتھ

آتی ہے اپنی بے بسی، ناکامی اور لاچاری کا اظہار وہ کچھ یوں کرتا ہے:

''انھوں نے مجھے افق کی ان سرحدوں پر لا کھڑا کیا۔ جہاں دوسروں ہی کی خوشیوں میں مسرت مسکراتی دکھائی دیتی ہے اور ان خوشیوں کو برقرار رکھنے کے لئے انسان اپنا آپ بھی بھول جاتا ہے میں نے اپنے کو یکسر بھول کر تمہارے جوزف کو ڈھونڈا تا کہ تمہاری مسکراہٹ قائم رہے لیکن آج تک اس لمحے تک اپنے لئے یا اپنوں کے لئے جو کچھ بھی چاہا۔ پا نہ سکا ناکام رہا۔ اب کی بار بھی ناکام ہی رہا اور اپنی ناکامیوں پر قہقہے لگانے والا آج پھوٹ پھوٹ کر رو رہا ہے کیوں کہ تم نہیں مریں فلورنس۔ دوبارہ میری بیلا مرگئی۔ دوبارہ میری نلنی روٹھ گئی۔ تم نہیں جانتی ہو۔ تم نے مجھے کب جانا اس وسیع عریض دنیا میں ...... جوزف کے سوا تم کسے پہچانتی تھیں جوزف بھاگ گیا۔ آنکھوں سے اوجھل ہو گیا۔ تمہاری دنیا بھاگ گئی۔ مرگئی، مٹ گئی اور کتنا بے بس اور لاچار ہوں میں۔''[1]

اس ناول کا کردار راج ناتھ اپنی زندگی سے نفرت کرتا ہے وہ ایسے معاشرے اور سماج سے بھی نفرت کرتا ہے۔ جہاں کوئی رشتہ نہیں۔ کوئی محبت نہیں کوئی جذبہ نہیں۔ صرف سونے چاندی کی بھوک ہے وہی زندگی ہے حسن ہے عشق ہے اور وہی ازدواجی رشتے اچھے تصور کئے جاتے ہیں جن میں روپئے پیسے کی ریل پیل ہو۔ ایسے ماحول میں اسے گھٹن ہوتی ہے جہاں انسان کے جذبات واحساسات کی کوئی قدر نہیں ہوتی دراصل راج ناتھ ایک معمولی کسان کا بیٹا تھا اس کی پہلی محبت بیلا ایک بہت بڑے زمیندار کی بیٹی۔ زمینداروں کی بیٹیاں جاگیرداروں کے گھر جاتی ہیں جیسے جاگیرداروں کی لڑکیاں راج مہاراجوں کے محلات کی زینت بنتی ہیں وہ اکثر سوچا کرتا تھا کہ بیلا ایک بڑے زمیندار کی بیٹی ہے اس کی صورت بھی چاند جیسی ہے بڑے بڑے اونچے محلات کی روشنیاں بھی اس کی منتظر ہوتی ہیں۔ سماج کی دیواریں بھی اتنی اونچی اٹھ جاتی ہیں کہ انہیں پھاندنے کی ہر ایک کی جسارت ناکام ثابت ہوتی ہے ایسا ہی راج ناتھ کے ساتھ بھی ہوتا ہے جب وہ پہلی محبت میں ناکام ہوتا

[1] ٹھاکر پونچھی، چاندنی کے سائے، ص۔۹

ہے۔اس ناکامی کے بعد راج ناتھ اپنی تعلیم مکمل کرنے کے لئے شہر کا رخ کرتا ہے وہ اپنی زندگی گزارنے کے لئے چھوٹے موٹے کام بھی کرتا ہے تعلیم مکمل کرنے کے بعد وہ ذہنی مریض بن جاتا ہے کیوں کہ اسے کوئی بھی انسان نوکری دینے کے لئے تیار نہیں ہوتا اور وہ دربدر کی ٹھوکریں کھاتا رہتا ہے وہ کافی حساس اور ذہین ہے سماج اور زمانے کے آہنی ہاتھ جس کا سب کچھ چھین لیتے ہیں وہ جس قدر عزت کا مستحق ہوتا ہے وہ اسے نہیں ملتی۔نوکری کی تلاش میں کافی تگ و دو کے باوجود اسے ناکامی سے ہی دوچار ہونا پڑتا ہے وہ شرافت کا لبادہ پھینک دیتا ہے اور ایک جواری بن جاتا ہے جواری ہوکر بھی اس کے اندر کا حساس انسان اس سے اچھے کام ہی کرواتا ہے ایک اقتباس پیش ہے:

''ڈھیرو استاد! آج اپنے ہاتھ سے رکھ دے ان ریکھاؤں پر تاش کے پتے لگا اپنی استادی کی پھونک اور بدل دے تقدیر کی لکیریں، تاکہ روپیہ کما سکوں، سب کو دھوکہ دے سکوں، اپنی زندگی، محبت اور شرافت کو بھی

....

ایک خوبصورت انسان مرگیا
ایک مقدس جذبہ فنا ہوگیا
نیکی کے راستے مسرور تھے لیکن بدی کی راہیں دور تک صاف دکھائی دے رہی تھیں۔اس نے ڈھیرو استاد کو اپنا لیا۔بدی کی راہوں کو اپنا لیا۔اب اس کے ساتھی تھے، تاش کے چکنے ملائم پتے اور محبوب تھے شراب کے دور، زندگی اس کی نگاہوں میں حسین ہوگئی تھی۔فلورنس سے بھی زیادہ حسین۔بیلا سے بھی زیادہ معصوم اور نلنی سے بھی زیادہ چنچل!
برسوں کی ریاضت ایک پل میں فنا ہوگئی۔''[1]

راج ناتھ کی زندگی میں اس وقت ٹھہراؤ کے آثار نمودار ہوتے ہیں جب وہ پہلے کارگی اور پھر کلپنا کے ساتھ اپنی زندگی گذارنے کا خواہش مند ہے لیکن یہاں بھی وہ اپنی خوشیوں کو دوسروں کی خوشیوں کی خاطر قربان

[1] ٹھاکر پونچھی، چاندنی کے سائے، ص ۴۵،۴۴

کردیتا ہے وہ کلپنا کو ایشور داس کے ساتھ منسوب کردیتا ہے خود غم زدہ ہی رہتا ہے۔ راج ناتھ کلپنا کو ہمیشہ کے لئے اپنانا چاہتا تھا اسے اپنا جیون ساتھی بنانے کا خواہاں تھا کلپنا نہیں جانتی تھی وہ اسے کم ہی ملتا تھا لیکن آگے چل کر وہ یہ زہر کا گھونٹ صرف اس لئے پی لیتا ہے تاکہ ایشور داس کی زندگی میں خوشیاں آئیں۔ غرض وہ اپنی خوشی کو دوسروں کے لئے ہر مقام پر قربان کردیتا ہے۔

ناول چاندنی کے سائے میں منظر نگاری کے عمدہ نمونے ملتے ہیں ٹھاکر پونچھی نے ہر ایک منظر اور اس منظر کی جزئیات کو بڑی باریک بینی سے پیش کیا ہے۔ ناول میں منظر نگاری کی کئی عمدہ مثالیں دیکھنے کو ملتی ہیں ٹھاکر پونچھی کو منظر نگاری میں بڑی مہارت تھی۔ مثال کے لئے یہ ایک اقتباس نقل کرتے ہیں:

''......قدرت کی ہر ایک جاندار اور بے جان چیز کو کسی کی تلاش ہے......
اس نے من ہی من میں سوچا ......تلاش انسان ہے۔ تلاش دنیا ہے، تلاش زندگی ہے۔ اگر یہ جذبہ نہ ہوتا کچھ بھی نہ ہوتا۔ یہ زمین یہ آسمان چاند ستارے دریا پہاڑ، ہواؤں کی گنگناہٹ، آبشاروں کے گیت، جھرنوں کا سنگیت اور یہ چہچہاتی ہوئی ابابیلیں، کس کی تلاش ہے ابتدائے آفرینش سے کس کو ڈھونڈ رہے ہو۔ کسی وجود کسی حسن کسی حادثے، کون سے ٹکراؤ کے متلاشی ہو؟......اپنی بیلا کے......اپنی بیلا کے......راج ناتھ کے چہرے پر مسکراہٹ دوڑ گئی، ذہن میں بیلا کے نام کی شہنائیاں سی بجیں۔ کائنات کا ذرہ ذرہ، پتہ پتہ، بوٹا بوٹا جیسے شہنائیاں بجا رہا تھا ......نہیں سچ مچ ہی کہیں شاہنائیاں بج رہی تھیں۔ سچ مچ ہی کہیں پہاڑی گیتوں کے بول کنوارے ہونٹوں کو چوم رہے تھے۔ سچ مچ ہی سارا قصبہ جگمگا رہا تھا اور دور پرے ٹیلے پر کھڑی پرانی وضع کی حویلی جس کی دیواریں پھاندنے کے لئے اس نے برسوں ریاضت کی تھی۔ پوری آب وتاب سے خاندانی وجاہت کا ثبوت دے رہی تھی۔ روشنی کا ایک بحر بیکراں تھا جو اچھل اچھل کر اس کے اندھیرے کونوں کو نور کی لہریں

بخش رہا تھا۔''[1]

ناول ''چاندنی کے سائے'' کو ٹھاکر پونچھی نے تین حصوں میں تقسیم کیا ہے بچپن، لڑکپن اور جوانی۔ ٹھاکر پونچھی نے راج ناتھ کے بچپن اور لڑکپن کو کتنی خوبصورتی کے ساتھ پیش کیا ہے ملاحظہ کیجئے یہ اقتباس:۔

''لڑکپن کی باتیں سلجھی ہوتے ہوئے بھی بہت گہری ہوتی ہیں دونوں میں سے کوئی بھی نہ جانتا تھا۔ پھر بھی لڑکپن بچپن سے بھی خوبصورت تھا۔ جھرنوں اور آبشاروں کی پھوار سے سینچا ہوا تھا بچپن اور لڑکپن کے بیچ کے دور کی بہت ہی پیاری بہت ہی خوبصورت باتیں راج ناتھ نے پڑھیں۔ ان کی گونج اپنی دھڑکنوں میں سنی۔ ان میں بوڑھے ماں باپ کا پیار بھی تھا اور غربت کا درد بھی جو وقت کے ساتھ ساتھ شدت اختیار کرتا جا رہا تھا۔ ماں باپ اپنی تمام پونجی صرف کر کے ابدی سرمائے کو بچائے رکھنا چاہتے تھے یہی خواہش تھی کہ سب کچھ بک جائے۔ لیکن اکلوتے بیٹے کی زندگی سنور جائے۔ خود بھوکے رہیں لیکن بیٹا زندگی کی ان بلندیوں کو چھو لے جہاں تک ان کا جانا پہچانا دوسرا ابھی تک کوئی نہیں پہنچا۔ راج ناتھ کو اپنے والدین کی ازلی تمنا کا احساس تھا اور اسے پورا کرنے کی جستجو میں تھا۔''[2]

راج ناتھ کی جوانی کی یادوں کو بھی ٹھاکر پونچھی نے یہاں جس خوبصورتی سے پیش کیا ہے اس کا اندازہ اس اقتباس سے لگایا جا سکتا ہے اقتباس ملاحظہ ہو:

''جوانی!!

بچپن اور لڑکپن کی بوجھل یادوں تلے دبی ہوئی، سوکھی پژمردہ اور پریشان جوانی...... جوانی میں کچھ بھی نہ تھا۔ والدین کا سہارا نہ تھا بچپن کی کہانیوں

---

[1] ٹھاکر پونچھی، چاندنی کے سائے، ص۲۳، ۲۲

[2] ٹھاکر پونچھی۔ چاندنی کے سائے، ص۱۸

کا سہارا نہ تھا۔لڑکپن کی یادوں کا سہارا نہ تھا۔ اپنے قصبے کے ماحول کا
سہارا نہ تھا۔ اور جوانی تو سہارے ڈھونڈتی ہے جوانی میں تو ان دیکھے
سہاروں کا انتظار ہوتا ہے جوانی کچھ بھی نہ تھی ایک کوڑھ زدہ تھی۔صرف
ایک بوجھ تھی بھاری جان لیوا بوجھ۔''[1]

ناول میں راج ناتھ کے علاوہ بھی کئی کردار اہمیت کے حامل ہیں جن میں ڈھیر وا استاد، ایشور داس، کارگی اور کلپنا وغیرہ شامل ہیں۔ یہ تمام کردار سماج کی ٹوٹتی بکھرتی قدروں کی عکاسی کرتے نظر آتے ہیں ڈھیر استاد جواریوں کا استاد ہے وہ راج ناتھ کا بھی استاد ہے۔ راج ناتھ جب زندگی میں ناکامی پاتا ہے اور دربدر کی ٹھوکریں کھاتا ہے تو ڈیرو استاد اس کی مدد کرتا ہے اور راج ناتھ کو اس بات کے لئے آمادہ کرتا ہے کہ انسان کی قدر پیسے سے کی جاتی ہے اور پیسے کمانے کے لئے سب سے بہترین کام جوا ہے۔ایشورداس ایک اخبارنویس کا بیٹا ہے وہ زمانے کے ہاتھوں اور سماج کے قائم کردہ فرسودہ نظام کا شکار ہے وہ ایک کہانی کار تھا لیکن اس کی تخلیقی صلاحیتوں کا اعتراف کوئی نہیں کرتا ہے وہ اندر سے ایک خوبصورت انسان تھا لیکن اس کا گذارہ لکھنے پر نہ ہوتا تھا اس لئے بھوکے پیٹ دن رات کہانیوں میں سرگرداں رہتا تھا۔

ناول میں ٹھاکر پونچھی نے سماجی مسائل کو بے باک انداز میں بیان کیا ہے اگرچہ ناول میں کئی مواقع پر قاری کی دلچسپی برقرار نہیں رہتی لیکن کردار نگاری اور منظر نگاری کے لحاظ سے پرناول کامیاب نظر آتا ہے۔

پیاسے بادل:

ٹھاکر پونچھی کا ایک مشہور ناول ہے سن اشاعت کہیں بھی نہیں ملتی البتہ یہ ناول رسالہ بیسویں صدی دہلی شائع ہوا۔ ناول فنی اعتبار سے کامیاب ناول ہے پلاٹ کردار نگاری منظر نگاری ہر چیز کو ٹھاکر پونچھی نے بڑی خوبصورتی کے ساتھ اور فنی مہارت کے ساتھ قارئین کے سامنے رکھا ہے۔ ناول تیرہ ابواب پر مشتمل ہے اس میں مختلف واقعات کو ٹھاکر پونچھی نے بڑی خوش اسلوبی سے پیش کیا ہے۔ ناول کے مختلف کرداروں کے درمیان ہونے والی بات چیت، ان کے آپسی رشتے ان کا رہن سہن سب اتنی مہارت سے پیش کیا ہے گویا حقیقت آنکھوں کے سامنے آ گئی شاردا نامی ایک لڑکی جو ایک تحصیلدار کی بیٹی ہے اور اس کی شادی کسی نیم پڑھے لکھے

[1] ٹھاکر پونچھی۔ چاندنی کے سائے ص۔۲۹

انسان سے ہوتی ہے اس بات کو ٹھاکر پونچھی نے کس انداز سے پیش کیا ہے دیکھئے اقتباس:

''...........نئی نئی شادی شدہ شاردا کا باپ ریاست میں تحصیلدار تھا۔ ایک پوری تحصیل کا حاکم تھا۔شاردا کی شادی امرت سر میں ایک کھاتے پیتے گھرانے میں ہوئی تھی۔سو روپے پیسے کا لین دین کرتا تھا اور شوہر سوڈا فیکٹری چلاتا تھا۔کھلی فضاؤں کی پروردہ تجربہ کار تحصیل دار کی آزاد خیال بیٹی اور سوڈا فیکٹری کے نیم پڑھے لکھے مالک جس شوہر اور بیوی کا رشتہ کچھ بے میل سا تھا کیوں کہ سوڈے کی بوتلیں بھرتے بھرواتے وہ خود خالی ہو چکا تھا اس نے شادی صرف خاندانی وجاہت کو بڑھاوا دینے والے سود خوار وارث اور سوڈا فیکٹری چلانے والے سپوت پیدا کرنے کے لئے کی تھی۔اس کے علاوہ کوئی رومان، کوئی تمنا، کوئی زندگی نہ تھی۔جو وقتی ہوتے ہوئے بھی ابدی ہوتی ہے ہونٹوں پر جوانی کی معطر مٹھاس نہ تھی کھارے میٹھے سوڈے کا ملا جلا پھیکا کسیلا ذائقہ تھا جو اس کی روح میں بھی سرایت کر چکا تھا اور شاردا تحصیل دار ہی کی بیٹی نہ تھی۔گورے رنگ کی خوبصورت جوانی تھی جس کے انگ انگ میں پرواز کی کسک تھی اور دھڑکنوں میں رومانی بلندیوں کی آرزو تھی اور سانسوں میں تمناؤں کی چاشنی تھی۔اور بڑی بڑی نیلی غزالی آنکھیں اور لانبی لانبی پلکیں، لڑکپن کی یادوں بھری کہانیوں کی کہکشاں لئے!''[1]

ہر دیش اس ناول کا مرکزی کردار ہے جو اول تا آخر ناول میں نظر آتا ہے اس کے علاوہ دیگر بہت سے معاون کردار ہیں جو ناول میں ملتے ہیں شاردا گوری، راجہ صاحب، لاجونتی بدلی، دیوی، لبھو پنڈت (بدلی کے بابا) نندی وغیرہ کے کردار اس ناول میں کہانی کو آگے بڑھاتے ہیں راجہ صاحب اپنی محبوبہ کی محبت میں کس قدر گرفتار تھے دیکھئے اقتباس:

---

[1] ٹھاکر پونچھی۔پیاسے بادل۔ص۲۹،۲۸

''گوری گاؤں ریاست کے بڑے راجہ صاحب کی محبوبہ کا گاؤں تھا جس سے وہ بے پناہ محبت کرتے تھے۔ اسے دیکھے بغیر انھیں زندگی کا کوئی چین، کوئی سرور، کوئی نشہ نہ آتا تھا۔ روٹی کا پہلا اور آخری لقمہ، شراب کا پہلا اور آخری گھونٹ اسی کے ہاتھ سے لیتے اور اس کی صراحی گردن دیکھتے سہلاتے سو جاتے۔ ایک دن راجہ صاحب نے اسے انگلیوں میں ناچتے پھدکتے دیکھا تھا قدرت کی ایک حسین ترین تخلیق تھی۔ خوب صورت پیداوار کے مالک راجہ صاحب تھے۔ اسے بھی زبردستی ڈولی میں بٹھا کر اپنے حرم میں لے آئے۔ گاؤں سونا ہو گیا لیکن حرم آباد ہو گیا۔ اس کی آبادی میں ایک اور حسین اضافہ ہو گیا۔ راجہ صاحب نے اس سے پیار کیا، اپنی محبت دی۔ اپنی دولت دی اس کے میلے کچیلے لباس کو تعطر بخشا۔''[1]

یہاں ایک اور اقتباس جس میں محبت کے مرنے کی روداد پیش کی گئی ہے دیکھئے:

''بڑے راجہ صاحب زندہ رہے ان کی حکومت زندہ رہی۔ محلات اور محلات کے حرم زندہ رہے۔ ایک محبت آتی تھی۔ ایک محبت چلی جاتی تھی۔ ایک حسن زندہ ہوتا تھا۔ ایک حسن مرجاتا تھا۔ وہاں کا ایسا ہی دستور تھا آرام و سکون بالکل برباد نہ ہوا۔ نشے سرور میں کوئی فرق نہ آیا صرف ایک محبت پاگل ہو کر مرگئی۔ پاگل ہو کر اپنی محبت کو ڈھونڈتی رہی جو اس نے اپنے گڈریئے محبوب کی پھٹی پرانی گودڑی میں بڑے راجہ صاحب سے چھپا کر رکھی تھی۔ لیکن واپسی پر اسے کچھ نہ ملا، نہ وہ گڈریا، نہ اس کا ریوڑ اور نہ اس کی پھٹی پرانی گودڑی ہی۔ بنسری کی وہ البیلی تان بھی اسے کہیں سنائی نہ دی۔ جسے سن کر وہ بے خود ہو جاتی تھی۔ جس میں پہاڑوں

[1] ٹھاکر پونچھی۔ پیاسے بادل، ص ۳۲

کی پکار تھی۔ جنگلوں کی پکار تھی۔ کھیتوں کی پکار تھی وہ پکار اسے کہیں بھی نہ سنائی دی۔ ہر چیز گونگی ہوگئی تھی۔ وہ خود بھی شاید گونگی اور بہری ہوگئی تھی۔ اس کے بچپن کا محبوب وہ گڈریا بھی جیسے گونگا اور بہرہ ہوگیا تھا وہ بھی شاید پاگل ہوگیا تھا۔ دور کے جنگلوں میں نکل گیا تھا۔ انہی میں بھٹکتا اپنی محبوبہ، اپنی محبت کو ڈھونڈتا مر گیا تھا۔ غربت کی محبت کی ابتدا اور انتہا یہی ہوتی ہے وہ کچھ نہیں مانگتی، اپنا سب کچھ لٹا دیتی ہے۔''[1]

ٹھاکر پونچھی نے کس طرح سماج کے اندر پنپنے والی برائیوں کو پیش کیا ہے اور حقیقت کو عیاں کرنے کے لئے ناول کو ذریعہ بنایا ہے ایک بڑے ادیب کی کامیابی کا راز ہے۔ ٹھاکر پونچھی نے مختلف واقعات کو بڑی فنی چابکدستی سے ناول کے مختلف ابواب میں پیش کر کے ایک مکمل نمونہ پیش کیا ہے جس سے اس عہد کے سماج میں ہونے والی ہر بات کا علم ہوتا ہے۔ طوطا رام اور شاردا کی محبت کا قصہ بھی اس ناول میں ملتا ہے مندر کے پجاری کا ذکر بھی اور بدلی کے بابا لبھو پنڈت کا ذکر بھی ہے لبھو پنڈت سادھی نما مندر کا مالک تھا پاس میں ایک ناؤ گھاٹ تھی گھاٹ کے کنارے پر ان گڑھ پتھروں اور سلوں کی تہہ جم کر عارضی گھاٹ بنایا گیا تھا ساری کشتیاں وہیں رہتیں کشتی کے ہر پھیرے پر ایک خاص شرح کے حساب سے پنڈت لبھو کے حصے میں آجاتا۔ جب کوئی دوسرا نہ ہوتا تو پنڈت لبھو خود ہی مسافروں کو دریا میں لے کر اتر جاتا پنڈت لبھو کا ذکر آٹھویں نویں باب میں کیا گیا ہے اور حقیقی تصویر پیش کی ہے۔

غرض ٹھاکر پونچھی کا یہ ناول ایک کامیاب ناول ہے کردار نگاری پلاٹ منظر کشی ہر ایک کو ناول نگار نے بڑی فنی مہارت سے ناول میں جگہ دی ہے۔ ہر دیش، نندی اور بدلی ناول کے اہم اور متحرک کردار ہیں ناول کا اختتام بھی ان پر ہوتا ہے ناول کا آخری اقتباس ملاحظہ ہو:۔

''ہر دیش کے کانوں میں جیسے مندر جل کی جانی پہچانی آواز گونجی نندی نے بھی جیسے اس کی پکار سن لی۔ بدلی کے کانوں میں بھی جیسے مندر جل نے سرگوشی کی۔ تینوں ایک ساتھ اٹھے جنم جنم کا ساتھی۔ جنم جنم کا پیار اپنی

[1] ٹھاکر پونچھی۔ پیاسے بادل۔ ص ۳۴

امانت واپس مانگ رہا تھا۔مندرجل آج کی پورے چاند کی رات ہی میں
لبھو پنڈت کی راکھ اپنی ذات میں تحلیل کر لینا چاہتا تھا۔ وہ تینوں اس کی
خواہش پوری کرنے چل پڑے۔ چاند نے اپنا سفر پورا کرنا شروع کرلیا
تھا وہ اپنی چاندی کو سمیٹنے کی جستجو میں تھا اور نئی صبح اپنے پر سنوار کر اپنی زندگی
کی پہلی اڑان کی تیاریوں میں تھی۔ ہردیش نے چتا میں سے مٹھی بھر راکھ
اٹھا کر بدلی کے کانپتے ہوئے ہاتھ پر رکھی۔اور اپنے ہاتھوں کے سہارے
اسے مندرجل کی لہروں کے حوالے کر دیا۔لمحہ بھر لہروں میں ارتعاش سا
پیدا ہوا اور پھر خاموش ہوگئیں۔جنم جنم کے ساتھی۔جنم جنم کے پیار کو اپنا
جنم جنم کا ساتھی،جنم جنم کا پیار مل گیا تھا۔‘‘[1]

ناول میں ہردیش کے پیار محبت کی کہانی ہے ٹھاکر پونچھی نے کچھ اور کرداروں کے ذریعے بھی ان کی داستان محبت کو پیش کیا ہے لیکن ہردیش ناول کا ہیرو ہے جو محبت میں گرفتار ہوتا ہے اور کامیابی بھی پاتا ہے۔

غرض پیاسے بادل ٹھاکر پونچھی کا ایک کامیاب ناول ہے ریاست جموں وکشمیر میں اردو ناول کا جب جب ذکر کیا جائے گا ٹھاکر پونچھی کو ہمیشہ یاد کیا جاتا رہے گا کیوں کہ انہوں نے اس صنف کو اپنے نالوں کے ذریعے تقویت بخشی ان کے ناول ان کو ہمیشہ زندہ رکھیں گے۔ان کی تخلیقات کی بنا پر صرف پونچھ ہی نہیں بلکہ ریاستی وقومی سطح پر بھی انہیں شہرت حاصل تھی اور آج بھی ان کو ان کے ادبی کارناموں بالخصوص ناولوں کی وجہ سے یاد کیا جاتا ہے۔

---

[1] ٹھاکر پونچھی۔ پیاسے بادل۔ص ۱۶۳

علی محمد لون

ریاست جموں و کشمیر سے تعلق رکھنے والا ایک اہم ناول نگار علی محمد لون ہے علی محمد لون کی ولادت ۲۷ ستمبر ۱۹۲۶ء میں سرینگر کے درگجن علاقے میں ہوئی۔ ان کے والد کا نام عبدالرحمان تھا۔ پڑھنے لکھنے کا شوق بچپن سے ہی تھا۔ سرینگر اور کشمیر کی خوبصورت وادی نے ان کی ذہنی نشو ونما میں اہم کردار کیا۔ علی محمد لون پر آشوب دور سے گزرے انہوں نے حالات کا اثر قبول کیا۔ انہوں نے نہ صرف ہندوستان بلکہ بیرونی مما لک کے ادیبوں کا مطالعہ بھی کیا جس کی وجہ سے ان کے اندر ایک ادبی لگاؤ پیدا ہوتا گیا ان کی ذہانت کا اندازہ خود ان کے ہی قول سے لگایا جا سکتا ہے:

> ''آٹھویں جماعت تک آتے آتے میں نے طلسم ہوش ربا کا بیشتر حصہ،
> ڈپٹی نذیر احمد اور شرر کے ناول، پریم چند اور سدرشن کی کہانیاں سبھی کچھ
> پڑھ لیا تھا۔ کالج میں آنے سے پہلے میں ترقی پسند مصنفین کی تحریک سے
> متعارف ہو چکا تھا۔''[۱]

علی محمد لون ترقی پسند تحریک کے بانیوں میں شمار ہوتے ہیں انہوں نے عالمی سطح کے ادیبوں کا مطالعہ کیا۔ خود علی محمد لون کا اپنا ادبی سفر افسانے سے شروع ہوتا ہے ان کا پہلا افسانہ 'بچے' ماہنامہ آج کل دہلی میں شائع ہوا۔ بعد میں علی محمد لون ریڈیو کشمیر سے بھی وابستہ رہے ریڈیو سے وابستگی کے بعد انہیں ڈرامے لکھنے کا شوق پیدا ہوا۔ دیکھتے ہی دیکھتے انہوں نے کئی بہترین ڈرامے تخلیق کر لئے ان کے ڈراموں میں سب سے پہلا ڈراما ''گھروندے'' ہے جسے کافی مقبولیت حاصل ہوئی اور علی محمد لون کو مزید لکھنے کا ذوق بڑھتا گیا۔ گھروندے کی مقبولیت کی وجہ سچے واقعات کی عکاسی ہے جس کی وجہ سے انھیں لوگوں کی مخالفت کا سامنا بھی کرنا پڑا۔ لیکن لون صاحب کے پختہ عزم کے آگے ان کی مخالفت کچھ کام نہ کر سکی۔ اس بارے میں جان محمد آزاد یوں رقمطراز ہیں:

[۱] ماہنامہ آج کل، فروری ۱۹۷۲ء، ص۔۱۲

''انہوں نے جو پہلا اردو ڈراما لکھا وہ نشر ہوکر کافی مقبول ہوا۔ کشمیر کی زندگی پر مبنی ان کا لکھا ہوا ڈراما' گھر وندے' جونہی نشر ہوا تو اس نے تہلکہ مچا دیا۔ سینکڑوں لوگوں نے ریڈیو اسٹیشن کے باہر مظاہرہ کیا لیکن اس حوصلہ شکن واقعہ نے پر جوش اور باعزم علی محمد لون کو ناامید نہیں کیا بلکہ اس کی ہمت اور مضبوط ہوئی۔''[1]

ان کے ڈراموں میں سب سے بہترین اور کامیاب ڈراما ''سیا'' ہے اس ڈرامے کے ہر موڑ پر علی محمد لون کی فنی مہارت کا ثبوت ملتا ہے یہ ڈراما تاریخی ہے اور اس کا مرکزی کردار 'سیا' ہے 'سیا' کشمیر کی تاریخ میں ایک انجینئر کی حیثیت سے شہرت پاتا ہے وادی کشمیر کو بچانے کے لئے جو سیا نے کارنامہ انجام دیا ہے وہ ناقابلِ فراموش ہے۔

اگر ان کی ناول نگاری کی بات کریں تو ان کا واحد ناول ملتا ہے شاید ہے تیری آرزو یہ ناول ان کی فنی مہارت کا ایک بے مثال نمونہ ہے علی محمد لون نے یہ ناول دہلی میں ملازمت کے دوران لکھا عبدالقادر سروری کے مطابق یہ ناول ان کے قیام دہلی کے زمانے کے مشاہدات اور تجربات کی پیداوار ہے۔

علی محمد لون ۱۹۶۵ء تک ریڈیو سے وابستہ رہے پھر ۱۹۸۱ء تک وہ جموں اینڈ کشمیر اکیڈمی آف آرٹ کلچر اور لیگویجز میں ڈپٹی سکریٹری کے عہدے پر فائز رہے۔ علی محمد لون کا انتقال ایک سڑک حادثے میں ہوا جب وہ ایک آٹو سے گھر جا رہے تھے اس طرح ۲۲ دسمبر ۱۹۸۷ء کو وہ دار فانی سے ہمیشہ کے لئے چل بسے۔

شاید ہے تیری آرزو:

علمی محمد لون کا ایک شاہکار ناول ہے جو ۱۹۶۲ء میں جے کے بک ہاؤس جموں سے شائع ہوا۔ شاہد ہے تیری آرزو ایک ڈراما نگار علی احمد کی کہانی ہے جو تھیٹر کی سرگرمیوں کے سلسلے میں کشمیر سے دلی آجاتا ہے ''شاید ہے تیری آرزو'' کی کہانی دلی کے اس علاقے سے شروع ہوتی ہے جس کی فضا اور جس کی طرز زندگی بداخلاقیت کی غلاظت سے غلیظ ہو چکی ہے احمد علی چوں کہ کشمیر کے رہنے والے ہیں اور دلی میں ایک ڈراما کمپنی میں بہ سلسلۂ ملازمت اپنے دوست حمید کے توسط سے ان کے گھر میں رہتے ہیں جہاں صرف ان کا نور بالا رہتا ہے

[1] جان محمد آزاد۔ ریاست جموں و کشمیر کے اردو مصنفین ص۔ ۷۹

لون دلی کے اس علاقے کے ماحول اور فضا، طرز زندگی اور تہذیب کی عکاسی کرتے ہیں جہاں شریف النفس انسانوں کو بھی بدکردار، بدمعاش اور بدچلن مانا جاتا ہے یہ وہ علاقہ ہے جس میں بازاروں کی رونق اور چہل پہل دن کے بجائے رات ہوتی ہے۔

ناول نویس نے دراصل ایسے موضوع کو چنا ہے جس پر لکھنے کی وقت کی ضرورت بھی تھی۔ سماج میں دین ودھرم، ذات پات رنگ ونسل اور غریب اور امیر کی بنیادوں پر انسانوں کو تقسیم کیا جاتا ہے اس فرق سے لوگوں کے دل سے محبت ہمدردی، خلوص اور انسان دوستی کا جذبہ بالکل ختم ہو گیا ہے اس ناول کا پس منظر یہی ہے ناول کے مرکزی کردار بالا اور جوالا سماجی کٹھپتلی بن کر اپنی ہی محبت کے بھینٹ چڑھ جاتے ہیں ناول نگار نے اس ناول میں یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ جب تک دنیا میں دین دھرم کی دیواریں قائم رہیں گی تب تک انسان کے دل میں رشتوں کی اہمیت کا احساس نہیں رہے گا۔

اس ناول کی ابتدا میں ناول نویس نے کئی چیزوں کا احاطہ کیا ہے جہاں ایک طرف ناول نویس نے شہری زندگی میں ملنساری اور آپسی بھائی چارے کی بے قدری کی بات کی اور کہا ہے کہ یہاں ہر کوئی اپنے آپ سے مطلب رکھتا ہے دوسری جانب زندگی تنگ ہوتے ہوتے لوگوں کی ذہنی تنگی بھی بڑھتی جاتی ہے جس کی وجہ سے بدکرداری اور بدفعلی اپنے عروج پر ہوتی ہے یہاں نہ صرف ہر کوئی رنڈیوں کی بات کرتا ہے بلکہ رنڈیوں کا باضابطہ میلہ لگایا جاتا ہے جہاں رات بھر شہر کے شریف لوگ رنڈیوں کا ناچ گانا دیکھنے آتے ہیں۔

علی محمد لون نے ناول کے پس پردہ شہر کو ایک بڑی ذلیل چیز سے تعبیر کیا ہے۔ جہاں انسان اپنی انسانیت کھو بیٹھتا ہے جہاں انسان اپنے دل سے ہمدردی، رواداری اور آپسی بھائی چارے سے ہاتھ دھو بیٹھتا ہے یقیناً انسان ایسے دلدل میں پھنس جاتا ہے جہاں وہ انسانی خصائص کو بھول جاتا ہے اور درندگی وحیوانیت کا روپ دھار لیتا ہے۔ بالا بھی ایک بھنگن کے عشق کے دلدل میں پھنس گیا تھا لیکن ایک بھنگن ہی کیوں؟ یہ ایک بڑا سوال ہے۔ بالا کو بچپن میں اس کے ماں باپ کے انتقال کی وجہ سے پیار نہ ملا تھا۔ دوسری طرف اس کے ماموں کی مار پیٹ نے بالا کو اور سنگ دل بنا دیا لیکن اب ایک بھنگن میں اسے وہ پیار نظر آیا جس کی کمی اس کی زندگی میں رہ گئی تھی۔ جس کی وجہ سے اب اسے اپنی زندگی خوشگوار محسوس ہونے لگی تھی یعنی اب وہ اپنی زندگی سے خوش تھا۔

یہ حقیقت ہے کہ خوش وغم انسانی زندگی کا حصہ ہیں گاؤں ہو یا شہر انسان کسی نہ کسی غم میں مبتلا رہتا ہے سریندر اور اطہر جو کہ راوی کے ساتھ ڈرامہ کمپنی میں کام کرتے ہیں سریندر ایک طرف اپنے پیدائشی وطن لائل پور سے بچھڑنے کا غم لئے ہوئے ہیں اور اطہر اپنی جنم بھومی لاہور سے بچھڑنے کے غم میں مبتلا ہے اور راوی خود بالا کے غم میں کہ اس کی زندگی ایک ایسے دلدل میں پھنس گئی ہے جہاں سے اس کا نکلنا مشکل ہے۔ لیکن راوی ایک ناصح کے طور یہ باور کرتے ہیں کہ اگر انسان انہیں غموں کے نہاں خانوں میں گم ہوتا رہے تو دنیا سے قہقہے چھین جائیں گے اور مسکراہٹیں ختم ہو جائیں گی بلکہ درد میں اضافہ ہوگا۔ لیکن یہ بات بھی اپنی جگہ مسلم ہے کہ انسان کے جھوٹے اطمینان، آسودگی اور سکون کے پیچھے دکھوں کا ایک پہاڑ چھپا ہوتا ہے۔ اگر انسان کسی فعل بد میں مبتلا ہوتا ہے تو اس کے پیچھے کوئی نہ کوئی وجہ ضرور ہوتی ہے جوالا ہی کو لیجئے، وہ ایک جھونپڑی میں اپنے شوہر کے ہمراہ رہتی ہے لیکن اپنی عصمت کو بیچ کر اپنے شوہر اور بچے کا پیٹ بھرتی ہے لیکن اس کے باوجود بھی اس کا شوہر اس پر ظلم وتشدد جاری رکھتا ہے ناول نگار ناول میں اس بات کی طرف توجہ مبذول کراتے ہیں کہ جب انسان پر خارجی ونفسیاتی حالات وواقعات کا بوجھ بڑھنے لگتا ہے تو اسے زندگی بے مصرف معلوم ہوتی ہے جوالا پر اس کے شوہر کا ظلم، بالا کی بے سمت جوانی کیوں کہ وہ ایک ایسی عورت سے عشق کر بیٹھتا ہے جو ایک تو شادی شدہ ہے دوسرے یہ کہ وہ ایک ہندو ہے اور تیسری بات یہ کہ وہ اپنی عصمت بیچتی تھی۔ اطہر اپنے وطن کا غم لئے ہوئے ہے اور سریندر زندگی کے جینے کے سلیقے سے بیزار اور شیتل کو دھوکہ دینے کے احساس نے اس میں ایک ایسی کسک پیدا کر دی تھی جس کی وجہ سے وہ احساس کمتری کا شکار ہو جاتا ہے۔

شہر اور گاؤں کے فرق کی واضح تصویر ناول میں دیکھنے کو ملتی ہے علی محمد لون نے گاؤں اور شہر کی تہذیب و تمدن کا موازنہ جوالا کے شوہر منو چمار کی موت کے ذریعے کیا ہے منو چمار کی موت جہاں ہوتی ہے وہاں آس پاس اس کی موت کا کہیں ذکر بھی نہیں ہوتا ہے یعنی شہر کی خاصیت یہی ہے کہ وہاں کوئی بھی بڑا واقع رونما کیوں نہ ہو کسی کے کانوں تک خبر نہیں پہنچتیں کیوں کہ شہری زندگی پر شور اور تیز رفتار ہے اس کے برعکس گاؤں کے لوگ بڑے ہی ملنسار، ہمدرد اور ملنے جلنے والے ہوتے ہیں۔

ناول میں سماجی زندگی کے بارے میں بھی مختلف واقعات سامنے آتے ہیں سماج میں چند لوگ ایسے ہوتے ہیں جو دوسروں کے کردار کا پتہ اپنے اندازے سے لگاتے ہیں جو کبھی کبھار نقصان دہ بھی ثابت ہوسکتا

ہے اتنا ہی نہیں بلکہ وہ اپنی طبیعت اور من مانی سے لوگوں کے حق میں فیصلے بھی صادر کرتے ہیں شیتل جو کہ سریندر سے محبت کرتی ہے لیکن کئی مردوں سے شناسائی کی بنیاد پر اس کے کردار پر سوالات کھڑے کئے جاتے ہیں اس کو شک کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے اس پر بدکرداری کا داغ زبردستی لگا دیا جاتا ہے علی محمد لون نے یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ زندگی ایک ڈرما ہے اور سماج میں بسنے والے لوگ اس کے کردار لیکن سماج کے چند لوگ اس ڈرامے کے خالق کے طور پر لوگوں کے متعلق ٹھیک اسی انداز سے فیصلہ کر دیتے ہیں جیسے ڈراما نگار اپنے کرداروں کے حق میں فیصلہ کرتا ہے۔ لیکن ایسا بھی ایک وقت آتا ہے کہ برے سے برے انسان کو اس بات کا احساس ہو جاتا ہے کہ کہیں نہ کہیں اس سے کوئی غلطی سرزد ہوگئی ہے اور وہ اپنی غلطی کو سدھارنے کے واقعے ڈھونڈتا رہتا ہے شیتل کے حق میں چند لوگوں نے یہ رائے قائم کر لی تھی کہ وہ ایک بدچلن اور بدکردار عورت ہے جس نے اپنے چہرے پر شرافت کا میک اپ لگایا ہوا ہے لیکن اسے بھی اس بات کا احساس ہو جاتا ہے کہ اس نے سریندر کو دھوکہ دیا ہے جس کے پچھتاوے نے اسے سریندر سے معافی مانگنے پر مجبور کیا اور وہ سریندر سے شادی کرنے کے لئے تیار ہو جاتی ہے۔ شاید ہے تیری آرزو ناول میں لون نے سریندر اور شیتل کی محبت کی شادی کے پس پردہ ان کے دفتر میں کام کرنے والے شرما اور پدما کی لومیرج کا حوالہ دیتے ہوئے لومیرج کی ناکامی کا احاطہ کیا ہے۔ لون کا تعلق چونکہ کشمیر سے ہے اور وہاں لومیرج کو اہمیت بالکل نہیں دی جاتی بلکہ اسے عیب سمجھا جاتا ہے کیوں کہ مانا جاتا ہے کہ اس طرح کی شادی کی عمر زیادہ نہیں ہوتی اور اس طرح بنائے گئے رشتے کمزور ہوتے ہیں جن کے جلد ٹوٹنے کا شک رہتا ہے کیوں کہ اس طرح کی شادی میں جو محبت شادی کے بعد ملنی ہوتی ہے وہ پہلے ہی ضائع کر دی جاتی ہے۔

علی محمد لون کے اس ناول میں جوالا کا کردار بھی کافی اہم ہے جو نہایت ہی نچلے طبقے سے تعلق رکھنے والی ایک بھنگن ہے وہ لوگوں کے گھروں میں جا کر جمادارنی کا کام کرتی ہے لیکن راوی کا جوالا کے گھر جانا اور بالا سے رشتے کی بات کرنا اس کی طرف واضح اشارہ کرتا ہے کہ ذات پات، بھید بھاؤ اور اونچ نیچ کی بنیاد پر افراد میں تفریق کرنے کے پیچھے اس کائنات کے تخلیق کار کی نہیں بلکہ سماج کی کارفرمائی ہے راوی جو خود احساس برتری کا شکار ہے لیکن ایک بار انہیں بھی اس بات کا احساس ہو جاتا ہے کہ جب بنانے والے نے کوئی تخصیص نہیں کی تو اس تفریق میں ہم انسان اتنی دلچسپی کیوں دکھاتے ہیں ناول نگار سماج کے اس ناسور کی طرف انگشت

نمائی کرتے ہیں جس نے افراد میں ذات پات رنگ ونسل اور کسی قسم کی کوئی تفریق ہے جس سے سماج اپنی تہذیب وثقافت کھو بیٹھتا ہے انسانی رشتوں کو نبھانے میں جب دین دھرم حائل ہو جاتا ہے تو ان رشتوں کی عمر یا تو کم ہوتی ہے یا پھر رشتے بننے سے رہ جاتے ہیں جیسے جوالہ اور بالا کا رشتہ۔ حالاں کہ ایک دوسرے سے محبت کرنے کے باوجود بھی وہ ایک دوسرے کے نہیں ہو سکے کیوں کہ جوالہ ایک تو ہندو تھی اور دوسرے یہ کہ وہ ایک نچلی ذات سے تعلق رکھتی تھی بالا مسلمان تھا لیکن وہ ہندو بننے کے لئے تیار ہو جاتا ہے مگر جوالہ اپنی ذات پات، دین دھرم اور سماجی اصولوں کے لئے بالا کو بھینٹ نہیں چڑھانا چاہتی ہے اور اسی لئے اس رشتے سے انکار کرتی ہے۔

ناول نگار نے انسانی رشتوں کے درمیان حائل ہونے والے کٹر سماج اصولوں کے ساتھ ساتھ قانون پر بھی تنقید کی ہے قانون ایک بھنگن کو سندی طور پر نچلی ذات سے تعلق رکھنے والی قرار دے سکتا ہے لیکن سماج میں اسے عزت نہیں دلا سکتا۔ قانون جوالہ کے بچے کو ایک بھنگن کا بچہ کاغذی طور پر ثابت کر سکتا ہے لیکن اسے اپنے والدین کے سائے سے دور کرنے والے سماج کے سخت گیر اصولوں کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا ہے یعنی سماجی اصولوں کے ساتھ ساتھ قانون بھی کہیں نہ کہیں سماج میں بسنے والے افراد میں تفریق کرنے کا رول ادا کرتا ہے لیکن وقت آنے پر سماج اور قانون کے یہ بندھن ٹوٹ جاتے ہیں اور انسان کو مجبوراً ایک ایسے راستے کا انتخاب کرنا پڑتا ہے جہاں پر اسے باغی قرار دیا جاتا ہے بالا کو یہ تجویز ملتی ہے کہ یا تو وہ جوالہ کو بھگا کر لے جائے یا پھر وہ اپنا دھرم بدلے۔ سماجی اور قانونی اصول وضوابط سے بالا تر ہو کر ایک باغیانہ راستہ اپنانے کے پیچھے جوالہ کے اس نو زائیدہ بچے کا مستقبل تھا جسے ابھی یہ بھی نہیں معلوم کہ اس کا باپ کون ہے۔

مذہب تبدیل کرنے یا جوالہ کو بھگا کر لے جانے کی تجویز اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ اگر سماج میں انسان ان فرسودہ اصولوں کو مٹا دینا چاہتا ہے تو اسے ہمت سے کام لینا ہوگا اور بزدلی اور ڈر کو دل سے دور کرنا ہوگا۔ کیوں کہ ذات پات، رنگ ونسل اور اونچ نیچ کی بنیاد پر انسانوں کے درمیان فرق کرنے والے اصول ہمت جٹا کر ہی مٹائے جا سکتے ہیں ناول میں اس بات کی طرف بھی اشارہ ہے کہ انسان میں چاہے کتنی خامیاں کیوں نہ ہوں ایک وقت ایسا آتا ہے کہ اسے اپنی خامیوں کا احساس ہو جاتا ہے اور وہ ایک نیک سیرت انسان بننے کی کوشش کرنا شروع کرتا ہے۔ راجو جو کہ ایک بدتمیز بداخلاق اور بدزبان ہے لیکن بالا کے بیمار ہونے کے

بعد جس طرح وہ اس کی تیمارداری کرتا ہے اس سے اس کے اندر کی اچھائی صاف دکھائی دیتی ہے سریندر جس کو آخر میں یہ احساس ہو جاتا ہے کہ اس نے شیتل کے ساتھ دغا بازی کر کے ایک غلط کام انجام دیا ہے بالا کا دل راجو کی اچھائی دیکھ کر پگھل جاتا ہے دراصل کسی بھی انسان کے تئیں اندازہ لگانا بہت ہی مشکل ہے کیوں کہ ایک حرکت، ایک معمولی بات یا پھر ایک واقعہ کسی بھی انسان کے تئیں لگائے گئے اندازے کو غلط ثابت کر سکتا ہے۔ ناول نگار یہ بات ذہن نشین کراتا ہے کہ انسان کے دل میں نفرت، محبت، حسد، دشمنی اور ہمدردی و دوستی کا مادہ ایک ساتھ ہوتا ہے لیکن اس پر اس کے نفسیاتی و مادی حالات و واقعات کی بنیاد پر اچھے یا برے ہونے کی لیبل لگائی جاتی ہے ناول کا اختتام جوالہ کی خودکشی پر ہوتا ہے جو اس دنیا میں تب دوبارہ جنم لینے کی خواہاں ہے جب اس دنیا سے دین و دھرم ذات پات کی دیوار بالا اور اس کی محبت کے درمیان مٹ جائے گی۔ جب اس سماج میں سبھی ایک سمان ہوں گے۔ جوالہ اپنے بچے کے لئے یہ پیغام چھوڑ جاتی ہے کہ وہ جب بڑا ہوگا تو سماج کے ان کٹر پن اصولوں کے خلاف جنگ کرے اور اسے اس دنیا سے مٹا دے تب جا کر سبھی انسان مل جل کر رہ سکتے ہیں۔ اقتباس دیکھیں:

> ''...... میں تب تک اس سنسار میں جنم نہیں لوں گی جب تک دین دھرم کی دیوار بالا اور جوالہ کے بیچ کھڑی رہے گی یہ دیوار نہ رہے گی تو جنم لوں گی اور بالا سے ملوں گی۔ جب آؤں گی جب سبھی ایک سمان ہوں گے بالا یہاں آؤ میرے سامنے...... بالا اس جنم میں میں نے کیوں تمہیں اپنا سوامی مانا ہے منا کو میرے بعد سنبھال لینا۔ یہ تمہارا بچہ ہے۔ کنسٹیبل صاحب میں تمہارے سامنے اپنا بچہ بالا کو سونپ رہی ہوں اس کی رکھشا کرے گا۔ اسے پالے گا، پوسے گا، بڑا بنائے گا اور سکھائے گا کہ اس کی ماں نے جس چیز کے کارن پران دئے۔ اس سے یدھ کرے۔ اسے سنسار سے مٹا ڈالے۔ تبھی سب منش ایک ہوں گے اور تب ہی میں جنم لے کر اس سنسار میں آؤں گی۔ نہیں تو کبھی نہیں آؤں گی۔ کبھی نہیں۔ کبھی نہیں۔''[1]

[1] علی محمد لون۔ شاید ہے تیری آرزو۔ ص ۲۵۴ جے کے بک ہاؤس۔ ۱۹۶۲

شاید ہے تیری آرزو کے اس اقتباس سے ظاہر ہوتا ہے کہ رشتوں کے درمیان جب بھید بھاؤ، دین و دھرم، ذات پات اونچ نیچ اور سماجی اصول درآتے ہیں تو انسان کی معنونیت مسخ ہو کر رہ جاتی ہے ناول کا پلاٹ عمدہ اور مربوط ہے چوں کہ ناول کا راوی ایک ڈرامہ نگار ہے اس لئے ایک آدھ جگہ فن ڈراما نگاری کی طرز پر لکھے گئے حصے کی وجہ سے پلاٹ میں تھوڑا سا جھول نظر آتا ہے۔

جہاں تک مکالمہ نگاری کی بات ہے تو مکالمہ نگاری کے وہ تمام اصول بھی اپنائے گئے جن میں ناول کی کامیابی مضمر ہے کرداروں کے ذریعے ایسے مکالمے ادا کئے گئے جن سے کردار کے پڑھے لکھے یا ان پڑھ ہونے کی تصدیق ہو جاتی ہے نوکر بالا کے ذریعے ایسے ہی مکالمے ادا کئے گئے جیسے ایک نوکر کی زبان ہوتی ہے اور جوالا کے ذریعے بھی ایسے ہی مکالمے ادا کئے گئے جیسے ایک بھنگن ادا کر سکتی ہے ناول زبان و بیان کے اعتبار سے بھی ایک مکمل تخلیق فن پارہ نظر آتا ہے انگریزی اور ہندی کے الفاظ بھی ملتے ہیں جملوں کو کئی جگہوں پر ادھورا چھوڑا گیا ہے جو ایک طرف قاری میں تجسس برقرار رکھتا ہے اور دوسری طرف اسے سوچنے کا بھی موقع فراہم کرتا ہے علی محمد لون کا اسلوب نگارش سادہ سلیس اور رواں ہے غرض فن و موضوع دونوں اعتبار سے یہ ناول ایک کامیاب ناول ہے علی محمد لون نے ایک ہی لکھا لیکن اس کی وجہ سے انہیں کافی شہرت حاصل ہوئی۔

غلام رسول سنتوش

ریاست جموں وکشمیر کے ناول نگاروں میں ایک اہم نام غلام رسول سنتوش کا بھی ہے غلام رسول سنتوش کے آباء واجداد نے مہاراجہ گلاب سنگھ کے زمانے میں دسل پورہ تحصیل پٹن ضلع بارہ مولہ سے ہجرت کر کے نالہ مار کے کنارے چنکرال محلّہ حبہ کدل سرینگر میں مستقل سکونت اختیار کی۔ غلام رسول سنتوش کے والد کا نام غلام محمد ڈار تھا۔ جولاہے کا کام ان کو وراثت میں ملا تھا تاہم وہ محکمہ پولیس میں بطور سپاہی ملازم ہو گئے تھے اور ملازمت کی وجہ سے وہ اکثر اپنے گھر سے باہر رہا کرتے تھے سنتوش کی ماں کا نام سیدہ بیگم تھا۔ ۱۹ جون ۱۹۲۹ کی صبح غلام رسول ڈار کی پیدائش محلّہ ڈب تل سرینگر میں ہوئی غلام رسول سنتوش نے ۱۹۴۵ میں دسویں جماعت کا امتحان پاس کیا لیکن پھر وہ مزید تعلیم حاصل نہ کر سکے۔ ان کے والد کا انتقال ہوا تو انہیں کچھ محنت کرنی پڑی۔ انہوں نے لکھنا شروع کیا مصوری میں بھی انہوں نے طبع آزمائی کی اور اپنا نام روشن کیا۔ سائن بورڈوں اور گاڑیوں پر رنگ چڑھانے کا کھردرا کام بالآخر ان کے لئے زندگی میں نکھار کا ذریعہ بن گیا۔ ۱۹۵۲ء میں ''انجمن ترقی پسند'' فنکاراں جموں وکشمیر کے ممبر بن گئے اور اس طرح سے دنیائے فن کے طویل سفر کا آغاز کیا۔ غلام رسول سنتوش کو ۱۹۵۴ء میں بخشی غلام نے مصوری کی تربیت حاصل کرنے کے لئے مہاراجہ سیاجیراو یونیورسٹی بڑودہ بھیج دیا۔ سرکار کی طرف سے ان کو ماہانہ ڈیڑھ سو روپے وظیفہ ملنے لگا۔ بڑودہ میں شعبہ مصوری کے سربراہ این۔ ایس۔ بیندرے تھے۔ سنتوش نے ان کی رہنمائی میں دو سال تک کام کیا۔ دو سال کے اس مختصر عرصے میں سنتوش مشہور فنکار بن گئے۔ مصوری کے میدان میں آگے بڑھنے کے لئے سنتوش نے دہلی میں مستقل سکونت اختیار کر لی جہاں وہ کئی عالمی شہرت کی آرٹ گیلریوں سے وابستہ ہو گیا۔ جن کے اہتمام سے ان کی تصویروں کی نمائش ملک کے بڑے شہروں کے علاوہ بیرون ملک کے اہم شہروں میں بھی منعقد ہوئی۔ غلام رسول سنتوش بنیادی طور پر ایک مصور تھے لیکن اردو زبان وادب سے ان کی گہری دلچسپی تھی۔ غلام رسول سنتوش ۱۰ مارچ ۱۹۹۷ کو نئی دہلی میں انتقال کر گئے۔

سمندر پیاسا ہے:

اس ناول کے مصنف غلام رسول سنتوش ہیں۔ غلام رسول دراصل مصوری میں دستگاہ رکھتے تھے لیکن اردو زبان وادب سے انہیں گہری دلچسپی تھی۔ اور اس دلچسپی اور وابستگی نے ان سے ایک بہترین ناول ''سمندر پیاسا ہے'' کے عنوان سے لکھوایا۔ ناول نگار نے اگر چہ ناول نگاری کے میدان میں قدم رکھا لیکن وہ مصوری میں بھی مصروف رہے اور اسی وجہ سے وہ اس صنف نثر کی طرف زیادہ توجہ نہ کر سکے۔ غلام رسول سنتوش نے ایک ہی ناول اردو ادب کے لئے یادگار چھوڑا ہے لیکن اس ناول کو پڑھنے کے بعد اندازہ ہوتا ہے کہ ان کے اندر وہ تمام صلاحیتیں موجود تھیں جو ایک ناول نگار کے لئے ضروری خیال کی جاتی ہیں وہ ایک مصور تھے اور اکثر اوقات مصوری میں مصروف رہتے تھے۔ شاید اسی وجہ سے ناول میں شروع سے آخر تک مصوری چھائی رہتی ہے اور ناول کے قریب قریب تمام کردار مصوری سے دلچسپی رکھتے ہیں 'سمندر پیاسا ہے' ناول کے نام ہی یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ناول میں کچھ کردار ایسے ہوں گے جن کی پیاس بجھتے ہوئے بھی بجھتی نہیں ہوگی ناول میں رومان اور ہوس پرستانہ جذبات کی عکاسی بہترین انداز میں کی گئی ہے ناول پڑھتے ہوئے ایسا لگتا ہے کہ یہ کہانی مصنف کی زندگی سے بہت حد تک میل رکھتی ہے ''سمندر پیاسا ہے'' ناول میں غلام رسول سنتوش نے واحد متکلم جیسی تکنیک استعمال کی ہے ایسی تکنیک میں ناول نگار کسی انجانے کردار کے ذریعے سے ناول کو آگے بڑھاتا ہے واحد متکلم ہی ناول کے تمام کرداروں کا تعارف کراتا ہے اور تمام واقعات میں موجود رہتا ہے اس ناول میں ناول کے مصنف غلام رسول سنتوش شروع سے آخر تک ناول کے ہر واقعے میں کسی نہ کسی طرح جڑا ہوا ہے اور پورا ناول اس کے گرد گھومتا ہے منصور احمد منصور غلام سنتوش کے اس ناول کے متعلق لکھتے ہیں:۔

> ''سنتوش کا اصل میدان مصوری ہے ''سمندر پیاسا ہے'' ان کا واحد ناول ہے اس ناول میں سنتوش نے بڑی بے رحمی کے ساتھ انسان کے باطن میں موجود ہوسناکی اور زہرناکی کو ابھارا ہے۔ یہاں زندگی ایک روگ کی صورت میں سامنے آتی ہے اس روگ نے حاجرہ، شکنتلا اور کلینا جیسی کتنی ہی زندگیوں کو دیمک کی طرح چاٹ لیا ہے یہ روگ انسان کے باطن میں پرورش پاتا ہے یہ خودغرضی، بولہوسی اور لذت پرستی کا روگ ہے۔''[۱]

[۱] منصور احمد منصور جموں و کشمیر میں اردو ناول ۱۹۴۷ء کے بعد۔ رسالہ شیرازہ۔ جلد ۳۷ شمارہ ۶۷ ص۔ ۱۸۳

غلام رسول سنتوش کے ناول میں زندگی کو اس طرح پیش کیا گیا ہے کہ واقعات اور کردار تمام بنیادی محرکات کے ساتھ اجاگر ہوتے ہیں۔ حالانکہ زندگی اتنی وسیع ہے کہ اس کے تمام پہلوؤں کو پیش کرنا مشکل ہے لیکن وہ اس مشکل امر سے بخوبی عہدہ برآ ہوتے ہیں کس بھی پس منظر کو ابھارنے میں انہوں نے کرداروں سے کام لیا ہے انھوں نے مصوری کی مدد سے ناول کے کرداروں کو عیاں کرنے کی کامیاب سعی کی ہے۔

اس ناول میں پہلی بار شعور کی رو کی تکنیک کی ہلکی سی جھلک دکھائی دیتی ہے۔ دراصل شعور کی رو کی تکنیک میں اہم کرداروں کی خارجی زندگی سے زیادہ ان کی داخلی زندگی سے متاثر ہوئے ہیں۔ کرداروں کی داخلی زندگی کے اسرار و رموز وہی فنکار اجاگر کرسکتا ہے جو اس فن میں بخوبی مہارت رکھتا ہے غلام رسول سنتوش کے ناول کو پڑھنے کے بعد ایسا محسوس ہوتا ہے کہ سنتوش اس گر سے پوری طرح نہیں لیکن کافی حد تک واقف تھے غلام رسول سنتوش نے ناول میں کرداروں کی خارجی زندگی کے بجائے انسان کی اندرونی پرتوں کو بڑی فنکاری سے کھولا ہے انہوں نے اس پر زیادہ زور نہیں دیا ورنہ اگر وہ ایسے کرتے تو شعور کی رو تکنیک میں عمدہ نمونے پیش کر سکتے تھے۔ لیکن پھر بھی ان سے جتنا ہوسکا انہوں نے کرداروں کی نفسیات کو اجاگر کرنے میں کافی محنت اور دیانتداری سے کام لیا ''سمندر پیاسا ہے'' ناول غلام رسول سنتوش کی زندگی اور ان کے فن دونوں کا آئینہ ہے ناول فنکار کی اپنی اصطلاحوں میں اپنی سرگزشت بھی ہے ناول کے دیباچے میں غلام رسول سنتوش نے لکھا ہے:

> ''سمندر پیاسا ہے'' میرا پہلا ناول ہے اس سے پہلے میں نے کشمیری اور اردو میں کہانیاں لکھی ہیں جن میں دوسروں کے چہروں کو اپنے آئینے سے دیکھنے کی جسارت کی ہے لیکن میں نے 'سمندر پیاسا ہے' میں اپنے چہرے کو خود اپنی آنکھوں سے دیکھنے کی کوشش کی ہے ناول میں جو کردار ہیں وہ میرے جانے پہچانے ہیں مدتوں میرے دل کے قریب رہے ہیں۔ جو واقعات ہیں وہ حقیقی دنیا سے تعلق رکھتے ہیں اور ان کا تعلق براہ راست میری زندگی سے بھی ہے۔ ناول میں میری زندگی کی بلندیاں اور پستیاں بھی ہیں اور تلخ و شیریں تجربے بھی جو انسان میں جینے کی تحریک

بخشتے ہیں۔''[1]

مندرجہ بالا اقتباس سے صاف ظاہر ہے کہ یہ ناول مصنف کی زندگی سے کافی حد تک میل کھاتا ہے ناول پڑھتے ہوئے بھی اس کا اندازہ ہوتا ہے اس ناول میں کئی ایسے واقعات ہیں جو حقیقت میں ان کی زندگی سے تعلق رکھتے ہیں لیکن یہ ناول کی کمزوری نہیں بلکہ خوبی ہے کیوں کہ اچھا ناول زندگی سے قریب ہوتا ہے اور یہی خوبی اسے داستان سے الگ کرتی ہے حقیقی زندگی سے قریب ہونے کے باوجود ناول نگار نے بڑی فنی چابکدستی سے کام لیتے ہوئے کہانی کو ترتیب دیا ہے۔ ٹھاکر پونچھی ان کے اس ناول کے متعلق اس طرح رقمطراز ہیں:۔

''سمندر پیاسا ہے'' ایک دریا کی کہانی ہے جو بھکی بھٹکی چھوٹی چھوٹی سی ندیوں کو اپنے سینے سے لگائے ان کی منزل کی جانب بڑھنے کی جستجو میں ہوتا ہے کیوں کہ اس میں اس کی اپنی محبت کی تکمیل ہے......سنتوش انسانی نفسیات اور سیاسی وسماجی باریکیوں اور لغزشوں پر گہری نظر رکھتا ہے۔''[2]

غلام رسول سنتوش کے اس ناول میں کئی کردار ہیں کردار نگاری کے اعتبار سے ناول بہترین ناول ہے ناول کا مرکزی کردار خود مصنف ہے جو ناول میں اول تا آخر آنے والے تمام واقعات میں موجود رہتا ہے یہی کردار پورے ناول پر چھایا ہوا نظر آتا ہے اور دوسرے کرداروں سے ہمارا تعارف کراتا ہے۔ ناول کے مطالعے کے دوران ہمیں یہ محسوس ہوتا ہے اس کردار کے پس پردہ ناول نگار خود بول رہا ہے یہ کردار دراصل ایک مصور ہے اور تصویریں بنانے میں اسے کافی دلچسپی اور مہارت ہے۔ اپنی پہلی محبت چھن جانے کے بعد وہ ہمیشہ اپنے خیالوں میں کھویا رہتا ہے۔ جس لڑکی کو اس نے چاہا تھا اس لڑکی کی شادی اس کے گھر والوں نے اس کی مرضی کے خلاف کہیں اور کردی جس کے نتیجے میں وہ اداس رہنے لگا۔ اس لئے اگرچہ کئی لوگ اسے اپنانا چاہتے ہیں لیکن وہ کسی کو اپنانے کے لئے تیار نہیں۔ ناول میں ہر مقام پر یہ کردار نفسیاتی الجھنوں کا شکار رہتا ہے وہ اپنے ماضی کو بھولنا چاہتا ہے مگر نہیں بھول پاتا اور ماضی کی یادیں اس کے دل ودماغ میں آخر تک رہتی ہیں مصنف اپنی

[1] غلام رسول سنتوش۔ سمندر پیاسا ہے ص۱۳۔ ۱۹۶۵

[2] غلام رسول سنتوش۔ سمندر پیاسا ہے تعارف از ٹھاکر پونچھی۔ ص۸۔۷ سن اشاعت ۱۹۶۵

محبت کی تصویریں پیش کرتا ہے:۔

''یہ حقیقت تھی کہ میں نے اس لڑکی سے پیار کیا تھا۔ بچپن میں ہم اکٹھے کھیلتے تھے ہمارا پیار ایک ساتھ پل کر جوان ہوا۔ جوانی اپنے ساتھ نام لائی مذہب لائی اور ہم دونوں کو سماج کے آہنی ہاتھوں نے الگ کر دیا۔ اس لئے کہ ہم دونوں کے نام مختلف تھے۔ مذہب مختلف تھے۔ سماج مختلف تھے۔ ہندو سماج، مسلمان سماج اور ایک دن اس کی شادی ہوگئی۔ آنسوؤں میں گھلی ہوئی مہندی ہاتھوں پر رچے ہوئے وہ اپنے گھر کو چھوڑ کر چلی گئی مجھے روتا ہوا چھوڑ کر چلی گئی۔ میری خوشیاں اپنے ساتھ لے گئی۔ مستقبل کے سہانے محل کو کھنڈر بنا کر چلی گئی۔ اب میرے پاس کچھ بھی نہ تھا۔ ایک بے معنی سا وجود تھا۔''[1]

مصنف یعنی ناول کا یہ مرکزی کردار محبت میں ناکامی پانے کے بعد اکثر اداس رہتا تھا۔ مصوری میں اس کے دن اور راتیں گزرتی گئیں کئی لوگوں سے اس کا سامنا ہوا۔ جیسے شکنت، ہاجرہ، کلینا، کانتا۔ ہر ایک نے سہارا دینے کی کوشش کی لیکن وہ کسی کو اپنا نہ سکا۔ وہ کسی سے اپنی محبت کا اظہار نہ کر سکا کیوں کہ وہ محبت کی جنگ میں پہلے ہی ناکام ہو چکا تھا۔ یہ کردار صرف ایک بہترین مصور ہی نہیں بلکہ اس کے اندر ہر انسان کے لئے محبت اور ہمدردی کے جذبات کوٹ کوٹ کر بھرے ہوئے ہیں وہ ہر موقع پر انسان دوستی کی باتیں کرتا ہے وہ لوگ کے پیدا کردہ رسم ورواج کو قبول نہیں کرتا بلکہ وہ ان سب چیزوں سے بغاوت کرتا ہوا نظر آتا ہے۔ یہ کردار جہاں ایک طرف محبت میں ناکامی کے سبب کافی دکھی ہے تو دوسرے طرف اس میں زندگی جینے کا حوصلہ بھی باقی ہے۔ وہ اپنی ماں، ہاجرہ اور اپنے چھوٹے بھائیوں کو پالنے کے لئے کافی محنت کرتا ہے اس کی محنت رنگ لاتی ہے اور وہ بہترین مصور بن جاتا ہے شہرت پانے کے باوجود بھی وہ اپنی ماں اپنے بھائیوں، ہاجرہ اور دوسرے یار دوستوں کو نہیں بھولتا۔ بلکہ برابر ان کی خوشی غمی میں ساتھ دیتا ہے۔ محبت میں ناکامی پانے کے باوجود وہ کچھ نہ کچھ کرنے کا جذبہ لئے ہوئے ہے۔

---

[1] غلام رسول سنتوش۔ سمندر پیاسا ہے ص۔ ۳۲۷، ۱۹۶۵

سمندر پیاسا ہے ناول کا ایک اور اہم کردار ہاجرہ ہے۔ ہاجرہ کا بچپن کھلی فضاؤں میں گزرتا ہے لیکن جوانی کی دہلیز پر قدم رکھتے ہی اس کی زندگی میں اندھیرا چھا جاتا ہے ہاجرہ سرتاپا ایثار وقربانی کا مجسمہ ہے ناول کے اس کردار سے کشمیر کی عام کم تعلیم یافتہ لڑکیوں کی تصویر دکھائی دیتی ہے جن کے اندر محبت اور ہمدردی کوٹ کوٹ کر بھری ہے اور دوسری چیز شرم وحیا ہے ہاجرہ شرم وحیات کا مجسمہ ہے اور اس وجہ سے ہاجرہ کی زبان کبھی بھی کھلنے نہیں پاتی۔ ہاجرہ اندر ہی اندر محبت کے الاؤ میں جلتی رہتی ہے مگر شرم وحیا کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑتی چونکہ لڑکیوں کا اپنی پسند سے لڑکے کو چننا اور پھر اس سے شادی کرنا مسلم سماج میں گناہ تصور کیا جاتا ہے اور اسی لئے ہاجرہ بھی یہ گناہ کرنے سے کتراتی ہے لیکن دوسری طرف اس محبت کی شدت کی وجہ سے وہ اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھتی ہے کیوں کہ اندر ہی اندر محبت کی آگ اسے ختم کر دیتی ہے۔

ناول میں دراصل یہ دکھانے کی کوشش کی گئی ہے کہ سماج میں رائج کردہ غلط تصورات کتنے نقصان دہ ثابت ہوتے ہیں جو ایک انسان کی جان لے لیتے ہیں۔ کشمیری عوام کے غلط تصورات اور توہمات کے خلاف سنتوش کا یہ ناول ایک احتجاج بھی ہے کیوں کہ انہیں غلط تصورات سے ہی ہاجرہ اپنے دل کی بات کبھی زبان پر نہیں لا پاتی اور اندر ہی اندر محبت کی شدت اس کے لئے جان لیوا ثابت ہو جاتی ہے۔

ناول میں ایک اور کردار شکنت بھی اپنی انفرادی شناخت قائم کئے ہوئے ہے آخر تک قاری کی ہمدردی اس کے ساتھ برابر رہتی ہے شکنت ناول کے ہیرو کو اپنانا چاہتی ہے لیکن ہیرو اپنی پہلی محبت کے دائرہ کار سے باہر نہیں نکلتا۔ اور شکنت مجبور ہو کر تنہائی کی زندگی بسر کرتی ہے اس کے علاوہ ناول میں پشپا۔ کانتا۔ ستیش۔ جیوتی۔ ترلوک اور بوڑھا پاگل جیسے کردار بھی ملتے ہیں جو ناول میں کہانی آگے بڑھانے میں معاون ثابت ہوتے ہیں اور قاری کی دلچسپی قائم رکھتے ہیں۔ بہرحال ناول میں شامل تمام کردار غیر صحت مند سماج کی عکاسی کرتے ہیں۔ اس ناول کے تمام نسوانی کردار کسی نہ کسی طرح مصیبت اور پریشانی سے دوچار ہوتے ہیں مرد کرداران نسوانی کرداروں کے ذریعے کشمیر میں اس دور کی ہندو اور مسلم عورتوں کے مقام ومرتبے کی صحیح تصویر کشی کی ہے یہ بتانے کی بھی کوشش کی ہے کہ جانے کتنے استاد ایسے ہیں جو اپنے شاگردوں کی معصومیت کا ناجائز فائدہ اٹھاتے ہیں غرض مختلف کرداروں کے ذریعے سماج کی مکمل عکاسی ناول میں ملتی ہے۔

غلام رسول سنتوش نے مکالمہ نگاری کے بھی عمدہ نمونے اپنے ناول میں پیش کئے ہیں ناول پڑھ کر محسوس

ہوتا ہے کہ انہیں مکالمہ نگاری پر دسترس حاصل ہے انہوں نے کرداروں کی زبان سے وہی مکالمے ادا کروائے جو بالکل ان کے شایان شان ہیں۔اس ناول کی مکالمہ نگاری کے متعلق فاروق ناز کی یوں رقمطراز ہیں:۔

> ''ناول 'سمندر پیاسا ہے' میں مکالمے نہایت چست ہیں اور بیانیہ میں عام فہم انداز اختیار کیا گیا ہے جس سے قاری کی دلچسپی آخر تک برقرار رہتی ہے۔''[1]

منظر نگاری کے اعتبار سے غلام رسول سنتوش کا یہ ناول کافی اہم ہے غلام رسول سنتوش نے مختلف مناظر کی ایسی تصویر کشی کی ہے جو واقع سے کافی حد تک مماثلت رکھتی ہے انہوں نے قدرتی مناظر کی بھی بڑی خوبصورت تصویر پیش کی ہے۔غلام رسول سنتوش کے اس ناول میں ان تمام سماجی روایات کی حقیقی تصویر پیش کی گئی ہے جس سے دو چار ہو کر عوام میں سے ہی کسی کو پریشانی کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔لیکن ناول کا ہیروان تمام رسومات سے بغاوت کرتا ہے غرض ناول فنی و موضوعی دونوں اعتبار سے کافی اہمیت کا حامل ہے جس سے انکار ممکن نہیں۔

---

[1] فارق نازکی۔دھنک یادوں کی ص ۷۷

حامدی کاشمیری

حامدی کاشمیری کا نام بھی ریاست جموں وکشمیر کے ناول نگاروں میں ایک بڑا نام ہے حامدی کاشمیری کا اصل نام حبیب اللہ ہے ان کا قلمی نام حامدی کاشمیری ہے ان کے والد کا نام خواجہ محمد صدیق بٹ اور والدہ کا نام خورشید بیگم تھا۔ حامدی کاشمیری کی ولادت ۲۹ جنوری ۱۹۳۲ء میں بہوری کدل بازاری مسجد سرینگر کشمیر میں ہوئی۔ حامدی کاشمیری کی تعلیم دستور کے مطابق قرآنی تعلیم سے شروع ہوئی پھر دنیاوی تعلیم کے لئے بھی نزدیک ہی کے ایک پرائمری اسکول میں داخل کر دیا گیا۔ اس طرح وہ دینی و دنیاوی دونوں تعلیم حاصل کرتے گئے۔ ۱۹۴۸ء میں حامدی کاشمیری نے ایم۔ پی۔ ہائی اسکول سری نگر سے فرسٹ ڈویژن میں امتیازی نمبرات کے ساتھ دسویں جماعت کا امتحان پاس کیا۔ ۱۹۵۲ء میں بی۔ اے آنرس (فارسی) ایس۔ پی کالج سرینگر سے کیا۔ ۱۹۵۴ء میں کشمیر یونیورسٹی سرینگر سے ہی ایم۔ اے۔ (انگریزی) کی ڈگری حاصل کی۔ حامدی نے ۱۹۵۸ء میں پنجاب یونیورسٹی سے اردو میں ایم اے (اردو) کی ڈگری حاصل کی۔ سنٹرل یونیورسٹی آف انگلش حیدرآباد سے ۱۹۵۹ میں انگریزی تدریس میں ڈگری لی۔ حامدی کشمیری نے ۱۹۶۶ء میں ''جدید اردو نظم اور یورپی اثرات'' کے موضوع پر مقالہ لکھ کر ڈاکٹریٹ کی ڈگری کشمیر یونیورسٹی سے حاصل کی۔ ایس پی کالج سرینگر میں انگریزی کے لیکچرر کی حیثیت سے کچھ عرصہ اپنا کام انجام دیا۔ ۱۹۵۹ء میں وہ کلچرل اکیڈمی جموں وکشمیر کے اسٹنٹ سکریٹری بنے۔ دو سال تک اس عہدے پر رہنے کے بعد شعبہ اردو کشمیر یونیورسٹی میں لیکچرر کی حیثیت سے تعینات ہوئے۔ ۱۹۶۱ء سے ۱۹۷۳ء تک اس عہدے پر رہے۔ ۱۹۷۴ء سے ۱۹۷۸ء تک ریڈر شعبہ اردو کشمیری یونیورسٹی کی حیثیت سے اپنی خدمات انجام دیں۔ ۱۹۷۹ء میں وہ پروفیسر شعبہ اردو کشمیر یونیورسٹی کے عہدے پر فائز رہے۔ اس دوران وہ کچھ عرصہ صدر شعبہ اردو کی حیثیت سے بھی کام کرتے رہے۔ ۱۹۸۰ء سے ۱۹۹۰ء تک وہ ڈین فیکلٹی آف آرٹس بھی رہے۔ ۱۹۹۰ء سے ۱۹۷۳ء تک وائس چانسلر کشمیر یونیورسٹی کے عہدے پر فائز رہے غرض کشمیر یونیورسٹی پر ان کے بے شمار احسانات ہیں جنہیں فراموش نہیں کیا جا سکتا۔

حامدی کاشمیری نے اپنی ادبی زندگی کا آغاز ۱۹۵۰ء کے آس پاس شاعری اور افسانہ نگاری سے کیا۔ ان کی شاعری کے ابتدائی نمونے ریاست کے علاوہ کئی دوسرے ملکی جریدوں میں بھی چھپنا شروع ہوئے تھے۔ ان کی ابتدائی دور کی شاعری جو ۱۹۶۱ء میں 'عروس تمنا' کے نام سے چھپ چکی ہے۔ ریاستی اور ملکی حالات کے پس منظر میں ایک حساس نوجوان کے قلبی اور رومانی احساسات وجذبات کا احاطہ کرتی ہے اس وقفے میں انہوں نے فکشن کی طرف بھی توجہ دی اور مختلف افسانوں پر آئے۔ ان کی تخلیقات میں وادئ کشمیر کے سماجی اور سیاسی حالات کے پس منظر میں نئی نسل کی نمائندگی کرنے والے کردار کو جذباتی، ذہنی اور نفسیاتی الجھنوں اور باریکیوں کے ساتھ سامنے لائے ہیں ان کے افسانے اور ناول ان کی ذکی الحسی، دردمندی اور فنی آگہی کا ثبوت پیش کرتے ہیں۔ ۱۹۶۰ء میں حامدی نے ادبی زندگی میں ایک نیا موڑ اپنانے کی کوشش کی فکشن نگاری ترک کر کے حامدی نے شاعری کو توجہ کا مرکز بنایا۔ شاعری کے ساتھ ساتھ انہوں نے تنقید کو بھی اپنا خاص میدان بنایا۔ تنقید میں انھوں نے ایسا جامع کام کیا ہے جس کی بنا پر وہ گنتی کے چند اہم اور سر برآوردہ نقادوں کی صف میں آ گئے ہیں۔ اور ان میں اپنا امتیاز قائم کیا ہے انھوں نے قدیم اور جدید شعرا پر متعدد تنقیدی کتابیں لکھی ہیں تنقید میں ان کو یہ امتیاز حاصل ہے کہ انھوں نے مختلف شعرا پر لکھتے ہوئے مضامین لکھنے پر اکتفا نہیں کیا بلکہ پوری کتابیں لکھ دی ہیں۔ میر، اقبال اور ناصر کاظمی وغیرہ اس کی مثالیں ہیں۔ حامدی کاشمیری کی شہرت کا باعث دراصل ان کا تنقیدی ادب ہی ہے۔ حامدی کاشمیری نے مروجہ تنقیدی تنقیدات میں نئے تجزیاتی نظریہ کو متعارف کیا۔ اس ضمن میں انہوں نے اکتشافی تنقید کی بنیاد ڈالی اور مروجہ تنقیدی نظریات کی عدم معنویت کو اجاگر کرتے ہوئے شعری متن پر توجہ مرکوز کی۔ اردو ادب کے فروغ میں انہوں نے اپنی بے شمار خدمات انجام دی ہیں۔ افسانہ ہو یا ناول غزل ہو یا نظم سفرنامہ ہو یا خودنوشت تنقید ہو یا تحقیق غرض ہر اعتبار سے انہوں نے اپنا بیش قیمتی سرمایہ اردو ادب کے لئے یادگار چھوڑا ہے۔ حامدی کشمیری جموں و کشمیر کا یہ ادبی سیارہ دسمبر ۲۷، ۲۰۱۸ء کو ستاسی سال کی عمر پا کر ہمیشہ کے لئے غروب ہو گیا۔

بہاروں کے شعلے:

حامدی کاشمیری کا پہلا ناول ہے جو ۱۹۵۷ء کو شاہین بک اسٹال سرینگر سے شائع ہوا۔ یہ ناول ۴۸۰ صفحات پر مشتمل ہے جسے حامدی کاشمیری نے چھوٹے چھوٹے عنوانات کے تحت پیش کیا ہے، ناول میں حامدی

کاشمیری نے کشمیری عوام کی زندگی کے گوناں گوں پہلوؤں کو ناول کے ذریعے پیش کرنے کی سعی کی ہے، کشمیری زندگی پر لکھا گیا یہ ناول کشمیری لوگوں کی زندگی کے مسائل اپنے اندر سمیٹے ہوئے ہے حامدی کاشمیری نے سماجی و معاشرتی زندگی کے مسائل کے علاوہ سیاسی صورتحال اور ڈوگرہ تانا شاہی کے خلاف تحریک کو بھی اس ناول میں پیش کیا ہے۔ ناول کشمیری عوام کے مسائل اور کشمیری سماج میں پائی جانے والی برائیوں کو اجاگر کر کے ان کی اصلاح کرنے کی ایک کاوش ہے۔عبدالقادر سروری اس ناول کے متعلق لکھتے ہیں:

''بہاروں میں شعلے بنیادی طور پر ایک سماجی ناول ہے اور جو سماجی زندگی اور سماجی مسئلہ وہ پیش کرتا ہے وہ کشمیری مسئلہ نہیں بلکہ سارے ہندوستان و پاکستان بلکہ اکثر مشرقی اقوام کے سماج کا مسئلہ ہے جو کشمیر کے افراد کے ذریعے پیش کیا گیا ہے اس سماجی نقشے میں طبقاتی تفاوت اور کشمکش کا رنگ ابھرتا ہے۔''[1]

حامدی کاشمیری کے اس ناول کو عبدالقادر سروری نے جہاں سماجی ناول قرار دیا ہے وہاں یہ بھی بتایا ہے کہ اس ناول میں جو مسائل ملتے ہیں وہ کشمیر ہی نہیں بلکہ تمام مشرقی ممالک میں نمایاں طور پر نظر آتے ہیں اور عوام ان سے دوچار ہوتی رہتی ہے۔

خود حامدی کاشمیری اپنے اس ناول کے متعلق حرف آغاز میں لکھتے ہیں:

''اس ناول میں آپ اہل کشمیر کی سماجی، مذہبی، معاشرتی اور سیاسی زندگی کو بہت قریب سے دیکھیں گے۔آج تک اردو میں کشمیری زندگی پر جو کچھ لکھا گیا وہ باہر کے ادیبوں کی کاوش فکر کا نتیجہ تھا۔جس میں حقیقت نگاری کم اور تخیل آرائی زیادہ تھی۔ یہ ناول کشمیریوں کی سماجی زندگی کے ماضی اور حال دونوں کی تصویر کشی کرنے کے ساتھ ساتھ ایک خاص تاریخی دور کی دھڑکنوں کو سموئے ہوئے ہے یہ وہ دور ہے جب یہاں کے عوام غلامی اور افلاس کے اندھیروں سے بیزار ہو کر پہلے پہلے آزادی

---

[1] دیباچہ از پروفیسر عبدالقادر سروری، حامدی کاشمیری، بہاروں میں شعلے،ص ۱۵،شاہین بک اسٹال سرینگر کشمیر، ۱۹۵۷ء

اور مسرت کی روشنی کی ضرورت محسوس کرتے ہیں اور وہ اپنی جدوجہد کی
بدولت منزل آزادی کے قریب آجاتے ہیں۔''[1]

'بہاروں میں شعلے' ناول کو حامدی کاشمیری نے ایک عشقیہ داستان کے طور پر پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ ناول میں دو مرکزی کردار ہیں ایک جاوید اور دوسرا اس کی محبوبہ۔ ناول کی پوری کہانی ان دونوں کی محبت پر مبنی ہے جاوید ایک پڑھا لکھا سمجھدار اور شریف لڑکا ہے لیکن بدقسمتی سے وہ غریب خاندان سے تعلق رکھتا ہے۔ جاوید کو والدین سے بہت پیار ملتا ہے اور غریب ہونے کے باوجود وہ جاوید کو اعلیٰ تعلیم دلواتے ہیں۔ جاوید محبوبہ کو پرائیویٹ طور پر پڑھانے کے لئے اس کے گھر جاتا تھا لیکن اس سب کے چلتے اچانک ہی انہیں ایک دوسرے سے محبت ہو جاتی ہے اور وہ محبت کرنے لگتے ہیں۔ چند دن بعد جاوید اعلیٰ تعلیم کے حصول کے لئے علی گڑھ چلا جاتا ہے۔ علی گڑھ سے وہ اپنی محبوبہ کو شادی کے لئے خط لکھتا ہے جب اس بات کی جانکاری محبوبہ کے والد جلال الدین کو ہوتی ہے تو وہ جاوید کے گھر جا کر جاوید کے والد قادر بٹ کو بے عزت کرتا ہے اور قادر بٹ کے بیٹے جاوید کے ساتھ اپنی بیٹی کو منسوب کرنا اپنی شان کے خلاف سمجھتا ہے وہ اپنی بیٹی کا رشتہ جاوید سے ٹھکرا کر حشمت اللہ کے بیٹے سے طے کر دیتا ہے۔ حشمت اللہ نہایت ہی امیر اور مالدار شخص ہے۔ جو ناجائز طریقے سے اپنے اکلوتے بیٹے سلیم کے لئے لاکھوں کی جائیداد جمع کر کے رکھتا ہے بیٹا آوارہ اور بدچلن ہے مگر جلال الدین کی بیٹی محبوبہ سلیم سے شادی کے لئے رضامند نہیں جس کو لے کر محبوبہ اور اس کے باپ کے درمیان کئی بار بحث و تکرار ہوتی رہتی ہے۔ جاوید کی ماں جاوید کا رشتہ اپنے بھائی کے بیٹی سے کر دیتی ہے جس کے بارے میں جاوید کو کوئی خبر نہیں ہوتی جب اس کا پتہ محبوبہ کو چلتا ہے تو وہ ٹوٹ جاتی ہے کہ جاوید کا رشتہ ہو گیا ہے اب وہ مجبور ہو کر ماں باپ کی مرضی پر شادی کے لئے تیار ہو جاتی ہے۔ جاوید تعلیم حاصل کر کے جب واپس آتا ہے تو ان واقعات سے بے خبر ہوتا ہے جب اسے حقیقت کا پتہ چلتا ہے تو وہ خط کے ذریعے اپنے رشتے سے متعلق اپنی لاعلمی کی دلیل پیش کرتا ہے لیکن تب تک کافی تاخیر ہو چکی ہوتی ہے۔

حامدی کاشمیری کے اس ناول سے جہاں اس عہد کے کشمیری سماج کے حالات پتہ چلتے ہیں وہاں سیاسی حالات کا بھی علم ہوتا ہے۔ حامدی کاشمیری نے جاوید اور محبوبہ کی عشقیہ کہانی کے ساتھ اس عہد کے حالات

---

[1] حامدی کاشمیری، بہاروں میں شعلے، ص ۵، شاہین بک اسٹال سرینگر کشمیر، ۱۹۵۷ء

کومحمودہ، حسین، اکرام، قادر بٹ وغیرہ کے ذریعہ پیش کیا ہے۔ جب کشمیری عوام صدیوں کے خواب غفلت سے بیدار ہوکر وقت کے ظالم جاگیرداروں، سیٹھوں اور حکمرانوں کے خلاف آواز بلند کررہی تھی اپنے حقوق کے لئے احتجاج کررہی تھی غرض کہ ناول کے پس منظر میں ڈوگرہ شاہی کے خلاف کشمیری عوام کی جدوجہد کوموضوع بنایا گیا ہے ناول کے اقتباس سے آپ کو اندازہ ہوگا کہ کشمیر جس کو جنت بےنظیر بھی کہا جاتا ہے اس کے لوگ کس طرح کے ظلم وجبر سے دوچار تھے۔ ناول کا اقتباس دیکھیں:

''جنت میں رہ کر بھی ہم جنت سے بیگانے ہیں کتنا ظلم ہے کتنا اندھیرا۔ جاوید کے لہجے میں تلخی پیدا ہوگئی اورتھوڑی دیر کے لئے اس کے چہرے کی بشاشت ڈوب گئی۔ میں یہ کہتا ہوں کیا یہ ظلم ہم پر ہمیشہ ہوتا رہے گا۔ کیا ہم اس طرح سڑتے رہیں گے۔ کیا ہم کبھی اپنی تقدیر نہیں بدل سکتے؟ اس کی آواز میں جذبات کے خلوص سے تھرتھری آ گئی ہم ضرور اپنی تقدیر بدل سکتے ہیں اپنی تقدیر آپ بدلنا ہوگی ہمیں غلامی اور جہالت کی زنجیروں کوتوڑنا ہوگا۔ جاوید کے لہجے میں پھر مسرت چھا گئی۔ حسین کے چہرے پر بھی جذبات کا اتار چڑھاؤ نمایاں تھا۔''[1]

حامدی کاشمیری کا یہ ناول جب منظر عام پر آیا تب ترقی پسند اپنے آخری مراحل پر تھی لیکن اس کا اثر باقی تھا۔ حامدی کاشمیری اگرچہ اس تحریک سے وابستہ نہیں تھے لیکن اس تحریک سے متاثر تھے کیونکہ حامدی کاشمیری کا مقصد اور اس تحریک کے مقاصد ایک ہی تھے۔ سماجی مسائل کی تصویر کشی کر کے اس سماج کی اصلاح کرنا ہی ان دونوں کا مقصد تھا جس کا اثر ناول میں واضح ہے۔

حامدی کاشمیری کے اس ناول کا سب سے اہم عنصر حسن وعشق ہے کشمیری تہذیب فطرت اور معاشرے کے پس منظر میں عشق کی بےتابی، گہرائی، بےقراری اور حسن کی سادگی ودل آویزی کو اجاگر کیا گیا ہے اس بات کا احساس ناول کے شروع سے آخر تک ہوتا ہے۔ حسن وعشق کی بےتابی اور بےقراری سماجی اونچ نیچ کی زد میں آجاتی ہے ناول نگار نے اپنی فنی مہارت کا ثبوت دیتے ہوئے جاوید اور محبوبہ کی محبت کے ذریعہ اس دور کی سماجی

[1] حامدی کاشمیری، بہاروں میں شعلے، ص۲۴، شاہین بک اسٹال سرینگر کشمیر، ۱۹۵۷ء

زندگی کی مکمل تصویر کشی کی ہے۔ جان محمد آزاد اس ناول کے متعلق لکھتے ہیں:

''اس ناول کی زبان شاعرانہ ہے اس میں آپ نے گرد و بیش کی سچی زندگی کو سادہ اور موثر طریقے میں پیش کیا ہے۔ یہاں آپ کے فن میں کوئی پیچیدگی نظر نہیں آتی بلکہ آپ نہایت معصومیت سے سرمایہ پرستی اور معاشرتی بھید بھاؤ کی ترجمانی کرتے ہیں آپ اہل کشمیر کی زندگی کے عکاس بن کر اس ضخیم ناول میں مصوری نیرنگیوں سے بھی قاری کو محظوظ کرتے ہیں۔''[1]

حامدی کاشمیری نے اپنے اس ناول میں مرد اساس معاشرے کو بھی طنز کا موضوع بنایا ہے جس معاشرے میں عورت کو بچے جننے والی مشین سمجھا جاتا ہو اور ان کی پرورش کے علاوہ کسی کام کے لائق نہیں سمجھا جاتا۔ انہیں عزت اور قدر نہیں ملتی۔ ناول میں ایسے مردوں کو طنز کا نشانہ بنایا ہے جو عورت کو بچے جننے اور پرورش کرنے تک محدود رکھتے ہیں۔ ناول کا ایک کردار شاہد شادی کے بعد آوارہ گردی کرتا ہے وہ کنوارے دوستوں کے ساتھ رہ کر یہ بھول جاتا ہے کہ اس کے دو بچے ہیں وہ اپنی بیوی پر بچے پالنے کی ذمہ داری ڈال کر خود آوارہ گردی اختیار کر لیتا ہے اس سے پتہ چلتا ہے کہ یہ لوگ عورت کے لئے کیا سوچ رکھتے ہیں اور کس لائق سمجھتے ہیں۔

کردار نگاری کے اعتبار سے دیکھا جائے تو حامدی کاشمیری کے اس ناول میں کئی اہم کردار بھی ہیں اور کئی غیر اہم بھی جو اپنی انفرادیت اور خصوصیت لئے ہوئے ہیں۔ ناول میں جاوید، سلیم، حسین، جلال الدین، قادر بٹ، حشمت اللہ، زینب، محبوبہ، محمودہ، ہاجرہ وغیرہ کے کردار کافی اہمیت رکھتے ہیں مرکزی کردار جاوید کو تراشنے میں ناول نگار نے کافی عرق ریزی سے کام لیا ہے۔ اس کردار میں وہ تمام صفات ہیں جو ایک ہیرو میں ضروری خیال کی جاتی ہیں۔ جاوید ایک غریب خاندان سے تعلق رکھتا ہے لیکن دل و دماغ سے وہ کافی امیر ہے وہ ڈوگرہ حکومت کے ظلم و جبر کے خلاف نظمیں لکھتا ہے وہ آزادی اور انقلاب کے لئے اپنا سب کچھ داؤ پر لگا تا ہے وہ ایک امیر خاندان کی لڑکی محبوبہ سے محبت بھی کرتا ہے لیکن ملک کی آزادی کی خاطر محبت کو بھی قربان کرنے کے لئے تیار رہتا ہے وہ ہمیشہ حکمت اور دانشمندی سے کام لیتا ہے ناول کے باغی کرداروں میں حسین بھی کافی

[1] جان محمد آزاد، جموں و کشمیر کے اردو مصنفین، ص ۸

اہم ہے وہ بھی کشمیری عوام کے اندر آزادی اور انقلاب کا جوش پیدا کرنے کی کوشش کرتا ہے۔نسوانی کرداروں میں محبوبہ ناول کا متحرک کردار ہے۔ وہ جاوید کی محبوبہ ہے محبوبہ جاوید کا انتظار بھی کرتی ہے وہ جاوید کے ساتھ شادی کرنے کے لئے لڑتی بھی ہے وہ اپنے باپ کے سامنے آزادی اور انقلاب کی باتیں بھی کرتی ہے وہ ڈوگرہ حکومت کے خلاف آواز اٹھانے والی تحریک کا استقبال کرتی ہے۔ وہ سرمایہ دار خاندان سے تعلق رکھتے ہوئے بھی غریب عوام کا ساتھ دیتی ہے اسی طرح ناول کے باقی کردار بھی اپنی انفرادیت لئے ہوئے ہیں۔کردار نگاری کے اعتبار سے یہ ناول بہت عمدہ ہے۔

'بہاروں میں شعلے' ناول میں منظر کشی کے بھی بہترین نمونے دیکھنے کو ملتے ہیں۔منظر نگاری کو پیش کرنے میں حامدی کاشمیری کامیاب نظر آتے ہیں وہ مناظر کی تصویر کشی اس انداز سے کرتے ہیں کہ منظر کی تصویر ہو بہو سامنے نظر آنے لگتی ہے۔اقتباس دیکھئے:

> ''صبح ہو چکی تھی۔آفتاب پوری آب وتاب کے ساتھ پہاڑ کی بلند ترین چوٹی سے سر نکال کر جھیل کے حسین آغوش میں چمک رہا تھا۔وہ تینوں صبح کا ناشتہ کر کے جھیل کی سیر کو روانہ ہوئے۔ درختوں کی گھنی اور خشک چھاؤں میں دائیں جانب جھیل سرسبز پہاڑوں کی آغوش میں مسکرا رہی تھی سورج کی پہلی کرنیں فضا کی نورانی دھند سے رقص کر رہی تھیں۔دور کناروں پر شاداب پتوں سے لدے ہوئے درخت انگڑائیاں لے کر نیند سے بیدار ہو رہے تھے۔دور دور کسان کھیتوں میں کام کرنے کے لئے تیزی سے قدم اٹھا رہے تھے۔''[1]

حامدی کاشمیری نے جہاں ایک طرف کشمیر کے خوبصورت مناظر کو بھی پیش کیا ہے لیکن اس ناول میں وہ کشمیر میں پڑنے والی برف سے متاثر مفلس لوگوں کے متعلق کچھ یوں لکھتے ہیں:

> '''برف باری کا پہلا دن سبھوں کے لئے خاص کر بچوں کے لئے کتنی مسرت اور استعجاب لاتا ہے لوگ اس دن عموماً ڈھل جھیل کی مچھلیاں

[1] حامدی کاشمیری، بہاروں میں شعلے،ص ۷۷-۷۴،شاہین بک اسٹال،سرینگر،کشمیر،۱۹۵۷ء

خریدتے ہیں غریب لوگ بھی حسب المقدور اس موقع پر خوشیاں مناتے
ہیں حالانکہ مفلسوں کے لئے برف باری کا یہ دن نئی نئی مصیبتوں اور
مشکلوں کا سبب بن جاتا ہے ان کی جھونپڑیاں کبھی کبھی برف کے بوجھ
تلے دب جاتی ہیں ان کے نہتے اور ننگے معصوم بچے سردیوں کی ٹھٹھری
ہوئی راتوں میں یخ بستہ ہو جاتے ہیں وہ ایک ٹوٹی پھوٹی کانگڑی کے
لئے ترستے ہیں تن ڈھانپنے کے لئے ان کے پاس گرم کپڑے نہیں ہوتے
برف پر ننگے پاؤں چل کر ان کے پاؤں سردی سے پھول جاتے ہیں ان
میں زخم ہو جاتے ہیں اور ان زخموں سے پیپ بہتی رہتی ہے۔''[1]

حامدی کاشمیری نے صرف خوبصورتی کی طرف توجہ مرکوز نہیں کی بلکہ وہاں کے عوام کو کن حالات سے دوچار ہونا پڑتا ہے ان باتوں کی طرف بھی توجہ مبذول کرانے کے لئے کئی اشارے کئے ہیں۔ ناول ''بہاروں میں شعلے'' موضوعاتی وفنی دونوں اعتبار سے اہم ہے۔ پلاٹ، کردار نگاری، منظر کشی، مکالمہ نگاری میں انہوں نے بڑی فنی چابکدستی سے کام لیا ہے۔ المختصر حامدی کاشمیری کا یہ ناول ایک کامیاب ناول ہے۔

اجنبی راستے:

حامدی کاشمیری کا ناول شاہین بک اسٹال سرینگر کشمیر سے شائع ہو کر ہی منظر عام پر آیا۔ حامدی کاشمیری نے ایک عام سی کہانی کو ناول کے قالب میں ڈھال کر پیش کیا ہے۔ اس ناول میں کشمیر کے ایک متوسط طبقے کے ایک مسلم گھرانے کی زندگی کو موضوع بنایا گیا ہے اس طبقے میں محبت کی جو قدر و قیمت ہے خودداری کا جو عنصر ہے تضاد کی جو صورت ہے اور توہمات کے جو بت ہیں وہ صاف طور پر ہمارے سامنے آتے ہیں۔ متوسط طبقے کی گھریلو زندگی کو بے تکلف ماحول کو ناول میں دیکھا جا سکتا ہے۔ یہ حامدی صاحب کا کمال ہے کہ کرداروں کو عام زندگی اور عام ماحول کا نمائندہ بناتے ہیں۔ ان کے کردار متوسط طبقے کے مرد اور عورت ہیں کہانی میں جو مسائل ملتے ہیں وہ کشمیر کے متوسط طبقے کے مسائل ہیں۔

ناول میں عوامی زندگی کے ایک اہم سماجی مسئلے بچپن کی شادی کو موضوع بتایا ہے لیکن اس سماجی مسئلے کو پیش

[1] حامدی کاشمیری، بہاروں میں شعلے، ص ۳۸، شاہین بک اسٹال، سرینگر، کشمیر، ۱۹۵۷ء

کرتے ہوئے کئی دوسرے مسائل کی طرف بھی اشارہ کردیا ہے ناول کے متعلق پروفیسر شکیل الرحمٰن لکھتے ہیں:

''یہ حقیقت ہے کہ حامدی کاشمیری کے ناولوں میں فلسفہ سے زیادہ فن اور فن کی باریکیوں سے دلچسپی ہے اس ناول میں غم کے نغموں سے وہ جتنے متاثر ہیں شاید اس سے پہلے اتنے متاثر نہ تھے۔ حقیقت کے تاریک پہلو پر ان کی نظر گہری ہے لیکن ساتھ ہی ساتھ امید کی شعاعیں ڈالتے جاتے ہیں ان کی طبیعت حساس ہے آدمی کو شکست کھاتے اور مختلف قوتوں سے ٹکراتے دیکھ کر وہ تلملا جاتے ہیں یہ ناول دراصل ایک آئینہ ہے جس میں مختلف پرچھائیوں کا عکس ہے اس آئینے کے سامنے سے کچھ ایسے کردار گزرتے ہیں جنھیں ہم پہچانتے ہیں۔''[1]

ناول ''اجنبی راستے'' میں حامدی کاشمیری نے ایک ایسی سماجی برائی یعنی بچپن کی شادی کو موضوع بنایا ہے رحمٰن اور ساجی دو کردار ہیں جن کی شادی چھوٹی عمر میں کرادی جاتی ہے جو کامیاب ثابت نہیں ہوتی بلکہ دو انسانوں کی زندگی کو جہنم بنا دیتی ہے اور ساتھ ہی ساتھ اس شادی نے دو گھروں کو خوشیاں بھی چھین لی جبکہ مذہب اور قانون دونوں میں اس کی اجازت نہیں ہے۔ ناول میں حامدی صاحب نے بدلتے ہوئے زمانے سے واقف کرانے کی کوشش کی ہے جہاں لڑکیاں کالج میں تعلیم حاصل کرنا چاہتی ہیں۔ شادی بیاہ میں ایسی لڑکیاں کوئی زور زبردستی نہیں مانتی۔ ساتھ ہی لڑکے اور لڑکی کا ایک دوسرے کو پسند کرنے اور پیار ومحبت کرنے کے معاملے کو بھی اس ناول میں پیش کیا گیا ہے اس بارے میں ناول کا اقتباس دیکھیں:

''قادر خان کئی دنوں کے بعد شاہ پور واپس آیا۔ اور ہفتہ بھر سلطان خان کی بات پر سوچتا رہا۔ اسی بات نے اسے چکرا دیا تھا۔ اس کے خیالات کو ایک زبردست ٹھوکر لگ چکی تھی۔ اسے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے سوتے میں کسی نے اس کے سر پر ایک بڑا پتھر دے مارا ہو۔ وہ ہر بڑا کر چھونک اٹھا تھا۔ کیا رفیقہ کی بھی یہ خواہش ہے کہ وہ رحمٰن سے شادی کرے؟ عجیب

---

[1] پیش لفظ از شکیل الرحمان، حامدی کاشمیری، اجنبی راستے، ص ۸، شاہین بک اسٹال سرینگر، کشمیر، ۱۹۶۳

بات ہے۔زمانہ کتنا بدل گیا ہے پہلے تو لڑکے یا لڑکی کو شادی کے دن تک
یہ پتہ نہ چلتا تھا کہ شادی ہو رہی ہے سب کچھ ماں باپ اور گھر کے
دوسرے بزرگ کرتے تھے لیکن سلطان خان نے سچ کہہ دیا کہ اب وہ
بات نہیں رہی۔''[1]

حامدی کاشمیری نے اپنے ناول میں جموں وکشمیر کی تہذیبی اور ثقافتی زندگی کے مختلف پہلوؤں کو بھی پیش کیا ہے۔کشمیر میں کافی ہاؤس کافی اہمیت کا حامل ہے چونکہ یہاں کے لوگ چائے کے کافی شوقین ہیں چائے کے ساتھ سیاسی معاملات سے متعلق کافی بحثیں ہوتی ہیں ناول میں یہ اقتباس اس کی مثال ہے:

''ہوٹل میں کافی رونق اور گہما گہمی تھی۔ٹیبلوں پر کالجوں کے پروفیسر،
ریڈیو، آرٹسٹ، اخبار نویس اور حاکم لوگ چائے پیتے پیتے باتیں بھی کر
رہے تھے کچھ لوگ اخباروں کا مطالعہ کر رہے تھے کچھ لوگ بہت انہماک
اور گرم جوشی سے عالمی سیاسیات پر تبادلہ خیالات کر رہے تھے۔''[2]

''اجنبی راستے'' ناول کا پلاٹ سیدھا سادہ اور عام فہم ہے کہانی بیانیہ ہے واحد متکلم کی تکنیک میں بیان کی گئی ہے کہانی میں کوئی خاص کشش نہیں لیکن موضوع کے اعتبار سے یہ ناول کافی اہم ہے۔ناول کا مرکزی کردار رحمان ہے۔پڑھا لکھا اور امیر خاندان کا نوجوان ہے۔دسویں جماعت کا امتحان پاس کرنے کے بعد وہ اپنے باپ عزیز میر کا کاروبار سنبھالتا ہے لیکن اس کی شادی بچپن میں ساجی کے ساتھ کر دی گئی تھی۔شادی کے ایک ہفتے کے اندر ہی وہ اپنی بیوی سے بیزار ہو جاتا ہے اس کی بیوی کافی تیز مزاج عورت ہے اس کردار کے ذریعے ناول نگار نے یہ دکھانے کی کوشش کی ہے کہ کس طرح ایک پڑھا لکھا انسان بھی بچپن کی شادی سے تباہ و برباد ہو سکتا ہے۔اس کے ساتھ ہی ناول میں رفیقہ کا کردار بھی اہمیت کا حامل ہے۔وہ گاؤں کی لڑکی ہے لیکن وہ تعلیم حاصل کرنے کے لئے شہر جاتی ہے تعلیم کا شوق اسے گاؤں سے شہر پہنچا دیتا ہے وہ رحمان سے پیار بھی کرتی ہے لیکن جب اسے یہ خبر ہوتی ہے کہ رحمان پہلے ہی سے شادی شدہ ہے تو وہ اندر سے ٹوٹ جاتی ہے لیکن وہ

[1] حامدی کاشمیری، اجنبی راستے، ص ۵۷، شاہین بک اسٹال سرینگر، کشمیر، ۱۹۶۳
[2] حامدی کاشمیری، اجنبی راستے، ص ۵۷، شاہین بک اسٹال سرینگر، کشمیر، ۱۹۶۳

آنکھیں بند کر کے باتوں کو تسلیم نہیں کرتی بلکہ حقیقت سے شناسائی چاہتی ہے۔ ناول میں ایک اور کردار غلام بھی کافی اہم ہے وہ شہر میں رہتا ہے اور رفیقہ کا رشتہ دار ہے لیکن وہ رفیقہ کو اپنی بیٹی کی نظر سے دیکھتا ہے وہ نئے زمانے کا انسان ہے وہ عقلمند اور ذی شعور ہے۔ وہ رفیقہ کی تعلیم جاری رکھنے کی وکالت کرتا ہے اس کے ساتھ ہی وہ رحمٰن اور رفیقہ کے درمیان پنپنے والے پیار سے بھی بیزار نہیں ہے وہ ان دونوں کی شادی کرانے کی کوشش کرتا ہے وہ شادی کے لئے لڑکے اور لڑکی کی پسند و ناپسند کا خیال رکھتا ہے اور اس چیز کو ترجیح دیتا ہے اور اپنے بھائی کو سمجھاتا ہے جو رفیقہ کی شادی کے خلاف ہے۔ اقتباس دیکھیں:

''دیکھئے، مذہب میں بھی یہ بات جائز نہیں۔ قرآن شریف میں آیا ہے
کہ لڑکی اور لڑکے کی باہمی رضامندی کے بعد ہی شادی ہوسکتی ہے۔
آنحضرت کی مثال سامنے ہے انھوں نے خدیجۃ الکبریٰ کو دیکھ کر ان سے
نکاح کیا تھا۔ بہر حال میں کہنا یہ چاہتا ہوں کہ رحمان اور رفیقہ دونوں
ایک دوسرے شادی کرنا چاہتے ہوں تو آپ کا کیا رویہ رہے گا۔''[1]

آگے چل کر اس کے رویے میں غیر معمولی تبدیلی آتی ہے وہ رحمان سے وعدہ کرتا ہے کہ وہ اپنے بھائی قادر خان کو اس شادی کے لئے منا لے۔ لیکن جب اس کا اپنا بیٹا علی گڑھ سے تعلیم مکمل کر کے گھر واپس آتا ہے تو وہ رفیقہ کو اپنے بیٹے غلام حسین کی بیوی اور اپنی بہو کے روپ میں دیکھتا ہے۔

ناول اجنبی راستے میں پلاٹ کردار نگاری اور مکالمہ نگاری سب میں ہی حامدی کاشمیری اپنا کمال دکھایا ہے ناول نگار نے مناظر کو پیش کرنے میں مہارت دکھائی ہے۔ منظر کشی کی ایک مثال اس اقتباس سے واضح نظر آتی ہے۔

''خزاں کے آخری دن تھے۔ درختوں کی ننگی شاخیں دن بھر یخ بستہ دھند
سے ہم آغوش رہتیں۔ میدانوں، باغوں، کھیتوں اور پگ ڈنڈیوں پر
درختوں کے گرے ہوئے پتے انبار در انبار جمع ہو چکے تھے۔ ہواؤں کے
جھونکے لٹی ہوئی بہاروں کا ماتم کر رہے تھے۔ گاؤں کے کتے دن بھر

[1] حامدی کاشمیری، اجنبی راستے، ص ۵۶، شاہین بک اسٹال سرینگر، کشمیر، ۱۹۶۳ء

اونگتے رہتے اور کبھی بڑبڑا کر بھوکنے لگتے۔ جیسے وہ کسی بھوت کا منحوس سایہ دیکھ لیتے۔ کسان دن بھر اپنی تاریک جھونپڑیوں میں بیٹھے حقہ گڑگڑاتے رہتے اس سال کی فصل کی خرابیوں کا ذکر کرتے یا آنے والے جاڑے اور برف کے طویل موسم کی دقتوں کا شمار کرتے۔ آسمان ہیبت ناک نظر آرہا تھا۔ سورج سیاہ بادلوں میں غائب ہو چکا تھا۔ ہر طرف پر اسرار خاموشی چھائی ہوئی تھی۔''[1]

غرض حامدی کاشمیری کا یہ ناول ایک عام سی کہانی پر مبنی ہے لیکن زبان و بیان کی چاشنی، مناظر کی دلکشی اور مکالموں کی پیش کش میں ناول نگار نے کمال دکھایا ہے۔ کہانی میں کوئی خاص کشش نہیں ہے۔ لیکن موضوع کے اعتبار سے اس ناول کی اہمیت بڑھ جاتی ہے۔

بلندیوں کے خواب:

حامدی کاشمیری کا یہ ناول ۲۸ حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے ناول کا آغاز ایک نظم سے ہوتا ہے ناول ''بلندیوں کے خواب'' کو عشقیہ داستان کے طور پر پیش کیا گیا ہے ناول ''بلندیوں کے خواب'' میں پہاڑوں، بادلوں اور ہواؤں کے طوفانی پہلو کو پیش کیا گیا اور دکھایا گیا ہے کہ انسان فطرت کے قہر وغضب کا کس طرح شکار ہو جاتا ہے اس میں انسان کو قدرت کے سامنے بے بس اور مجبور دکھایا گیا ہے ساتھ ہی اس میں انسان کی ہمت و کاوش کے ذریعے فطرت کے طوفانی پہلو سے نبرد آزما ہونے کے مناظر کی عکاسی کی گئی ہے۔ وہ پہاڑوں کو عبور کرتا اور برفیلی آندھیوں سے راستہ نکالتا ہے لیکن انسانی سماج میں جو خرابیاں ہیں اونچ نیچ ہے جو استحصال ہے وہ اس کے خوابوں اور ارادوں کو پامال کر دیتا ہے۔ انسان فطرت پر تو قابو پالیتا ہے مگر وہ سماجی برائیوں کو دور نہیں کر سکتا ہے اور غم والم کا شکار ہو جاتا ہے۔ پریشانیوں سے دوچار ہوتا ہے یہی ناول کا موضوع ہے جو پورے ناول میں نظر آتا ہے۔ ناول بلندیوں کے خواب کی کہانی کچھ اس طرح سے ہے کہ رفیق جو ناول میں مرکزی کردار کی حیثیت رکھتا ہے رشیدہ سے بے حد محبت کرتا ہے۔ رشیدہ ایک دن اپنے محبوب سے کہتی ہے میرے گھر والے ہماری شادی کے لئے راضی نہیں ہونگے کیونکہ اس کے گھر والے چاہتے ہیں کہ اپنی بیٹی کی شادی ایک ایسے

[1] حامدی کاشمیری، اجنبی راستے، ص ۲۴۱، شاہین بک اسٹال سرینگر، کشمیر، ۱۹۶۳

لڑکے سے کریں جو اعلیٰ تعلیم یافتہ ہو۔ رفیق یہ سن کر رشیدہ کو پانے کے لئے مزید تعلیم کے لئے لکھنؤ چلا جاتا ہے۔ رفیق لکھنؤ سے ایم اے کا امتحان پاس کرنے کے بعد سرینگر کے لئے روانہ ہو جاتا ہے۔ جموں پہنچتے ہی وہ سرینگر کے لئے گاڑی کا ٹکٹ خرید لیتا ہے صبح سویرے گاڑی پر سوار ہو جاتا ہے اور گاڑی سرینگر کی طرف چل پڑتی ہے۔ وہ بٹوت پہنچ جاتے ہیں وہاں گاڑیاں رکی ہوتی ہیں رفیق اور اس کے دیگر ساتھیوں کی بس بھی وہاں رک جاتی ہے کیونکہ انھیں پتہ چلتا ہے کہ راستہ خراب ہے برف باری زوروں سے ہو رہی ہے آگے جانے کا کوئی امکان نہیں رہتا۔ اس لیے سبھی مسافر اپنے بستر اور باقی سامان کو لے کر ہوٹلوں اور ڈاک بنگلوں کی طرف چلے جاتے ہیں۔ رفیق کو رہائش کے لئے جگہ نہ ملنے پر وہ سردار لڑکوں کے ساتھ اپنے بستر لے کر گردوارے میں چلا جاتا ہے۔ ایک رات وہاں گزارنے کے بعد وہ اور اس کے ساتھ باقی دن ڈاک بنگلہ کے ہال میں گزارتے ہیں۔ رفیق کے ہمسفر پروفیسر ایڈیٹر، انور صاحب، سمار چند، مدراس سے آئی ہوئی ایکٹرس غلام محمد اور اس کی بیوی اور انجینئر اختر وغیرہ کے ساتھ اور بھی کئی مسافر تھے مگر ان میں سے انجینئر اختر بس میں نہیں بلکہ اپنی جیپ میں آتا تھا۔ راستہ بند ہونے کی وجہ سے اسے بھی ڈاک بنگلہ میں رکنا پڑا اور یہاں رفیق کی اس کے ساتھ ملاقات ہوتی ہے یہاں ان کو کچھ دن اکھٹے گزارنے کا موقع ملتا ہے۔

رفیق کی جیب خالی ہو جاتی ہے اور وہ اپنی گھڑی فروخت کر کے اپنے گزارے کے لئے کچھ روپیے وصول کرتا ہے مگر اسے ان حالات میں بھی رشیدہ کی یاد ستاتی ہے اور وہ سوچتا ہے کہ اگر میں پرندہ ہوتا تو اڑ کر ان پہاڑوں سے ہوتا ہوا سرینگر پہنچ جاتا اور رشیدہ سے ملاقات کرتا لیکن خرچے کی پریشانی اور محبوبہ کی جدائی کو برداشت کرتے ہوئے بھی وہ دوسروں کی مدد کرتا ہے۔ غلام محمد اور اس کی بیوی کا خرچہ اپنے سر لیتا ہے۔ اسی طرح ایک دن رفیق ڈاک بنگلہ سے نکل کر کھانا لینے کے لئے دین محمد کے ہوٹل پر جاتا ہے اور دیکھتا ہے کہ دین محمد کا نوکر خلیل بے سود پڑا تھا وہ بیمار تھا کوئی بھی اس کی طرف توجہ نہیں دے رہا تھا۔ رفیق نے جب اس کی یہ حالت دیکھی تو اسے رحم آتا ہے اور وہ دین محمد کو ڈاکٹر لانے کو کہتا ہے لیکن وہ رضامند نہیں ہوتا تو رفیق خود ہی برف کے سینے کو چیرتے ہوئے ڈاکٹر کے پاس پہنچتا ہے اور پورا حال سناتا ہے مگر ڈاکٹر اسے مشورہ دیتا ہے کہ اسے یہیں لے آؤ۔ رفیق کی جدوجہد کے بعد ڈاکٹر تیار ہو جاتا ہے اور رفیق اس کا سامان اٹھا کر آگے چل پڑتا ہے اور جلدی جلدی ہوٹل پہنچ کر لوگوں کو راستہ چھوڑنے کے لئے کہتا ہے جب رفیق اور ڈاکٹر خلیل کے پاس

آتے ہیں تو دیکھتے ہیں کہ وہ اس دنیا کو خیر آباد کہہ چکا ہے۔

بلندیوں کے خواب کے آخری جملے ملاحظہ فرمائیں:۔

''پان، پان، پان
اتنے میں بس نے تیزی سے ہارن بجایا۔ مسافر چیزیں لے کر دوڑنے لگے بس کے گرد مسافروں کا ہجوم کھڑا ہو گیا اختر نے جلدی سے فوٹو ڈائری میں رکھا ڈائری جیب میں ٹھونس دی اور ہینڈ بیگ لے کر دوڑنے لگا
''چلو بھئی''HURRY UP'' وہ مجھ سے آگے نکل گیا
سراسیمگی میں، میں بھی قدم اٹھانے لگا۔
لیکن میں کہاں جا رہا تھا؟
میرے سامنے تاریکیاں ہی تاریکیاں تھیں، لامحدود تاریکیاں، پستیاں مجھے محسوس ہو رہا تھا جیسے میں روشن بلندیوں سے تاریک پستیوں میں اوندھے منھ گرتا جا رہا ہوں۔!!![1]

ناول اپنے تمام فنی تقاضوں کو پورا کرتا نظر آتا ہے پلاٹ مربوط ہے۔ کردار نگاری، مکالمہ نگاری اور منظر کشی میں بھی حامدی کاشمیری نے فنی چابکدستی سے کام کیا ہے غرض حامدی کاشمیری کا یہ ناول موضوع اور فن دونوں اعتبار سے ایک کامیاب ناول ہے۔ دراصل ناول نگار اپنے ناول کے ذریعہ کشمیری سماج اور معاشرے میں پائی جانے والی برائیوں کو جڑ سے اکھاڑ پھینکنے کا عزم رکھتے تھے۔ اس لئے ان کے ناول سماج اور معاشرے کا حصہ بن گئے ہیں حامدی کے نزدیک ملک وقوم سے بڑھ کر انسانیت کا جذبہ ہے ان کے خیال میں انسانیت ہی ایک ایسی شے ہے جسے بڑائی کا شرف حاصل ہے ان کے ناولوں میں کشمیر کی مذہبی اور تہذیبی زندگی کے مرقعے پیش کئے گئے ہیں ان کے ناولوں میں ہمیں انسانی زندگی کا عکس نظر آتا ہے انھوں نے اپنے ناولوں میں صرف تخیلی دنیا کو نہیں سجایا بلکہ تخیل اور حقیقت دونوں کو کام میں لیتے ہوئے ایسا فنکارانہ انداز اختیار کیا ہے جس سے حقیقی زندگی کی تصویریں سامنے آتی ہیں۔

[1] حامدی کاشمیری، بلندیوں کے خواب، ص ۲۷۰، ادارۂ ادب بھوری کدل سرینگر کشمیر

حامدی کاشمیری کے ناولوں کے پلاٹ مربوط ہیں لیکن ''بہاروں میں شعلے'' ناول کا پلاٹ مرکب ہے ان کے ناولوں کی پلاٹ نگاری میں جغرافیائی حقیقت اور مقامی رنگ کی عکاسی ملتی ہے حامدی کاشمیری نے اپنے ناولوں کے پلاٹ کی تعمیر میں وادی کشمیر کا سہارا لیا ہے انہوں نے جموں و کشمیر کے خوبصورت مقامات، جھیلوں، باغوں، اور دریاؤں وغیرہ کے صحیح نام اور سچی تصویریں پیش کی ہیں۔ جو قاری کے مزاج کی ہم آہنگی میں معاون ثابت ہوتے ہیں۔ پلاٹ کی تشکیل میں حامدی کاشمیری نے اپنی فنی مہارت کا ثبوت دیا ہے۔

کردار نگاری کے حوالے سے دیکھیں تو حامدی کے ناولوں کے کردار حقیقی زندگی سے قریب معلوم ہوتے ہیں۔ انھوں نے اپنے ناولوں میں جو کردار پیش کئے ہیں وہ اسی معاشرے سے تعلق رکھتے ہیں ان کے تخلیق کردہ کرداروں میں جاوید، محبوبہ، رشیدہ، رفیقہ، رفیق اور رحمان وغیرہ اہم ہیں حامدی کے ہاں کردار نگاری کو موثر بنانے کی شعوری کوشش نظر آتی ہے اور جس میں انھیں کامیابی بھی ہوئی ہے مگر وہ ایسا زندہ جاوید کردار تراشنے میں ناکام نظر آتے ہیں جس کو قاری زیادہ دنوں اپنے ذہن میں محفوظ رکھ سکیں۔ مناظر کی پیش کش میں بھی حامدی کاشمیری نے بہت فنی چابکدستی سے کام لیا ہے ماحول کی عکاسی ان کے ناولوں کی دلچسپی کی ایک اور وجہ ہے ان کے ناولوں میں کشمیر کے ماحول کی ہو بہو عکاسی ملتی ہے کشمیر کے خوبصورت مقامات، برفیلے پہاڑ، کھلتے پھول، ندیاں، جھرنے، سرسبز میدان اور خوبصورت جنگلوں کے علاوہ ان کے ناولوں میں کشمیر کی سماجی سیاسی اور تہذیبی جھلکیاں بھی واضح نظر آتی ہیں۔ منظر کشی کی ایک مثال ''بہاروں میں شعلے'' ناول سے یہاں پیش کی جاتی ہے۔ ملاحظہ کیجئے:

> ''کار شالیمار کے گیٹ کے سامنے رکی اور دونوں کار سے اتر کر شالیمار کے اندر چلے گئے۔ دائیں بائیں متنوع رنگوں کے مہکتے ہوئے پھولوں کے قافلے قطاروں میں مسکرا رہے تھے اور خش لحن پرندوں کے چہچے موسیقی کے لہریں بکھیر رہے تھے۔ دائین سمت ہرے بھرے گھاس کے کنارے میوہ اور درخت شگوفوں سے لدے ہوئے تھے اور ہوا میں نکہت و رنگ تحلیل ہو رہا تھا۔ چاروں طرف چھائی ہوئی خواب اور خاموشی فواروں کا سنگیت ماحول کی سرشاری میں اضافہ کر رہا تھا اور کسی فوارے سے کھیلتے

ہوئے کسی حسین اور شوخ وشنگ دوشیزہ کا نقرئی قہقہہ خاموش فضا میں نغمے بکھیر دیتا۔''[1]

حامدی کاشمیری کے ناولوں میں مکالمے موزوں اورالفاظ مناسب ہیں فقرے ڈرامائی عناصر رکھتے ہیں ان کے مکالمے کرداروں کے حسب حال ہیں ان کے مکالموں سے کردار کے خیالات، طبقے اور معیار زندگی کا آسانی سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ انھوں نے کرداروں کی قابلیت اور ماحول کے مطابق ان سے جملے ادا کرائے ہیں جو مکالمہ نگاری کی خوبی ہے۔

حامدی کاشمیری کے ناول اسلوب بیان کے اعتبار سے بھی کافی دلکش اور دلچسپ ہیں ان کے ناولوں میں سلاست اور قناعت ہے۔ انھوں نے ناولوں کے کرداروں کی مناسبت سے زبان کا استعمال کیا ہے۔ موقع و محل کے اعتبار سے محاوروں اور ضرب الامثال کے ساتھ ساتھ خوبصورت تشبیہات و استعارات کا بھی استعمال کیا ہے جس سے ان کی تہہ داری اور دلکشی کا بھی پتہ چلتا ہے اس کے علاوہ انہوں نے کئی کئی انگریزی زبان کا استعمال کر کے اپنی تحریر میں شگفتگی اور جاذبیت پیدا کی ہے ان کے ناولوں کا مطالعہ کرتے وقت قاری زبان و بیان کی چاشنی سے لطف اندوز ہوتا ہے۔

مجموعی اعتبار سے مختصراً یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ حامدی کاشمیری ناول کے تمام فنی تقاضوں کو پورا کرنے میں کامیاب نظر آتے ہیں ان کے ناول پلاٹ کردار نگاری، منظر کشی اور مکالمہ نگاری کے اعتبار سے اپنا انفرادی رنگ رکھتے ہیں۔ ان کے ناول موضوع وفن دونوں اعتبار سے کافی اہمیت کے حامل ہیں۔ غرض ریاست کے معتبر ناول نگاروں میں حامدی کاشمیری بھی ایک اہم نام ہے۔

---

[1] حامدی کاشمیری، بہاروں میں شعلے، ص ۹۶، شاہین بک اسٹال، سرینگر، کشمیر، ۱۹۵۷ء

وجے سوری

وجے سوری کا نام بھی جموں وکشمیر کے ناول نگاروں میں سرفہرست ہے وجے سوری کے آباواجداد میری پور پاکستان کے رہنے والے تھے وجے سوری کی ولادت ۱۹۴۲ء میں میر پور پاکستان میں ہوئی ان کے والد کا نام رام لال سوری اور ماں کا برج رانی تھا۔ آزادی اور فسادات کے بعد میر پور سے ہجرت کر کے جموں میں مستقل سکونت اختیار کی وجے سوری تاریخ کے سب سے بڑے اور سب سے گھناؤنے المیہ سے دوچار ہوئے یہی المیہ ان کی تحریروں میں بھی نمایاں حیثیت اختیار کرتا گیا۔ وجے سوری نے جموں سے ہائی اسکول کی تعلیم حاصل کی لیکن اسکولی تعلیم سے انہیں کوئی خاص دلچسپی نہ تھی یہی وجہ رہی کہ آٹھویں جماعت کا امتحان پاس کرنے کے بعد پانچ سال کا وقفہ لیا۔ اس دوران وہ اپنے والد کے ساتھ دوکان پر بیٹھا کرتے تھے۔ اپنے کیریئر کا آغاز ریڈیو سے کیا لیکن ریڈیو کے علاوہ ان کا ادب سے بھی گہرا لگاؤ رہا۔ افسانہ پڑھنے کا ذوق بچپن سے ہی تھا اور اچھے افسانہ نگار کے افسانوں کو وہ ذوق وشوق سے پڑھتے تھے اسی ذوق اور جذبے نے انہیں ایک کامیاب افسانہ نگار بنا دیا۔ اس کے علاوہ اسٹیج اور ڈرامے سے بھی انہیں خاص دلچسپی تھی۔ اس بارے میں ان کے ایک دوست نریندر ناتھ سوز نے لکھا ہے:۔

> ''اسٹیج ڈرامے کا شوق اسے اسکول کے زمانے سے ہی تھا اور وہ رفتہ رفتہ ایک کامیاب اسٹیج آرٹسٹ بن گیا۔ اس کامیابی کی وجہ سے اسے سانگ اینڈ ڈراما ڈیویژن، بھارت سرکار میں ملازمت مل گئی اور ڈراما انسٹرکٹر کی پوسٹ پر اس کا تقرر ہوا۔ کئی ٹی۔ وی سیریلز میں بھی اس نے کام کیا اور کئی ٹی سیریل خود بھی لکھے۔ گویا کہ وجے سوری ہرفن مولا بن گیا اور ہر شعبے میں مقبول ہو گیا۔''[1]

---

[1] وجے سوری۔ ایک ناؤ کاغذ کی۔ ص ۱۳۔ ہائی وجے پبلیکیشنز جموں ۱۹۶۵ء

لوچن بخشی نے لکھا ہے:۔

''اردو افسانے میں وجے سوری نے نئے نئے تجربے کئے ہیں اس کے ہاں مشاہدہ بھی ہے اور طرز بیان کی سادگی بھی۔ وجے سوری حقیقت کو کہنے کا عادی ہے۔''[1]

وجے سوری کے افسانوں کا پہلا مجموعہ ''آخری سودا'' ہے اس مجموعے کے افسانے پڑھ کر ان راہوں کا پتہ چلتا ہے جن پر جدید ترین پود کے افسانہ نگار سوچتے ہیں ان افسانوں میں نہایت خلوص سے چھوٹی چھوٹی باتیں پیش کی گئی ہیں زبان کی مٹھاس اور جذبے کی صداقت پر محنت کی گئی ہے افسانوں کی دلچسپی برقرار رکھنے کے لئے اصل موضوع کو مسخ یا مجروح نہیں ہونے دیا ہے۔ وجے سوری نے ادب میں نام کمایا ہے انہوں نے معمولی باتوں کو بھی بڑی وضاحت کے ساتھ اپنے افسانوں میں پیش کیا۔ وجے سوری نے ایک ہی ناول تخلیق کیا جس پر یہاں بحث کی جائے گی۔ وجے سوری کا انتقال مئی ۲۰۰۴ کو جموں میں ہوا۔

ایک ناؤ کاغذ کی:

وجے سوری کا یہ ناول ہائی وجے پبلیکیشنز سے ۱۹۶۵ء میں دہلی شائع ہوا انہوں نے بہت کم عمر میں ادبی زندگی میں چند کہانیاں پیش کرنے کے بعد ناول نگاری کی شروعات کی۔ اور اپنا ناول 'ایک ناؤ کاغذ کی' لکھ کر قارئین کے سامنے اپنی قابلیت کا لوہا منوایا ناول شائع ہوتے ہی بے حد مقبول ہوا۔ ناول تمامی فنی لوازمات کو پورا کرتا ہے اس میں وہ تمام عناصر شامل ہیں جو ایک کامیاب ناول میں پائے جانے لازمی ہوتے ہیں اس ناول میں کردار نگاری کی بھی عمدہ مثالیں ملتی ہیں۔ وجے سوری کا یہ ناول دراصل ایک ادیب، ایک قلم کار پال کی محبت کی ناکامی کی داستان ہے لیکن ناول نگار نے اس عام سی کہانی کو ایسے انداز اور انفرادیت کے ساتھ پیش کیا ہے کہ آخر تک کہانی میں دلچسپی کا عنصر باقی رہتا ہے پال جو ایک ادیب ہے ناول اور شاعری میں اس کی خصوصی دلچسپی ہے اس کے اندر تخلیقی صلاحیت بدرجہ اتم موجود ہے وہ کالج کے زمانے سے اپنی ایک انفرادیت اور پہچان بنالیتا ہے۔ وجے سوری نے ناول میں پال کا جو نقشہ کھینچا ہے وہ صرف پال جیسے ادیب کا نقشہ نہیں، بلکہ ہمارے ملک کے تمام ادیبوں کے لئے وہ موزوں ہے۔ ناول کا اقتباس دیکھیں جہاں وجے سوری نے پال کا نقشہ پیش کیا ہے:

[1] وجے شوری۔ ایک ناؤ کاغذ کی۔ ص ۷۔ ہائی وجے پبلیکیشنز، جموں ۱۹۶۵ء

''پال کی ادبی زندگی کا آغاز کالج کے زمانے میں ہوا تھا اس زمانے میں وہ شاعری کیا کرتا تھا لیکن پھر خود ہی آہستہ آہستہ وہ نثر کی طرف مائل ہوتا گیا۔ لیکن وہ کافی کارساز تھا اور یہ زندہ رہنے کے لئے جدو جہد کا دور پال کے اب تک چار ناول شائع ہو چکے تھے اور دنیائے ادب میں اس کا نام بھی تھا لیکن نام ہی تو سب کچھ نہیں۔ اسے ہر ناول کا معاوضہ دوسو روپے کے قریب ملتا ہے جو اس مہنگائی کے زمانہ میں بہت ہی قلیل رقم تھی اور پھر ناول بھی تو روز نہیں لکھے جاتے۔ اور پھر نہ ہی یہ مغرب ہے کہ جہاں ایک ناول نگار ایک ناول لکھ کر تا حیات اقتصادی پریشانیوں سے نجات پا جاتا ہے اور یہی وجہ تھی کہ پال نے ایک پرائیوٹ فرم میں ڈیڑھ سو روپے ماہوار کی ملازمت اختیار کر رکھی تھی لیکن جب بھی وہ اپنی ادبی زندگی پر نظر ڈالتا تو جھنجھلا اٹھتا اور پال کی یہ سوچ جائز تھی اس ملک کے فن کار کب اپنا صحیح مقام حاصل کریں گے۔''[1]

پال کی بہن شیلا جب پال کو شادی کے لئے کہتی ہے اور پال اسے جواب دیتا ہے دیکھئے ان کے الفاظ میں ہی:۔

''ایک بات کہوں پال برا تو نہیں مانو گے؟

شیلا نے نوالے توڑتے ہوئے پوچھا

کہو...... کہو بھلا میں تمہاری بات کا برا مانوں گا

اب تم شادی کرلو...... کیا ساری عمر یونہی......

پھر تم نے شادی کا ذکر کیا۔ میں کتنی دفعہ کہہ چکا ہوں کہ اس گھر میں اپنی شادی سے متعلق کوئی بات نہیں سننا چاہتا''

کیوں......؟ آخر کیوں نہیں سننا چاہتے؟ شیلا کا گلا بھر آیا۔

---

[1] وجے سوری۔ ایک ناؤ کاغذ کی۔ ص ۱۲۱۳۔ ہائی وجے پبلیکیشنز جموں ۱۹۰۰ء

''......''

''بولونا؟''

''ڈیڈی کیا تم چاہتی ہو کہ میں کسی مظلوم لڑکی کی زندگی تباہ کردوں۔ اپنے غموں میں ایک معصوم وجود کو گھسیٹ لاؤں۔ اپنی یا تمہاری خوشی کے لئے کسی بیکس کی مسکراہٹ چھین لوں؟......اور اگر تم یہ سب چاہتی ہو ڈیڈی تو مجھ سے نہ ہوسکے گا......مجھ سے نہ ہوسکے گا......''[1]

پال کا شادی سے انکار کرنے کا سبب یہ ہے کہ ایک تو مفلس ہے اور دوسرے وہ جوالا کی محبت میں گرفتار تھا اسے پانا چاہتا تھا۔ جوالا ایک دولت مند لڑکی تھی جو پال کے ساتھ کالج میں پڑھتی تھی وہ کار کے بغیر کبھی کالج نہ آتی تھی۔ لیکن پال جو ایک مفلس انسان ہے غریب خاندان سے تعلق رکھتا ہے غریب انسان کے جذبات کی توہین کس طرح ہوتی ہے اس کا اندازہ ناول پڑھ کر اچھی طرح ہوجاتا ہے جوالا پال کے جذبات کو اس لئے ٹھکرا دیتی ہے کہ وہ ایک معمولی انسان ہے غریب خاندان سے ہے جوالا کو ڈر ہے کہ زمانہ کیا کہے گا کہ ایک دولت مند امیر لڑکی نے پال جیسے معمولی انسان کی محبت قبول کرلی دوسری طرف پال دنیا کے لوگوں کی بنائی ہوئی فرسودہ روایات کو نہیں مانتا کہ جن کے مطابق محبت رتبے کے حساب سے ہونی چاہئے چنانچہ وہ اپنے خیالات کے گھیرے میں جکڑا رہتا ہے اور اس کے ذہن میں کئی سوالات پیدا ہوتے ہیں۔ دراصل جوالا سے محبت ہونے کے بعد اس نے ایک افسانہ ''دلی جذبات'' کے عنوان سے لکھا جس میں افسانہ کے سہارے سے جوالا سے اظہار محبت کیا گیا تھا، جب جوالا کو پتہ چلتا ہے وہ افسانہ پڑھتی ہے تو اس کا چہرہ غصے سے لال ہوجاتا ہے دوسرے دن وہ کالج کے گیٹ پر بڑی بے صبری سے پال کا انتظار کرتی ہے جب پال آتا ہے تو جوالا خود آگے بڑھ کر پوچھتی ہے کہ کیا آپ کے پاس کچھ وقت ہے پال کہتا ہے فرمایئے پھر دونوں ریسٹوران جاتے ہیں وہاں جوالا پال سے پوچھتی ہے کہ آپ کے تازہ افسانے میں جوالا کا کردار کس طرف اشارہ ہے پال سوال کرتے ہوئے کہتا ہے آپ نے کیا محسوس کیا تو جوالا کہتی ہے میں یہ محسوس کرتی ہوں کہ آپ کی شامت آئی ہے جو آپ نے حرکت کی ہے مجھے بازاری عورت سمجھ کر تم نے ایسا کیا کہ میں انسانوں اور کہانیوں کی زینت بنوں

[1] وجے سوری۔ ایک ناؤ کاغذ کی۔ ص ۱۳۔ ہائی وجے پبلیکیشنز جموں ۱۹۶۵ء

کالج کا ہر فرد مجھے شک کی نظر سے دیکھتا ہے چاہتی تو کالج میں ہی آپ کی خاطر کرتی لیکن یہ میری شرافت ہے کہ یہاں بیٹھ کر چائے پی رہے ہیں غرض وہ طرح طرح کی باتیں پال کو سناتی اور کہتی ہے اگر آپ نے پھر ایسی حرکت کی تو مجھ سے برا کوئی نہ ہوگا۔

پال جواب تک امید لئے بیٹھا تھا کہ جوالا کی محبت پانے میں کامیاب ہوجاؤں گا لیکن جوالا کے یہ کڑوے الفاظ سن کر وہ خود ہی سوالات قائم کرتا ہے اقتباس ملاحظہ ہو:

> ''کیا اس کی محبت اس کے جذبات کو صرف اس لئے ٹھکرا دیا گیا ہے کہ وہ مفلس ہے برسوں سے ایک ہی سوٹ میں کالج آرہا ہے اور باقی لڑکوں کی طرح وہ کنٹین میں ایک ہی نشت میں دس دس روپے خرچ نہیں کرسکتا تھا اور کیا یہ دولت مند ہم غریبوں کو حقارت کی نظر سے دیکھتے رہیں گے؟ کیوں یہ لوگ صدیوں سے ہم غریبوں کو کچل دینے کے در پر ہیں؟ کیوں آخر کیوں؟''[۱]

پال کی اس قدر محبت دیکھ کر جوالا اس کی محبت کو قبول کر لیتی ہے اور وہ بھی اس سے پیار کرنے لگتی ہے جوالا کا والد سیٹھ امر ناتھ جب پال سے ملتا ہے تو اسے ذلیل کرتا ہے لیکن جوالا اپنے والد سے ناراض ہوکر پال کے ساتھ بھاگ کر کلکتہ چلی جاتی ہے یہاں پال اور جوالا کی شادی مندر میں ہوتی ہے پال یہاں پر بہت کوشش کرتا ہے کہ اسے کوئی نوکری مل جائے مگر قسمت اس کا ساتھ نہیں دیتی اور کہانی یہاں ایک نیا موڑ اختیار کرتی ہے جوالا جو ناز و نعم میں پلی بڑی ہے۔ یہاں اسے کئی کئی دنوں بھوکا رہنا پڑتا ہے ایسے میں جوالا کو محبت سے بھروسہ اٹھ جاتا ہے وہ خود سے کہتی ہے کہ اگر اس کا نام قربانی اور امتحان ہے تو وہ باز آئے ایسی محبت سے۔ ایسے میں وہ اپنے والد کو ایک خط لکھتی ہے۔ اس کا والد پولیس کی مدد سے پال کو گرفتار کرواتا ہے اور اپنی لڑکی جوالا کی شادی کہیں اور کر دیتا ہے ناول کا اختتام ایک عدالت کے مقدمے پر ہوتا ہے جہاں پال جوالا کو اغوا کرنے کا الزام اپنے سر لیتا ہے اور یوں اسے پانچ سال کی سزا ہوتی ہے۔

عدالت میں جب مقدمہ چلتا ہے اور ملزم پال سے سوالات کئے جاتے اور الزام لگائے جاتے ہیں تو وہ

---

۱ وجے سوری ایک ناؤ کاغذ کی۔ ص ۱۶۔ ہائی وجے پبلیکیشنز جموں ۱۹۶۵ء

اپنی محبت جوالا کی خاطر ان الزامات کو قبول کرتا ہے عدالت جوالا سے بھی سوال کرتی ہے لیکن جوالا خاموش رہتی ہے اس لئے عدالت ان دونوں کو ایک دن کا اور موقع دیتی ہے تاکہ دونوں صاف صاف بیان دیں۔ کنور شام میں پال کو سمجھاتا ہے کہ تم اب بھی عدالت میں صحیح واقعات بیان کر و ورنہ زندگی جہنم بن جائے گی وہ سمجھاتا ہے کہ تم بڑی فن کار ہو تمہیں ملک وقوم کی خدمت کرنی ہے ان دونوں کے درمیان ہونے والی بات چیت کا اندازہ دیکھئے:۔

''میرا مطلب ہے تم فنکار ہو...... تمہیں زندگی اس لئے نہیں دی گئی کہ تم اسے تباہ کر ڈالو...... تمہیں ملک وقوم کی خدمت کرنا ہے...... تم۔ تمہیں اپنی قوم کو جگانا ہے......اس میں ایک نئی روح پھونکنا ہے۔''

''نہیں کنور نہیں ......اب میں کچھ نہیں کرسکتا ......اب میں ہر طرح کی موت مر چکا ہوں ...... یہ ...... یہ پال جو تمہارے سامنے کھڑا ہے یہ پال نہیں ...... یہ پال نہیں ہے...... پال نہیں میرے دوست یہ ایک زندہ لاش ہے......صرف زندہ لاش''

''پال یہ بزدلی ہے......تم نے حالات سے گھبرا کر سر جھکا لیا ہے تم......تم ہمت وعزم سے کام لو میرے دوست: ...... اپنے لئے نہ سہی ...... دوسروں کے لئے سنبھلو...... ان لوگوں کے لئے جنہیں تم نے ڈوبنے سے بچایا ہے۔''

''میں کسی کو ڈوبنے سے نہیں بچا سکتا۔ کنور...... کسی کو نہیں بچا سکتا کنور ......اب تو خود میری اپنی زندگی کی ناؤ ڈوبنے والی ہے......اور اس کو تو اب تک ڈوب جانا چاہئے تھا...... یہ زندگی ...... یہ زندگی بھی تو ایک کاغذ کی ناؤ کی طرح ہے...... یہ کب تک ساتھ دے سکتی ہے............''[1]

یہاں ناول کا عنوان بھی پتہ چلتا ہے کہ پال نے زندگی کو کاغذ کی ناؤ سے تعبیر کیا ہے۔ پال اپنا سب

---

[1] وجے سوری۔ ایک ناؤ کاغذ کی۔ ص ۱۳۸۔ ہائی وجے پبلیکیشنز جموں ۱۹۶۵ء

کچھ اپنی جوالا کے لئے قربان کرتا ہے اور پانچ سال کی سزا پانے کے لئے جیل چلا جاتا ہے۔ جہاں چند دن بعد جوالا کا باپ اسے اپنی لڑکی کی شادی کا کارڈ بھجواتا ہے اور پھر کچھ عرصہ بعد جوالا خط لکھ کر پال سے اپنی محبت کی صفائی پیش کرتی ہے۔ خط کی شروعات یوں کرتی ہے۔

''پال میرے سہاگ خوش رہو!

تمہیں میری شادی کا کارڈ مل چکا ہوگا...... کیوں کہ مجھے معلوم ہے کہ ڈیڈی نے تمہیں کارڈ بھیجا تھا اور اسے دیکھ کر نہ جانے تم نے میرے بارے میں کیا سوچا ہوگا۔

یہی نا کہ جوالا ہرجائی نکلی، وہ بیسوا ہے تمہیں دھوکہ دے گئی اتنا ضرور ہے کہ میں نے ڈیڈی کو لکھا تھا کہ مجھے کلکتہ سے لے جائے......لیکن یہ نہیں لکھا تھا کہ وہ............ وہ تمہارے ساتھ ایسا سلوک کریں کہ میری روح تک کانپ اٹھے......

لیکن جب انہوں نے سینے پر ریوالور رکھ لیا اور کہا کہ اگر میں ان کے کہنے کے مطابق نہ چلی تو وہ آتم ہتیا کریں گے......اور یہی سبب تھا کہ عدالت میں میری زبان پر تالا تھا......اور میری مرضی کے بغیر شادی کا اعلان کر دیا گیا۔

لیکن پال جوالا تو تمہاری تھی اور ہمیشہ تمہاری رہے گی......اس جوالا سے سکون دینے والی آنچ کا ایک ہی شخص حقدار ہے اور وہ تم ہو......صرف تم۔''[1]

اس خط سے یہ واضح ہوتا ہے کہ جوالا کے دل میں جو پہلے محبت تھی وہ اب بھی ہے بس وہ حالات کے آگے ہاتھ دھو بیٹھتی ہے ورنہ اسی کی محبت میں کوئی کمی نہیں آتی وہ ہمیشہ کے لئے پال کو اپنے دل میں جگہ دیتی ہے ناول کا اختتام خط سے ہی ہوتا ہے خط کے آخر میں جوالا لکھتی ہے:۔

---

[1] وجے سوری۔ ایک ناؤ کاغذ کی۔ ص۱۵۳۔۱۵۲۔ ہائی وے پبلیکیشنز جموں ۱۹۶۵

''ہندو دھرم کے مطابق میاں بیوی کا رشتہ جنم جنم کا ہوتا ہے اور اگر مجھے
اس جنم میں تمہاری خدمت کا موقعہ نہیں ملا تو دوسرے جنم میں ضرور تمہاری
داسی بنوں گی

اچھا اب اجازت......!

تمہاری اور صرف تمہاری جوالا۔[1]

مجموعی طور پر و جے سوری کا یہ ناول فن اور موضوع دونوں اعتبار سے ایک بہترین ناول ہے ناول کا پلاٹ صاف اور سپاٹ ہے کہانی میں کہیں بھی جھول نہیں ملتا۔ پال اور جوالا کے علاوہ بھی ناول میں کئی کردار ملتے ہیں جو ضمنی ہیں بہرحال ناول کا ہیرو پال اور ہیروئن جوالا ہی ہے زبان و بیان کے اعتبار سے بھی یہ کامیاب ناول ہے اسلوب بیان نہایت دلکش ہے مکالمہ نگاری میں و جے سوری نے کمال دکھایا ہے کہ قاری کی دلچسپی بڑھتی جاتی ہے منظر نگاری کے لحاظ سے بھی ناول کی انفرادی اہمیت ہے غرض ناول 'ایک ناؤ کاغذ کی' تمام فنی لوازمات کو پورا کرتا ہے لہٰذا جموں وکشمیر کے بہترین ناولوں میں اس ناول کا شمار کیا جاتا ہے و جے سوری کو اس ناول کی وجہ سے ہمیشہ یاد کیا جاتا رہے گا۔

---

[1] و جے سوری۔ ایک ناؤ کاغذ کی۔ ص ۱۵۵۔ ہائی و جے پبلیکیشنز جموں ۱۹۶۵ء

باب چہارم

ریاست جموں وکشمیر اردو ناول

۱۹۷۱ء سے ۲۰۰۰ء تک

(۱) جان محمد آزاد

(۲) عبدالغنی شیخ

(۳) شبنم قیوم

(۴) نور شاہ

(۵) زینت فردوس

(۶) عمر مجید

(۷) جیوتیشور پتھک

(۸) فاروق رینزو

جان محمد آزاد

جان محمد آزاد جموں وکشمیر کے اردو ناول نگاروں کی فہرست میں ایک اہم نام ہے ان کی پیدائش سرینگر کے پائین علاقے کاری کدل میں ۴فروری ۱۹۴۸ء میں ہوئی۔ والد کا نام محمد سلطان تھا۔ وہ پیشے سے ایک بہترین تاجر تھے۔ اخبار پڑھنے کا انہیں بہت شوق تھا۔ جان محمد آزاد کی والدہ بھی نہایت ہی نرم دل، سخی اور نیک سیرت خاتون تھیں۔ وہ مڈل پاس تھیں، علمی ذوق انہیں بہت زیادہ تھا، جان محمد آزاد کے مطابق ان کی والدہ کلاسیکی ادب جیسے گلستان، بوستان، مثنوی مولانا روم اور دوسری چیزیں بہت شوق سے پڑھا کرتی تھی۔

جان محمد آزاد بچپن سے ہی نہایت ذہین طالب علم تھے۔ جان محمد آزاد نے ابتدائی تعلیم اسلامیہ ہائی اسکول سرینگر سے حاصل کی۔ بارہویں جماعت کا امتحان انہوں نے امتیازی نمبرات سے پاس کیا اور سائنس کے مضامین سے گریجویشن کی ڈگری حاصل کی۔ جان محمد آزاد کے والد چونکہ بارہا کشمیر کے کئی علاقوں کا اور دیہاتوں کا سفر اپنے کاروبار کے سلسلے میں کرتے تھے۔ اس دوران جان محمد آزاد بھی کئی بار ان کے ساتھ رہے۔ اور یوں جان محمد آزاد کو قدرت کے حسین وجمیل مناظر کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملا۔ جان محمد آزاد نے اپنے ادبی سفر کی شروعات افسانہ 'جمی' لکھ کر کی جو کالج کے میگزین ''بادام واری'' میں شائع ہوا۔ اس کے علاوہ آپ کے افسانے روزنامہ آفتاب اور شیرازہ میں متواتر شائع ہوتے رہے اس کے علاوہ ان کی کہانیاں ملک کے معتبر رسائل ماہنامہ آجکل (دہلی) ماہنامہ روبی (دہلی) اور ماہنامہ کہکشاں (ممبئی) وغیرہ میں شائع ہوئیں ہیں۔

آزاد کا پہلا افسانوی مجموعہ ۲۰۰۹ء میں ''آشیاں سے آسماں تک'' شائع ہوا۔ مجموعے میں شامل تمام افسانے اس دور میں تخلیق کئے گئے ہیں جب قدرت نے انہیں غم وآلام اور آزمائش کی سوغاتیں عطا کیں۔ جان محمد آزاد نے انہیں غم وآلام اور زندگی کی تلخ حقیقتوں کو بڑی ہنرمندی سے اپنے افسانوں میں پیش کیا ہے اگرچہ جان محمد آزاد کی ادبی زندگی کا آغاز افسانے سے ہوا لیکن ناول نگاری ان کا خاص میدان رہا ہے۔ انہوں نے اردو ادب کو کئی بہترین ناول عطا کیے ہیں۔ وادیاں بلا رہی ہیں، کشمیر جاگ اٹھا، ظلمات کے مسافر اور

بر فیلے لمحوں کے جنگل ان کے ناول ہیں اس کے علاوہ انہوں نے شاعری میں بھی طبع آزمائی کی ہے ان کا شعری مجموعہ ''الوداع موسمی پنچھی'' ۱۹۹۹ء میں شائع ہوا۔ان کے اس شعری مجموعے کی ادبی حلقوں میں خاصی پذیرائی ہوئی۔ جان محمد آزاد کی صحافت کے متعلق بھی ایک کتاب '' آداب صحافت'' ہے کتاب کے پیش گفتار میں محمد یوسف ٹینگ لکھتے ہیں:

''میں جان محمد آزاد صاحب کی اس کاوش کو کتاب سے زیادہ ایک بشارت جانتا ہوں جو ہماری صحافت کی تابندگی، توانائی تطہیر اور تکبر کی دعا بھی ہے۔ اور اس کا اعلان بھی۔ اس کتاب میں صحافت کے بڑے منصب کے بارے میں جو باتیں کہی گئی ہیں وہ نئے امکانات کے بیج ہیں جو ضرور بار آور ہوں گی۔ آزاد صاحب ہمارے صحافت شناسوں کی نئی نسل سے تعلق رکھتے ہیں اور اگر اس نسل کے نمائندہ میں صحافت کا یہ تصور ابھر رہا ہے تو اس کا صریحاً مطلب ہے کہ یہ بجلیاں زیادہ دیر تک بادلوں میں چھپی نہیں رہ سکتیں۔ یہ تڑپ تڑپ کر آخر کار ہماری زمین دل اور کشتِ ضمیر پر گر پڑیں گی۔''[1]

اس کے علاوہ انکی ایک کتاب ''جموں و کشمیر کے اردو مصنفین'' بھی بہت شہرت کی حامل ہے۔نور شاہ اس کتاب کے متعلق لکھتے ہیں:

''یہ درست ہے کہ جان محمد آزاد نے اپنی کتاب جموں و کشمیر کے اردو مصنفین میں ریاست سے تعلق رکھنے والے چند قلم کاروں کا شعوری یا غیر شعوری طور پر تذکرہ نہیں کیا ہے لیکن اس کے باوجود یہ کتاب ایک Reference Book کے طور پر بڑی اہمیت کی حامل ہے اس کتاب کو ترتیب دینے میں ان کی برسوں کی عرق ریزی کو کسی طرح نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔''[2]

[1] آداب صحافت، مصنف جان محمد آزاد، ص ۹

[2] نور شاہ، جموں و کشمیر کے اردو افسانہ نگار، ص ۱۰۷

جان محمد آزاد کو چونکہ اپنے والد کے ساتھ کشمیر میں گھومنے کا بار بار موقع ملتا رہتا تھا اس لئے انہوں نے ریاست کے مختلف لوگوں کی زندگی کو بہت قریب سے دیکھا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے اپنے ناولوں میں زندگی کے تلخ حقائق، نشیب وفراز، غریبی و مفلسی اور یہاں کے عوام پر ہو رہے ظلم و جبر اور ان کی لاچاری و مجبوری وغیرہ کو موضوع بنا کر فنی چابکدستی کے ساتھ پیش کیا ہے ان کے ناول موضوع ہو یا فن ہر اعتبار سے کامیاب ہیں۔ اب ہم ان کے ناولوں کا بالترتیب تنقیدی جائزہ پیش کریں گے۔

(۱) وادیاں بلا رہی ہیں:

جان محمد آزاد کا پہلا ناول ''وادیاں بلا رہی ہیں'' جو ۱۹۸۰ء میں جان محمد آزاد پبلیکیشنز آروٹ فتح کدل سرینگر، سے پہلی بار شائع ہوا۔ ناول ۱۲۸ صفحات پر مشتمل ہے ناول میں تین حصے ہیں پہلے حصے میں چار ابواب، دوسرے میں تین ابواب اور تیسرے حصے میں دو ابواب ہیں۔ پہلا حصہ ''لالہ صحرائی'' کے عنوان سے ہے۔ دوسرا حصہ ''برف باری کی رات'' اور تیسرا حصہ ''بہار کی دستک'' کے عنوان سے ہے۔

جان محمد آزاد نے ناول ''وادیاں بلا رہی ہیں'' میں کرشن چندر کے زیر اثر کشمیر کے ایک پہاڑی علاقے ''کاغان'' کے پس منظر میں سماجی زندگی کے تضاد اور شکست و محرومی کو اپنا موضوع بنایا ہے یوں تو آپ کا موضوع کوئی جدت نہیں رکھتا۔ لیکن ناول نگار نے اس ناول میں سماج کے مختلف طبقوں کے درمیان تصادم، کوہستانی علاقہ کے لوگوں کی سادگی، خلوص، خوابوں اور آرزوؤں کی کہانی کو پیش کیا گیا ہے۔ ناول نگار نے کشمیر کے خوبصورت مناظر کے علاوہ کشمیر کی غریب عوام کی زندگی کے مسائل کو بھی بڑے موثر انداز میں پیش کیا ہے۔ ظلم اور استحصال کے اس دور میں شہر کے ٹھیکہ دار کس طرح سادہ اور ان پڑھ لوگوں کا استعمال کرتے ہیں۔ اس ناول میں اس چیز کی طرف بھی اشارہ کیا گیا ہے۔ پیش لفظ میں حامدی کاشمیری اس بات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''جان محمد آزاد نے کرشن چند کے زیر اثر کشمیر کے کوہستانی علاقے ''کاغان'' کے پس منظر میں سماجی زندگی کے تضاد اور شکست اور محرومی کو اپنا موضوع بنایا ہے یوں تو آپ کا موضوع کوئی جدت نہیں رکھتا...... طبقاتی نظام کی چیرہ دستیوں کا بیان اور معصوم اور سادہ لوگوں کے خوابوں،

> حسرتوں اور آرزؤں کی کہانی......شہناز کی یتیمی اور بے کسی، اس کی کافر جوانی، جوانی کے شیرین خواب، اس کے شباب پر پڑتی ہوئی ہوس کار نگاہیں اور نجم الثاقب کے روپ میں اس کے خوابوں کی تکمیل، ایک سیدھی سی عام سی معصوم کہانی ہے لیکن مصنف نے اس کہانی کو پہاڑوں، جنگلوں اور وادیوں کے بدلتے ہوئے موسموں کے متنوع رنگوں سایوں اور روشنیوں میں تحلیل کر کے اس کی شعری تعبیر کی ہے اور یہی اسے جاذب النظر بناتا ہے۔''[۱]

جان محمد آزاد نے اس ناول میں کاغان کے لوگوں کے نفسیاتی رجحان کے ساتھ ان کے سماجی اور مادی حالات کو بھی پیش کیا ہے مقامی لوگ تعلیم کے زیور سے آراستہ نہیں تھے اس لئے دوسرے علاقوں کے لوگ انہیں جاہل اور گنوار تصور کرتے تھے اور حکومت کی بھی اس علاقے کی طرف کوئی خاص توجہ نہیں تھی یہی وجوہات اس علاقے کی پسماندگی کا سبب بنی اور یہاں کی ایک غریب لڑکی سارہ کو بیگ خاندان کے لوگ اپنی بہو ماننے سے انکار کرتے ہیں اور وہ یوں کاغان پہنچ کر غربت کی زندگی گزارنے پر مجبور ہو جاتی ہے سارہ کے سسرال والوں کے مطابق کاغان کی غلیظ بستی سے آئی ہوئی کوئی گنوار لڑکی بیگ خاندان کی بہو نہیں بن سکتی۔ جان محمد آزاد نے یوں اس زمانے کی رسومات کی طرف اشارہ کیا ہے جو آج بھی کہیں نہ کہیں نظر آ ہی جاتی ہے۔

'وادیاں بلا رہی ہیں' ناول میں جان محمد آزاد نے چند تلخ حقیقتوں کو بھی بیان کرنے کی کوشش کی ہے جمیلہ اور شاہ عالم جب کئی سال بعد اس راز سے آشنا ہو جاتے ہیں کہ ان کے یہاں اولاد پیدا ہونے والی ہے تو ان کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہیں رہتا لیکن یہی خوشی اس وقت مایوسی میں بدل جاتی ہے جب شاہ عالم زمین گروی رکھ کر سکندر شاہ سے قرض لیتا ہے اور اس طرح اس کے مزاج میں کڑواہٹ پیدا ہو جاتی ہے۔

جان محمد آزاد نے ناول میں ڈوگرہ راج میں مختلف طبقوں کی کشمکش کا بڑی خوبصورتی سے نقشہ کھینچا ہے ساتھ ہی کشمیر کے خوبصورت مناظر کی قلمی تصویریں بھی بہترین انداز میں پیش کیں ہیں ساتھ ہی ہی ساتھ اس خوبصورت وادی میں جو ظلم و بربریت کا دور چل رہا ہے اسے بھی نمایاں کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ اگر چہ

---

[۱] جان محمد آزاد، وادیاں بلا رہی ہیں، پیش لفظ، ص ۷، جان محمد آزاد پبلیشنز سرینگر، ۱۹۸۰ء

شہناز کو بیگ منزل میں تمام سہولیات میسر تھی لیکن کا غازت کی پسماندہ وادی کے لوگوں کی تصویر ہر وقت اس کی آنکھوں کے سامنے رہتی ہے یہ لوگ رات دن ایک کر کے سکندر شاہ کا قرض ادا کرتے تھے لیکن مرنے کے بعد بھی ان کے بچوں کو معلوم ہوتا ہے کہ اصل ابھی باقی ہے شہناز ان لوگوں کی حالت بدلنے کی کوشش کرتی ہے اور آخر نجم الثاقب کی مدد سے اپنے مقصد میں کامیاب ہو جاتی ہے اور اس طرح جان محمد آزاد ناول کا خاتمہ ظلم کی شکست اور حق کی فتح پر کرتے ہیں۔

جان محمد آزاد نے ناول میں ساہوکاروں کے ظلم اور استحصال کا نقشہ جن الفاظ میں کھینچا ہے اس سے ان کی شخصیت پوری طرح واضح ہو جاتی ہے۔ آزاد کے مطابق یہ ساہوکار مقروض کو چارہ کھلا کر زندہ رکھتے ہیں اور پھر آہستہ آہستہ ان کی غذا کم کر دیتے ہیں۔ اس طرح یہ مظلوم قوم اپنی زمین اور جائیداد چند سکھوں کے عوض گنوا بیٹھتے ہیں۔ جمیلہ کے یہاں جب ایک بیٹا جنم لیتا ہے تو شاہ عالم مہمانوں کی خاطر تواضع کے لئے سکندہ شاہ سے دو برس کے فصل کے عوض رقم ادھار لیتا ہے۔ جب یہ غریب لوگ دو وقت کی روٹی کے لئے ٹرپتے رہتے ہیں وہیں ساہوکار خواجہ سکندر شاہ ان کی لوٹ کر اپنی تجوریاں بھرتا ہے۔ اس طرح وہ ان لوگوں پر ظلم و جبر کی انتہا کرتا ہے لیکن آخر کار اپنے گناہوں تلے دب کر اس کی موت واقع ہوتی ہے ناول کے پلاٹ میں کوئی خاص ربط نہیں اس کے علاوہ کئی کردار بھی غیر اہم ہیں جان محمد آزاد کا دراصل یہ پہلا ناول تھا اس لئے فنی تقاضوں کو پورا کرنے میں وہ ناکام ثابت ہوئے ہیں۔

’وادیاں بلا رہی ہیں‘‘ ناول میں زندگی کی دہشت ناکی کے بجائے رومانی آرزومندی کے دلکش رنگ ملتے ہیں۔ جان محمد آزاد کی پہلی ہی کاوش سے تخیل آرائی منظر نگاری جذباتی کیفیات کی مصوری اور زبان و بیان کی حسن کاری سے ان کی تخلیقی صلاحیتوں کا بین ثبوت ملتا ہے۔ منظر نگاری کی ایک بہترین مثال ناول سے پیش کی جاتی ہے:

> ’’چندن پور کی وادی دو حصوں میں بٹی ہوئی تھی۔ ڈھکی کے نیچے تقریباً ایک کلومیٹر لمبا سرسبز قلعہ جہاں صاف وشفاف سڑک کے دونوں طرف ایک سودو کانوں پر مشتمل ایک پر رونق بازار تھا۔ بازار کے پیچھے وادی میں غریب ترین باشندوں کے گھر تھے۔ گھروں کے درمیان گلیاں جہاں

سارا دن گہما گہمی رہتی۔ ڈھکی کے اوپر کئی پختہ اور جدید طرز کے بلگلے تھے
جن میں حاجی حیدر بیگ کی یہ حویلی بھی تھی چاروں طرف بکھرے ہوئے
عشق پیچان کے پھولوں کی گود میں...... یہاں خوبصورت مناظر تھے......
حسین اور صحت مند چہرے تھے۔ بھڑکیلے ملبوسات تھے۔ سورج کا سونا
تھا اور زندگی کا رقص تھا۔'' [1]

جان محمد آزاد نے کرداروں کے درمیان ہونے والی گفتگو اور رشتوں کے تقدس کا بھی بہت خیال رکھا ہے سکندر شاہ اور اس کے نوکروں نے جو ظلم و جبر کیا اس کے چلتے کرداروں میں رشتوں کی پاسبانی کیسے کی گئی ہے۔ اقتباس دیکھیں:

''یہ خونخوار بھیڑیئے ڈھائی سو روپے کے عوض تمہارا سودا طے کرنا چاہتے
ہیں تمہارے جسم کا...... تمہارے جذبات کا...... لیکن تم میری بہن ہو......
ان پہاڑوں کی بیٹی ہو...... تمہیں ان پہاڑوں کے تقدس کی قسم...... تم اپنی
عزت و آبرو کو نیلام ہونے سے پہلے ان پہاڑوں کی ہی گود میں سما جاؤ۔
بھاگ جاؤ...... تم یہاں سے بھاگ جاؤ شہناز......!'' [2]

مختصر یہ کہ ناول 'وادیاں بلا رہی ہیں' جان محمد آزاد کی اگرچہ پہلی کوشش ہے لیکن اس کے باوجود بھی یہ ناول کافی حد تک کامیاب نظر آتا ہے۔

(۲) کشمیر جاگ اٹھا

''کشمیر جاگ اٹھا'' جان محمد آزاد کا دوسرا ناول ہے جو ۸۵۔۱۹۸۴ء میں شائع ہوا۔ اس ناول میں بھی جان محمد آزاد نے اپنے پہلے ناول کی طرح کشمیر کے دور افتادہ علاقہ کو موضوع بنایا ہے۔ اس ناول میں مطلق العنانیت کے تاریک ترین دور میں استحصال اور جبریت کے ہاتھوں مظلوموں اور بے زبان انسانوں کی کہانی پیش کی گئی ہے۔ یہ ناول اردو مرکز متصل مجاہد منزل سرینگر سے شائع ہوا۔ ناول کا انتساب کشمیریوں کے نواہائے

---

[1] جان محمد آزاد، وادیاں بلا رہی ہیں، ص ۷۷، جان محمد آزاد پبلیشنز سرینگر، ۱۹۸۰ء

[2] جان محمد آزاد، وادیاں بلا رہی ہیں، ص ۵۵، جان محمد آزاد پبلیشنز سرینگر، ۱۹۸۰ء

جگر سوز کے ساز کو چھیڑنے والے مسیحا کے نام کیا ہے ناول ۱۳۱ صفحات پر مشتمل ہے۔ ناول کے شروع میں اس وقت کے وزیر اعلیٰ ڈاکٹر فاروق عبداللہ کا اس ناول کے متعلق ایک ''پیغام'' شامل کیا ہے جس میں فاروق عبداللہ نے اسے ادبی مقام دینے سے گریز کرتے ہوئے اسے سماجی، سیاسی اور تہذیبی تسلسل اور جدوجہد کی ایک لافانی داستان بتایا ہے۔ فاروق عبداللہ اپنے پہلے جملے میں ہی یہ کہتے ہیں کہ ناول تحریک حریت کشمیر کے تناظر میں لکھا ہے۔ اس ناول کا پیش لفظ ڈاکٹر برج پریمی کا لکھا ہوا ہے۔ اور اس ناول کا تعارف ڈاکٹر محمد زمان آزردہ نے لکھا ہے۔

ناول ''کشمیر جاگ اٹھا'' کے پلاٹ اور کہانی میں کوئی پیچیدگی نہیں ملتی لیکن موضوع متاثر کردہ ہے کشمیر کے ایک دور افتادہ گاؤں میں ایک معمولی خاندان کو موضوع بنا کر ناول نگار نے ڈوگرہ دور کی درد بھری زندگی کی عکاسی کی ہے۔ دلاور خان گھر کے حالات اور ڈوگرہ حکمران کے ظلم و جبر سے تنگ آ کر گھر بار چھوڑ دیتا ہے اور شہر کا رخ کرتا ہے اس کی بیوی ماہتاب پر گھر کی ساری ذمہ داری آن پڑتی ہے اور دن بھر کھیتوں میں کام کرتی ہے لیکن فصل کی کٹائی پر اس کی محنت اور کمائی پر مہاراجہ اور اس کے کارندے ہاتھ صاف کر دیتے ہیں اور اس کے پاس کچھ بھی نہیں رہتا۔ ماہتاب کے گھریلو حالات اور شکستہ صورتحال کی تصویر کشی کرتے ہوئے جان محمد آزاد لکھتے ہیں:

> ''ماہتاب آج ساری صبح دور فضاؤں میں تکتی رہی اس کا ذہن مردہ خیالات کے بوجھ سے دب گیا تھا۔ اسے اب ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے بے جان اور بے حس خیالوں نے اس کے گرد ایک قبر سی بنا لی ہو جس کے اندر اس کا جسم اور اس کا ذہن گل سڑ رہا ہو۔ اسے ایسا محسوس ہو رہا تھا جسے آج اس کی قسمت کا فیصلہ ہونے والا ہو۔ کیونکہ آج اس کے خون پسینے سے حاصل کئے گئے اناج کا بٹوارہ ہوگا۔ آج گاؤں والے دل کھول کر اس کے بارے باتیں کریں گے۔ حشمت خان کا خیال آتے ہی پنجرے میں اسیر پرندے کی طرح اس کا دل بیٹھنے لگا۔ گاؤں کے مقدم کی جھونپڑے میں جہاں حشمت خان ٹھہرا ہوا تھا بال تل کے لوگ ایک ا

یک کر کے جمع ہورہے تھے۔ جاگیردار کے کارندے کو سلام کہنے۔ وہ اس
کے سامنے سربسجود تھے۔''[1]

جان محمد آزاد کے ناول ''کشمیر جاگ اٹھا'' کا موضوع اس اعتبار سے اہم ہے کہ انہوں نے نہ صرف یہاں کے دلآویز حسن کی حشر سامانی کی تصویر کھینچی ہے بلکہ اس سیاسی، سماجی اور معاشی آشوب کو بھی پیش کیا ہے جس نے افلاس، ناداری اور بے بسی کی لکیروں سے ان کی تقدیر کو سیاہ کر دیا تھا۔ آزاد نے شہروں اور قصبوں سے ''تھاجواس'' کے حسین دھندلکوں کے دامن میں پھیلے ہوئے بال تل اور اس کے گرد و نواح کو پیش کیا ہے۔ اور یہاں کی معصوم اور بے ریا زندگی کے پاکیزہ دامن پر ڈوگرہ شاہی کے جاگیردارانہ نظام کے خونین رقص کو اپنے خون جگر کے رنگ سے رنگا ہے آزاد نے شہری ہنگاموں سے دور اس بستی کا وہ پہلو دکھایا ہے جو نظروں سے اوجھل ہے۔ انہوں نے اپنے ظلم کی نوک سے ان آنسوؤں کو موتیوں کی طرح چن لیا ہے جن میں صدیوں کا ملال چھپا ہوا ہے لیکن آزاد کا قلم صرف اس پر اکتفا نہیں کرتا وہ بدلتے ہوئے شعور کو بھی پیش کرتا ہے جس نے کشمیر کی تقدیر بدل دی۔

دلاور لون کے گھر سے بھاگ جانے کے بعد گاؤں کے نمبردار کے کارندے حشمت خان کی نظریں جب پہلی بار ماہتاب کو دیکھتی ہیں تو حوس کا بھوت اس کے سر پر سوار ہو جاتا ہے اور وہ ماہتاب کی مجبوری اور بے کسی کا بھرپور فائدہ اٹھاتا ہے دلاور شہر سرینگر میں تلاش معاش کے سلسلے میں تو گئے تھے لیکن یہاں کی حالت دیکھ کر اسے اور بھی مایوسی ہوتی ہے۔۔ کیونکہ ڈوگرہ مہاراجوں کے دور میں سرینگر کی حالت بھی انتہائی غیر تھی۔ ناول سے ایک اقتباس دیکھئے جہاں دلاور لون کے ساتھ جو سلوک ہو رہا تھا وہ اس ڈوگرہ حکومت کی حقیقی تصویر کو پیش کرتے ہیں:

''دلاور کو سنتری کے اس ذلت آمیز سلوک سے افسوس نہیں ہوا تھا۔ رنگ
اور شیش محل میں رہنے والے راجکمار بھلا اور کیا دے سکتے ہیں۔ یہاں تو
چاروں طرف بھوک ہی بھوک منڈلا رہی تھی۔ لوگ چاول کے ایک ایک
نوالے کے لئے تڑپ تڑپ کر جان دے رہے تھے۔ زندگی طویل اور

---

[1] جان محمد آزاد، کشمیر جاگ اٹھا، ص ۴۲، اردو مرکز متصل مجاہد منزل سرینگر، ۸۵۔۱۹۸۴ء

سنسان راتوں کی طرح بھیانک اور بے کیف تھی۔ شہر کے ساتھ اس نے
کیسی الف لیلوی باتیں منسوب کی تھیں لیکن یہاں تو بھوک گندگی اور
غلاظت کی حکمرانی تھی۔''[1]

ماہتاب اس وقت بہت پریشانی کے عالم میں ہوتی ہے جب اسے علم ہوتا ہے کہ وہ حشمت کے بچے کی ماں بننے والی ہے لیکن اس پریشانی کے عالم میں اس کی ایک سہیلی گلابی اس کے لئے کچھ جڑی بوٹیوں کا انتظام کرتی ہے اور بچہ بطن میں ہی مرجاتا ہے ایک طرف یہاں ماہتاب کسی قدر مطمین تھی کہ مصیبت اور بدنامی سے چھٹکارا ملا لیکن دوسری طرف وہ اپنے آپ کو قاتل تصور کرتی ہے یہاں پر ناول نگار نے اس کے جذبات کی بہترین تصویر پیش کی ہے:

''نہ جانے کیسے کیسے خیال سرابھارتے ہیں کبھی خیال آتا ہے کہ میں نے
ایک گناہ کو چھپانے کے لئے دوسرے بڑے گناہ کا ارتکاب کر ڈالا۔ جرم
کی آخری نشانی مٹا کر بدنامی، خوف اور خدشوں کے اندھیرے تو چھٹ
گئے اور اطمینان کی روشنی ہر طرف پھیل گئی۔ لیکن نہ جانے یہ کیسا اندھیرا
ہے...... گلابی!...... جو میرے دل و دماغ پر چھایا جا رہا ہے۔ کیا یہ محض
میرا جذباتی انتشار ہے آہ!...... میرا بچہ...... میرے اپنے گوشت اور خون
کی تخلیق...... نرم نرم گوشت کا ایک ننھا منا وجود...... وہ ابھی کل تک میری
کوکھ میں سمایا ہوا تھا۔ اور آج میرے ہاتھ بھی خالی ہیں اور گود بھی......!
مجرم تو حشمت خان تھا انتقام اس سے لینا چاہیے تھا لیکن میں نے کیا
کیا...... کیا کیا۔ ہم نے یہ گلابی...... کہیں ہم سے ایک اور ناقابل تلافی
جرم تو سرزد نہیں ہوا۔ ایک بے قصور اور فرشتوں کے تقدس کا
سرچشمہ.......... اسے کس جرم کی سزا دے دی ہم نے۔!''[2]

[1] جان محمد آزاد، کشمیر جاگ اٹھا، ص ۶۲، اردو مرکز متصل مجاہد منزل سرینگر، ۸۵۔۱۹۸۴ء

[2] جان محمد آزاد، کشمیر جاگ اٹھا، ص ۶۸، ۶۷، اردو مرکز متصل مجاہد منزل سرینگر، ۸۵۔۱۹۸۴ء

بڑی تیزی سے وقت گذرتا جا رہا ہے اور دلاور خان واپس نہیں لوٹتا۔ ماہتاب اب بوڑھی ہو چکی ہے ان کا لڑکا نادر اب کھیتوں میں کام کرتا ہے لیکن اس کے چھوٹے بھائی گل ریز سے ان کی نہیں بنتی تھی جس کی وجہ سے گھر میں نفرت انگیز ماحول رہا کرتا ہے۔ ماہتاب اب نادر کی شادی خورشی سے کرانے کے بعد اپنی اندھی بیٹی پمپوش کو ایک بوڑھے سے بیاہ کراتی ہے جس کی وجہ سے پمپوش کی امنگیں ہمیشہ کے لئے مر جاتی ہیں ماہتاب کا چھوٹا گل ریز گھر سے بھاگ کر شہر کا رخ اختیار کرتا ہے اور وہ کشمیر کی آزادی کے لئے باغی بن جاتا ہے واپس آنے پر وہ انقلاب اور استحصال کی باتیں کرتا ہے جسے یہاں کے لوگ نہیں سمجھ پاتے۔ وہ اپنے گاؤں بال تل کے لوگوں سے یوں مخاطب ہوتا ہے:

''بھائیو! ہم کشمیر کے مظلوم کسان...... محنت کش...... صدیوں کی غلامی...... استحصال...... لوٹ گھسوٹ اور ظلم و تشدد سے تباہ و بے حال ہیں ہم اپنے اہل کی نوک سے زمین کی چھاتی کریدتے ہیں۔ اپنے تھکے تھکے پاؤں سے اسے ہموار کرتے ہیں۔ سنوارتے سجاتے ہیں...... امنگ سے جھوم کر بیج بوتے ہیں...... پودے اگتے ہیں۔ سورج تپتا ہے۔ لہلہاتے کھیت سنہرے ہو جاتے ہیں امید اور خوشی میں مستغرق کسان فصل کاٹنے لگ جاتے ہیں۔ زمین ہماری محنت سے سرور ہو کر سونا اگل دیتی ہے اور ہم رنگین خوابوں میں ڈوب جاتے ہیں۔ بیوی کے لئے نیا پھرن بنے گا۔ بچوں کے لئے نئی ٹوپیاں آئیں گی۔ لذیر پکوان بنیں گے ہر طرف انبساط اور خوشیوں کا عالم ہوگا لیکن ہمارے یہ خواب جاگیردار زمیندار اور ان کے حواریوں کے بھینٹ چڑھتے ہیں۔ یہ خواب ادھورے رہ جاتے ہیں...... صیاد ہماری محنت کے پھل کو ایک ایک کر کے نوچ لیتے ہیں ہم ایک بار پھر ننگے اور بھوکے رہتے ہیں...... ہمارے دلوں میں پھر تاریکی چھا جاتی ہے۔ ایک بار پھر وہی بلکتی، سسکتی، بے رونق، بے خواب اور ویران زندگی ہمیں اپنی پناہ میں لیتی ہے ہم جاگیردار

شاہی کے سامنے سربسجود ہو جاتے ہیں ہمیں مغلوں، پٹھانوں اور آسمان کو
چھونے والے ہمارے پہاڑ خوبصورت گھاٹیاں شاداب مرغزار گھنے
جنگل، تڑپتے سیماب صفت پانی والے ان گنت چشمے...... آبشار......
کانوں اور دبے کچلے لاکھوں انسانوں کو صرف ۷۵ لاکھ روپئے میں بیچ
دیا۔ یہ انسانی تاریخ کا سب سے ارزاں سودا تھا۔ ڈوگرہ مہاراجوں نے
اپنے ظلم وستم کے آگے چنگیز خان اور نادر شاہ کا بھی سر نیچا کیا انہوں نے
اپنے حواریوں میں جاگیریں تقسیم کیں۔ وَڈ دار چکدار اور سودخوار پیدا
کئے کشمیر کا بے بس انسان غربت جہالت اور بھوک سے اپنے صیاد کے
پنجوں میں پرنوچے پنچھی کی طرح تڑبڑاتا رہا اور اگر دکھ اور درد سے تلملا کر
اس کے سینے میں ایک آہ، ایک کراہ اٹھی تو آمریت کی سنگینوں نے اس آہ
کو گلے کے اندر ہی جبراً گھونٹ دیا۔''[1]

ناول ''کشمیر جاگ اٹھا'' کا اختتام کشمیر کا ہندوستان کے ساتھ الحاق پر ہو جاتا ہے ناول نگار نے اگر چہ اسے نئی صبح کہا ہے لیکن کشمیر کے لئے یہ نئی صبح ثابت نہیں ہوئی۔ الحاق تو اس وعدے پر کیا گیا تھا کہ حالات میں بہتری کے ساتھ ہی یہاں رائے شماری کرائی جائیگی۔ اور پھر لوگوں کی مرضی سے کشمیر کے مستقبل کا فیصلہ کیا جائے گا کہ آیا وہ ہندوستان میں رہنا چاہتے ہیں یا پاکستان یا پھر آزاد۔ ہندوستان کے پہلے وزیر اعظم نے کشمیر کے لوگوں اور یہاں کے ایک محبوب لیڈر اور رہنما شیخ محمد عبداللہ سے لال چوک میں اقرار کیا تھا کہ کشمیری ابھی تک اس بات کا مطالبہ کرتے ہیں کہ رائے شماری کرائی جائے۔ ڈاکٹر برج پریمی نے اس ناول کے متعلق اپنے خیالات کا اظہار پیش لفظ میں کچھ یوں کیا ہے کہ جس سے عام قاری کو اس ناول کے موضوع کو سمجھنے میں کافی مدد ملتی ہے وہ یوں رقمطراز ہیں:

''کشمیر...... صدیوں کی غلامی سے جھلسی ہوئی یہ سرزمین جس کی بے بسی
بانہوں میں مغل عہد سے لے کر ڈوگرہ عہد تک برابر پامال اور غلام در غلام

---

[1] جان محمد آزاد، کشمیر جاگ اٹھا، ص ۱۰۰۔۹۹، اردو مرکز متصل مجاہد منزل سرینگر، ۸۵۔۱۹۸۴ء

لوگ اونگھتے رہے ہیں۔ ہمیشہ نظر انداز ہوئی ہے۔ بیشتر رومان پرست فنکاروں نے یہاں کے خواب آلود فضاؤں، برفیلے پربتوں، نیلی جھیلوں کی گہرائیوں اور حسین گھاٹیوں سے اپنے فن کی قوس قزح سجائی۔ انہوں نے نہ افلاس کے ماتے پپوٹوں پر تھرکتے ہوئے خواب دیکھے نہ دھڑکتے ہوئے دلوں کی آہٹیں سنیں اور نہ ہی اس آتش فشاں کی جدت کو محسوس کیا جو ان کے بے حس وجود میں کھول رہا تھا۔ پردیسی اور ان کے بعد یہاں کے بعض فنکاروں نے اس طرف پہلی بار توجہ کی۔ جان محمد آزاد کے ناول ''کشمیر جاگ اٹھا'' کا موضوع اس اعتبار سے اہم ہے کہ انہوں نے نہ صرف یہاں کے دل آویز حسن کی حشر سامانی کی تصویر کھینچی ہے بلکہ اس سیاسی، سماجی اور معاشی آشوب کو بھی پیش کیا ہے جس نے افلاس ناداری اور بے بسی کی لکیروں سے ان کی تقدیر کو سیاہ کر دیا تھا۔''[1]

جان محمد آزاد کے اس ناول کا عنوان بھی بہت دلکش ہے جس پر نظر جاتے ہی عام انسان بھی اس ناول کے مطالعے کے لئے بیتاب ہو جاتا ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ یہ ناول ایک عرصہ تک ادبی حلقوں میں موضوع بحث رہا اور اس کے اب تک کئی ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔ ناول میں جان محمد آزاد نے کشمیر کے ظاہری حسن کے پس منظر انسانیت کے ان دکھوں اور محرومیوں کی عکاسی کی ہے جو صدیوں تک ان لوگوں کا مقدر بنی رہی ہیں۔ ''کشمیر جاگ اٹھا'' کہانی کے اعتبار سے مصنف کا ورثہ ہے جبر و استبداد کا وہ دور جو صدیوں تک کشمیریوں پر مسلط رہا یہ ناول اس کی ایک کڑی ہے جس کی تصویر مصنف نے بڑی خوبی سے کھینچ کے رکھ دی ہے۔

جان محمد آزاد کے اس ناول میں مختلف حقیقتیں ابھر کر سامنے آتی ہیں انسان جو بنیادی طور پر آزاد معلوم ہوتا ہے اسے غلامی کا طوق پہنایا جاتا ہے۔ عورت جو قدرت کا حسین شاہکار ہے ہر جگہ مظلوم، بے کس اور بے بس کیوں ہے؟ کیا اس کی مجبوری و مظلومی ازلی و ابدی ہے؟ یا فطری خواہشوں بنیادی ضرورتوں اور اس کے ماحول کا نتیجہ ہے؟ وادئ کشمیر سے متعلق اس ناول میں جو پہلو ابھر کر سامنے آتے ہیں ان میں قدرت کی فیاضی،

---

[1] جان محمد آزاد، کشمیر جاگ اٹھا ص ۱۰۰۔۹۹، اردو مرکز متصل مجاہد منزل سرینگر، ۸۵۔۱۹۸۴ء

مناظر کی دلکشی، ظلم واستحصال کی انتہا اور وہ انسانی حسن ہے جس کی بنیاد خود بخود اس ناول کو شاعرانہ اسلوب عطا کرتی ہے اس ناول میں پہاڑی علاقے کے سادہ لوح، ان پڑھ، غریب مزدور اور کسان ہیں جن کی دوستی اور دشمنی کی طرف محبت بھی ایسی طوفانی اور جذباتی ہوتی ہے کہ ان کے رشتے داستانوں کے مثالی کرداروں سے جا ملتے ہیں۔

ناول ''کشمیر جاگ اٹھا'' اپنے موضوع اور تکنیک کے اعتبار سے کامیاب ناول ہے واقعات بالترتیب ہیں کہیں بھی کوئی الجھاؤ نہیں ہے کہانی احسن طریقے سے آگے بڑھتی ہے اور تجسس کا عنصر برقرار رہتا ہے۔ کردار نگاری بھی فنی تقاضوں کے مطابق نظر آتی ہے کئی اہم اور غیر اہم کردار کہانی کو آگے بڑھاتے ہیں لیکن ماہتاب اس ناول کا مرکزی کردار ہے جو مختلف قسم کے مصائب و آلام کی علامت ہے وہ ان دکھوں، تکلیفوں اور پریشانیوں سے گھبراتی نہیں ہے بلکہ ان کا مقابلہ بڑی بہادری سے کرتی ہے اس کے وجود کا ایک ریزہ جاگیر شاہی میں بسے ہوئے بے حس معاشرے کی چیرہ دستیوں کی داستان ہے۔ گل ریز بھی اس ناول کا ایک اہم کردار ہے جو نئی نسل کی نمائندگی کرتا نظر آتا ہے۔ ناول کے دیگر کرداروں میں دلاور لون، حشمت خان، خورشی، مام دین، گلابو، قادر لون کی بھی اپنی اہمیت ہے اور آزاد نے ان کرداروں کی مدد سے اس معاشرت کی کہانی تیار کی ہے جو صدیوں سے ظلم و جبر سہتی چلی آرہی تھی۔ حامدی کاشمیری اس ناول کی کردار نگاری کے متعلق لکھتے ہیں:

> ''...... ماہتاب اس کا خاوند دلاور لون گھوڑا سوار کا رندہ حشمت ساس،
> نادر اور گل ریز سب اسی جبر وتشدد کے دور کے نمائندے ہیں۔ انہوں
> نے ماہتاب کے کردار کی گہرائی میں ممتا کی عظمتوں کو ابھارا ہے۔ بعض
> کردار نیم روشن سایوں کی طرح ابھرتے ہیں۔ لیکن پورے ناول میں
> فطرت کا کردار بھی ایک زندہ تغیر آشنا اور رہم زاد وہمدم کردار کی طرح
> خاموشی سے اپنا رول ادا کرتا ہے۔''[1]

جان محمد آزاد کے یہاں جذبات نگاری اور منظر نگاری کی بہترین تصاویر ملتی ہیں یہ ناول اپنے سیاسی پس منظر اور سماجی کوائف کے باوجود جذبات کا ایک مرقع ہے مگر مصنف کا کمال یہ ہے کہ وہ خود جذبات کی رد

1. حامدی کاشمیری، حرف اول، کشمیر جاگ اٹھا، ص ۱۳۔۱۲۔ از جان محمد آزاد، اردو مرکز متصل مجاہد منزل سرینگر

میں بہہ نہیں جاتے بلکہ ماہتاب اور دلاورلون کے جذبات پیش کر کے اپنے ہم وطنوں کے ماضی کے زخموں کو یاد کرتے ہیں وہ اس دور کی تصویر کشی کر کے موجودہ زندگی سے محظوظ ہونے کا راستہ دکھاتے ہیں۔

منظر نگاری کی کامیابی کا سبب یہ ہے کہ مصنف نے اعتبار نظر سے کام لیا ہے ان کی منظر کشی میں دماغ سے زیادہ نگاہ کا دخل ہے وہ کشمیر کے ان دور دراز کے علاقوں میں خود رہ چکے ہیں جہاں قدرت نے سامان زندگی مہیا کرنے میں کسی طرح کا بخل نہیں کیا ہے۔ جہاں تیز رفتار نالے، دودھ کی بہتی ہوئی ندیوں کا منظر پیش کرتے ہیں جہاں پتھر کے ٹکڑوں سے چشمے ابلتے ہیں جہاں درختوں کی گھنی چھاؤں کائنات کو اپنے سایے میں پناہ دینے کے لئے ہر وقت تیار رہتی ہے۔ جہاں کے مکینوں کی قدرتی خوبصورتی ماہتاب کی طرح ہر وقت دعوت نظارہ دیتی ہے مگر جابر اور ظالم حکمران کے نمائندے ہرنی آنکھوں کو خون کے آنسو رلانے پر مجبور کرتے ہیں جن آنکھوں کو قدرت نے وحشی ہرنیوں کی معصومیت دی تھی ان ہی کو جاگیردارانہ نظام دہکتے شعلوں میں بدل دیتا ہے جن کو قدرت نے محبت کے لئے پیدا کیا تھا وہی ہوس اور نفرت کا شکار ہو جاتے ہیں۔ مجموعی اعتبار سے جان محمد آزاد کا یہ ناول ''کشمیر جاگ اٹھا'' ان کے پہلے ناول ''وادیاں بلا رہی ہیں'' کے مقابلے میں کافی کامیاب نظر آتا ہے۔ موضوع اور فن وتکنیک ہر اعتبار سے یہ ناول جان محمد آزاد کو ایک اہم ناول نگار قرار دیتا ہے۔

(۳) ظلمات کے مسافر:

جان محمد آزاد کا لکھا ہوا یہ تیسرا ناول ہے جو ۱۹۸۹ء میں میکاف پریس سرینگر سے شائع ہوا۔ اس ناول کا انتساب زوجی لا کی ان لرزاں خیز چوٹیوں کے نام جن کی برف پوش گہرائیوں میں آج بھی نہ جانے کتنی لاشیں دفن ہیں جن خون آشام چوٹیوں کے اس پار کی سیاہ بخت سرزمین میں نہ جانے کتنی کھوکھلی روحیں اور کھوکھلے جسم آج بھی طلسم دوش فردا کے اسیر ہیں۔ ناول ''ظلمات کے مسافر'' جان روسو کی انگریزی کتاب ''دی لونگ ڈیڈ'' سے اخذ کیا گیا ہے۔ ''ظلمات کے مسافر'' ایسے نامراد لوگوں کی کہانی ہے جو موت کی وادیوں سے بے لگام عفر پتوں کی طرح رات کے سینے پر بدی کے سفیر اور فن کی پکار بن کر چھا گئے۔

ناول ''ظلمات کے مسافر'' فن اور موضوع دونوں اعتبار سے کامیاب ناول ہے ناول کا پلاٹ مربوط ہے کردار نگاری میں ناول نگار نے فنی چابکدستی سے کام لیا ہے۔ منظر کشی کی بھی بہترین مثالیں دیکھنے کو مل جاتی ہیں۔ منظر کشی کی ایک مثال پیش کی جاتی ہے:

''پہاڑیوں کے دامن میں واقع جیک ملر کے دیہاتی طرز کے مکان پر تاریکی اور خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ یہ مکان جس مقام پہ واقع تھا وہ قصبے کی آبادی سے تقریباً تین کلومیٹر کے فاصلے پر تھا۔ اس دور افتادہ، ویران اور سنگلاخ بلندیوں کی چڑھائی پر یہ تنہا مکان تھا۔ یہاں دور دور تک کسی آبادی یا کسی انسان کا پتہ نہ تھا۔ دروازے کی دوسری طرف ایک وسیع وعریض کمرہ تھا۔ جس کی چھت بلند تھی۔ کمرے کے فرش میں موٹے اور مضبوط پتھر جڑے ہوئے تھے۔ اس کی دیواریں بھی پتھر کی تھیں، کمرے کے ایک گوشے میں چتھیڑوں کا انبار تھا لیکن ان چتھیڑوں پر کڑھے ہوئے نقش ونگار کے آثار اس بات کا پتہ دیتے تھے کہ یہ کبھی عمدہ پردے رہے ہوں گے جو کمرے کی ننگی دیواروں کی ستر پوشی کیا کرتے ہوں گے۔ ایک دیوار کی آغوش میں بڑا سا آتش دان تھا جس میں خشک کمریاں برابر سلگ رہی تھیں۔[1]

ظلم کی بے شمار مثالیں ناول میں ملتی ہیں یا یوں کہا جائے کہ ناول ظلم سے بھرپور ہے تو بے جا نہ ہوگا۔ ناول میں ایک موقع ایسا آتا ہے جہاں ایک معصوم بچے کی ماں مرجاتی ہے اور بچہ بھوکا رہتا ہے اس صورت میں بھی ظالم حملے کے لئے تیار رہتے ہیں۔ دیکھئے مثال:

''یہ بچہ کل رات پیدا ہوا۔ اِس کی ماں مرگئی۔ وہ لوگ یہیں جنگل کے اس طرف آپ کے پڑوس میں رہتے ہیں کل سے اس بچے نے کچھ بھی نہیں پیا کیا آپ لوگ ازراہ کرم اِسے دودھ کے چند قطرے پلائیں گے۔''[2]

ظلمات کے مسافر ناول میں مختلف اہم اور غیر اہم کردار ہیں جو ناول میں کہانی کو آگے بڑھانے میں معاون ثابت ہوتے ہیں۔ کیرن، جارج، لارنس، سیوائین، جیمز براؤن، جوزف، مسٹر ڈروسی، سائیمن وغیرہ

---

[1] جان محمد آزاد، ظلمات کے مسافر، ص ۳۳، میکاف پریس سرینگر، ۱۹۸۹ء

[2] جان محمد آزاد، ظلمات کے مسافر، ص ۹۳، میکاف پریس سرینگر، ۱۹۸۹ء

کردار بہت اہم ہیں۔ ناول کے تمام کردار فرضی ہیں۔

جان محمد آزاد کا یہ ناول ظلمات کے مسافر اخذ کیا گیا ہے اس لئے اس کو زیادہ شہرت نہ مل پائی۔ ناول مجموعی اعتبار سے موضوع اور فن کے حوالے سے بہترین شاہکار ہے۔ پلاٹ مربوط ہے کسی قسم کا کوئی جھول نظر نہیں آتا۔ ناول میں کردار نگاری بھی عمدہ فن کاری کا ثبوت ہے منظر نگاری کی بھی بہترین مثالیں ناول میں موجود ہیں۔غرض ناول ہر اعتبار سے کامیاب نظر آتا ہے۔

(۴) بر فیلے لمحوں کا جنگل:

جان محمد آزاد کا چوتھا اور آخری ناول ہے یہ ناول ۱۹۹۵ء میں پہلی بار شائع ہوا اردو مرکز پبلی کیشنز سرینگر سے یہ طبع ہوا۔اس ناول کا انتساب جان محمد آزاد نے اپنے بچوں ظل ھُما، حنا حجازی اور شاداب اویس کے نام کیا ہے جن کی معصوم مسکراہٹیں ہر بلند و پست میں مصنف کا حوصلہ بڑھاتی رہیں۔ ناول ۱۶۹ صفحات پر مشتمل ہے یہ ناول جاسوسی ہے ابتدائی ناولوں سے اس ناول کا موضوع مختلف ہے ناول میں ایک بین الاقوامی زیر زمین گینگ کی کہانی کو پیش کیا گیا ہے ناول کا مرکزی کردار صنوبر ہے اس گینگ کی سرپرستی صیہونی خفیہ ایجنسی موساد کرتا ہے اس گینگ کا بگ باس کے۔ کے ہے جو ہر وقت لوگوں کی آنکھوں میں دھول جھونکنے میں مہارت رکھتا ہے یہ گینگ اپنی سرگرمیوں کا مرکز کشمیر کے ایک صحت افزا مقام گلمرگ کو بنایا ہے اس جگہ کا انتخاب اس لئے کیا جاتا ہے کہ یہاں دنیا کے مختلف حصوں سے لوگ سیاحت کے لئے آتے ہیں غیر قانونی منشیات کی تجارت اس گینگ کا خاص بزنس ہے۔

موساد نے ایٹمی دھماکہ بنانے کے لئے ایک فارمولے کے لئے ایک سینڈیکیٹ کی خدمات حاصل کیں۔اس فارمولہ کے موجد ڈاکٹر ہنری گولڈ اور ڈاکٹر منیب ہیں ڈاکٹر موساد ہنری موساد کے ہاتھوں بکنے سے انکار کرتا ہے جس کی وجہ سے وہ اپنے افراد خانہ کے ساتھ موت کے گھاٹ اتار دیا جاتا ہے۔

بعد ازاں ڈاکٹر منیب بھی اس فارمولے کو بچانے کے چکر میں جان سے ہاتھ دھو بیٹھتا ہے اب موساد گم شدہ فارمولہ کی تلاش میں گلمرگ میں ہلاکتوں کا سلسلہ شروع کرتی ہے اور انٹرپول کی طرف سے راحیل کو کشمیر روانہ کیا جاتا ہے۔صنوبر اور راحیل کشمیر آنے سے قبل ایک دوسرے کی محبت میں گرفتار ہو جاتے ہیں اور دونوں کی شادی طے ہو جاتی ہے اسی دوران صنوبر کو جینٹ کی طرف سے ایک خط ملتا ہے جس میں وہ صنوبر کے لئے ایک

بڑا راز چھوڑ دیتی ہے اور اس راز کو پانے کے لئے انٹرپول اور بگ باس کافی کوشش کرتے ہیں پھر یہاں جب راحیل انٹرپول کے آفیسر کی حیثیت سے ان سے ملتا ہے تو وہ یہ راز افشا کرتی ہے اور یوں ناول کا اختتام ہوتا ہے جاسوسی ناول ہونے کی وجہ سے ناول میں دلچسپی شروع سے آخر تک قائم رہتی ہے اور قاری کی تشنگی باقی رہتی ہے۔

جان محمد آزاد کے اس ناول کا مرکزی کردار ڈاکٹر منیب کی بیٹی صنوبر ہے جو اپنے وطن سے بہت دور ہوتے ہوئے بھی کشمیر کی محبت اپنے دل میں بسائی ہوئی ہے اور کشمیری طرز زندگی کو ہمیشہ یاد کرتی ہے وہ بناوٹی دنیا میں الجھن اور گھٹن محسوس کرتی ہے مغرب میں پرورش پانے کے باوجود اس نے اپنے آپ کو وہاں کی برائیوں سے دور رکھا تھا۔ وہ شراب، جوا، ڈانس وغیرہ میں حصہ نہیں لیتی تھی اس لئے ہوسٹل کے طلبا اسے ہیولی سنو کہتے تھے۔ وہ بہت ہمت سے اور بہادری سے کام لیتے ہوئے راحیل سے مل کر اس گینگ کا پردہ فاش کرتی ہے۔ جس نے یہاں قتل وغارت کا بازار گرم کیا ہوا تھا۔ وہ کشمیری لڑکیوں کی نمائندگی بھی کرتی ہے جو کشمیر سے باہر رہ کر بھی کشمیری تہذیب وتمدن اور وہاں کی روایات کو بھولتی نہیں۔ صنوبر کا کردار اس ناول میں شروع سے آخر تک متحرک نظر آتا ہے جس کے اردگرد گویا سمٹی ہوئی ہو۔

''برفیلے لمحوں کا جنگل'' ناول میں راحیل کا کردار بھی کافی اہمیت کا حامل ہے۔ کہانی میں صنوبر اور راحیل کا کردار ناول کو فطری انجام کی طرف لے جاتا ہے۔ راحیل اصل انٹرپول میں ایک آفیسر ہے لیکن صحافتی سرگرمیوں میں اس لئے دلچسپی ہے تا کہ عوام میں اعتبار قائم رہے راحیل اور صنوبر دونوں ناول میں بہت اہمیت کے حامل کردار ہیں ان کے علاوہ کے۔ کے بھی ناول کا ایک اہم کردار ہے وہ ایک عام شہری کے روپ میں ایک بڑے گینگ کی سربراہی کرتا ہے۔ کے۔ کے کا مقصد منشیات اور دوسرے کالے دھندوں کو فروغ دینا ہے وہ بے شمار جرائم کا مرتکب ہو چکا ہے جان محمد آزاد نے اس کردار کو تراشنے میں فنی چابکدستی سے کام لیا ہے۔ یہ کردار ایسے لوگوں کی نمائندگی کرتا ہے جو عوام میں ہمیشہ شریف اور ہنس مکھ دکھائی دیتے ہیں۔ لیکن ان کے باطن میں شیطان ہوتا ہے اور ایسے لوگوں کی سماج میں کمی نہیں ہوتی۔ ناول میں کچھ دوسرے کردار بھی کافی اہم ہیں جن میں سارہ، ریگی، شہہ میری، جینٹ، میجر ملکانی ٹریسی وغیرہ شامل ہیں۔

''برفیلے لمحوں کا جنگل'' ناول میں جان محمد آزاد نے موضوع وفن دونوں میں بڑی فنی چابکدستی سے کام

لیا ہے جان محمد آزاد کے اس ناول میں منظر نگاری بھی بہت عمدہ ہے اس ناول میں گلمرگ اور شہر سرینگر میں ڈل جھیل کے عمدہ مناظر پیش کیئے گئے ہیں۔ منظر کشی کی ایک مثال دیکھیں:

''اب ان کا شکارا دریائے جہلم کی طرف بڑھ رہا تھا۔ اس دریا کے دونوں اطراف پر بڑے بڑے ڈونگے ایک دوسرے سے ملے جلے کھڑے تھے ان کے عرشوں پر کشمیری ٹوپیاں اور پھرن پہنے ہانجی چھوٹے چھوٹے حقے گڑگڑا رہے تھے۔ ڈونگوں کی چھوٹی چھوٹی پھونس کی چھتوں کے نیچے ملگجے پھرن اور سستے زیوروں سے لدی پھندی بعض نوجوان عورتیں جہلم میں اپنے بچوں کو نہلا رہی تھیں۔ کہیں کہیں عورتیں اس پانی سے اپنے برتن کھنگال رہی تھیں اور کہیں کہیں گھاٹوں پر خواتین کے بڑے بڑے گروہ اپنے کپڑے دھو رہی تھیں۔ کبھی کسی بڑے سے ڈونگے کے آثار قدیمہ سے ایک ضعیف لڑکی کا چہرہ ابھرتا صنوبر سوچتی کہ کیا ان الف لیلوی تاریک ڈونگوں میں یہ عورتیں سنگدل راجوں کے حصاروں میں عمر قید کی ملزم ہیں۔''[1]

جان محمد آزاد نے منظر کشی میں تقریباً تمام ناولوں میں بڑی فنی مہارت کا ثبوت دیا ہے۔ منظر کشی کے گر سے وہ بخوبی واقف تھے چنانچہ ان کے تمام ناولوں میں منظر کشی کی بہترین مثالیں مل جاتی ہیں۔ منظر نگاری اور مکالمہ نگاری دونوں کی مثال کے لئے ایک اور اقتباس یہاں پیش کیا جاتا ہے ملاحظہ کیجئے:

''ہاؤس بوٹ پانی پر ڈولتا ہوا تھپیڑے کھانے لگا۔ جھیل کے کنارے پر چنار اور سفیدے تیز ہواؤں کے آگے سر جھکا رہے تھے۔ ملہ سلام کہیں دور دوسرے ملاحوں کو زور زور سے آواز دے رہا تھا۔ ''ہو خضرا ہو'' پھر تھوڑی دیر بعد وہ کھانستا ہوا صنوبر کے کمرے کے دروازے پر نمودار ہوا۔

رات میں شاید بڑا آندھی آنے کا چانس ہے مس بابا۔ ہم ہاؤس بوٹ کو مضبوطی سے باندھ رہا ہے۔ ڈونٹ یو وری ملہ سلام اپنے بوٹ کی

---

[1] جان محمد آزاد، بر فیلے لمحوں کا جنگل، ص ۹۶، اردو مرکز پبلی کیشنز، سرینگر، ۱۹۹۵ء

شان رکھنا جانتا ہے یونو۔!

اب پانی کی پھوار تیز ہونے لگی تھی۔ جھیل پر پانی کی بڑی بڑی بوندیں رم جھم گرنے لگیں اور بلبلے اٹھنے لگے۔ رات کا کھانا کھا کر صنوبر نے بوٹ کا ایک چکر لگایا اور بلب گل کر کے کمروں کے کواڑ اور کھڑکیاں بند کرنے لگیں۔ باہر زبردست شور برپا تھا۔ لیکن بوٹ کے اندر رات خاموش اور حیران تھی۔ صنوبر نے ڈائینگ روم کی روشنی بھی آف کر دی۔ اس نے صرف کوٹھری کی لائیٹ جلتی رہنے دی تاکہ بستر میں گھس جانے کے بعد اس مدھم سی روشنی کی دمک نیم کھلے دروازے میں اسے دکھائی دیتی رہے اور اس کی ہمت بندھاتی رہے۔ وہ لحاف اوڑھ کر اپنے بستر میں دبک گئی۔ ڈل کی لہراب پر جھومتے ہوئے ہاؤس بوٹ نے اسے تھپکیاں دے دے کر سلایا۔ وہ سوتی رہی لیکن پھر وہ اچانک بیدار ہو اٹھی اور بستر میں اٹھ کر بیٹھ گئی۔ نہ جانے کس چیز نے اسے گہری نیند سے بیدار کر دیا تھا۔ وہ نیند کے اتھاہ ساگر میں مستغرق تھی۔ لیکن یک بیک اس کی آنکھ کھل گئی وہ رات کے طلسمی سناٹے میں اس سکون کو تلاش کر رہی تھی جو جھیل کی سطح کے بہت نیچے کہیں تہہ نشین ہو گیا تھا۔ تیز ہوائیں اب رک گئیں تھیں تاہم لہروں کا شور اور ہاؤس بوٹ کا دھیرے دھیرے ڈولنا اب بھی باقی تھا۔ صنوبر کو ایسا محسوس ہوا جیسے کوٹھری کی بتی بجھ گئی ہو اور سارا ہاؤس بوٹ مکمل اندھیرے میں ڈوب گیا ہو۔''[1]

مجموعی اعتبار سے جان محمد آزاد کا یہ ناول تمام تر فنی تقاضوں کو پورا کرتا ہے، پلاٹ، کردار نگاری، مکالمہ نگاری، منظر کشی اور اسلوب بیان کی دلکشی کی وجہ سے ناول ''بر فیلے لمحوں کا جنگل'' کی انفرادیت اور اہمیت دوہری ہو جاتی ہے۔ ان کے تقریباً تمام ناول موضوع اور فن دونوں کے اعتبار سے بہترین شاہکار ہیں۔ ریاست جموں و کشمیر میں اردو ناول کا جب جب ذکر ہوگا جان محمد آزاد اور ان کے ناولوں کا ذکر بھی ضرور کیا جائے گا کیونکہ اس کے بغیر ناول نگاری کا ارتقا نامکمل رہے گا۔

---

[1] جان محمد آزاد، بر فیلے لمحوں کا جنگل، ص ۸۱، اردو مرکز پبلی کیشنز، سرینگر، ۱۹۹۵ء

عبدالغنی شیخ

عبدالغنی شیخ کا تعلق ریاست جموں وکشمیر کے خطہ لداخ سے ہے نثر کے حوالے سے ان کا نام کسی تعارف کامحتاج نہیں۔عبدالغنی شیخ ۵ مارچ ۱۹۳۶ءکو پیدا ہوئے۔ان کے دادا انیسویں صدی کے دوسرے نصف میں کشمیر سے لداخ آئے تھے اور لیہہ میں بس گئے تھے۔وہ سرینگر کے گرگڑی محلّہ میں رہتے تھے اور تجارت کے سلسلے میں لداخ آئے تھے۔انہوں نے لیہہ میں مریم نام کی ایک خاتون سے شادی کی۔جن کی والدہ ایک نومسلم بودھ خاتون تھیں۔دادا لداخ میں خاچے ماما ے نام سے مشہور ہوئے۔دادا محمد شیخ نے طویل عمر پائی۔دادا کے انتقال کے وقت ان کے والد کی عمر صرف چھ سال تھی ان کی تین بہنیں بھی تھیں کوئی سرپرست نہیں تھا اس لئے ان کے والد کو بڑے مصائب کا سامنا کرنا پڑا۔والد صاحب زیادہ پڑھے لکھے نہیں تھے۔غالبًا پانچویں جماعت تک ہی پڑھ پائے تھے وہ اردو پڑھ لکھ لیتے تھے۔والدہ بالکل ناخواندہ تھیں۔وہ شام کو جب چراغ روشن کرتیں تو بلاناغہ یہ دعا پڑھتی تھیں۔''**اللہ ربی محمد نبی والاسلام الدین**''یعنی اللہ میرا رب ہے، محمد نبی اور میرا دین اسلام ہے۔والدہ کو یہ دعا والد نے سکھائی تھی اور بتایا تھا کہ مرنے کے بعد قبر میں نکیر ومنکر پہلا سوال یہی کریں گے کہ اس کا مذہب کیا ہے اگر غلط جواب دیا تو غضب ہوگا۔

عبدالغنی کے والد صاحب گرمیوں میں بازار میں چارپائی پر خوبانی اور اور سیب بیچتے تھے۔سردیوں میں سوکھے پھل جیسے سوکھی خوبانی، گری، اخروٹ وغیرہ فروخت کرتے تھے۔غرض مالی حالت بہت خراب تھی ایک مرتبہ مشکل حالات میں والدہ کے سونے کا زیور چالیس روپے میں گروی رکھنا پڑا۔گروی کی رقم ادا نہ کر پانے پر زیور واپس حاصل نہیں کر پایا۔ایک اور مرتبہ عبدالغنی شیخ کے وظیفے کے دس یا پندرہ روپے بہت کام آئے۔تب یہ بہت بڑی رقم تھی ان کے والد زندگی کے آخری سال لیہہ جامع مسجد میں موذن بھی رہے۔عبدالغنی شیخ ابھی بچپن میں ہی تھی کہ والد کا سایہ سر سے اٹھ گیا اور جب گھر کی تمام ذمہ داریاں ان کے کاندھوں پر پڑیں تو وہ فکر معاش میں مبتلا ہو گئے۔اس لئے دسویں کا امتحان پاس کرنے کے بعد ملازمت کے متلاشی ہوئے اور کئی غیر سرکاری

اداروں میں ملازمت کرنے کے بعد سرکاری ملازم ہو گئے۔ گھریلو معاملات کے پیش نظر کسی دور دراز علاقے میں ملازمت کرنا ان کے لئے ممکن نہیں تھا اس لئے بیطار کی حیثیت سے جو ملازمت ملی تھی اس سے استعفیٰ دینا پڑا۔ سرکاری ملازمت سے دست کشی اختیار کئے کچھ ہی عرصہ ہوا تھا کہ لیہہ کے ایک مڈل اسکول میں بحیثیت ہیڈ ماسٹر ان کا تقرر ہوا۔ تعلیم کی اہمیت کا انھیں بے حد خیال اور لگاؤ بھی تھا۔ اس لئے ملازمت کے دوران ہی فاصلاتی نظام تعلیم کے ذریعہ بی اے کی ڈگری حاصل کی اور محکمہ تعلیم میں مزید کچھ مدت کے لئے کام کیا لیکن اس شعبے کو بہت جلد خیر باد کہہ کر محکمہ اطلاعات ونشریات سے وابستہ ہو گئے اور اس میدان میں بھی اپنی صلاحیتوں کا مظاہرہ کیا۔ جس کا اندازہ اس بات سے بخوبی لگایا جا سکتا ہے کہ وہ آل انڈیا ریڈیو کے نامہ نگار ہو کر کئی شہروں کی نمائندگی کرتے رہے۔ بالآخر ریڈیو کشمیر سرینگر اور پھر لیہہ سے منسلک ہو کر سماج و معاشرے کی ترجمانی کرتے رہے اور منصبی مصروفیات کے باوجود بھی اپنی تمام عمر اردو زبان کی آبیاری کے لئے وقف کر دی اور ابھی ان کا تخلیقی سفر جاری ہے۔ عبدالغنی شیخ بیک وقت ایک مورخ، ناول نگار، نقاد اور افسانہ نگار ہیں ان کا شمار ریاست کے ساتھ ساتھ برصغیر کے اہم فکشن نگاروں میں ہوتا ہے۔ عبدالغنی شیخ کی علمی و ادبی کاوشوں کی پذیرائی نہ صرف لداخ بلکہ پوری ریاست کے اہل ذوق طبقوں نے کی۔ ان کی اردو نوازی کا راز اس بات میں بھی مضمر ہے کہ ریاستی سرکار نے ریاست میں اردو اکادمی کے قیام کے سلسلے میں ریاست کے چند نامور ادیبوں کی ایک کمیٹی تشکیل دی تا کہ اس کڑی کو منزل مقصود تک پہنچانے کے لئے اپنے خیال انگیز نظریات پیش کریں۔ دانشوران کی اس جماعت میں عبدالغنی کو بھی ممبر یا رکن ہونے کا شرف حاصل ہے۔ عبدالغنی شیخ نے انسٹی ٹیوٹ آف ماس کمونیکیشن دہلی سے صحافت میں پانچ ماہ کی ٹریننگ بھی حاصل کی۔ انہوں نے کئی بین الاقوامی سیمیناروں میں لداخ کی تاریخ وثقافت وغیرہ پر اپنے مقالے بھی پڑے۔ ان ممالک میں فرانس، انگلینڈ، ترکی، جرمنی، ڈنمارک، برازیل، سنگاپور، پاکستان، ایران، ہالینڈ اور سعودی عرب وغیرہ شامل ہیں۔

عبدالغنی شیخ لداخ خطے میں اردو زبان وادب کو پروان چڑھانے میں نمایاں کارنامے انجام دیتے رہے ہیں انہوں نے لداخ جیسے برفیلے علاقے میں اردو فکشن کو زندہ رکھا اور اپنی کہانیوں میں لداخ کے اطراف میں بکھری ہوئی زندگی اور زندگی سے وابستہ ان گنت واقعات وحالات کو ایک منفرد اسلوب میں سمیٹ کر پیش کیا۔ عبدالغنی شیخ کا پہلا افسانوی مجموعہ ''زوجیلا کے آر پار'' ۱۹۷۵ء میں شائع ہوا۔ اس مجموعے کے ذریعے انھوں

نے پہلی مرتبہ لداخ کے اردو ادب میں ادب برائے زندگی کے تصور کو پیش کیا۔ ان کا یہ مجموعہ اس اعتبار سے بھی اہمیت کا حامل ہے کہ اس سے ان کے ادبی سفر کا آغاز ہوا۔ اس مجموعے کی خوب پذیرائی ہوئی۔ اس کے بعد ان کا پہلا ناول ۱۹۷۷ء میں ''وہ زمانہ'' شائع ہوا۔ اور ۱۹۷۸ء میں ان کا دوسرا ناول ''دل ہی تو ہے'' شائع ہوا۔ ان ناولوں کے علاوہ ان کے اب تک کئی افسانوی مجموعے منظر عام پر آ چکے ہیں۔ ان کی تخلیقات میں لداخ، تہذیب وثقافت، قلم قلم کار اور کتاب اسلام اور سائنس، لداخ محققوں اور سیاحوں کی نظر میں، دو ملک ایک کہانی لداخ کی تاریخ کے اہم گوشے بہت اہمیت کی حامل ہیں۔ ان کی ادبی خدمات پر انہیں کئی مرتبہ انعامات اور اعزازات سے بھی نوازا گیا ہے۔ یہاں ان کے دونوں ناولوں کا ایک تنقیدی جائزہ پیش کیا جا رہا ہے۔

(۱) وہ زمانہ:

عبدالغنی شیخ کا ناول ''وہ زمانہ'' ۱۹۷۷ء میں کشمیر مرکنٹائل پریس سرینگر سے شائع ہوا۔ ناول اپنے موضوع کے اعتبار سے ایک منفرد مقام رکھتا ہے وہ ناول میں لداخ کے رسم ورواج، رہن سہن، تہواروں، میلوں کے بارے میں روشنی ڈالتے ہیں۔ ''وہ زمانہ'' ناول ایک نیم تاریخی ناول ہے اس میں مصنف نے ناول کی کہانی کو تاریخی اعتبار سے بیان کیا ہے مصنف نے لداخ کی پرانی تاریخ کو ناول کا جامہ پہنایا ہے اور اپنی تخلیقی صلاحیتوں سے اس کو ناول کی شکل دی۔ ناول کو پڑھ کر لداخ کی فضا سے قاری بخوبی واقف ہو جاتا ہے جس کی بنیاد حقیقت پر مبنی ہے مصنف اس ناول کے آغاز میں لکھتے ہیں:

> ''وہ زمانہ ایک ناول بھی ہے اور ایک تاریخ بھی جس کی تخلیق میں ذاتی مشاہدات، یاداشتوں اور متعدد لوگوں اور بزرگوں کے احوال بیان کے علاوہ لداخ پر لکھی گئی ۶۴ سے زائد کتابوں سے استفادہ حاصل کیا ہے۔''[۱]

ناول کی کہانی کو مصنف نے صیغہ واحد متکلم میں تاریخی اعتبار سے بیان کیا ہے اس کے مطالعے سے قدیم و جدید لداخ کی تہذیب وتمدن، رہن سہن طرز معاشرت، تعلیم وتربیت وغیرہ سے متعلق پوری جانکاری حاصل ہوتی ہے اس میں لداخ سے بے شمار کرداروں کے ذریعے گذشتہ لداخ کے مختلف اہم اور دلچسپ روپ ملتے ہیں۔ عبدالغنی شیخ اس ناول کے پیش لفظ میں ایک اور جگہ لکھتے ہیں:

---

[۱] وہ زمانہ، از عبدالغنی شیخ، ص ۵، کشمیر مرکنٹائل پریس سرینگر ۱۹۷۷ء

''وہ زمانہ'' جو ایک ناول بھی ہے اور ایک تاریخ بھی جس کی تخلیق میں ذاتی مشاہدات، یادداشتوں اور متعدد لوگوں اور بزرگوں کے احوال بیان کے علاوہ لداخ پر لکھی گئی چونسٹھ سے زائد کتابوں سے استفادہ حاصل کیا گیا ہے۔''[1]

جان محمد آزاد اس ناول سے متعلق یوں لکھتے ہیں:

''اسی دوران آپ کا یہ ناولٹ ''وہ زمانہ'' شائع ہوا جس میں ۱۹۴۷ء سے پہلے کے لداخ کی معاشرتی، ثقافتی اور مجلسی زندگی اور اس کے بعد رونما ہونے والی تبدیلیوں کی جزئیات مزاحیہ اور دلکش پیرائے میں پیش کی گئی ہے۔''[2]

ناول ''وہ زمانہ'' میں لداخ کی تہذیب وتمدن، طرز معاشرت، پکوان لباس، رسم و رواج، میلے، تہواروں، تفریحات اور بدلتی قدروں پر دلکش پیرائے میں روشنی ڈالی گئی ہے اس ناول کو ناول سے زیادہ اگر تاریخ مانا جائے تو بے جا نہ ہوگا کیوں کہ ناول کے مطالعے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس میں لداخ کی تاریخ کو سمو دیا گیا ہے اور ناول کو پڑھتے پڑھتے ہم لداخ کی ایک صدی سے زیادہ مدت کے بدلتے واقعات سے واقف ہو جاتے ہیں ساتھ ہی ساتھ کل اور آج کے لداخ کی بدلتی تصویریں ہمارے ذہن پر چھا جاتی ہیں جنھیں پڑھنے والے کبھی فراموش نہیں کر سکتے۔ اصل میں مصنف تاریخ کو ناول کی شکل میں پیش کر کے کامیابی حاصل کرنا چاہتے تھے کیونکہ تاریخ کم اور فکشن زیادہ پڑھا جاتا ہے انہوں نے اس چیز کو ذہن میں رکھ کر لداخ کی تاریخ کو ناول کی شکل میں پیش کیا۔ ناول کی ابتدا اس اقتباس سے ہوتی ہے:

''یہ اس زمانے کا قصہ ہے جب ہندوستان کو آزاد ہونے میں ایک سال باقی تھا لیہہ میں انگریز جوائنٹ کمشنر آنے والا تھا۔ صبح دس بجے مڈل اسکول کے بچوں نے لیہہ بازار میں مارچ پاسٹ کیا۔ ان بچوں نے

---

[1] عبدالغنی شیخ، وہ زمانہ، ص۳، کشمیر مرکنٹائل پریس سرینگر ۱۹۷۷

[2] شیرازہ، ص۲۰۴، کلچرل اکیڈمی سرینگر ۲۰۰۴ء

خاکی وردیاں پہنیں تھیں۔ ان کے گلے میں سرخ رومال، کندھے پر
سٹک اور پیٹی سے سکاوٹ روپ (Rope) لٹک رہی تھی۔ آگے آگے
بینڈ بج رہا تھا۔ بچوں کی لمبی قطار تھی میں قطار کے آخر میں دو بچوں سے
آگے تھا آخری بچہ غلام محی الدین تھا جو اپنے چھوٹے قد و قامت کے
ناطے فل سٹاپ کہلاتا تھا ہم دونوں تیسری جماعت میں پڑھتے تھے۔''[۱]

مندرجہ بالا اقتباس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ ناول کا آغاز لداخ میں انگریز جوائنٹر کمشنر کے آنے سے ہوتا ہے جو وسط ایشیا کے تجارتی امور کا ناظم ہوتا ہے اور گرمیوں میں لداخ میں تین چار مہینے کے لئے آتا ہے اور سردیوں سے پہلے واپس چلا جاتا ہے ابتدائی چار ابواب میں عبدالغنی شیخ نے جوائنٹ کمشنر کے استقبال اور اس کی تفریح کے لئے دکھائے جانے والے میلوں کا ذکر بڑے خوبصورت انداز میں کیا ہے۔ ایک مثال دیکھیں:

''لیہہ میں استقبالیہ محرابیں کھڑی کی گئی تھیں جن پر اردو اور انگریزی میں
Welcome اور خوش آمدید لکھا تھا دو کانوں پر رنگ برنگی جھالریں لٹک
رہی تھیں اور بازار کی ریتلی مٹی پر چھڑکاؤ کیا گیا تھا۔''[۲]

''وہ زمانہ'' میں جہاں عبدالغنی شیخ نے اپنے گھریلو حالات کا ذکر کیا ہے تو وہاں لیہہ میں تعینات باہر سے آنے والے ملازمین کی مشکلات کا ذکر یوں کیا ہے:

''ان دنوں لداخ آنا ہفت خوان طے کرنے کے مترادف تھا۔ ملازم
اعزاء اور احباب یہ سوچتے تھے کہ وہ اب واپس نہیں آئے گا چنانچہ چند
پنڈت گھرانے پہلے ہی واہ سنکار کی رسم سرانجام دیتے کوئی وصیت نامہ لکھ
کر لداخ جاتا۔ تمام لواحقین اور دوست یار تبدیل ہو کر لداخ جانے
والے ملازم کو رخصت کرنے کے لئے وایول تک جاتے اور روتے پیٹتے
ہوئے خدا کے حوالے کرتے تھے۔''[۳]

---

[۱] عبدالغنی شیخ، وہ زمانہ، ص ۸، کشمیر مرکنٹائل پریس سرینگر ۱۹۷۷

[۲] عبدالغنی شیخ، وہ زمانہ، ص ۱۱، کشمیر مرکنٹائل پریس سرینگر، ۱۹۷۷

[۳] عبدالغنی شیخ۔ وہ زمانہ، میں ص ۱۱۱، کشمیر مرکنٹائل پریس سرینگر ۱۹۷۷

برف پگھلنے اور راستے کھلنے پر مختلف اطراف سے لوگ لداخ پہنچتے تھے۔ان میں یورپی سیاح، وسط ایشیا کے تاجران، پنجابی دکاندار، لداخ تبدیل ہونے والے سرکاری ملازم، یاتری وغیرہ شامل تھے۔ان کے ساتھ ساتھ دور دور سے لداخ کی جھیلوں کی سیر کرنے کے لئے پرندے پہنچ جاتے تھے۔چوتھے باب تک ان سب کا تذکرہ ملتا ہے آگے کے ابواب میں آزادی سے پہلے کی لداخ کی پسماندگی اور معاشرتی زندگی کی تصویر کھینچی گئی ہے جیسے جب لداخ میں سڑک نہیں بنی تھی گاڑی نہیں بنی تھی۔ہوائی جہاز سے لوگ نا آشنا تھے۔ٹارچ اور ریڈیو کا کچھ اتا پتا نہیں تھا جب لوگ توہمات پر یقین رکھتے تھے عبدالغنی شیخ توہمات کے بارے میں یوں لکھتے ہیں:

''وہ لوگ کہتے تھے کہ کبھی فوٹو نہ لینے دو اس سے عمر چھوٹی ہوتی ہے کسی کا سایہ اپنے پر پڑنے دینا بدشگون سمجھا جاتا تھا۔سیڑھی کے نیچے چلنا بدنصیبی سے تعبیر کیا جاتا تھا۔آپس میں بات چیت کرتے دوران منہ پر ہاتھ رکھتے تاکہ دوسرے کی روح جسم میں داخل ہو کر نقصان نہ پہنچائے۔
جسم پر کالا داغ اقبال مندی کی علامت تھی کسی جگہ پاگل ہو تو وہ اس بستی کے لئے فال نیک اور اچھا شگون خیال کیا جاتا تھا۔''[۱]

عبدالغنی شیخ کے اس ناول میں منظر نگاری کے خوبصورت نمونے پیش کئے گئے ہیں مصنف لیہہ کا نقشہ کس خوبصورتی سے کھینچا ہے اقتباس ملاحظہ کیجئے:

''موسم بہار پورے جوبن پر تھا لیہہ کے باغوں میں گلاب، گل لالہ، ڈھیلا، سورج مکھی، سپید کوسموس، ہالو Holy Hock اور گیندے کے پھول کھلے تھے کھیتوں میں سوسن اور تمرس کے سفید اور گلابی پھولوں کی بہار تھی...... پہاڑ، وادیاں اور گھاٹیاں خود رد تارا پھول، قیف نما پیٹونیہ، جنتیانا، بچھو بوٹی، یوروشیا، لیونڈر کی جھاڑیوں اور پیری مولا کے پیلے اور ارغوانی گلابی پھولوں کی خوشبوؤں سے رچی تھیں۔''[۲]

---

[۱] عبدالغنی شیخ۔وہ زمانہ۔کشمیر مرکنٹائل پریس سرینگر ۱۹۷۷

[۲] عبدالغنی شیخ۔وہ زمانہ۔ص ۳۰،کشمیر مرکنٹائل پریس سرینگر ۱۹۷۷

عبدالغنی شیخ نے ''وہ زمانہ'' میں لداخ کے سودخور زمینداروں، سرکاری اہلکاروں اور بارسوخ افراد کا لوگوں پر ظلم وزیادتی کی روداد کی بھی عکاسی کی ہے اس کے ساتھ ساتھ لوگوں کے مشاغل، بچوں کے کھیل کود، میلوں تہواروں کو بھی افسانوی انداز میں پیش کیا ہے عورتوں کے بناؤ سنگھار کا اپنا پیمانہ تھا۔ شیمپو، کریم وغیرہ نہیں تھے عورتیں جڑی بوٹیاں وغیرہ استعمال کرتی تھیں۔

تہواروں میں لداخ میں ''لوسر'' ایک اہم تہوار ہے جو بڑی دھوم دھام سے منایا جاتا ہے اس میں اعلیٰ خاندان کی عورتیں ناچ پیش کرتی ہیں اس کے علاوہ اور تہوارون کا بھی ناول میں ذکر ہے جیسے میلہ، سموچھے، ستورلوق وغیرہ قابل ذکر ہے آزادی کے بعد بدلتے ہوئے لداخ اور مختلف تبدیلیوں کا تذکرہ ہے جیسے ہوائی جہاز کا لداخ میں آنا، گاڑیوں کا چلنا، سکول اور شفاخانے کا قیام، ریڈیو، گیس، سلائی مشین، ٹیلی فون، ٹیلی ویژن، پریشر کوکر وغیرہ کا چلن شامل ہے۔

عبدالغنی شیخ نے ناول کے آخری ابواب میں پرانی اور نئی نسل کے درمیان جنریشن گیپ کو مختلف کرداروں کی معرفت سے اجاگر کیا ہے کہ کس طرح یہ نئے ذہن کے لڑکے اپنے آباواجداد کے راستے سے انحراف کرتے ہیں اور پرانی ڈگر پر چلنا ان کو گوارہ نہیں ہوتا بیرونِ لداخ سے تعلیم حاصل کر کے لداخ آنے والے نئی نسل کے نوجوان کا زاویہ نگاہ بڑوں سے جدا ہوتا ہے دراصل موصوف یہ دکھاتا ہے کہ مغربی تہذیب آج لداخ کی نئی نسل کی زندگی کا حصہ بن چکی ہے۔

ناول کے فن کے حوالے سے بات کریں تو ناول کی زبان عام فہم اور سادہ ہے کہیں مقامی الفاظ کا استعمال بھی ہوا ہے منظر نگاری اعلیٰ پایہ کی ہے مکالمے بھی اس ماحول سے میل کھاتے ہیں اور کرداروں کا انتخاب بھی بڑی ہنرمندی سے کیا ہے مجموعی اعتبار سے ناول ''وہ زمانہ'' اس اعتبار سے نہایت ہی اہمیت کا حامل ہے کیونکہ لداخ کی تاریخ وہاں کی تہذیب وثقافت کو ناول نگار نے بڑی فنی چابکدستی سے ناول کے روپ میں پیش کیا ہے اس طرح ریاست جموں وکشمیر کے اردو ناولوں کی فہرست میں ایک تاریخی ناول کا اضافہ بھی قرار دیا جا سکتا ہے۔

دل ہی تو ہے:

عبدالغنی شیخ کا دوسرا ناول ''دل ہی تو ہے'' ۱۹۷۸ء میں کشمیر مرکنٹائل پریس سرینگر سے ہی شائع ہوا۔

''دل ہی تو ہے'' لیہہ کے پس منظر میں لکھا جانے والا پہلا رومانی ناول ہے خطۂ لداخ کے ننگے پہاڑ اور ریتیلے میدان جو صدیوں سے خاموش اور گم سم تھے۔ اچانک سیاحوں کی آمد سے جاگ اٹھتے ہیں سیاحوں کی آمد سے جہاں متعدد لوگوں کی اقتصادی خوشحالی یقینی بن جاتی ہے۔ وہیں اس سرزمین کے لوگوں کا ذہنی سکون ان کی انفرادیت اور معصومیت مجروح ہونے لگتی ہے جیسے کہ ناول کی ایک کردار مس کارلا کہتی ہے:

''......لیکن بہت جلد آپ لوگوں کو سکون کی تلاش میں چنگ تھنگ اور نو ابرہ جانے کی اجازت پڑے گی۔ لیہہ میں نئی تہذیب اپنی برکتوں کے ساتھ اپنے دامن میں لعنتیں اور مصیبتیں لا رہی ہے۔''[1]

ایک اور جگہ ناول کا ایک کردار یہ خوشخبری اپنے ساتھیوں کو سناتا ہے کہ نوبراہ بھی سیاحوں کے لئے کھل رہا ہے تو ایک سیاہ کہتا ہے:

''سیاحوں کے جانے سے نوبراہ والوں کا سکون ختم ہوگا میں نے سنا ہے کہ نوبراہ کے لوگ بڑے ہشاش بشاش اور زندہ دل قسم کے لوگ ہیں لیکن سیاح ان کی مسرت بھری خلوت کی زندگی میں خلل انداز ہوں گے اور وہ روپیہ کے پھیر میں پڑ جائیں گے۔''[2]

ا اس طرح سے سیاحوں کی آمد سے فائدے کے ساتھ ساتھ جو نقصانات ہو رہے ہیں ان کی طرف بھی قارئین کی توجہ مبذول کرائی گئی ہے اس ناول کا ہیرو سرینگر سے ڈاکٹری کی تعلیم مکمل کر کے جب کچھ دنوں کے لئے لیہہ واپس آتا ہے تو اسے یہاں کی ہر چیز بدلی نظر آتی ہے۔ یہاں ہر ایک شخص غیر ملکی سیاحوں سے زیادہ سے زیادہ پیسہ بٹورنے میں سرگرداں نظر آتا ہے سونم کا چچا سونم کو بھی نتیجہ نکلنے تک ٹورسٹ گائیڈ بنا دیتا ہے۔ اس دوران وہ پدماں سے ملتا ہے جو اس کی بچپن کی ساتھی ہے جو برسوں سے اس کی راہ میں آنکھیں بچھائیں ہوئی ہیں جواب بھی اسے ٹوٹ کر محبت کرتی ہے۔ پدماں سونم کی نس نس میں پیار کی جوت لگاتی ہے گھر والے ان کی شادی کے لئے راضی ہو جاتے ہیں لیکن پھر اچانک مغربی تہذیب کی ایک تتلی نیاں سونم کو اپنے حسن سے ہلا کر

---

[1] عبدالغنی شیخ 'دل ہی تو ہے' ص ۴۰ کشمیر مرکنٹائل پریس سرینگر، ۱۹۷۸

[2] عبدالغنی شیخ۔ دل ہی تو ہے ص۔ ۵۱، کشمیر مرکنٹائل پریس سرینگر ۱۹۷۸

رکھ دیتی ہے سونم پدماں کے خلوص اور وفا کو نظر انداز کر کے نیماں کی طرف بے تحاشہ قدم بڑھاتا ہے لیکن نیماں انجام کار اسے منجدھار میں چھوڑ کر چلی جاتی ہے اور اپنے جذبات پر نادم ہو کر آخر پدماں کے پاؤں میں گر جاتا ہے۔ جان محمد آزاد اس ناول کے متعلق لکھتے ہیں:

> ''یہ ایک سیدھی سادھی کہانی ہے اس کے مفہوم و معانی میں کوئی پیچیدگی یا تہہ داری نہیں۔ رومانی آرزومندی کی یہ کوشش اگرچہ جدید ادبی تقاضوں کے میزان اور معیار پر کھری نہیں اتر سکتی۔ تاہم مصنف نے اپنے ماحول کی جو پرخلوص عکاسی کی ہے وہ لائق ستائش ہے۔''[1]

اس ناول کے متعلق خود عبدالغنی شیخ ناول کے ابتدائی صفحے پر لکھتے ہیں:

> ''۱۹۷۷ کے لیہہ کے ماحول اور یورپی سیاحوں کے پس منظر میں لکھا ہوا ایک دلچسپ رومانی ناول۔''[2]

ناول ''دل ہی تو ہے'' کا پلاٹ مربوط ہے۔ ناول میں پلاٹ، موضوع اور کردار نگاری پر مصنف کی مضبوط گرفت نے اس میں ایک ایسی کشش اور تاثر بھر دیا ہے جو قاری کو ایک لمحے کے لئے بار نہیں گزرتا۔ عبدالغنی شیخ نے ناول کو اپنی فنکارانہ صلاحیتوں سے اس کے واقعات کو ایک لڑی میں پرویا ہے مصنف نے عالمی ادب کے شاہکار ناولوں کا مطالعہ کیا ہے اور ان سے فیض حاصل کیا ہے انھیں پوری طرح اس بات کا احساس تھا کہ پلاٹ ناول کی ریڑھ کی ہڈی ہے یہ نہ ہو تو ناول کی عمارت اٹھ نہیں سکتی۔ اس لئے عبدالغنی شیخ نے اپنے ناول ''دل ہی تو ہے'' کے پلاٹ کو تعمیر کرنے میں اپنی تمام تر فنکارانہ صلاحیتوں کو بروئے کار لایا جس کی عمدہ مثال ہمارے سامنے ہے۔

ناول کے اجزائے ترکیبی میں قصہ اور پلاٹ کے بعد کردار نگاری کو بڑی اہمیت حاصل ہے کردار نگاری کے بغیر نہ کہانی بیان کی جا سکتی ہے اور نہ پلاٹ کی تعمیر ہو سکتی ہے ''دل ہی تو ہے'' تین مرکزی کرداروں پر مبنی ہے سونم، پدماں اور نیماں، جن کے ارد گرد کہانی گھومتی ہے اس کے علاوہ بھی چھوٹے چھوٹے بہت سے کردار ہیں

۱؎ جان محمد آزاد، جموں کشمیر کے اردو مصنفین۔ ص ۲۰۶۔۲۰۵۔ کلچرل اکیڈمی سرینگر ۲۰۰۴

۲؎ عبدالغنی شیخ 'دل ہی تو ہے' کشمیر مرکنٹائل پریس سرینگر، ۱۹۷۸

ناول کے مطالعہ سے یہ اندازہ ہوجاتا ہے کہ ناول کے تمام کردار اپنے مخصوص ماحول اور تہذیب کی نمائندگی کرتے ہیں ناول کا ہیرو سونم اور پدماں اس کی ہیروئن کی شکل میں ہمارے سامنے آجاتے ہیں اور یہ بات عیاں ہوجاتی ہے کہ اس ناول کے تمام کردار شروع سے آخر تک ناول کے کینوس پر بڑی کامیابی کے ساتھ اپنا رول ادا کرتے ہیں اور کہانی کو آگے بڑھانے میں مدد کرتے ہیں ان میں جھول نظر نہیں آتا۔ دراصل مصنف نے جو کردار تراشے ہیں وہ وقت کی کٹھ پتلی نہیں ہیں بلکہ وہ اپنی زندگی خود جی رہے ہیں ان میں کسی قسم کی بناوٹ یا سنگار نہیں ملتا اور یہ کردار حقیقی معلوم ہوتے ہیں ناول میں مکالمہ نگاری بھی بہت اہمیت کی حامل ہے یہ ناول کی کامیابی اور ناکامی کا بڑی حد تک دارومدار ہوتا ہے یہ ناول مکالمہ نگاری کے حوالے سے بھی ایک منفرد ناول ہے مصنف کو مکالمہ نگاری میں بڑی مہارت حاصل ہے سبب یہ ہے کہ ہر طبقے کے لوگوں سے ان کا واسطہ رہا ہے اور اچھی طرح جانتے ہیں کہ کس کردار کی زبان سے کیا مکالمے ادا ہوسکتے ہیں عبدالغنی شیخ انسانی نفسیات سے گہری واقفیت رکھتے ہیں خاص کر نسوانی کرداروں پر ان کی پوری گرفت ہے اور ہر کردار کے منہ سے وہی مکالمہ ادا کرتے ہیں جو اس سے مطابقت رکھتا ہو۔ ایک مثال ملاحظہ کیجئے:

''پدماں مجھے معاف کرو میں تم سے نہیں مل سکا۔

پدماں نے اس کا جواب نہیں دیا

میرے متعلق کچھ غلط فہمی ہو تو وہ دور کرنے آیا ہوں

پداماں میرے سوال کا جواب دو

آپ مجھے میرے حال پہ رہنے دو مجھے سسک سسک کر مرنے دو۔ پدماں بولی۔ اس کی آواز بھرائی ہوئی تھی۔

ایسا نہ کہو پدماں۔ آخر بات کیا ہے؟

''یہ سوال مجھے آپ سے کرنا چاہئے تھا۔''

تم کیا کہنا چاہتی ہو۔

آپ نیماں کے ساتھ کیوں نہیں جاتے؟ کیا آپ کا جی اسے بھر گیا؟

پدماں! میں تسلیم کرتا ہوں میں وقتی طور پر نیماں کے بہت قریب آیا تھا۔ لیکن میں اب اس کو بھول چکا

ہوں وہ اب چلی گئی ہے۔

نیماں چلی گئی ہے لیکن کوئی اور نیماں ہوگی۔کوئی روزی کوئی ہیلن کوئی شمی۔''[۱]

عبدالغنی شیخ کے ہاں اس ناول ''دل ہی تو ہے'' میں منظر کشی کے بہترین نمونے ہیں منظر کشی سے ناول کی دلکشی اور تاثر میں اضافہ ہوجاتا ہے منظر کشی کامیاب ہو تو جھوٹا قصہ بھی سچا لگنے لگتا ہے اس ناول میں عبدالغنی شیخ نے منظر کشی میں اپنی فنی مہارت کا ثبوت دیا ہے لفظوں اور جملوں سے تصویر بنانے میں بڑی مہارت رکھتے ہیں۔پدماں کے گھر کا منظر اس طرح بیان کیا ہے کہ پورا ماحول ہماری نظروں کے سامنے آجاتا ہے۔جیسے

''چھت پر گھاس کے پولے اور اوپلے، نچلی منزل میں بھیڑ بکریاں کے باڑے اور گاؤ خانہ چھوٹا سا آنگن، صاف ستھرے کمرے، گاؤں کا ایک جانا پہچانا گھر ہے باورچی خانہ میں کالک لگے سیاہ طاق پر برتن دیگچے اور رکابیاں قرینے سے سجائی ہیں ننگے فرش پر سبز گھاس کے ایک ٹکڑے پر کلھیا میں لسی رکھی ہے۔جس میں مکھن کا ایک پیڑا تیر رہا ہے چنگیر میں ایک کپڑے میں بھنے ہوئے مٹر کے آٹے سے پکائے گئے تکونے ٹکڑے رکھے ہیں پاس میں ایک ڈبیا میں پیسی ہوئے سرخ مرچ ہے سامنے مٹی کے دو برتن ہیں ایک برتن میں دوائی رکھی ہوئی ہے چھکے میں مکھن کا ایک بڑا ڈالا ہے پرات میں آٹا گوندھا ہوا ہے گھونٹے سے اون کے کاتے ہوئے کئی گولے لٹکے ہوئے ہیں اور ایک تھال میں پونی دھری ہے فرش پر ایک ننھا صحت مند بچہ غوں غوں کر رہا ہے۔''[۲]

منظر کشی کی ایک اور مثال دیکھیں سرزمین لیہہ کا نقشہ کچھ یوں کھینچا ہے۔

''......سفید گری کی خوبانی میں رس اترا تھا اور سیب میں لائی آئی تھی۔

نالے میں پانی کی موجیں حسب معمول چٹانوں سے ٹکراتی، دھاڑتی اور

۱؎ عبدالغنی شیخ، دل ہی تو ہے، ص ۱۲۶،۱۲۵، کشمیر مرکنٹائل پریس سرینگر، ۱۹۷۸ء

۲؎ عبدالغنی شیخ، دل ہی تو ہے، ص ۷۰، کشمیر مرکنٹائل پریس سرینگر، ۱۹۷۸ء

سپید بلبلے پیدا کرتی ہوئی رواں دواں تھیں۔ گندم اور جو کے خوشے گہرے
سنہرے ہو گئے تھے۔ برفانی چوٹیاں دھوپ میں چمک رہی تھیں۔ اگر چہ
برف کی تہہ اب پتلی ہو گئی تھی۔ چشمے پر الھڑ دوشیزائیں گاگر کے حسب
معمول چہلیں کر رہی تھیں۔ اور پد ماں کو چھیڑتی تھیں......،، [۱]

منظر کشی کی ان مثالوں سے واضح ہوتا ہے کہ عبدالغنی شیخ منظر نگاری کے فن سے بخوبی واقف تھے اور بڑی فنی چابکدستی سے ناول میں منظر کشی کی بہترین تصاویر کھینچی ہیں۔

ناول اپنے اسلوب کے اعتبار سے بھی اپنے منفرد پہچان رکھتا ہے ناول کی زبان نہایت عام اور گفتگو کی زبان ہے جو روزمرہ زندگی میں استعمال کی جاتی ہے۔ ان کے تراشے ہوئے جملے اپنے اندر ایک لطف اور نغمگی رکھتے ہیں دراصل عبدالغنی شیخ کے پاس لفظوں کا خزانہ ہے اور جنہیں وہ اچھی طرح استعمال کرنے کا ہنر بھی جانتے ہیں اس ناول کے اسلوب سے ناول نگار کے تخلیقی شعور کی پختگی کا پتہ چلتا ہے وہ جذباتی تقریروں اور رنگین بیان سے گریز کرتے ہیں ناول میں انگریزی ہندی کے علاوہ لداخی الفاظ کا استعمال بھی ہوا ہے جو بولنے والے کرداروں کی شخصیت کے ساتھ ان کی تہذیب اور معاشرت کی عکاسی بھی کرتے ہیں مکالمے مختصر مگر فکر اور جذبے میں ڈوبے ہوئے ہیں۔ مجموعی اعتبار سے ناول اپنے تمام تر فنی تقاضوں کو پورا کرتا ہوا نظر آتا ہے اور عبدالغنی شیخ کا یہ ایک بہترین ناول قرار دیا جا سکتا ہے۔

---

[۱] عبدالغنی شیخ، دل ہی تو ہے ص ۱۱۷ کشمیر مرکنٹائل پریس سرینگر ۱۹۷۸

شبنم قیوم

سرزمین کشمیر سے تعلق رکھنے والا ایک اہم ناول نگار شبنم قیوم بھی ہے شبنم قیوم کا اصل نام عبدالقیوم ریشی ہے ان کی پیدائش ۲ دسمبر ۱۹۳۸ء میں کشمیر کی حسین وادی میں ڈلگیٹ کی زمین پر ہوئی جس کے متعلق عام لوگوں کا خیال ہے کہ یہاں کی آب و ہوا اردو ادب اور شاعری کے لئے نہایت موزوں ہے کیوں کہ کشمیر کے دوسرے علاقوں کے مقابلے ڈلگیٹ نے قلمکاروں کی کثیر تعداد اردو اور کشمیری ادب کو دی ہے اپنے ہم عصر لکھنے والوں میں شبنم قیوم کم تعلیم یافتہ ہے مگر اوروں کی نسبت شبنم قیوم نے بہت زیادہ لکھا ہے ۱۹۵۷ء سے ان کی ادبی تخلیقات کا باقاعدہ آغاز ہوتا ہے اس وقت تک وہ کم و بیش بیس کتابوں کے مصنف ہیں شبنم قیوم ابتدا سے ہی ذہین واقع ہوئے تھے اور ادب سے انھیں بے حد لگاؤ تھا۔ انھوں نے ۱۹۵۱ء میں جامعہ علی گڑھ سے ادیب کا امتحان پاس کیا۔ اس کے بعد ۱۹۵۲ء میں انھیں ریاست کے ڈپٹی پرائم منسٹر بخشی غلام محمد نے گھریلو کام کے لئے اپنے گھر میں رکھا۔ ۱۹۵۷ء میں وہ محکمہ زراعت میں ملازم ہوئے ۱۹۹۶ء میں وہ ملازمت سے سبکدوش ہوئے۔ شبنم قیوم ایک ہمہ جہت شخصیت کے مالک ہیں وہ بیک وقت ناول نگار و افسانہ نگار ہونے کے ساتھ ساتھ ایک اچھے صحافی بھی ہیں وہ مقامی اخبارات میں حالات حاضرہ پر تبصرہ کرتے رہتے ہیں۔ شبنم قیوم اردو افسانہ نگاری کا ایک اہم نام ہے وہ گذشتہ کئی سالوں سے اپنی دلچسپ اور معیاری تخلیقات کے ذریعے قارئین سے خراج تحسین حاصل کر رہے ہیں اس کے علاوہ کشمیر کی سیاسی تاریخ سے انہیں کافی دلچسپی ہے اس سلسلے میں ان کی کتاب ''کشمیر کا سیاسی انقلاب'' کافی اہمیت کی حامل ہے یہ ایک ایسی سیاسی و تاریخی دستاویز ہے جس نے انھیں شہرت بخشی اور قارئین کو حیرت پر وفیسر قدوس جاوید شبنم قیوم کے متعلق لکھتے ہیں:

> ''کشمیر کے منفرد اور معروف فکشن نگار، صحافی اور تاریخ نویس شبنم قیوم کو
> پڑھتے ہوئے اس بات کا خیال رکھنا ضروری ہے کہ شبنم قیوم ایک ایسے
> کہنہ مشق ادیب ہیں جن کا ادب شبنمی نہیں، آتشیں ہوا کرتا ہے، شبنم قیوم کا

ہر تازہ ادبی متن کچھ پرانے اور کچھ نئے زخموں کے بیج بوتا ہے۔''[1]

شبنم قیوم ایک دردمند دل رکھتے ہیں طبیعت سادہ اور معصوم ہے خلوص اور اپنائیت بدرجہ اتم موجود ہے خودداری اور احساس دونوں ہی ہر لمحے اس کے ساتھ ہیں ان کی تخلیقات میں درد اور تڑپ ہے زندگی کی گہرائیوں پر ان کی گہری نظر ہیں فطرت انسانی سے وہ بخوبی واقف ہیں اس لئے کہ انہوں نے زندگی کی تمام تشنگیوں تلخیوں اور زہرناکیوں کو بڑے صبر اور سکون سے اپنے اندر سمولیا ہے وہ انسانیت سے شدید محبت کرتے ہیں انہیں اپنے ماحول کی بے چارگی، بے بسی افلاس اور پریشانی کا شدت سے احساس ہے اور افسردہ ماحول میں وہ اکثر انسانیت کی روح کے متلاشی نظر آتے ہیں اور اس کے لئے اپنی آواز بھی بلند کرتے ہیں۔

شبنم قیوم ایسا فنکار نہیں جن کو یہ فن ورثے میں ملا ہو لیکن ان کے خاندان میں ادیب، شاعر، صحافی اور ڈراما نگار سب ہی موجود ہیں اپنے پرائے لکھنے والوں کو ان کی تعلیم وتحریر دیکھ کر یقیناً حیرت ہوتی ہے یہی حیرت ان کو اس کا رقیب بھی بناتی ہے۔

شبنم قیوم ریاست جموں وکشمیر کے ادبی حلقوں میں ایک بہترین فکشن نگار کی حیثیت سے مشہور ہیں انہوں نے جب ادب کے میدان میں قدم رکھا اس وقت ان کی عمر محض ۱۸ سال تھی۔ اب تک ان کے کئی ناول منظر عام پر آچکے ہیں ان کی ناول نگاری کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ کرداروں سے اعمال کو خیر وشر، نیکی وبدی یا سود وزیاں کے پیمانے سے ناپنے کے قائل نہیں۔ پروفیسر خورشید عالم اپنے ایک مضمون میں لکھتے ہیں:۔

> ''شبنم ہندوستان کا ابھرتا ہوا فنکار ہے۔ ایڈیٹر نگارش امرتسر مہندر باوانے ان کو کشمیر کا اے حمید لکھا ہے ان کے فن کو ایک لمبے عرصے تک نظرانداز کرنے کے بعد خوش قسمتی سے اب کئی جانب سے انہیں سمجھنے کی کوشش کی جارہی ہے اور توقع کی جاتی ہے شبنم قیوم اردو ادب میں جلد ہی وہ مقام حاصل کرے گا جس کا صریحاً طور پر مستحق ہے۔''[2]

---

[1] مشمولہ آزادی کی تلاش، افسانے از شبنم قیوم، ص ۵

[2] پروفیسر خورشید عالم، شبنم قیوم اور اس کا فن مشمولہ ایک زخم اور سہی از شبنم قیوم، ص ۲۴ میزان پبلشرز سرینگر۔ ۲۰۱۵

زندگی اور موت:

شبنم قیوم کا یہ پہلا ناول ہے یہ ناول اس لئے اہم ہے کہ بہت کم عمر میں انہوں نے یہ ناول تخلیق کیا۔ ناول کے متعلق تنقید نگاروں نے اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے جان محمد آزاد کے مطابق یہ ناول جزباتیت اور انقلاب پسند رومانیت کا ایک دلچسپ امتزاج ہے اس ناول کے کرداروں میں غیر معمولی مقصدیت نظر آتی ہے کردار نگاری کے لحاظ سے بھی یہ ناول کامیاب مانا جاتا ہے کرداروں کی داخلی کشمکش نفسیاتی کیفیتوں کے ساتھ قاری کو متاثر کرتی ہے ناقدین کے مطابق یہ ناول زندگی کے مزاج کو سمجھنے کی ایک پر خلوص کوشش ہے، ناول میں جذبات کی گہرائی یقین کی روشنی اور انقلاب پسند رومانیت کے ساتھ ایک دلچسپ ناول ہے۔ پروفیسر خورشید عالم اس ناول کے متعلق لکھتے ہیں:

> ''شبنم قیوم میدان ادب میں اس وقت اترا جب اس کی عمر صرف ۲۰ سال کی تھی۔ ۲۸ سال کی عمر میں اس نے پہلا ناول لکھا ''زندگی اور موت'' اس کا اولین ناول ہے جو جذبات کی گہرائی، یقین کی روشنی اور انقلاب پسند رومانیت کے ساتھ ایک دلچسپ ناول ہے اس ناول کے کرداروں کی غیر معمولی مقصدیت اور ان کا انقلابی جوش وخروش دل پر اثر کئے بغیر نہیں رہتا۔ اس ناول میں اس کے بلند خیالات، اس کے فن کی پختگی خاص طور پر ظاہر ہے بین الاقوامی مسائل میں قومی رنگ کو نبھاتے ہوئے اس نے انسانیت کی بنیادی صلاحیتوں پر نظر رکھی ہے اور ایسے کرداروں کو ابھارا ہے جن کی داخلی کشمکش باریک سے باریک نفسیاتی کیفیتوں کے ساتھ قاری کے سامنے آجاتی ہے۔''[۱]

شبنم قیوم کا چونکہ یہ پہلا ناول ہے اس لئے فنی اعتبار سے یہ ناول اتنا اچھا نہیں ہے لیکن ابتدائی کوشش میں ایسی کمزوریوں کا پایا جانا کوئی مضائقہ نہیں۔ ناول اپنے موضوع کے اعتبار سے نہایت دلچسپ و دلکش ہے قاری اس کو پڑھتے وقت محض ناول کے قصوں میں محدود ہو کر رہ جاتا ہے غرض ناول ''زندگی اور موت'' شبنم قیوم کی پہلی کاوش ہوتے ہوئے بھی کافی حد تک کامیاب نظر آتا ہے۔

---

[۱] پروفیسر خورشید عالم، شبنم قیوم اور اس کا فن مشمولہ ایک زخم اور سہی از شبنم قیوم ص ۱۷ میزان پبلشرز سرینگر ۲۰۱۵

چراغ کا اندھیرا:

شبنم قیوم کا ایک اہم ناولٹ ہے یہ ناولٹ ۱۹۶۹ میں منظر عام پر آیا۔اس ناول میں غنڈہ گردی کے ایسے دور کو موضوع بنایا گیا ہے جب رہبر رہزن بن گئے تھے۔ یہاں انہوں نے اس قسم کے سیاہ کارنامے یا حرکتیں کرنے والے حاکموں اور سیاسی ٹھیکداروں پر ایسی ضربیں لگائی ہیں جن سے قاری متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ ناول اپنے موضوع کے اعتبار سے بالکل منفرد ہے ناول ''چراغ کا اندھیرا'' میں وہ تمام صفات موجود ہیں جو ایک عمدہ اور معیاری ناول کے لئے ضروری تصور کی جاتی ہیں۔تجسس اور سنسنی خیزی، بدی کی ناکامی اور اچھے لوگوں کی فتح اس ناول کا بنیادی موضوع ہے اس ناول کا ہیرو بشیر احمد ہے جو ایک پڑھا لکھا اعلیٰ تعلیم یافتہ نوجوان ہے وہ علی گڑھ سے ایل۔ ایل۔ بی کر کے آیا ہے اس کے باپ کا نام دولت مند ہے اس کے علاوہ وہ ذہین اور خوبصورت بھی ہے۔ وہ بہادر بھی ہے اور غیور بھی۔غرض دنیا جہان کی ساری خوبیاں اس میں موجود ہیں۔ یہ خصوصیات اسے ناول کا ہیرو بناتی ہیں۔ایل ایل بی پاس کرنے کے بعد علی گڑھ جب وہ واپس اپنے گھر آتا ہے تو یہاں پہنچ کر اسے علی گڑھ یونیورسٹی اور شہر کی یادیں ستاتی ہیں وہ علی گڑھ میں گزارے ہوئے دنوں کو چاہ کر بھی نہیں بھلا سکتا۔علی گڑھ کی ہر ایک چیز اسے یاد آ رہی ہے اور وہ بے چین ہو رہا ہے دیکھئے وہ اپنے علی گڑھ کے ایام کو کس طرح بیان کرتا ہے۔

> ''تقریباً آٹھ ماہ پہلے کی بات ہے میں علی گڑھ سے ایل ایل بی کر کے آیا تھا۔ پورے چار سال بعد...... مجھے یہاں آئے ہوئے چند دن ہوئے تھے کہ میں اسی راستے پر آتے ہوئے جس راستے میں اس وقت چل رہا ہوں نہ جانے کیا سوچ رہا تھا۔ان لمحوں میں میں ماضی میں تھا۔اس ماضی میں جس میں میں نے زندگی کا پہلا سفر علی گڑھ تک کیا تھا علی گڑھ کی زندگی، یونیورسٹی اور ہوسٹل کی فضائیں،طلبا کی سوسائٹی شہر کی سڑکیں اور گلیاں سب یاد آ رہی تھیں۔ایسا لگتا تھا یہ سڑک اسی دنیا میں لے جائے گی جس دنیا میں مجھے بہت کچھ ملا ہے۔
>
> یونیورسٹی کی پر وقار عمارت ذہن میں ابھری، ہوسٹل کے کمرے اور دوست

نظر آئے جی چاہتا تھا پھر اسی دنیا میں واپس چلا جاؤں۔ وہ دنیا کتنی رنگین، آزاد اور سادہ تھی کتنی روشن اور دل فریب تھی۔ مجھے وہ دن یاد آیا جس دن پرانے طلبا رخصت ہو رہے تھے اور الوداعی پارٹی میں وائس چانسلر نے تقریر کی تھی۔ وائس چانسلر کا ایک ایک لفظ یاد آ رہا تھا اور سارے جسم میں سرایت کر جاتا تھا۔ ان کی پروقار آواز کانوں میں گونج رہی تھیں۔''[1]

بشیر وائس چانسلر کی تقریر کو یاد کر کے زندگی کی قدروں کے متعلق غور کرنے لگا وہ قانون پڑھ کر لوگوں اور غریبوں کی مدد کرنے کا عزم کرتا ہے وہ ناانصافی کے رینگتے ہوئے سانپوں کو قانون کے اصولوں اور ضابطوں کے تحت کچل دیتا ہے وہ خود کو سماج کا ایک ذمہ دار فرد سمجھنے لگتا ہے لیکن بشیر احمد اس وقت بہت مایوس ہوتا ہے جب اسے پتہ چلتا ہے کہ اس کا اپنا باپ سرکاری خزانے کو لوٹ رہا ہے۔ ایسے محسوس ہوتا ہے کہ وہ جن لوگوں کو سزاوار ٹھہراتا ہے ان میں اس کا باپ بھی شامل ہے اس کے باپ نے غریب عوام کا خون چوس کر دولت جمع کی ہے لوٹی ہوئی دولت سے اس کے باپ نے ایک عالی شان محل تعمیر کروایا ہے بشیر احمد کی شخصیت کی ایک جھلک اس ناول کے ایک اقتباس سے ملاحظہ کیجئے:

''بشیر! اب میں سب کچھ سمجھ گیا ہوں۔ آج میری آنکھیں کھل گئی ہیں۔ آج میرے سامنے اپنے گھر بار کی ٹھاٹھ باٹھ کا راز کھل گیا ہے میں اس جھوٹی آزادی نام نہاد جمہوریت اور غلط سیاست سے واقف ہو چکا ہوں۔ اب تم جیل میں نہیں رہ سکتے جب تک میں تمہیں آزاد کرا کے تمہاری جگہ ان اصلی ڈاکوؤں کو قید نہیں کرواؤں گا۔ میں چین سے نہیں بیٹھوں گا۔''[2]

غرض بشیر اپنے ہی گھر میں بغاوت شروع کرتا ہے جب اس پر یہ راز فاش ہوتا ہے کہ اس کے باپ

[1] شبنم قیوم، چراغ کا اندھیرا ص۔۹ نیو کشمیر پریس سرینگر، ۱۹۶۹

[2] شبنم قیوم، چراغ کا اندھیرا ص ۷۴ نیو کشمیر پریس سرینگر ۱۹۶۹

نے مزدوروں کی تحریک کو کچلنے میں کافی اہم کردار ادا کیا ہے وہ اپنے باپ کی کالی کرتوتوں سے نفرت کرنے لگتا ہے، وہ اپنے اور تمام سرمایہ داروں کو شک کی نگاہوں سے دیکھتا ہے اور انصاف کا متلاشی نظر آتا ہے۔

چراغ کا اندھیرا ناول دراصل ایک بے ایمان باپ اور ذہین وقابل بیٹے کی کشمکش کی کہانی ہے ناول میں باپ سرمایا داروں کی نمائندگی کرتا ہوا نظر آتا ہے۔ وہیں بشیر مزدور طبقے کا ہمدرد اور انقلابی خیالات رکھنے والا طالب علم ہے وہ سرمایہ دارانہ نظام کو مٹانا چاہتا ہے وہ مزدوروں کے انقلاب میں خود بھی حصہ لیتا ہے اور اس کا خواہاں بھی ہے وہ اپنے باپ کو عدالت میں پیش کرنا چاہتا ہے وہ اپنے باپ کو عدالت میں پیش کرنا چاہتا ہے تاکہ اس کی لوٹی ہوئی دولت اور غریبوں مزدوروں پر روار کھے جانے والے ظلم کی سزا ملے۔ اور ان مظلوموں کو وہ انصاف دلا پائے۔ لیکن سرمایہ داروں کی پہنچ بہت دور تک ہوتی ہے ان کی رسائی سرکار اور پولیس تک ہوتی ہے وہ سرکار اور پولیس کو اپنی لونڈی سمجھتے ہیں بشیر کی بات سننے کے لئے کوئی تیار نہیں۔ بشیر کا باپ پہلے اسے اپنے گھر میں سمجھاتا ہے لیکن جب وہ بشیر کو سمجھانے میں ناکام ہوجاتا ہے تو وہ اسے جیل میں قید کروا دیتا ہے ایسے میں بشیر احمد آزادی اور آزادی کے بعد پیدا ہونے والے سرمایہ داروں کو کوستا ہے یہاں ناول میں آزادی کے بعد پیدا ہونے والے واقعات پر طنز کیا گیا ہے:

''اس سرزمین پر تھوک چکنے کے بعد اب میں اس کو ٹھوکر مار کر جا رہا ہوں کیوں کہ انسان نے ترقی کے زینے طے کرتے کرتے اسے ناپاک کر دیا ہے یہاں اس نے ظلم جفا اور بے دردی کے پودے اگائے ہیں یہاں اس نے انصاف سچائی، وفا اور ہمدردی کو مٹا دیا ہے۔

اس سرزمین جس کے ذرے ذرے سے آج مجھے نفرت ہو رہی ہے۔ یہاں چند صاحب اقتدار لوگ سینکڑوں مفلسوں کا خون چوس کر اپنی فتح پر ناز کر رہے ہیں ...... یہاں چند خودغرض مفاد پرست اپنے فائدے کے لئے ہزاروں لوگوں کی روزی کو روند کر بھوکوں مارتے ہیں یہاں چند رشوت خور، بددیانت اور حرام خور اپنی تجوریاں بھرنے کے لئے سینکڑوں لوگوں کی تمناؤں کا گلا گھونٹتے ہیں ...... اس پاپی سرزمین پر کنبہ پروری،

رشوت خوری اور ذخیرہ اندوزی کی انتہا ہورہی ہے۔ یہاں آزادی کو بد
نام کیا جارہا ہے۔ جمہوریت کے پرخچے اڑائے جارہے ہیں سیاست کی
توہین کی جارہی ہے اور یہ سب وہی کررہے ہیں جو اس دیش کی آزادی،
جمہوریت اور سیاست کے مالک بن بیٹھے ہیں۔''[1]

یوں یہ ناول سرمایہ داروں اور مزدور طبقے کی رساکشی اور جدوجہد پر مبنی ہے ناول کا مرکزی کردار بشیر احمد جہاں غریب اور مزدور طبقے کی نمائندگی کرتا ہے وہ ایک مل (Mill) میں کام کرتا ہے لیکن سرکاری افسر اس (Mill) مل کو لوٹنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑتے نوبت یہاں تک پہنچتی ہے کہ مل (Mill) خسارے میں کام کرنے لگتی ہے سرکار اس مل کو بند کرنے کا حکم دیتی ہے مل میں کام کرنے والے ایک ہی رات میں سڑک پر آجاتے ہیں یہ مزدور اس لئے بے روزگار ہوجاتے ہیں کیوں کہ بڑے افسران مل کو لوٹ کر اسے بند کرنے کا فیصلہ کرتے ہیں مزدور احتجاج کرتے ہیں ان کی رہنمائی ان کا ایک مزدور ساتھی بشیر احمد کرتا ہے۔ وہ اجتماع سے مخاطب ہوکر اپنی پوری ٹیم کو سمجھاتا ہے کہ مزدور مزدور ہوتا ہے چاہے وہ مل کا ہو یا فیکٹری کا۔ وہ کہتا ہے اب ہمیں اپنے مطالبے اور اپنے مقاصد کا اعلان کرنا ہے اقتباس دیکھیں:

''بزرگو اور بھائیو!

آج ہم سب مختلف ملوں، کارخانوں اور فیکٹریوں کے مزدور ایک جا جمع ہوئے ہیں ہم سب مزدوروں کا ایک ہی مطالبہ ہے۔ ہمارا مقصد ایک اور پروگرام بھی ایک ہے اس لئے کہ مزدور ایک ہے۔

مزدور مل کا ہو یا فیکٹری کا، مزدور شہر کا ہو کا دیہات کا، مزدور دیس کا ہو یا بدیس کا۔ مزدور مشرق کا ہو یا مغرب کا......مزدور ایک ہے مزدور جاگ اٹھا ہے چاہے وہ ایشیا کا ہو یا رشیا کا......صرف ہم نیند میں پڑے ہوئے ہیں اگر آج ہم اپنے مطالبے اور اپنے مقاصد کا اعلان کریں گے۔ تو آپ دیکھ لیجئے تمام دنیا کے مزدور اس کا لبیک کہیں گے۔ اس دنیا کا معمار

---

[1] شبنم قیوم، چراغ کا اندھیرا، ص ۵۰۔۴۹، نیو کشمیر پریس سرینگر، ۱۹۶۹

ایک مزدور ہے۔اس دھرتی کی ترقی، بہبودی اور خوش حالی مزدور کے
بازؤں سے جنم لیتی ہے اور خود مزدور......صد افسوس ہے اس دیش پر جو
آج بھی ہمیں ذلیل سمجھتی ہے۔آپ لوگ یہ جان لیجئے جب تک دنیا
مزدوروں کی قدر نہیں کرے گی۔دنیا حقیقی خوش حالی سے محروم رہے گی
دنیا میں بعض ملکوں میں آج مزدور کی قدر کی جارہی ہے۔دنیا کے کئی
دیشوں میں آج مزدور اپنی حیثیت کا ڈنکا بجا رہا ہے اور کئی جگہوں پر
مزدور کو قومی نشان بنایا گیا ہے۔''

ناول کے آخر تک بھی مزدوروں کی کوشش کامیاب ثابت نہیں ہوتیں انہیں سیاست داں اور سرمایہ دار طرح طرح سے پھنساتے ہیں۔ان کو اپنے جال میں اس طرح پھنسا دیتے ہیں کہ یہ لوگ یہاں سے چھٹکارا حاصل نہیں کر سکتے ناول کا اختتام بشیر کی تقریر پر ہوتا ہے۔وہ آنے والے وقت میں مزدوروں کو یہ پیغام دیتا ہے کہ اگر چہ ہمارے زمانے میں ملک میں مزدور انقلاب لانے میں کامیاب نہیں ہوئے لیکن ہماری یہ جنگ اور جدوجہد جاری رہے گی۔وہ دن دور نہیں جب سرمایہ داری کا سورج ڈوب جائے گا اس ناول پر ترقی پسند تحریک کا گہرا اثر نظر آتا ہے اس ناول کے ذریعے مزدور طبقے کے لوگوں کے مسائل کی بھرپور عکاسی کی گئی ہے۔فنی اعتبار سے یہ ناول کافی کامیاب نظر آتا ہے ناول میں باپ اور بیٹے کے درمیان ہونے والے مذاکرے کا ایک نقشہ مثال کے لئے یہاں پیش کیا جاتا ہے۔

''میرا خیال تھا میری طرح میرا بیٹا بھی سمجھ دار، ذہین، زمانہ شناس اور
وقت کا قدردان ہوگا مگر آج میں اس کے برعکس دیکھ رہا ہوں کیا میں تم
سے معلوم کرسکتا ہوں اب تک تم نے کیا کچھ پڑھا ہے؟''
''انصاف اور سچائی''
''انصاف اور سچائی ....'' میرے باپ نے طنزیہ مسکراہٹ سے
دہرایا اور وقفہ بھر کے بعد سراپا استفہام بن کر بولا

[1] شبنم قیوم، چراغ کا اندھیرا،ص۸۲۔۸۱۔نیو کشمیر پریس سرینگر ۱۹۶۹

''کیا تم مجھے زمانے کی ڈکشنری میں وقت کے باب میں انصاف اور سچائی کا مفہوم بتا سکتے ہو؟''

میں اسے اس کا کوئی جواب نہیں دے سکا وہ فوراً بولا

''تمہاری خاموشی بتلا رہی ہے تم نے ابھی زمانے کی ڈکشنری وقت کے باب کا مطالعہ ہی نہیں کیا ہے اور جب تم نے اس کا مطالعہ ہی نہیں کیا ہے اور جب تم نے اس کا مطالعہ ہی نہیں کیا تو تم مجھے سچائی اور انصاف کا مفہوم کہاں بتا سکتے ہو......''

دیکھو بیٹا! خالی لکھنے پڑھنے سے کچھ نہیں ہوتا جب تک کہ پڑھا لکھا آدمی زندگی کا تجربہ کار، وقت کا نباض، ماحول کا پروردہ اور زمانہ شناس نہ ہو وہ ایک عالم اپنے آپ کو کہلانے کا ہرگز مستحق نہیں ہے اور اس صورت میں وہ انصاف اور سچائی کا دعویٰ بھی نہیں کرسکتا ہے۔

میں آپ کی یہ فلسفیانہ باتیں بالکل نہیں سمجھ سکا'' میں نے گمبھیر لہجے سے کہا انہوں نے فوراً جواب دیا......''اس لئے کہ تم کنویں کے مینڈک ہو تم میرے اولاد ہو۔ بحیثیت ایک باپ کے جب میں تمہاری سچائی اور انصاف کو دیکھتا ہوں تو میں خوشی سے پھولے نہیں سماتا ہوں مگر بحیثیت ایک آدمی ترقی یافتہ زمانہ کے ایک ایڈوانس آدمی کی حیثیت سے میں تمہاری سچائی اور انصاف کا مذاق اڑا سکتا ہوں میں تمہارے اس خیال پر طنز کرسکتا ہوں'' اتنا کہہ کر وہ خاموش ہوا لیکن جلد ہی بولا

''دیکھو اے نوجوان......! میں تم کو یہ سمجھانا چاہتا ہوں کہ زمانے کی ڈکشنری میں وقت کے باب کی سچائی اور انصاف کا مفہوم کیا ہے؟''

''کیا ہے بتایئے''

''سنئے: انصاف، ظلم اور زبردستی کو کہتے ہیں اور......سچائی دغابازی اور

مکاری کا نام ہے اس لئے اگر تم کو کبھی انصاف کرنا ہوگا تو تم کو پہلے اپنے دل کو سیاہ کرنا پڑے گا۔ اگر کبھی تم کو سچائی دکھائی ہوگی تو تم کو پہلے اپنی آنکھوں پر تاریک پردہ ڈالنا پڑے گا کیوں کہ سیاہی اور تاریکی ہی وہ اندھیرا بنتا ہے جس اندھیرے کا زمانہ اور وقت طلب گار ہے''

''کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ زمانہ اور وقت اس اندھیرے کا طلب گار کب سے رہا ہے؟ میں نے ان سے پوچھا۔ انہوں نے جواب دیا

''جب سے آزادی کا چراغ جمہوریت کی لو سے جلایا گیا''

''مگر چراغ جل کر روشنی دیتا ہے۔ اندھیرا نہیں''

''مگر یہ وہ چراغ نہیں تھا میرے یار......! یہ الہ دین کا چراغ نہیں تھا میں سچ کہتا ہوں ہمیں دھوکہ دیا گیا ہمیں خواہ مخواہ دشوار گزار راہوں پر ڈال دیا گیا ...... ہمیں ناحق دکھ تکلیف اور اذیت پہنچائی گئی اور مصیبتوں پریشانیوں میں ڈال دیا گیا کیوں کہ جب ہم نے کتنی قربانیاں دے کر ہم نے اس چراغ کو حاصل کرلیا تو وہ نقلی چراغ تھا......وہ ایک دھوکا تھا۔''[1]

مندرجہ بالا اقتباس سے جہاں باپ بیٹے کے درمیان ہونے والی بحث کا ذکر ملتا ہے وہاں خوبصورت مکالمہ نگاری کی مثالیں بھی سامنے آتی ہیں اس اقتباس کو یہاں پیش کرنے کا مقصد یہ بھی تھا کہ ناول کا عنوان کیوں 'چراغ کا اندھیرا' قائم کیا گیا مندرجہ بالا اقتباس سے ہمیں یہ باتیں سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔ مجموعی اعتبار سے شبنم قیوم کا یہ ناول اپنے موضوع اور فن دونوں اعتبار سے ایک کامیاب ناول ہے۔

یہ کس کا لہو ہے، کون مرا:

شبنم قیوم کا یہ ناول پہلی مرتبہ جون ۱۹۷۵ء میں زیور طبع سے آراستہ ہو کر منظر عام پر آیا۔ پہلی مرتبہ شانہ ادب سرینگر نے اس ناول کو چھاپا۔ ناول کا انتساب مصنف نے اپنے مادر وطن کے نام کیا ہے جو جنت سے جہنم بنائی گئی مظلوم و محکوم وطن داروں کے نام جو اپنوں کے ظلم و ستم جبر اور تشدد کے نشانہ بنے رہے جو پیار محبت اور

---

[1] شبنم قیوم۔ چراغ کا اندھیرا۔ ص ۶۳، ۶۲، ۶۱، نیو کشمیر پریس سرینگر، ۱۹۶۹ء

اعتماد کا صلہ دکھ درد مصیبت کے طور وصول کر رہے ہیں اپنے نادان ناسمجھ اور بے حس عوام کے نام جو اپنے لئے دودھ پلا کر زہریلے سانپ پالتے ہیں جنھوں نے ہمیشہ ایک ہی بلے میں ہاتھ ڈال کر اپنے لئے زخم لئے۔

شبنم قیوم کا یہ ناول نیم تاریخی اور نیم سیاسی ناول شہرت کی بلندیوں کو چھو گیا ہے شبنم قیوم کا ماننا ہے کہ اس ناول نے مجھے شہرت کے ساتھ دولت بھی دی عزت دی وقار دیا اور یہ ناول ایک طرح سے میری شناخت بن گئی۔ کشمیر کی سیاحت کے پس منظر میں جب یہ ناول پہلی بار چھپ گیا تو سرکار نے اس پر پابندی لگا دی۔ شبنم قیوم کو انڈر گراؤنڈ جانا پڑا اور کچھ مدت کے بعد پولیس کے سامنے سرنڈر کرنا پڑا چونکہ ناول کی پوری کہانی حقیقت پر مبنی تھی لہٰذا عدالت سے بری ہوگئی۔ اس سے ناول کی اتنی ڈیمانڈ بڑھ گئی کہ کشمیر کی ادبی تاریخ میں اس نے اشاعت اور ایڈیشنوں کا ایک ریکارڈ قائم کیا۔ ۲ مہینوں کے اندر اس کی ۲۶ ہزار کی بکری ہوگئی حد تو یہ کہ کتب فروشوں نے اس کو نہ صرف بلیک میں فروخت کیا بلکہ اس کے جعلی ایڈیشن بھی نکالے اس ناول نے یقیناً شہرت کا دام حاصل کر لیا۔ سچ تو یہ ہے کہ اتنے برسوں کے بعد بھی اس کی ڈیمانڈ کم نہ ہوئی۔ ناول کا موضوع کشمیر کی سیاسی تاریخ ہے ناول کا پس منظر ۱۹۴۷ء کے بعد ریاست جموں و کشمیر میں پیدا ہونے والے حالات و واقعات پر مبنی ہے تقسیم کے بعد جہاں ایک طرف پاکستان نے قبائلی فوج کو وادی میں بھیج کر یہاں کی اینٹ سے اینٹ بجا دی تھی تو دوسری طرف مہاراجہ ہری سنگھ اور شیخ محمد عبداللہ کی درخواست پر ہندوستان کی افواج کو قبائلوں کے مقابلے میں صف آرا ہونا پڑا۔ ان حالات میں ریاست کو دونوں ممالک کا قہر دیکھنا پڑا۔ ہندوستان نے اپنی فوجیں اس شرط پر کشمیر روانہ کی تھیں کہ حالات میں بہتری کے ساتھ ہی وہ اپنی فوج کو اپنے ملک واپس بلائیں گے ہندوستان کے پہلے وزیر اعظم جواہر لال نہرو نے کشمیر کے لوگوں سے وعدہ کیا تھا کہ کشمیر کے حالات میں بہتری کے ساتھ ہی یہاں کی عوام سے ان کی مرضی پوچھی جائے گی۔ پنڈت جواہر لال نہرو نے اس بات کا اعلان بھی کیا تھا کہ کشمیری عوام کو اختیار دیا جائے گا کہ وہ ہندوستان میں رہنا پسند کریں گے یا پاکستان میں۔ اس کے علاوہ آزاد رہنے کی بھی ان کے پاس پسند ہوگی۔ لیکن آج تک ایسا ممکن نہ ہوسکا۔ نہ ہندوستان نے اپنی فوجیں واپس بلائیں اور نہ ہی کشمیر کی عوام سے آج تک ان کی مرضی پوچھی گئی نہ پاکستان نے اس حصے سے اپنی فوجیں واپس بلائیں۔ ناول کی ابتدا کیسے ہوتی ہے اس کے لئے ناول کے آغاز کا یہ اقتباس ملاحظہ کیجئے:

''کشمیر جس کا دوسرا نام ریشما ہے۔ طویل بیماری کے بعد وہ صحت یاب

ہورہی ہے لیکن اس کی جوڑ جوڑ میں اب بھی درد ہورہا تھا۔ ناسازگار موسم اس کی صحت پر خاصا اثر ڈال رہا تھا۔ ہوائیں بھی اس بیمار جسم کے ریشے ریشے میں سرایت کرتی جارہی تھیں۔ ملک کے ان بدلتے حالات کا ذمہ دار وہ فسادات کو گردانتی تھی فسادات سارے ملک کو لپیٹ میں لے کر خطرناک صورت اختیار کر کے اس کی پریشانی کا باعث بن رہی تھی۔ وہ دیکھ رہی تھی ابھی بادل چھائے ہوئے تھے ابھی دھوپ نکل آئی ہے۔ ادھر زوروں کی بارش ہورہی ہے۔ ادھر تند و تیز ہوائیں چل رہی ہیں بیک وقت یہ سب کچھ ہورہا ہے۔ اس کے سمجھنے میں ذرا بھی دیر نہیں لگی۔'' [1]

یہ ناول کشمیر میں ۱۹۴۷ء کے بعد سے اب تک جو کشیدگی اور تناؤ جاری ہے اسی پس منظر میں لکھا گیا ہے ناول نگار شبنم قیوم اس سلسلے میں حرف اول میں یوں رقمطراز ہیں:

''یہ ۱۹۴۷ء کی بات ہے برصغیر تقسیم ہو چکا اور تقسیم کے دوران جو کچھ ملک بھر میں رونما ہوا۔ اس سے متاثر ہوئے بنا نہیں رہ سکا۔

تقسیم کا یہ زخم ابھی مندمل بھی نہ ہونے پایا تھا کہ میری اس ریاست پر قبائلوں نے حملہ کر کے یہاں کے امن کو درہم برہم کر دیا۔ قبائلی پٹھانوں کے اس حملے سے اس سرزمین پر جو کچھ ہوا اسے میں نے دیکھا اور محسوس کیا حالانکہ ان دونوں میں بہت چھوٹا تھا جیسا کہ آپ جانتے ہیں ہندوستانی فوج کی آمد پر قبائلی پٹھان یہاں سے بھاگ تو گئے لیکن وہ اپنے ساتھ جو کچھ بھی لے گئے وہ آج بھی ان کے قبضے میں ہے اس طرح برصغیر تقسیم ہونے کے ساتھ میری مادر وطن بھی تقسیم ہوگئی۔ اس کے بھی دو حصے ہوگئے اور یہ دونوں حصے دوسروں کے قبضے میں آگئے اس طرح دونوں پڑوسی مجھے زخمی کر گئے میرے وطن کے ایک خطے کو آزاد کشمیر کا نام

[1] شبنم قیوم۔ یہ کس کا لہو ہے کون مرا، ص ۲۲ کشمیر بک ڈپو سرینگر ۲۰۱۶

دیا گیا جب کہ دوسرا اہم خطہ غلام کشمیر بنایا گیا اس غلام کشمیر کا پہلا عوامی لیڈر شیخ محمد عبداللہ حکمران بنایا گیا اس طرح ریاست پر ہندوستانی حکمرانی کا آغاز ہوا۔ اگست ۱۹۵۳ میں ریاست کے حکمران شیخ محمد عبداللہ کی مخدولی اور گرفتاری نے یہاں کی صورت حال تبدیل کر دی، کٹر ہندوستان یعنی ہندوستان کا وفادار اور ان کے مفادات کا رکھوالا ہندوستان کا مخالف بن گیا۔ ہندوستان ان کا دشمن اور پاکستان دوست بن گیا۔ شیخ محمد عبداللہ نے بدلے کی بھاؤنا وطن کی آزادی کے لئے ہندوستان کے خلاف جہاد کا راستہ اختیار کر لیا۔''

شبنم قیوم کے ناول ''یہ کس کا لہو ہے کون مرا'' کے اس اقتباس سے ناول کے موضوع کا بخوبی علم ہوتا ہے اس کے علاوہ ناول کے آغاز میں موضوع کے عنوان سے جو تحریر ہے اس سے ناول کی کیفیت کا اندازہ اچھی طرح ہو جاتا ہے اقتباس شیخ محمد عبداللہ کی ایک تقریر سے لیا گیا ہے ملاحظہ کیجئے:

''کشمیر کی مثال ایک خوبصورت عورت سے دی جا سکتی ہے جس سے دو آدمی جو ایک دوسرے کے ہمسائے بھی ہیں شادی کرنا چاہتے ہیں۔ اس عشق کی وجہ سے دونوں کے درمیان قتل اور غارت گری کی نوبت آتی رہتی ہے۔ دونوں اس عورت کو حاصل کرنے کے لئے اپنی طرف کھینچ رہے ہیں۔ اس کھینچ تان نے عورت کو آدھ مرا کر دیا ہے ان کے عشق کی وجہ سے کشمیری عوام کی حالت ماہی بے آب کی سی ہوگئی ہے ان دونوں عاشقوں کو کشمیری عوام کی خواہشات کی پرواہ ہے نہ ان کی امنگوں کی کوئی فکر ہے۔ ایک عورت بیک وقت دو خاوندوں کی بیوی نہیں ہو سکتی۔ کشمیر یہ سوچ رہا ہے کہ ہندوستان اور پاکستان کو کیسے راضی رکھا جائے جب کہ اس عشق کی وجہ سے دونوں کا نقصان ہو رہا ہے۔ ان حالات میں ہم بجز

---

[۱] شبنم قیوم۔ یہ کس کا لہو ہے کون مرا ص ۱۰۔۹ کشمیر بک ڈپو سرینگر، ۲۰۱۶

اس کے اور کیا کہہ سکتے ہیں کہ خدارا ہمیں ہمارے حال پر چھوڑ دو۔
آزادی اور خود مختاری ہمارا پیدائشی حق ہے یہ ہمارا نصب العین، ہمارا
ایمان اور اصول ہے۔اس کے حصول کے لئے اگر ہماری جان بھی چلی
جاتی ہے تو ہم ہرگز گریز نہیں کریں گے۔''[1]

ناول کے اس اقتباس سے ناول کے موضوع کا بخوبی علم ہوتا ہے اس ناول کا کردار اشوک ہے، اشوک کا کردار تراش کر مصنف نے ہندوستان کی تصویر کشی کرنے کی کوشش کی ہے اشوک یہاں ہندوستان اور یہاں کی سیاست کی علامت ہے اس کے ساتھ محمود پاکستان کی علامت کے طور پر پیش کیا گیا ہے یہ بھی کافی اہم کردار ہے ان کرداروں کی کشمکش اور رسا کشی پر ناول کی بنیاد قائم ہے اس کے ساتھ شیخ عبداللہ بھی ناول میں اہم کردار ہے جو ریشما کا باپ ہے بعد ازاں ناول رومان اور فکشن کی دنیا سے نکل کر حقیقی دنیا میں داخل ہوتا ہے اب جو کردار نمودار ہوتے ہیں وہ سب حقیقی اور تاریخی ہیں شیخ عبداللہ، بخشی غلام محمد، میر صادق۔

جب ریشما کے باپ کو اپنی غلطی کا احساس ہوتا ہے کہ اس نے اپنی بیٹی کی آزادی صلب کر لی ہے تو وہ اشوک کے سامنے جاتا ہے وہ اشوک سے کہتا ہے کہ ریشما کو اپنے حقیقی پیار محمود کے ساتھ ہی رہنا چاہئے اس میں ریشما کی خوشی بھی ہے اور میری مرضی بھی ہے اشوک یہ باتیں سن کر تلملا اٹھتا ہے وہ ریشما کے باپ کو قید کر لیتا ہے۔وہ ریشما کے ساتھ اپنے ناجائز رشتے کو استوار رکھنے کے لئے ریشما کے قریبی رشتہ داروں بخشی اور صادق کو مراعات اور پیسہ دے کر اپنی طرف کر لیتا ہے شبنم قیوم کے سامنے ناول لکھنے سے زیادہ تاریخ بیان کرنے کا مقصد ہے۔وہ تاریخی واقعات کو من وعن پیش کرنے میں دلچسپی رکھتے ہیں۔اگر چہ یہ ایک حقیقت بھی ہے کہ ناول نگار میں تاریخی واقعات اور حقائق پیش کرنے کی صلاحیت موجود ہے لیکن تخلیقیت کا عنصر بہر حال ضروری ہے۔ناول نگار تاریخ داں نہیں ہوتا کہ وہ تاریخی واقعات بیان کرنے لگے۔ناول نگار کی ذمہ داریاں تاریخ داں سے زیادہ ہوتی ہے۔تاریخی نگاری میں جذبات اور احساسات کی کوئی گنجائش نہیں ہوتی۔ناول میں کرداروں کی داخلی زندگی کو پیش کرنے کی بھر پور گنجائش موجود ہوتی ہے۔اس لئے ناول کا فن کافی دشوار اور مشکل مانا جاتا ہے۔ناول نگار شبنم قیوم اس بات کا اعتراف کرتے ہیں کہ ناول میں شیخ عبداللہ کے بیانات تحریریں، تقریریں

[1] شیخ محمد عبداللہ مشمولہ یہ کس کا لہو ہے کون مرا از شبنم قیوم، ص ۷، کشمیر بک ڈپو سرینگر، ۲۰۱۶

اور انٹرویو وغیرہ کو ترتیب دے کر کتابی صورت دی گئی ہے۔ گو کہ یہ ناول کی سب سے بڑی کمزوری ہے لیکن اس کمزوری کے باوجود یہ ناول ریاست جموں و کشمیر کے ادبی حلقوں میں موضوع بحث بنا رہا۔ حکومت وقت نے اس پر پابندی بھی لگائی اور ناول نگار کو سلاخوں کے پیچھے ڈال دیا۔ لیکن مصنف کے قلم سے نکلے ہوئے الفاظ آزاد رہے۔ شیخ محمد عبداللہ کے زمانے میں ہی یہ ناول شائع ہوا۔ شیخ محمد عبداللہ کو کشمیر کے لوگوں کا بھرپور ساتھ رہا اور ان کی ہر ایک بات پر وہ ایمان لاتے تھے۔ ان کے ہر فیصلے کو یہ صحیح مانتے تھے۔ کشمیری عوام ان کو اپنا عزیز و رہنما مانتے تھے۔ ناول میں کئی جگہ اس بات کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ کس طرح کشمیری عوام میں شیخ عبداللہ مقبول تھے۔ لیکن اس لیڈر نے ان کو ایسے جہنم میں ڈال دیا جہاں سے واپسی کا راستہ ملنا مشکل لگ رہا ہے۔

ناول کی کہانی ریشما کے کردار کے گرد گھومتی ہے ریشما کے ساتھ وہ سارے واقعات رونما ہوتے ہیں جو ۱۹۴۷ کے بعد کشمیر کے ساتھ پیش آئے۔ ہندوستان اور پاکستان کی آزادی کے ساتھ ہی یہ امید بنی تھی کہ اب کشمیر بھی آزاد مملکت بن جائے گا لیکن یہ خواب ادھورا ہی رہا۔ فسادات نے ریشما کی زندگی اجیرن بنا دی ہے ابھی ریشما کچھ سنبھلی تھی کہ محمود جو اسے دل و جان سے چاہتا ہے اور ریشما بھی اس کے ساتھ اپنی زندگی بسر کرنا چاہتی ہے اس مقصد کے لئے محمود قبائلوں کو بھیج دیتا ہے تا کہ وہ ریشما کو حاصل کر سکے۔ ریشما کو محمود کی ادا ایک پل بھی پسند نہ آئی ریشما کا باپ سکتے میں آ گیا کہ کیا کیا جائے ایسے میں وہ اشوک سے مدد مانگتا ہے کہ وہ محمود کے بھیجے ہوئے حملہ آوروں کو یہاں سے نکالنے میں اس کی مدد کرے۔ اشوک ریشما کے باپ کے سامنے یہ شرط رکھتا ہے کہ اگر اس کی شادی ریشما سے کرائی جائے تو وہ میدان میں اتر کر محمود کی قبائلی فوج کو نیست و نابود کر دے گا۔ ایسے میں محمود اور اشوک ریشما کو حاصل کرنے کے لئے پوری کوشش کرتے ہیں ریشما کو جب یہ معلوم ہوتا ہے کہ اشوک اس سے زبردستی شادی کرنا چاہتا ہے تو وہ آپے سے باہر ہو جاتی ہے لیکن اشوک جو کافی طاقتور ہے اس پر ریشما اور اس کے باپ کی باتوں کا کوئی اثر نہیں ہوتا ریشما کا باپ کئی بار ریشما کی مرضی کے خلاف شادی کرنے کو گناہ سمجھتا ہے لیکن ہر وقت اشوک کی دولت اور طاقت کو دیکھ کر اپنے فیصلے بدلتا رہتا ہے یہاں اشوک بھی ریشما کے باپ کی کمزوری کا پورا فائدہ اٹھانے کی کوشش کرتا ہے۔ محمود کی محبت اور اشوک کی قربت جب ریشما کے لئے عذاب کی صورت اختیار کر جاتی ہے تو اس کا باپ پریشان سا ہو جاتا ہے وہ اپنی بیٹی سے کہتا ہے:۔

''دونوں (اشوک اور محمود) تم کو حاصل کرنے کے لئے تم پر اپنا حق

جتاتے ہیں تم کس کو چاہتی ہو اور کس کو نہیں۔ اس کے جاننے کی مجھے کوئی
ضرورت نہیں ہے لیکن ریشما تم سوچ لو جب کسی حسین اور نوجوان لڑکی
کے دو چاہنے والے ہوں اور ان دونوں میں سے ایک بھی پیچھے ہٹنے والا
نہ ہوتو اس صورت میں کیا کیا جا سکتا ہے۔''[1]

ناول میں جہاں ایک طرف شیخ اپنی بیٹی ریشما کا بھروسہ حاصل کرنا چاہتا ہے تو وہاں دوسری طرف وہ اشوک سے کافی مراعات حاصل کرتا ہے۔ ایسے میں ایک باپ اپنے ذاتی فائدہ کی خاطر ریشما کی تقدیر کا فیصلہ اس کی مرضی کے بغیر کر دیتا ہے ناول کے آخر تک ریشما اشوک سے چھٹکارا حاصل کرنے کی کوشش کرتی ہے لیکن پہلے وہ اپنے والد اور بعد میں اپنے بھائی کے لئے مراعات حاصل کرنے کا ذریعہ بنتی ہے۔ جب ریشما اپنے بھائی فاروق سے یہ چاہتی ہے کہ وہ اس کو اشوک کے آہنی ہاتھوں سے آزاد کرائے تو ایسے میں وہ بھڑک جاتا ہے وہ ریشما کو جان سے مارنے کی دھمکی تک دیتا ہے ریشما کو جب یقین ہو جاتا ہے کہ ہر کوئی اسے اپنے ذاتی فائدے اور اقتدار کے لئے استعمال کرنا چاہتا ہے تو وہ خودکشی کر لیتی ہے ریشما کی خودکشی پر ناول کا اختتام ہو جاتا ہے لیکن یہ اختتام نہایت موثر اور بامعنی ہے جہاں ناول نگار قارئین کے لئے ایک پیغام بھی چھوڑتا ہے یہاں ناول کی آخری دو چار سطور رقم کر دیتا ہوں جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ کس طرح ایک عورت کو استعمال میں لانے کے لئے دو لوگ ایڑی چوٹی کا زور لگانے میں ناکام بھی ہوتے ہیں اور ایک اچھی عورت سے محروم بھی ہو جاتے ہیں:

''ریشما! تمہیں یہ تسلیم کرنا پڑے گا، تمہارے سبھی اپنوں نے جن میں سبھی
سرکاری سیاست دان اور کثیر تعداد میں عوام شامل ہیں۔ انہوں نے
تمہیں ایک زندہ لاش بنا رکھا ہے۔ آج تم واقعی ایک زندہ لاش ہو......!
''اتنا کہہ کر ان کا اپنا وجود جس نے سایہ بن کر اسے گود میں لیا تھا غائب
ہو گیا۔
ریشما کے جسم سے نکلا ہوا لہو جو فرش پر پھیل گیا، آج یہ سوال نہیں کر رہا
ہے۔

[1] شبنم قیوم۔ یہ کس کا لہو ہے کون مرا؟، ص ۲۰، کشمیر بک ڈپو سرینگر، ۲۰۱۶

''یہ کس کا لہو ہے کون مرا؟

آج اس نے خود ہی جواب دیا۔

یہ لہو کشمیر کا ہے۔

یہ کشمیر مرا!''[1]

شبنم قیوم کا یہ ناول اپنے تمام تر فنی تقاضوں کو پورا کرتا ہوا نظر آتا ہے موضوع کے حوالے سے تو یہ ایک انفرادی مقام رکھتا ہے موضوع کی جدت کی بنیاد پر یہ ناول بہت تیزی سے فروخت ہوا۔ کشمیر کی تاریخی اور سیاسی سچائی کو ناول نگار نے اپنے ناول میں پیش کر کے ایک اہم کارنامہ انجام دیا ہے۔

---

[1] شبنم قیوم۔ یہ کس کا لہو ہے کون مرا؟، ص ۳۵۷، کشمیر بک ڈپو سرینگر، ۲۰۱۶

نورشاہ

نورشاہ بھی ریاست جموں وکشمیر کے ناول نگاروں میں ایک بڑا نام ہے نورشاہ کا اصلی نام نورمحمد شاہ ہے اور قلمی نام نورشاہ ان کی پیدائش ڈلگیٹ درگہ جن سرینگر کشمیر میں ۹ جولائی ۱۹۳۶ء میں ہوئی۔ نورشاہ نے مقامی اسکولوں سے ابتدائی تعلیم حاصل کی اور بی۔ اے کی ڈگری بھی کشمیر سے حاصل کی۔ نورشاہ اپنی قابلیت کی بنیاد پر اہم سرکاری عہدوں پر فائز رہے۔ نورشاہ ابتداء میں شاہدہ شریں کے نام سے لکھتے تھے بعد میں نورشاہ قلمی نام اختیار کیا۔ انہوں نے افسانے لکھ کر ادبی دنیا میں قدم رکھا اور اب تک مسلسل لکھ رہے ہیں اس کے علاوہ وہ ناول نگار کی حیثیت سے بھی بہت اہمیت کے حامل ہیں انہیں فکشن اور شاعری کے علاوہ تحقیق وتنقید میں بھی کافی دلچسپی ہے اس کے علاوہ ریاست جموں وکشمیر میں ایک بہترین نقاش ومصور بھی مانے جاتے ہیں ان کے افسانوں میں رومانی اور جمالیاتی پہلوؤں کا اثر صاف دکھائی دیتا ہے ان کے افسانے ریاست کے اندر اور باہر مقبول جرائد میں شائع ہوتے رہتے ہیں۔ افسانوں کے علاوہ نورشاہ نے ناول نگاری میں اہم کارنامہ انجام دیا۔ اردو ادب کو کئی عمدہ ناول فراہم کیے ان کے ناولوں میں ''نیلی جھیل کالے سائے''، ''پائل کے زخم'' اور ''قفس اداس ہے''، ''آؤ سو جائیں''، ''لمحے اور زنجیریں'' (تین ناولٹ) بہت مشہور ہیں۔ لیکن ان کے ابتدائی دو ناول تلاش بسیار کے باوجود نہیں مل پائے شاید زمانے کی دست برد سے تلف ہو گئے ہوں کیوں کشمیر ایسی صورتحال سے آئے دن دوچار ہوتا رہتا ہے۔

نورشاہ کو ان کی ادبی تخلیقات اور دیگر کارناموں پر مختلف انعامات واعزازات سے نوازا جاتا رہا ہے افسانوی مجموعے پر بیسٹ بک ایوارڈ، ہرمکھ لٹریری ایوارڈ جموں وکشمیر اردو اکادمی ایوارڈ، وفا فاؤنڈیشن ایوارڈ، ڈاکٹر برج پریمی لٹریری ایوارڈ، ڈاکٹر سی۔ ایل گپتا لٹریری ایوارڈ، اردو فاؤنڈیشن ممبئی ایوارڈ، کرشن چندر ایوارڈ، بخشی میموریل ایوارڈ وغیرہ جیسے بے شمار انعامات حاصل کر چکے ہیں۔ نورشاہ کی پیدائش ایسے علاقے میں ہوئی جو ایک ادبی گہوارہ ہے۔ نورشاہ کا تخلیقی سفر ایک افسانے سے شروع ہوا۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر شمع افروز زیدی کا یہ

اقتباس ملاحظہ کیجئے:

''نور شاہ سرینگر میں پیدا ہوئے۔ کشمیر کی خوبصورت وادیوں میں کھیل کود کر جوانی کی منزلیں طے کرنے سے قبل کہانیاں بننے لگے۔ یہاں تک کہ ان کے اس شوق نے جنون کی کیفیت اختیار کر لی۔ عمر بڑھنے کے ساتھ مزاج میں پختگی آتی گئی، ساتھ ہی فن میں بھی نکھار آتا رہا اور جب نور شاہ کو یقین ہو گیا کہ وہ کہانی کہنے کے فن سے کسی حد تک واقف ہو چکے ہیں تو پہلی کہانی ''گلاب کا پھول'' ماہنامہ بیسویں صدی میں اشاعت کے لیے بھجوا دی۔ حسن اتفاق کہ کہانی شائع بھی ہو گئی۔ بس پھر کیا تھا ان کے شوق کو مزید جلا ملی اور یوں وہ کہانیاں لکھنے لگے۔ پھر ان کا قلم ایسا رواں ہوا کہ آج تک نئے نئے فن پارے تخلیق کر رہا ہے۔''۱

ایک اور جگہ شرافت حسین ان کی ادبی مسافت کے متعلق لکھتے ہیں:

''نور شاہ کی ادبی مسافت نے انہیں نت نئے تجربوں سے روشناس کرایا ہے انہوں نے اپنی تخلیقات کے لیے بگڑتے سماج سے زیادہ تر مواد حاصل کیا ہے۔ آس پاس پھیلی برائیوں سے پیدا شدہ اضطراب، انتشار، خود غرضی اور بے حسی کو اپنی کہانیوں کا محور بنایا۔ ظاہر ہے ایک سچا فنکار سب کچھ دیکھتے ہوئے آنکھوں پر ہتھیلی رکھ کر ان دیکھی نہیں کر سکتا۔ بھلے ہی اس کے قلم کو گستاخ کا نام دیا جائے۔ نور شاہ ایسے ماحول کے پروردہ ہیں جہاں سیدھے سادے لوگ ٹیڑھے میڑھے راستوں کا انتخاب کرتے ہیں اور اوبڑ کھابڑ زمین پر اپنی پریشانیاں کندھوں پر اٹھائے دوڑے رہتے ہیں۔ نور شاہ نے انہیں دیکھا ہے۔ ان کی خامیوں کی نشاندہی بھی کی ہے لیکن یہ معصوم لوگ شاید اشاروں کی زبان نہیں سمجھتے۔''۲

---

۱ نور شاہ ایک عہد ساز شخصیت، ڈاکٹر شمع افروز زیدی، مشمولہ نور شاہ، فکر اور فکشن، از محمد اقبال لون، ص ۹۷، میزان پبلیکیشنز، ۲۰۱۷ء

۱ نور شاہ فکشن کی عہد آفرین شخصیت، شرافت حسین، مشمولہ نور شاہ فکر اور فکشن از محمد اقبال لون، ص ۱۴۷، میزان پبلیکیشنز سرینگر، ۲۰۱۷ء

نور شاہ ریاست جموں وکشمیر کے فکشن نگاروں میں ایک اہم اور معتبر نام ہے۔ جہاں نور شاہ بحیثیت افسانہ نگار ہندو پاک میں اپنا ایک مقام رکھتے ہیں اور اب تک آٹھ افسانوی مجموعے منظر عام پر آ چکے ہیں وہیں ناول نگاری میں بھی انہوں نے اہم تخلیقات پیش کیں ہیں۔ ہندو پاک کے اکثر ناقدین و محققین نے ان کے فن کی انفرادیت کو سراہا ہے۔

جیسا کہ پہلے ذکر کیا جا چکا ہے کہ ان کے ابتدائی دو ناول اب دستیاب نہیں ہیں لہٰذا ان کے تیسرے ناول ''قفس اداس ہے'' سے ہم ان کی ناول نگاری پر بات شروع کرتے ہیں۔

قفس اداس ہے:

قفس اداس ہے وادی کے معتبر فکشن نگار جناب نور شاہ کے زور قلم کا نتیجہ ہے نور شاہ فن کی ماروائی کرشمہ سازیوں پر بھروسہ رکھتے ہیں اور زندگی وسماج کے تمام مسائل کا حل بھی فن ہی میں ڈھونڈتے ہیں۔ انہیں اس بات کا کامل یقین ہے کہ خصوصاً فنون لطیفہ انسانی زندگی کے بے شمار مسائل کا حل ہیں نور شاہ ترقی پسند تحریک سے لکھ رہے ہیں اور وہ ادب کے بدلتے رجحانات سے پوری طرح واقف ہیں انہوں نے ترقی پسند کے عروج و زوال کو دیکھا بھی ہے جیا بھی ہے اور برتا بھی ہے۔ جدیدیت کی گھن گرج کو انہوں نے محسوس بھی کیا ہے اور اظہار ذات کے لئے بروئے کار بھی لایا ہے۔ آج جب مابعد جدیدیت کا دور دورہ ہے نور شاہ اپنے تخلیقی سفر کو اب تک مسلسل جاری رکھے ہوئے ہیں۔ ناولٹ ''قفس اداس ہے'' نور شاہ کا ایک بہترین شاہکار ہے نور شاہ کے اس ناولٹ کے متعلق ڈاکٹر مشتاق احمد وانی اپنے ایک مضمون میں لکھتے ہیں:۔

> ''قفس اداس ہے'' ان کا ایک ایسا ناول ہے جس میں انھوں نے سلونی جس کا دوسرا نام صنوبر ہے ناول میں مرکزی کردار کی حیثیت رکھتی ہے۔ رقص کی شوقین ہوتی ہے لیکن یہی رقص اسے تباہی کے دہانے میں پہنچا دیتا ہے ایک فوجی مداح پریم کے عشق میں اس طرح گرفتار ہو جاتی ہے کہ اپنے والدین کو چھوڑ کر ایک نئی دنیا بساتی ہے۔''[1]

---

[1] جموں وکشمیر میں معاصر اردو ناول۔ ڈاکٹر مشتاق احمد وانی، مشمولہ سہ ماہی دربھنگہ ٹائمز ص ۳۴، دربھنگہ ٹائمز پبلیکیشنز، جنوری تا مارچ۔ ۲۰۱۸

قفس اداس ہے کا مرکزی کردار سلونی اسکول جانے والی ایک ایسی لڑکی ہے جو بچپن کی سرحد اور نو جوانی کی دہلیز پر کھڑی ہے اس کی ماں میریا اسے گھر کے ایک خاص کمرے سے دور رکھتی ہے جس میں اس کی خالہ صنوبر کی یادگار چیزیں رکھی ہوئیں ہیں صنوبر جو سلونی کی خالہ ہے بچپن میں بہت خوبصورت رقص کرتی تھی۔ جوان ہو کر وہ پوری طرح رقص میں گم ہوئی۔ وہ رقص کے فن کو قدرت کی ایک عظیم نعمت سمجھتی تھی۔ ایک ایسی نعمت جو کسی کسی بندے کو نصیب ہوتی ہے اس کا ماننا تھا کہ دنیا فن اور فنکار کو قدر کی نگاہ سے دیکھتی ہے اس لئے فنکار کو چاہئے کہ فن کے اظہار میں کسی طرح کے بخل سے کام نہ لے۔ اس کے گھر کے افراد اس کے نظریے کے خلاف تھے وہ سمجھتے تھے کہ رقص کرنا شرفاء کی شان کے منافی ہے لہٰذا صنوبر کو اس سے دور رہنا چاہئے۔ ایک مقامی ہوٹل کا مالک شام کو صنوبر کو اپنے ہوٹل میں رقص کرنے کی پیش کش کرتا ہے صنوبر یہ پیشکش پیسے کی خاطر نہیں بلکہ اپنے فن کے مظاہرے کی خاطر قبول کرتی ہے اس طرح وہ گھر والوں کی مرضی کے خلاف نکل پڑتی ہے اور نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ پورا گھر ایک بڑے حزینہ میں گھر جاتا ہے۔ صنوبر اپنے ایک مداح فوجی پریتم کے عشق میں گرفتار ہو کر سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر ایک نئی دنیا بسانے کی خاطر شہر چھوڑ کر چلی جاتی ہے یہ سب باتیں سلونی کو اس کی ماں کی غیر موجودگی میں ممنوع کمرے (جہاں جانے سے سلونی کو منع کیا گیا تھا) میں رکھی ایک ڈائری سے پتہ چلتی ہیں سلونی بھی یہ جان کر اپنی خالہ کی طرح اپنے اندر رقص کرنے کی خواہش محسوس کرتی ہے چنانچہ وہ بھی اپنے خالہ کے نقش قدم پر چل پڑتی ہے اور کچھ ہی دنوں میں اپنے اسکول اور پھر کالج میں ایک بہترین رقاصہ کے طور پر شہرت پاتی ہے۔ جب سلونی من ہی من میں رقص کرنے کی خواہش ظاہر کرتی ہے اس کو نور شاہ نے یوں پیش کیا ہے:

> ''ہائے میں رقص کر سکتی ہوں۔ میں بھی ناچ سکتی ہوں۔ میرے پاؤں کی جنبش پازیب کو جھنکار دے سکتی ہے۔ میرے بازوؤں کی محرابیں زندگی کے ان تصورات پر جھک سکتی ہیں لیکن ماں آجائے گی۔ ماں آجائے گی کوئی دیکھ لے گا اور پھر......؟ سلونی نے جلدی سے کپڑے اتار دیئے اور کمرے کو بند کر کے باہر آ گئی۔ چابیاں جہاں سے اٹھائیں وہیں رکھ دیں۔ اپنی پیشانی سے پسینہ پونچھا جیسے سچ مچ اس سے کوئی گناہ سرزد ہو گیا ہو''[1]

[1] نور شاہ۔ قفس اداس ہے مشمولہ شیرازہ ہم عصر ناولٹ نمبر ص۔۱۳۲۔ جنوری تا مارچ ۲۰۱۶

سلونی اس کے بعد جب ایک مرتبہ کالج کے ایک پروگرام میں رقص کرتی ہے تب اس کی ممی بھی اتفاق سے اس پروگرام میں شریک ہوتی ہے اور جب سلونی کو رقص کے لئے اسٹیج سیکٹری اسٹیج پر بلاتا ہے تو ماں اتنا سنتے ہی اپنے کانوں میں انگلیاں رکھ کر کان بند کر لیتی ہے تاکہ وہ کچھ اور نہ سن پائے اس وقت سلونی رقص کرتی ہے اس وقت سلونی کی ماں کے دل میں ایک آگ لگی ہوتی ہے یہ آگ ایسی جیسے رقص کی پوری محفل کو جلا دے گی سلونی کی ماں جب گھر جا کر صنوبر کے کمرے میں سارا سامان دیکھتی ہے تو وہ صنوبر کا لباس وہاں نہیں پاتی تو سلونی کا انتظار کرنے کے لئے دروازے پر کھڑی رہتی ہے سلونی کے آنے پر اسے ڈرا دھمکا کر اسے کالج سے ہمیشہ سے دور کر لیا جاتا ہے اور صنوبر کا کمرہ بالکل لاک کر دیا جاتا ہے لیکن سلونی کی خواہشات اور اس کے جذبات اسے حرکت کرنے کے لئے بار بار آمادہ کرتے ہیں چنانچہ وہ آخری بار اپنی ممی کے نام خط لکھتی ہے کہ میں اب آپ سے دور ہو رہی ہوں ہمیشہ کے لئے میں نے آنٹی کے گھر کا پتہ لے لیا ہے میں وہاں جا رہی ہوں۔ سلونی کی ممی کو جب یہ خط ملتا ہے تب سلونی ممبئی کی راہ پر نکل چکی ہوتی ہے ممبئی پہنچ کر جب سلونی کو آنٹی کے خط میں موجود پتہ پر آنٹی کے ہونے کا کوئی سراغ نہیں ملتا تو وہ بے چین ہو جاتی ہے وہ ہوٹل میں ٹھہرنے کے لئے انتظام کرتی ہے اور کئی بار یہ سوچتی ہے کہ یہ بہت بڑا شہر ہے یہاں سب اجنبی ہیں اس کے دل سے آواز آتی ہے کہ اسے واپس چلے جانا چاہئے انہیں خیال وگمان میں تھی کہ ایک بڑھیا سے یہ پتہ چلتا ہے کہ صنوبر اور اس کے شوہر اور بچے سب آسام چلے گئے ہیں اب وہ اور بھی پریشان ہوتی ہے ہوٹل کے مالک کو پتہ چلتا ہے کہ سلونی کے پاس پیسہ نہیں تو وہ اسے انورادھا ہوٹل نوکری دلانے لے جاتا ہے سلونی وہاں رقص کرتی ہے اور مختلف قسم کے لوگوں کی توجہ اپنی طرف مبذول کراتی ہے کچھ دنوں بعد سلونی کو یہ احساس ہوتا ہے کہ لوگ ''ہوٹل انورادھا'' میں اس کے فن کی قدر دانی کے لئے نہیں بلکہ اس کی جسمانی خوبصورتی کو دیکھنے کے لئے آتے ہیں وہ یہاں مایوس ہوتی ہے میرے فن کا کوئی قدر دان نہیں بلکہ اپنی حوس کا نشانہ بنانا چاہتے ہیں لیکن اب سلونی زندگی کے جس موڑ پر آ گئی تھی وہاں سے واپسی کے سارے راستے بند ہو گئے تھے۔ سلونی اس مایوسی کے عالم میں یوں کہتی ہے:

''یہاں آ کر مجھے کیا ملا۔ گھورتی ہوئی نگاہیں جن میں اشارے پوشیدہ ہیں
مسکراتے ہوئے لب جن میں پیغام بکھرتے ہیں۔ ان اشاروں اور ان

پیغاموں میں میرے فن کی کوئی قدر نہیں۔ یہ اشارے اور یہ پیغام میرے جسم کے لئے ہیں۔ میری جوانی کے لئے ہیں ...... کاش کوئی میری روح میں اترنے کی کوشش کرتا ...... کاش میں نے رحمان دادا کی بات مان لی ہوتی اس وقت کچھ بھی نہ بگڑا تھا۔''[1]

رحمان دادا اس ہوٹل کا مالک تھا جو اسے اپنے گھر جانے کی صلاح دیتا ہے لیکن سلونی نہیں مانتی تو وہ اسے انورادھا ہوٹل میں نوکری پر لگوا دیتا ہے دھیرے دھیرے سلونی پر اس دنیا کی اصلیت کھلتی گئی اس نے دیکھا کہ انسان اپنے چہرے پر کئی چہرے لگائے پھرتا ہے خوبصورت چہرے اور خوبصورت لباس والے لوگ اندر سے کتنے بدصورت ہوتے ہیں۔

سلونی کو ایک اور فنکار منوہر کی شکل میں ملتا ہے جو فلموں کے لئے گیت لکھ کر اپنا مقدر آزمانے کے لئے ممبئی آیا تھا۔ منوہر سلونی کو سیڑھی بنا کر کامیابی حاصل کرنا چاہتا تھا منوہر سلونی کے فلیٹ میں آکر رہنے لگا اور سلونی نے اسے سب کچھ حوالے کر دیا لیکن سلونی نے جب ایک دن اپنے کانوں سے سنا کہ منوہر آگے بڑھنے کے لئے ایک پروڈیوسر کے ہاتھ سلونی کو سونپنے کے لئے تیار ہو گیا ہے اس کی دنیا لرزہ براندام ہوئی۔ اسے احساس ہوا کہ پھول کی پیاس تیزاب سے بجھائی گئی ہے سلونی ہوٹل انورادھا میں اس طرح رقص کرنے لگی گویا وہ اپنے فن سے اپنی زندگی کا انتقام لے رہی تھی۔ رقص کرتے کرتے بالآخر وہ فرش پر گر پڑتی ہے اور جب نرسنگ ہوم میں اپنی آنکھ کھولی تو اس کا حمل گر چکا تھا۔ ہوٹل انورادھا کے مالک مسٹر کھنہ نے معدے کی بیماری لکھوا کر کیس رفع دفع کیا۔ ڈاکٹروں نے اعلان کیا کہ سلونی اب آگے کبھی رقص نہیں کر پائے گی کیوں کہ فرش پر گرنے سے اس کی ٹانگ کی ہڈی میں خرابی پیدا ہو چکی ہے اس کے بعد مسٹر کھنہ جسے سلونی ہمیشہ خراب سمجھتی تھی آج ایک ہمدرد کی شکل میں سامنے کھڑا تھا مسٹر کھنہ نے سلونی سے شادی کرنے کی خواہش ظاہر کی۔ اس نے سلونی کو بتایا کہ اس کی بیوی انورادھا بچے کو جنم دیتے ہی اس دنیا سے چلی گئی اور وہ چاہتی ہے کہ سلونی اس کی جگہ لے لے۔ سلونی جواب میں کہتی ہے:

''ہاں میں جانتی ہوں کہ اب وہ میری زندگی میں دوبارہ نہیں آئے گا۔

---

[1] نور شاہ۔ قفس اداس ہے مشمولہ شیرازہ ص ۱۶۰۔ ۱۵۹۔ جنوری تا مارچ ۲۰۱۶

میں آنے بھی نہ دوں گا۔ وہ میرے لئے اور میں اس کے لئے مر چکی ہوں
لیکن محبت تو نہیں مرتی، محبت تو امر ہے......''
''نہیں میں اپنے وطن لوٹ جاؤں گی جس مٹی نے مجھے جنم دیا وہ مٹی بلا
رہی ہے جن گلیوں میں میرا بچپن گزرا ہے۔ ان گلیوں کو میرے پاؤں کی
آہٹ کا انتظار ہے وہ میری اپنی مٹی ہے وہ مجھے گھر سے بے گھر ہوتے
نہیں دیکھ سکتی۔''[۱]

اس ناولٹ میں ناولٹ نگار جہاں ایک طرف انسان کے اندر چھپے حیوانی خصائل سامنے لاتا ہے وہیں عشق، محبت اور انسان دوستی جیسے لطیف احساسات و جذبات کے لافانی اور ابدی خصائص کی وکالت بھی کرتا ہے اس پورے ناولٹ کی فضا حقیقت اور تخیل کے بیچ معلق نظر آتی ہے ناول نگار مرکزی کردار کا اپنی ماں کے مقابلے میں اپنی خالہ کی راہ پر چل نکلنے کا کوئی مضبوط جواز پیش کرنے سے قاصر رہا ہے۔ ابتدا میں ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ناول نگار سلونی کے من میں پیدا ہونے والی خواہشوں اور امنگوں کا جواز کسی نفسیاتی یا وارثتی پس منظر میں پیش کرنے کی کوشش کر رہا ہے لیکن جلد ہی قاری اس خوش فہمی سے باہر نکل آتا ہے۔ کہانی کے کئی واقعات میں اچانک پن نظر آتا ہے جس سے کہیں کہیں پلاٹ میں جھول پیدا ہو گیا ہے۔ کئی کردار اضافی معلوم ہوتے ہیں جنہیں ناول نگار کچھ دیر تک بلا جواز کہانی کے ساتھ ساتھ کھینچ رہا ہے۔ مثال کے طور پر ہوٹل انورادھا کے مالک مسٹر کھنہ کا کردار غیر ضروری معلوم ہوتا ہے۔ یہ کردار آخر پر کچھ حرکت کرتا دکھائی آتا ہے لیکن اس کی حرکات یا افعال کہانی میں غیر ضروری پیوند سے زیادہ کوئی اور تاثر پیدا نہیں کر سکتے ہیں۔

میریا اور صنوبر جیسے قارئین کے لیے عیسائی کرداروں کا نقش چھوڑتے ہیں تو وہیں پریتم اور کھنہ ہندو کرداروں کی شبیہ بناتے ہیں اس طرح ذیلی کرداروں کے نام بھی قارئین کے ذہنوں میں کسی مخصوص معاشرے کا نقش اتارنے میں ناکام ثابت ہوتے ہیں۔ کچھ خوبیوں اور کچھ خامیوں سے بھرپور یہ ناول اپنے موضوع کے اعتبار سے بہت دلچسپ ہے کیونکہ رقص کرنے والی سلونی جس کے ساتھ جنسی استحصال بھی ہوتا ہے لیکن وہ اپنی جیت کو اپنے فن میں آخر دم تک تلاشتی نظر آتی ہے اور مختلف کامیابیوں کے پس پشت ناکامی اس کے پیچھے چلتی

[۱] نور شاہ۔ قفس اداس ہے، مشمولہ شیرازہ ہم عصر ناولٹ نمبر ۳، ۱۷۔۲، ۱۷۔ جنوری تا مارچ ۲۰۱۶

رہتی ہے اور بالآخر وہ ممبئ سے رقص کی محفلیں ترک کر کے گھر جانے کا ارادہ کر لیتی ہے اور اس طرح ناول ختم ہوتا ہے لیکن قاری کی تشنگی باقی رہ جاتی ہے۔

آؤ سو جائیں:

اس ناولٹ میں مصنف نے جنسی ونفسیاتی خواہشات کے ساتھ ساتھ کشمیر کی نیم تاریخ کو بھی علامتوں اور اشاروں کے تحت بیان کیا ہے اس ناولٹ میں عشق ومحبت کے قصے، احباب کے بچھڑنے کا غم اور کشمیر کی عوام پر ہوئے ظلم وستم وغیرہ جیسے چھوٹے چھوٹے واقعات کا بیان ملتا ہے اور واقعات کے علاوہ کشمیر لیڈروں پر طنز، فرقہ پرستوں سے دور رہنے کا سبق، حب الوطنی کا جذبہ اور آپسی بھائی چارے کا پیغام بھی ملتا ہے اس کے علاوہ اس ناولٹ میں ایک ایسی عورت کے کردار کی نقاب کشائی کی گئی ہے جس کی زندگی کا کوئی اصول نہیں ہوتا۔ ہر ایک سے دوستی کرنا اور پھر ان کے ساتھ بیٹھ کر شراب پینا اس کا خاصہ ہوتا ہے مصنف نے اس کے کردار کی عکاسی بڑے خوبصورت انداز سے کی ہے۔ قاری اس ناول کے مطالعے سے یہ سبق حاصل کر سکتا ہے کہ بدکردار عورتوں سے دور رہنا چاہئے جن سے معاشرے پر برا اثر پڑتا ہے اس ناولٹ میں نفسیاتی پیچ وخم کو ایسے پیش کیا گیا ہے کہ قاری مسحور ہو کر تخیلی دنیا کی سیر کرتا ہے۔ نور شاہ کے اس ناولٹ کے متعلق ماہنامہ ''شاعر'' کے مدیر اعجاز صدیقی رقمطراز ہیں اس سے ان کے فن کو سمجھنے میں بھی مدد ملتی ہے۔ ملاحظہ کیجیے:

> ''نور شاہ کی تحریروں میں زخم خوردہ دلوں کی دھڑکنیں ملتی ہیں، انداز بیان میں جو شگفتگی رچاؤ اور موسیقی ہے وہ کچھ تو حیات پرور پہاڑی وادیوں کی عظمت وجلال کی دین ہیں اور کچھ اپنے ماحول اور طبقے کی رہین منت، نور شاہ بطور کہانی کار مقبول ومعروف ہیں۔ نور شاہ کی تحریروں میں شعور و فکر کی اکثر مثالیں ملتی ہیں۔ زبان واسلوب فنکارانہ اور شاعرانہ ہے ''آؤ سو جائیں'' جہاں ایک لمحے کی کہانی ہے وہیں ایک یگ کی کہانی بھی ہے اس ناولٹ میں نور شاہ نے ایک خاص ماحول اور اس ماحول میں رہنے والے کرداروں کی نقاب کشائی اپنے منفرد ڈھنگ سے کی ہے۔''[1]

[1] نور شاہ کے تین ناولٹ، رؤف راحت، ص ۶۳، میزان پبلیشرز سرینگر، ۲۰۰۹ء

یہ ناولٹ اپنی فنی خصوصیات کے اعتبار سے ایک بہترین ناولٹ ہے پلاٹ ہو یا کردار مکالمہ نویسی ہو یا منظر کشی ہر اعتبار سے ایک کامیاب ناولٹ ہے۔ منظر کشی کی ایک مثال دیکھیں:

''سمے اور جل نے مل کر ٹنگمرگ کو تراشا ہے ایک طرف دیوار اور چیڑ کے درخت، چنار کے پتوں کا لال رنگ، کھیتوں میں اناج کی سنہری بالیاں اور دوسری جانب یخ ٹھنڈا جل، دور دور تک بہتا ہوا پانی، رنگوں کے نئے روپ کے لئے ہی شاید راشد نے ٹنگمرگ میں مکان بنا لیا ہے کیونکہ یہاں سے لال نارنجی رنگ زوجی لا چوٹی پر بکھرے نظر آتے ہیں اور پھر یہاں کی پچکاریاں کی ہوں یہاں چڑیوں کے راگ سے رات گا اٹھتی ہے پانی کی آواز سے ندی نالے گنگناتے ہیں اشٹابری کی خوشبو میں ڈوبی ہوئی دھوپ کس قدر صحت مند ہے...... اسی ماحول میں راشد کا مکان ٹنگمرگ کی وسعتوں میں کھڑا ہے۔ اکیلا تنہا...... جیسے میں۔ میری زندگی۔ میرا جیون۔''[1]

ناولٹ کا اختتام کچھ یوں ہوتا ہے آخری اقتباس ہے:

''میں ایک ویران سی گلی میں ہانپ رہا ہوں!

میرے بالکل سامنے ایک مکان کا دروازہ اچانک کھل گیا ہے اور دروازے میں کھڑی ایک لڑکی میری طرف دیکھ رہی ہے۔ اجنبی سا چہرہ۔ اجنبی سی آنکھیں اور ان آنکھوں سے پھوٹتی ہوئی مدھم مدھم سی روشنی سے میری ضمیر کی تاریکی دور ہونے لگی ہے۔ میں آگے بڑھ رہا ہوں۔ لڑکی دروازے سے ہٹ رہی ہے جانے اس کا کیا نام ہے......شاہدہ، نیلما، اوما، کوثر...... میں آگے بڑھ رہا ہوں...... اور آگے......!! لڑکی سامنے ہے!

[1] نور شاہ کے تین ناولٹ، رؤف راحت، ص ۷۶، میزان پبلیشرز سرینگر، ۲۰۰۹ء

میں......میرے قدم لڑکھڑا رہے ہیں۔

اور پھر......زور سے دروازہ بند کرتا ہوں!!!''[1]

نورشاہ نے ناولٹ میں کرداروں کا خارجی اور باطنی دنیا کو کبھی براہ راست اور کبھی بلا واسطہ طور پر بڑی باریک بینی سے پیش کیا ہے نورشاہ کا اسلوب اکثر ایک دلکش استعاراتی فضا کی تشکیل بھی کرتا ہے جوان کے مخصوص رومانی مزاج سے ہم آہنگ ہے۔

لمحے اور زنجیریں:

لمحے اور زنجیریں بھی نورشاہ کا ایک مختصر ناولٹ ہے ناول نگار نے اس ناول کے ذریعے معاشرے میں پائی جانے والی ایسی برائیوں اور خامیوں کو اجاگر کیا ہے کہ جن سے ہندوستانی تہذیب و معاشرت کی توہین ہوتی ہے قارئین کو ان برائیوں سے بچانے کے لئے اور خامیوں کو دور کرنے کا سبق ملتا ہے یہ ناولٹ بھی جنسی موضوعات پر مبنی ہے اس ناولٹ کے دونوں مرکزی کردار الگ الگ شادی شدہ ہونے کے باوجود ایک دوسرے سے مسلسل ناجائز تعلقات بنائے رکھتے ہیں تاج کی خاطر اختر اپنے اہل وعیال سے بھی دور ہو جاتا ہے لیکن جب تاج اختر کو چھوڑ کر کسی اور سے جنسی تعلقات بنا لیتی ہے تو اس وقت اختر پچھتاتا ہے اختر اپنی بیوی سلمیٰ کو اس یقین سے طلاق دے دیتا ہے کہ اب میں تاج کو ہی اپنی شریک حیات بنایا ہوا ہوں وہ میرا ساتھ دے گی لیکن آگے چل کر تاج میر صاحب نامی ایک شخص سے تعلقات قائم کر لیتی ہے اور اختر سے منہ موڑ لیتی ہے اختر کو جب اس پر شک ہونے لگا تو اس نے تاج کی گھر میں غیر موجودگی پر کمرے کا جائزہ لیا تو معلوم ہوا تاج نے وہ تمام خطوط جو اختر کو لکھے تھے اور وہ تمام تصاویریں بھی جن میں تاج اور اختر ساتھ ساتھ تھے تاج نے اٹیچی سے نکال لیں تھیں یہ سب دیکھ کر جب اختر سے برداشت نہ ہوا تو تاج سے مخاطب ہو کر کہنے لگا کہ میں دیکھ رہا ہوں تم......اختر کے اس جملے پر تاج کچھ یوں چلاتی ہے اور اختر کا ہاتھ اٹھتا ہے۔ دیکھئے اقتباس:۔

''تم سے دیکھا نہیں جاتا تو یہاں سے چلے کیوں نہیں جاتے اس نے میری بات کاٹ کر کہا میرا ہاتھ اٹھا تاج فرش پر گر پڑی ایک ہنگامہ بپا ہوا۔ اسی ہنگامے میں تاج کی آواز صاف صاف سنائی دے رہی تھی

---

[1] نورشاہ کے تین ناولٹ، رؤف راحت، ص ۱۶۰، میزان پبلیشرز سرینگر، ۲۰۰۹ء

''نکل جاؤ یہاں سے۔ چلے جاؤ۔''[1]

آخر میں اختر بتا تا ہے کہ یہ سب خواب تھا جو میں آٹھ برس سوتے جاگتے دیکھا جس نے میری زندگی کا سارا سکون میری زندگی کی ساری شانتی چھین لی انہیں سبھی خوابوں کا منظر آنکھوں کے سامنے تھا کہ اچانک نیند سے بیدار ہوتا ہے ماں کے دو نرم نرم شفقت والے ہاتھوں کو اپنے کندھوں پر محسوس کیا اور اپنی ماں سے لپٹ گیا اختر کی مان کی آنکھوں میں بھی آنسو تھے۔ اب بھی کچھ نہیں بگڑا میرے بیٹے۔ اپنے بیٹے کو اپنا لو اور اسے اپنے گھر لے آؤ۔ جب ماں اختر سے یہ کہتی ہے تو اختر شرمندگی سے یوں کہتا ہے:۔

''میرا بیٹا۔ میرا اپنا بیٹا مجھ سے پوچھے گا'' پاپا تم نے ممی کو گھر سے کیوں بے گھر کر دیا۔ کیوں اسے طلاق دی۔ تو میں اس کا کیا جواب دوں گا میرے پاس تو اس کے کسی سوال کا کوئی جواب نہیں!!''[2]

نورشاہ کے تینوں ناولٹ میں قصہ، پلاٹ، کردار نگاری مکالمہ نگاری منظر کشی اور زبان و بیان کا استعمال بڑی فنی چابکدستی سے کیا گیا ہے نورشاہ کے ہاں واقعات کا بہاؤ کسی رخنہ کے بغیر آگے بڑھتا ہے۔ واقعات جس طرح اپنی راہِ حسین بناتے ہیں اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ فنکار ان تجربات سے بخوبی واقفیت رکھتا ہے اور انہیں تحریر کرتا جا رہا ہے حقیقت پسندی نورشاہ میں پائی جاتی ہے انھوں نے حقیقت کے ان عوامل کو بڑی باریکی سے ناولٹ کا جامہ پہنا دیا ہے۔ کردار نگاری کی بات کی جائے تو نورشاہ کے ناولٹوں میں کردار نگاری بھی اعلیٰ درجہ کی ہے سب کرداروں کو مصنف نے مکمل فنی سانچے میں ڈھال کر پیش کرنے کی سعی کی ہے طرح طرح کے کرداروں کے باوجود ایک دوسرے کو ہر لحاظ سے الگ رکھا ہے۔ ان کرداروں کی سخت گیری ان کے مترجم آمیز حالات اور زندگی کے متعلق ان کا رویہ عبرت آمیز ہے اور سبق آموز بھی ہے ان کے کردار اپنے معاشرتی اور خاندانی پس منظر کے لحاظ سے اپنی اپنی زبانیں استعمال کرتے ہیں غرض نورشاہ کے تمام ناولٹ اپنے موضوع اور فن دونوں کے اعتبار سے بہترین اور معیاری ناولٹ ہیں لیکن مجھے افسوس ہے کہ ان کے زندہ ہوتے ہوئے ان کی تخلیقات ان کے پاس سے بھی میسر نہ ہو پائی۔ ابتدائی دو ناول جو نایاب ہیں وہ نہ ملنا میرے لئے مایوس کن بات ہے۔ بہر حال نورشاہ کا نام فکشن نگار کی حیثیت سے اردو ادب میں ہمیشہ زندہ جاوید رہے گا۔

---

[1] نورشاہ کے تین ناولٹ۔ رؤف راحت ص ۱۹۲۔ میزان پبلشرز سرینگر، ۲۰۰۹

[2] نورشاہ کے تین ناولٹ رؤف راحت ص ۱۹۳۔ میزان پبلشرز سرینگر ۲۰۰۹ء

زینت فردوس

جموں وکشمیر کی خواتین ناول نگاروں میں ایک نام زینت فردوس کا بھی ہے زینت کا تعلق بنیادی طور پر کشمیر سے لیکن ازدواجی زندگی میں شامل ہونے کے بعد وہ جموں میں قیام پذیر تھیں۔ زینت نے افسانہ اور شاعری کے علاوہ ناول بھی لکھے ہیں ان کا ناول ''نئی سحر'' ۱۹۷۷ میں مگھرمل باغ سرینگر کشمیر سے شائع ہوا۔ ناول کا انتساب مصنفہ نے اپنی ماں کے نام اور سچے ادیبوں کے نام کیا ہے ناول کے علاوہ زینت کا ایک افسانہ گھرائی شائع ہو چکا ہے جس کے متعلق مصنفہ ناول کے ابتدا میں لکھتی ہیں:۔

''اس سے بیشتر میری کتاب ''گھرائی جو مختصر افسانوں پر مبنی ہے منظر عام پر آ چکی ہے جس میں ۵۶ افسانے ہیں وہ جن حضرات نے پڑھی میں ان کی بھی شکرگزار ہوں کہ ان میں سے بہتوں نے اپنے زریں خیالات سے نوازا ہے۔''[۱]

زینت فردوس اپنے ناول کے متعلق بھی ناول کے آغاز میں یوں رقمطراز ہیں:۔

''میرے خیال میں ہر انسان کا کوئی نہ کوئی شوق ہوتا ہے وہی شوق زیست کے لئے مسرت کا باعث بھی ہوتا ہے، جو ذہن جذبۂ شوق سے خالی ہیں میں سوچتی ہوں۔ وہ کیا کرتے ہوں گے جن حضرات سے میری ملاقات ہوتی ہے میں دیکھتی ہوں، ان میں سے بہت سے اپنے اپنے شوق میں کچھ نہ کچھ کرتے رہتے ہیں کچھ کرنا ہی زندگی ہے اور وہ کرنا دوسروں کے لئے فائدہ مند ہونا چاہئے ورنہ ہمارے اور حیوانوں میں کچھ فرق نظر نہ آئے۔ بس اس طرح شروع شروع میں تو میں نے لکھنا ایک

---

[۱] زینت فردوس۔ نئی سحر۔ ص۔ ۸، مگھرمل باغ سرینگر کشمیر، ۱۹۷۷

شوق ہی سمجھا۔ اور لکھتی رہی۔ اب یہ شوق زندگی بن کے رہ گیا ہے مختلف خیال ذہن میں گھومتے پھرتے نظر آتے ہیں ان خیالوں میں یہ ناول بھی شامل ہے کئی بار چاہا لکھوں۔ مگر جذبۂ شوق ذہن پر طاری رہا۔ چنانچہ نئی سحر لکھنا ہی پڑا اس ناول میں جتنے بھی جذبات، احساسات، خیالات ہیں یہ سب مجھے اپنی قوم سے، اپنے ملک سے حاصل ہوئے۔ سب سے زیادہ ان میں میری والدہ ماجدہ صاحبہ کا ہاتھ موجزن ہے۔''[1]

زینت فردوس نے ناول افسانہ اور شاعری غرض ہر میدان میں اپنی کوشش سے بھر پور طبع آزمائی کی اور کافی حد تک کامیاب بھی ہوئی۔ ریاست جموں وکشمیر کی خواتین قلمکاروں میں ایک بڑا نام ہے زینت فردوس کا ہے اردو میں ہی نہیں پہاڑی زبان وادب پر بھی بہت بڑا احسان ہے انہوں نے اردو کے علاوہ پہاڑی میں بھی شاعری کی۔ زینت فردوس کا انتقال ۱۵ اپریل ۲۰۱۴ کو جموں میں ہوا اس طرح یہ ادبی چراغ ہمیشہ کے بجھ گیا۔

نئی سحر:

زینت فردوس کا یہ ناول اپنے موضوع کے اعتبار سے بہت اہمیت کا حامل ہے ناول کا موضوع انسانیت اور اتحاد کے اقدار کا اظہار کرتا ہے انسان دوستی، تفریق کا خاتمہ، دوستی، محبت، اخوت، بھائی چارہ، آپسی میل جول اور ایک دوسرے کو برداشت کرنے کی قوت کی بہترین مثالیں ناول میں پیش کی ہیں اس ناول میں بار ہا ایسے واقعات رونما ہوئے ہیں جن سے ہمارے جذبات کی تطہیر ہوتی ہے۔ چاہے وہ اشوک کا جمیلہ کی خاطر اپنا سب کچھ قربان کرنا یا پھر جاوید کا اشوک کے لئے اپنا گھر بار چھوڑ دینا ناول میں اشوک اور جمیلہ مرکزی کردار ہیں جو شروع سے آخر تک متحرک نظر آتے ہیں اور پوری کہانی انھیں دو کرداروں کے گرد گھومتی ہے اشوک اور جمیلہ ایک ساتھ پلے بڑے ہیں دونوں کی تعلیم ایک ساتھ ہوتی ہے کالج اسکول ایک ساتھ آنا جانا بھی ہے دونوں کافی ذہین ہیں جمیلہ اپنی ماں کے ساتھ رہتی ہے ایم۔ اے کرنے کے بعد جمیلہ کی ماں کو اس کی شادی کی فکر دامن گیر ہوتی ہے ایسی صورتحال میں اشوک جمیلہ کے لئے ایک قابل اور ذہین لڑکے زاہد کا رشتہ لے کر ان کے گھر آتا ہے بڑی دھوم دھام کے ساتھ جمیلہ کی شادی زاہد کے ساتھ ہو جاتی ہے شادی کی پوری ذمہ داری

[1] زینت فردوس نئی سحر، ص۔ ٦۔ ۵، مگھرمل باغ سرینگر کشمیر ۱۹۷۷

اشوک اٹھاتا ہے وہی شادی کے تمام کام انجام دیتا ہے جمیلہ شادی کے بعد اپنے شوہر زاہد سے مشورہ کر کے اشوک کی شادی رانی سے کرا دیتی ہے ادھر زاہد کے ہاں جمیلہ کے بطن سے ایک خوبصورت بیٹی جنم لیتی ہے لیکن بد قسمتی سے زاہد اور جمیلہ کی ایک حادثہ میں موت ہو جاتی ہے۔ وہ اپنی معصوم بیٹی روبی جس کا اصل نام شکیلہ ہے کو اشوک کے حوالے کرتے ہیں اشوک روبی کی پرورش کی ذمہ داری لیتا ہے اور اس کی پرورش بالکل حقیقی اولاد کی طرح کرتا ہے۔ اقتباس ملاحظہ کیجئے:

''بیٹے! شکیلہ خود بھی ایک لکھ پتی باپ کی بیٹی ہے۔ مگر میری تمام جائداد کی بھی وہی واحد مالک ہے۔ بیٹا میں ہندو ہوں کیوں کہ میں نے ہندو گھرانے میں جنم لیا ہوگا۔ شکیلہ مسلمان ہے کیوں کہ اس نے مسلمان گھرانے میں آنکھ کھولی۔ مگر جہاں تک مری فکر اور تجربہ کی بات ہے یہاں نہ کوئی ہندو ہے نہ مسلمان، صرف وہی مذہب میرے نزدیک اونچا ہے جو انسانیت کی قدروں سے آشنا ہو چاہے وہ ہندو ہو، مسلمان ہو، سکھ ہو یا عیسائی۔ بہرحال زمانے کی روش کو سامنے رکھتے ہوئے شکیلہ بیٹی کو میں نے سب طور طریقے مسلمان مذہب کے مطابق سکھائے ہیں۔ مولوی صاحب گھر پر آتے ہیں وہ شکیلہ کو اسلامی تعلیمات سے واقف کراتے ہیں تا کہ وہ اپنے دین سے پورے طور آگاہی پائے۔ یہی وجہ ہے کہ میرے گھر میں اگر مندر ہے تو مسجد بھی ہے جسے عبادت گاہ کہتے ہیں بھگوان کی کرپا سے میری بچی اپنے مذہب سے اچھی طرح روشناس ہے میرے گھر کی مسجد میں مولوی الٰہی بخش رہتے ہیں تم ان سے میری ان باتوں کے بارے میں پوچھ سکتے ہو کہ وہ کس حد سچ ہیں۔''[1]

اس اقتباس سے یہ واضح ہوتا ہے کہ وہ کتنی ایمانداری اور نیک نیتی کے ساتھ اس بچی کی پرورش کے ساتھ اسے اسلامی علوم سے بہرہ ور بھی کرتا تھا۔ لیکن یہ ناول اہم اور دلچسپ موڑ پر اس وقت آتا ہے کہ جب

[1] زینت فردوس۔ نئی سحر، ص۔ ۵۷، مگھرمل باغ سرینگر کشمیر، ۱۹۷۷

روبی کی شادی کی فکر اشوک کو لاحق ہوتی ہے روبی اب جوان ہے لیکن کوئی بھی اس ہندو گھرانے میں پرورش پانے والی لڑکی سے رشتہ کرنے کے لئے تیار نہیں ہے اقتباس دیکھیں:

''چوں کہ روبی (شکیلہ) جوان تھی۔اس لئے اشوک اور اس کی بیوی رانی کو اس کے بیاہ کی فکر لگ گئی۔اشوک نے روبی کے نکاح کی بات اچھے اچھے گھرانوں میں چلائی مگر اشوک کی پریشانی بڑھتی گئی۔ہر ایک کی زبان پر ایک ہی بات تھی۔ہندو گھرانے میں پلی ہوئی لڑکی مسلمان کیسے ہوسکتی ہے؟ یہ ناممکن ہے۔نہ نماز کا پتہ نہ روزے کا علم،نہ ہی قرآن پاک سے روشناس صرف کلمہ پڑھنے سے تھوڑی ہی مسلمان ہوسکتی ہے اس لڑکی کو کون گھر میں لائے۔روز قیامت کو خدائے برتر کو ہم کون سا منہ دکھائیں گے؟ خدایا ہمیں معاف کرنا۔''[1]

اشوک کی فکر اور مسلسل محنت اور کوشش آگے چل کر رنگ لاتی ہے اور ایک اچھے لڑکے جاوید سے روبی کی شادی کر دی جاتی ہے۔یہاں ناول کا اختتام ہوجانا چاہئے تھا لیکن ناول نگار نے داستان کی طرح یہاں راجن کا قصہ شامل کر کے ناول کو بیجا طوالت دینے کی ناکام کوشش کی ہے جس سے ناول کی خامی سامنے آتی ہے۔

اشوک اور روبی دونوں کے یہاں ایک ساتھ لڑکے پیدا ہوتے ہیں اشوک کی بیوی رانی لڑکے جنم دے کر مر جاتی ہے۔اب روبی اشوک کے بیٹے راجن اور اپنے بیٹے شکیل کی پرورش ایک ساتھ کرتی ہے راجن کو جب یہ پتہ چل جاتا ہے کہ وہ جاوید کا نہیں اشوک کا بیٹا ہے تو اس کے اندر بغاوت اور نفرت کا جذبہ پیدا ہوجاتا ہے وہ ہر ایک کو شک کی نگاہ سے دیکھتا ہے راجن پورے خاندان کا شیرازہ بکھیرنے کی کوشش کرتا ہے لیکن آخر میں وہ راہ راست پر آجاتا ہے۔ناول کے آخر میں ساری غلط فہمیاں دور ہوجاتی ہیں راجن کو اپنی غلطی کا احساس ہوتا ہے پھر دونوں خاندان ایک ساتھ مل جل کر اور محبت کے ساتھ رہتے ہیں۔اقتباس ملاحظہ کیجئے:

''صبح شکیلہ قرآن شریف کی تلاوت کر رہی تھی۔شکیلا اپنے کمرے میں رامائن کا پاٹ کر رہی تھی۔برآمدے میں اشوک خاموش اور امید کے

---

[1] زینت فردوس۔نئی سحر۔ص ۴۵۔۴۴۔مھگر باغ سرینگر کشمیر، ۱۹۷۷

ساتھ دونوں آوازیں سن رہا تھا۔ اس کے چہرے پر شفق کھل رہی تھی۔
اشوک جب بھی یہ دو آوازیں سنتا جیسے وہ دنیا میں جنت کی بہاریں دیکھا
کرتا۔ وہ آنکھیں بند کئے ہوئے دل ہی دل میں ناچ اٹھتا کہ اس کے
ایک ہی آنگن میں دو مقدس آوازوں کا سنگم ہو رہا ہے۔"[1]

ناول کا اختتام بہت دکھ بھرا ہے جب اشوک کا آخری وقت ہوتا ہے اس وقت بھی وہ اپنی مسلمان بیٹی جو یتیم ہوگئی تھی اور اشوک نے اس کی پرورش کر کے اس کی شادی کر دی تھی اسے اپنے ہاں طلب کرتا ہے روبی کے بیٹے شوہر اور اپنے بیٹے اور گھر کے ہر فرد کو نام لے کر اپنے پاس بلاتا ہے اور نصیحت کرتا ہے۔ اس آخری منظر کی مثال کے لئے ناول کے آخری اقتباس کو یہاں مثال کے طور پر پیش کر رہا ہوں۔ ملاحظہ کیجئے:

""بیٹی شکیلہ تم تلاوت کرو"............شیلا کہاں ہے؟......شیلا ادھر ہے بابا
آپ کے چرنوں میں" شیلا نے جواباً کہا۔ نہیں تم چرنوں کے نہیں سر
آنکھوں پر بٹھانے کے قابل ہو۔ مجھے............معاف............کرنا"
میرا وقت پورا ہو رہا ہے" "جلدی کرو بیٹا پارٹ پڑھو"۔ "شیر سنگھ!" اپنا
ہاتھ دو...... یار...... ہاں ٹھیک...... ہے"......شیر......واہے گرو کہو......
بچوں کا......خیال......رکھنا...... وہ......رانی ہاں جمیلہ پھولوں کے ہار
لئے ......آ رہی...... ہیں۔ جاوید...... انوپ......کو...... معا......ف
کرنا......شکیلہ!......انوپ......تمہارا بیٹا......ہے......اسے......معاف
کرنا...... یہ لوٹ آیا ہے۔ ہمارے...... پاس...... جاوید کے...... پاس
......شکیل کے......رانی......اور......زاہد!......تم بھی......لینے......آ گئے
جمیلہ...... چلو...... میں......آ رہا ہوں۔ اور اسی کے ساتھ اشوک نے
آخری سانس لی۔"[2]

---

[1] زینت فردوس۔ نئی سحر ص۱۴۴، مگھر مل سرینگر کشمیر، ۱۹۷۷

[2] زینت فردوس۔ نئی سحر۔ ص۱۶۳،۔۱۶۲، مگھر مل باغ سرینگر کشمیر، ۱۹۷۷

ناول اپنے موضوع کے اعتبار سے بہترین ناول ہے لیکن ناول کی بے جا طوالت اور پیچیدگی ناول کی کمزوری بن جاتی ہے جان محمد آزاد اس ناول کی فنی کمزوریوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''فنی لحاظ سے دیکھیں تو زینت صاحبہ کا مذکورہ ناول زیادہ کامیاب قرار نہیں دیا جاسکتا۔ اس کی پیش کش کا انداز گھسا پٹا ہے اس کی زبان میں فنی اختصار نہیں بلکہ بے معنی طوالت ہے لیکن جس چیز کے لئے ''نئی سحر'' کو بلا تامل سراہا جاسکتا ہے وہ اس کا اچھوتا موضوع ہے مصنفہ نے نہایت دیانتداری سے اپنے مافی الضمیر کا اظہار کیا ہے۔''[1]

ناول کے مطالعہ کے بعد اس نتیجے پر پہنچتا ہوں کہ ناول چند فنی خامیوں کے باوجود ایک بہترین ناول ہے۔ ناول کی پوری کہانی میں انسان دوستی اور ہندو مسلم اتحاد و بھائی چارگی کی فضا چھائی ہوئی نظر آتی ہے عہد حاضر میں اس ناول کی اہمیت اور بھی بڑھ جاتی ہے مکالمے جاندار ہیں زبان کرداروں کی شخصیت سے مناسبت رکھتے ہوئی استعمال کی گئی ہے زینت فردوس کا یہ ناول اپنے موضوع اسلوب اور بہترین و جاندار مکالموں کی وجہ سے ایک بہترین ناول ہے۔

---

[1] جان محمد آزاد۔ ریاست جموں و کشمیر کے اردو مصنفین ۷ ص۔ ۳۳۵

عمر مجید

ریاست جموں وکشمیر کے ناول نگاروں میں ایک اہم نام عمر مجید کا بھی ہے ان کا اصل نام عمر مجید میر ہے ان کی پیدائش ۱۸ ستمبر ۱۹۴۰ کو سرینگر کے علاقے سونہ وار میں ہوئی۔ عمر مجید کے والد کا نام غلام قادر میر ہے اور ان کی والدہ کا نام سارہ بیگم ہے عمر مجید کا بچپن ان کے آبائی گھر میں ہی گزرا۔ ابتدائی تعلیم بسکو میموریل اسکول سرینگر سے حاصل کی یہاں سے انہوں نے ۱۹۵۳ء میں میٹرک کا امتحان امتیازی نمبرات حاصل کر کے پاس کیا۔ انہوں نے بی۔ اے کا امتحان ۱۹۵۸ میں کشمیر یونیورسٹی سے مکمل کیا۔ اس کے بعد کشمیر یونیورسٹی سے ایم۔ اے کی ڈگری بھی امتیازی حیثیت سے حاصل کی۔ عمر مجید نے اپنی ملازمت کا آغاز بسکو اسکول میں مدرس کے طور پر کیا۔ اس کے ساتھ ہی انھوں نے اپنی ادبی وصحافتی زندگی کا آغاز روز نامہ ''آفتاب'' سے کیا۔ روز نامہ ''آفتاب'' سے ان کا کالم ''خیال اپنا اپنا'' ریاست کے ادبی حلقوں میں بے حد مقبول ہوا۔ اس کے ساتھ ساتھ عمر مجید ریاست کی مختلف علمی وادبی انجمنوں کے فعال رکن بھی رہ چکے ہیں جن میں تلاشِ ادب اور رائٹرس گلڈ کشمیر بہت اہم ہیں۔

عمر مجید کو ابتدا سے ہی تصنیف وتالیف کا شوق تھا۔ ان کی ادبی تخلیقات کا آغاز ۱۹۶۵ میں افسانے سے ہوتا ہے عمر مجید کا پہلا افسانہ ۱۵ اگست ۱۹۶۵ کو روز نامہ آفتاب میں ''ایک بوڑھا ولر کے کنارے'' کے عنوان سے شائع ہوا اس کے بعد ان کے کئی اور افسانے منظر عام پر آئے۔ روز نامہ آفتاب میں ہی ان کا ایک اور افسانہ ''مردہ چنار'' شائع ہوا۔ یہی افسانہ دراصل عمر مجید کی شہرت کا باعث بنا۔ افسانے شائع ہوتے ہی عمر مجید کا نام ادبی حلقوں میں گونجنے لگا۔

عمر مجید بیک وقت ایک افسانہ نگار، ناول نگار، کالم نویس اور تجربہ کار معلم بھی تھے۔ انہوں نے زندگی کے بے شمار مشکلات کا سامنا کرتے ہوئے بھی امید کا دامن ہاتھ سے نہ جانے دیا۔ وہ اپنے افسانوں میں انسانیت کی پاکیزہ روح اور اجتماعی مصائب اور مشکلات سے بھرے ہوئے ہیں ان کی نظر میں اتنی صلاحیت تھی

کہ وہ پاس کی یا اپنے اطراف کی زندگی کا مشاہدہ کرسکیں اپنے افسانوں میں زیادہ تر کشمیر کو ہی موضوع بنایا ہے وادی کشمیر کے پر آشوب حالات کے پس منظر میں انہوں نے کئی شاہکار افسانے لکھے۔ان کے افسانوں کے موضوعات میں نچلے طبقے کے لوگوں کے معاملات، غربت، امن پسندی اور دکھ درد وغیرہ شامل ہیں ان کی تحریروں میں ایک صالح معاشرے کے قیام کی تصوریں جھلکتی ہیں عمر مجید کے ہاں انسانی قدروں کا احترام، اخلاق، ایمانداری۔سچائی اوراعلیٰ تہذیبی قدروں کے مٹتے نقوش پر اظہار افسوس ملتا ہے یعنی ان کی تحریروں میں معاشرے میں پائی جانے والی برائیوں کی مکمل تصویر کشی ملتی ہے ان کے افسانوں میں کشمیری تہذیب و معاشرت کے نمونے بھی مل جاتے ہیں افسانوں کے علاوہ عمر مجید ناول نگاری کی صنف میں بھی کامیاب طبع آزمائی کر چکے ہیں عمر مجید کے ناولوں سے یہ محسوس ہوتا ہے کہ انہیں ناول نگاری کی صنف میں بھی مکمل عبور حاصل تھا۔ان کے دو ناول ریاست جموں وکشمیر کی اردو ناول نگاری کی تاریخ میں ایک اہم اضافہ ہیں ان کے دو ناول ''یہ بستی یہ لوگ'' اور ''درد کا دریا'' ہیں عمر مجید چونکہ اپنے سماج میں ہونے والی تبدیلیوں کو سمجھتے تھے اور کشمیری عوام کی زندگی کا انہوں نے قریب سے مشاہدہ کیا تھا لہٰذا ان کے ناولوں میں کشمیر کے دیہاتوں کی واضح عکاسی ملتی ہے اس کے علاوہ ان کے ناولوں میں سماجی نابرابری سے پیدا شدہ مسائل کو ابھارنے کی کوشش بھی ملتی ہے جموں وکشمیر میں اردو فکشن کے حوالے سے عمر مجید کا نام بہت اہمیت کا حامل ہے انہوں نے اردو زبان وادب کے فروغ میں اہم کارنامہ انجام دیا ہے عمر مجید ۲۲ دسمبر ۲۰۰۸ کو بروزِ دوشنبہ داعی اجل کو لبیک کہہ گئے اور اس طرح ہماری ریاست ایک عظیم فن کار سے ہمیشہ کے لئے محروم ہوگئی۔اب ان کے ناول ''یہ بستی یہ لوگ'' کا ایک جائزہ یہاں پیش کروں گا لیکن مجھے افسوس ہے کہ دست بردِ زمانہ سے ان کا دوسرا ناول ''درد کا دریا'' تلف ہو چکا ہے تلاشِ بسیار کے باوجود یہ ناول کشمیر کی کسی بھی لائبریری سے ہاتھ نہیں لگا۔لہٰذا یہاں ان کے صرف ایک ناول پر ہی گفتگو کی جائے گی۔

''یہ بستی یہ لوگ''

عمر مجید کا پہلا ناول ہے۔یہ ناول شاہین پبلشرز سرینگر کشمیر سے ۱۹۷۱ میں پہلی مرتبہ شائع ہوا۔عمر مجید کا یہ ناول ۱۸۷ صفحات پر مشتمل ہے۔عمر مجید نے اس ناول میں گاؤں کی زندگی کے مسائل کو دیکھ کر یہاں کی مصیبت زدہ عوام کے دکھ اور درد کی تصویر کشی بڑی فنکاری سے کی ہے۔ناول کے موضوع کے سلسلے میں جان محمد

آزاد کی یہ تحریر بہت واضح ہے ملاحظہ کیجئے جان محمد آزاد کے یہ جملے:۔

''یہ ایک انسان کے ظلم اور دوسرے ان گنت لوگوں کی مظلومی اور ستم رسیدگی کی داستان ہے۔آپ نے ناول میں معاشرے کی مکروہ باتوں کی دھجیاں اڑائی ہیں آپ نے اخلاقی انحطاط اور قومی تہذیب کی آن پر دھبہ لگتے دیکھ کر ایک ایسی چیخ بلند کی ہے جس سے بام و در ہل اٹھے ہیں۔''[1]

عمر مجید نے اس ناول میں جلنور گاؤں کے پس منظر میں پورے کشمیر کے گاؤں کی درد بھری اور کراہتی زندگی کو پیش کرنے کی کوشش کی ہے ان کے اس ناول میں سرمایہ داروں اور جاگیرداروں کے ہاتھوں کئے جانے والے ظلم کو بھی بیان کیا گیا ہے۔ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے منشی پریم چند ہندوستان کے گاؤں کی حالت زار کا نقشہ اپنی کہانیوں میں کھینچتے ہیں ٹھیک اسی طرح عمر مجید نے اس ناول میں گاؤں کی زندگی اور یہاں کے لوگوں کے مسائل کو پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔اس ناول کے مطالعے کے دوران لگتا ہے عمر مجید کے ہاں پریم چند کا اثر ہے عمر مجید کا یہ ناول شروع سے آخر تک ظلم و جبر جنسی استحصال، لوٹ کھسوٹ جیسے مسائل پر مبنی ہے۔ناول کی کہانی جنوبی کشمیر کے قصبے اسلام آباد اور اس کے قریب ایک گاؤں جلنور کے پس منظر میں پیش کی گئی ہے ناول میں اسلام آباد قصبہ شہری زندگی کی علامت ہے۔ یہاں بجلی کی روشنی، پختہ روڈ، بڑے اور عالیشان مکانات، بڑے بڑے ہوٹل، گاڑیاں، موٹر کاریں اور کارخانے ملتے ہیں۔ یہاں کی زندگی بہت مصروفیت میں گزرتی ہے آدھی رات تک بازار میں دوکانیں کھلی رہتی ہیں اور کاروبار ہوتا رہتا ہے۔ یہاں پر لوگوں کے پاس فرصت کے لمحات میسر نہیں۔اس کے علاوہ یہاں رات کی تاریکی میں کالے کارنامے بھی انجام دئے جاتے ہیں شراب، شباب اور کباب کی محفلیں بھی چلتی رہتی ہیں۔گاؤں اور دیہات سے لائی گئی لڑکیوں اور دوشیزاؤں کے جسم بھی بکتے ہیں۔ یہاں کے امیر لوگ ان پر بولی بھی لگاتے ہیں جو سیٹھ یا جاگیردار زیادہ پیسے خرچ کرنے والا ہوتا ہے گاؤں کی خوبصورت ترین لڑکی کچھ راتوں کے لئے اس کا دل بہلاتی اور لذت کا سامان فراہم کرتی ہے اس طرح اسلام آباد کا نقشہ ناول میں پیش کر کے کشمیر کے تمام ترقی یافتہ قصبوں کی ترجمانی کی ہے۔دوسری طرف گاؤں جلنور جو ریاست کے تمام گاؤں اور دیہاتوں کی علامت ہے جلنور گاؤں کی زندگی تمام دیہاتوں کی

[1] جموں و کشمیر میں اردو ادب کے پچاس سال۔شیرازہ۔ص۔۱۸۸

حالت زار کی تصویر پیش کرتی ہے یہاں کی تصویر کشی کر کے ناول نگار نے گویا تمام دیہاتوں کا نقشہ پیش کرنے کی کوشش کی ہے راستے کچے ہیں، ٹانگوں اور بیل گاڑیوں کا استعمال کیا جاتا ہے گاؤں کے تمام لوگ کھیتی باڑی کرتے ہیں ان کے کپڑے گندے ہیں کھیتوں میں کام کرتے کرتے ان کے چہروں کا رنگ تک اڑ گیا ہے کافی محنت کرنے کے باوجود بھی ان کی حالت میں تبدیلی نہیں آتی ہیں اور وہ اپنے بچوں کو بھی کھیتوں میں اپنے ساتھ لے جاتے ہیں جلنور کے سب مکان کچے تھے۔ وہاں شام ہوتے ہی گاؤں سنسان ہو جاتا تھا۔ گاؤں جلنور کی منظر کشی ناول نگار نے کچھ یوں کی ہے:۔

> ''وہ جس گاؤں میں رہتے تھے۔ اس کا نام جلنور تھا۔ جلنور کے سب ہی مکان کچے تھے۔ شام ہوتے گاؤں سنسان ہو جاتا تھا اور مٹی کے چراغوں کی دھیمی اور لرزاتی ہوئی روشنی اس طرح دکھائی دیتی جیسے کسی دبیز سیاہ کمبل پر چند جگنو رینگ رہے ہوں۔''[1]

ناول کی کہانی سارہ اور نذیر کے گرد گھومتی ہے سارہ عبداللہ نامی مزدور کی خوبصورت بدقسمت لڑکی ہے جوان ہونے پر سارہ کی شادی شہر کے ایک بزرگ حاجی صاحب سے کرائی جاتی ہے کہ سارہ کا باپ اس کا قرض دار تھا گویا قرض چکانے کے لئے وہ سارہ کو ایک بوڑھے امیر شخص کے حوالے کرتا ہے سارہ کی خوبصورتی کی تصویر کشی ناول نگار نے کچھ یوں کی ہے:

> ''سارہ جس کے رخسار زعفران کے پھولوں کو بھی شرما دیتے تھے جس کی بڑی بڑی آنکھوں میں سورج جیسی چمک تھی...... کتنے نرم اور نازک ہاتھ تھے اس کے جیسے نرمے کے سپید اور بے داغ پھولوں سے تراشے گئے ہوں۔''[2]

سارہ کی شادی ساٹھ سالہ بزرگ حاجی صاحب سے ہوتی ہے جن کا جسم بہت پیلا سیب کی طرح اور بے رس تھا یعنی وہ بہت کمزور تھے۔ حاجی صاحب کے ہاں پہلے سے تین بیویاں ہیں اور وہ دو مرتبہ حج بھی کر

---

[1] عمر مجید۔ یہ بستی یہ لوگ، ص۔۹، شاہین پبلشرز سرینگر۔ کشمیر۔ ۱۹۷۱

[2] عمر مجید۔ یہ بستی یہ لوگ۔ ص۔۲۱، شاہین پبلشرز سرینگر کشمیر۔ ۱۹۷۱

چکے تھے۔اس شادی سے سارہ کے سارے سپنے ٹوٹ چکے تھے جو سپنے وہ اپنی ہم عمر لڑکیوں کے ساتھ چشمے کے کنارے بیٹھ کر دیکھا کرتی تھی۔ سارہ کی شادی کے بعد حاجی صاحب صرف ایک سال زندہ رہتے ہیں جب سارہ کے شوہر کا انتقال ہو جاتا ہے تو اس کا اکلوتا بیٹا اکرم یہ دیکھ کر خوش ہو جاتا ہے کہ ان کے باپ نے کافی دولت کے علاوہ ایک خوبصورت اور جوان بیوہ بھی چھوڑی ہے لیکن یہاں پر حاجی کا ٹانگہ چلانے والا مزدور سارہ کو وہاں سے بھگا کر جلنور گاؤں لے آتا ہے یہاں وہ دونوں شادی کر کے بہت ساری مصیبتوں کے باوجود آخری دم تک ایک ساتھ رہتے ہیں سارہ کے ہاں ایک بیٹا ہوتا ہے سارہ کے اس بیٹے کا نام نذیر ہے جو کشمیر کے ایسے نوجوانوں کی نمائندگی کرتا ہے جو گاؤں میں پیدا ہونے کے باوجود تعلیم حاصل کرنا چاہتے ہیں نذیر دسویں جماعت پاس کرنے کے بعد نوکری کی تلاش میں کافی مشکلات سے دوچار ہوتا ہے نذیر احمد اپنی ماں اور بہن آمنہ کے ساتھ رہتا ہے۔ وہ اپنے گھر اور اپنی بہن کی عزت کی خاطر اپنی محبت کو قربان کر دیتا ہے وہ جیل میں بھی تیرہ سال قید میں گزارتا ہے کیوں کہ نذیر کے ہاتھوں اکبر کا قتل ہو جاتا ہے۔ ناول میں اکبر کہانی کی جان ہے وہ ناول میں بطور ویلن دکھایا گیا۔اس میں وہ تمام برائیاں موجود ہیں جو ایک ویلن میں ہونی چاہئے لیکن کہیں کہیں پر وہ بہت ہی لالچی اور دل دہلانے والا بھی دکھائی دیتا ہے وہ اپنی بہن زینب اور گاؤں کی دوسری لڑکیوں کو شہر لے جا کر بڑے جاگیرداروں اور سرمایہ داروں کے حوالے کرتا ہے اکبر کے مزاج میں یہ کج روی بچپن سے ہی ہے ماں کی موت کے بعد اس کے باپ نے دوسری شادی کر لی۔ سوتیلی ماں نے اکبر اور اس کی بہن زینب کو کبھی بھی اپنی اولاد نہیں سمجھا۔ ہمیشہ مار کھانے اور محبت سے محرومی کی وجہ سے نذیر میں یہ کج روی آتی ہے جب اس کا باپ اسے گھر سے نکال دیتا ہے تو وہ شہر کی راہ لیتا ہے اور شہر میں خطرناک کارنامے انجام دیتا ہے۔ نذیر اکبر کو اس لئے مارتا ہے کیوں کہ وہ نذیر کی بہن کو بھگا کر لے جا رہا تھا۔ پہلے تو نذیر خود برف میں پھنس جاتا ہے لیکن بعد میں نذیر کے ہاتھ میں کوئی سخت وزنی چیز آجاتی ہے تو وہ اس کے ذریعے اکبر کو مارنا شروع کرتا تھا ذرا ملاحظہ کیجئے نذیر کس طرح سے اکبر کے ساتھ پیش آرہا تھا:۔

''ذلیل کمینے کتے ......! نذیر کسی بھوکے درندے کی طرح اس کا گلا
دبانے لگا اور جب اکبر بے دم سا ہو گیا تو نذیر نے اس پر مکوں کی بارش
شروع کی۔'' آمنہ......کہاں ہے......'' وہ دانت پیستے ہوئے بولا۔

''بب...... بتاتا ہوں......وہ کراہا۔

''حرام زادے تو کیا بتائے گا......کیا تیری دوستی تھی...... یہ لے یہ لے۔

''نذیر پاگلوں کی طرح اس پر مکے برسانے لگا اور پھر آخری بار اس کے

گلے کو دبانے لگا۔ اکبر کی آنکھیں ابل پڑیں......پھر اس کی گردن خود بخود

ایک طرف لڑھکتی چلی گئی۔''[1]

نذیر اسی پر بس نہیں کرتا ہے بلکہ وہ قریب کے ایک مکان جس کی کھڑکی سے روشنی آ رہی تھی وہاں جاتا ہے اور دروازے پر دستک دیتا ہے لیکن دروازہ نہیں کھلتا تو وہ دروازے کے ساتھ کان لگاتا ہے اسے آمنہ کے بولنے کی آواز سنائی دی تو وہ بے اختیار کھٹکھٹانے لگا لیکن دروازہ نہیں کھلا پھر نذیر نے پوری قوت سے کندھے سے ٹکریں مارنا شروع کیا اس طرح کنڈی ٹوٹ کر نیچے گر پڑی اور دروازہ کھل گیا۔ لیکن وہاں آمنہ کے بجائے صرف نعیم خان تھا۔ نذیر نے نعیم خاں کو بھی مار مار کر جان سے ختم کر دیا اب نذیر کے قدم کھڑکی کی طرف بڑھے جہاں سے آمنہ چھلانگ لگا چکی تھی۔ آمنہ کی لاش پر برف کے ننھے ننھے ریزے خاموشی سے گر رہے تھے۔ نذیر احمد کے اس شدید غصے کی بنیاد پر تین انسانوں کی قیمتیں جانیں ضائع ہو گئیں۔ اور نذیر اس طرح جیل جاتا ہے اور تیرہ سال جیل میں کاٹتا ہے۔ تیرہ سال کی عمر کاٹنے کے بعد جب وہ اسلام آباد میں اپنے گھر کی تلاش کرتا ہے تو وہاں سب کچھ بدل چکا ہوتا ہے نذیر کے مکان کی جگہ اب ایک نیا خوبصورت مکان بنا ہے نذیر وہاں ایک بوڑھی عورت سے دریافت کرتا ہے کہ میرے مکان میں ایک بوڑھی عورت تھی وہ کہاں ہے بوڑھی عورت نے بتایا کہ تمہاری ماں تمہاری پھانسی کا حکم سنتے ہی چل بسی۔ نذیر دوبارہ پوچھتا ہے کہ وہ شاداں، زینب اور خالد کے بارے میں آپ کچھ جانتی ہیں تو بھی اسے مایوس کن جواب ملتا ہے کہ وہ شاداں مر............نذیر احمد کی مایوس اور تنہائی کو ناول نگار نے ناول کے آخر میں کچھ یوں پیش کیا ہے:۔

''بس کیجئے......نذیر رو پڑا......اور دوڑتے ہوئے صحن سے باہر نکل گیا۔

وہ عورت اسے پکارتی ہی رہ گئی۔

پرانی مسجد...... کے کھنڈر ویسی ہی حالت میں نظر آ رہے تھے لیکن نذیر

[1] عمر مجید۔ یہ بستی یہ لوگ۔ص ۱۸۱۔ شاہین پبلشرز سرینگر۔ کشمیر ۱۹۷۱

خان آج تیرہ برس بعد زندگی کی ہیبت ناک تاریکیوں میں بے بس و مجبور کھڑا تھا۔

بالکل اکیلا ...... چاروں طرف آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھ رہا تھا لیکن سنسان اندھیروں میں دور تک کچھ بھی نظر نہیں آ رہا تھا۔

آنسو سیلاب بن کر بربادیوں کو اس کے دل کے اندر پگھلا رہے تھے۔

اس کے قدم تھکے ہوئے انداز سے پرانی مسجد کی طرف اٹھ رہے تھے۔''[1]

عمر مجید کے ناول کے اس پلاٹ میں ربط ہے ابتدا سے عروج تک ناول قاری کو اپنی گرفت میں رکھتا ہے ہر ایک واقعے کے ساتھ تجسس بڑھتا چلا جاتا ہے ناول کی کہانی میں معاشرے کے تمام مسائل زیر بحث ہیں کہانی کا ہر واقعہ معاشرے کے اصل چہرے کو بے نقاب کرتا ہوا نظر آتا ہے۔ ناول کے کرداروں کو تراشنے میں بھی ناول نگار نے بڑی فنی چابکدستی سے کام لیا ہے ناول کی کہانی شعور کی رو کی تکنیک میں بیان کی گئی ہے ریاست کے ناول نگاروں میں شعور کی رو تکنیک کے سلسلے میں عمر مجید سب پر سبقت لے جاتے ہیں۔ زبان و بیان کی دلکشی بھی ناول کی ایک ایسی خوبی ہے جو اس کی اہمیت کو بڑھاتی ہے مکالمہ نگاری اور منظر کشی میں بھی عمر مجید کا یہ ناول اپنی انفرادیت رکھتا ہے۔ عمر مجید کا یہ ناول انہیں ریاست کے اہم ناول نگاروں کی صف میں لا کھڑا کرتا ہے۔

منظر کشی کی ایک مثال دیکھیں:۔

''دوسری صبح سارہ سب سے پہلے کھیتوں میں پہنچ چکی تھی۔ اس کے چاروں طرف دھان کے پودے سورج کی پہلی ملائم اور شفاف کرنوں میں سنہرے ہو رہے تھے۔

اس سال کی فصل سے اس کی بہت سی امیدیں وابستہ تھیں اس سال اس نے بڑی لگن سے اپنے سامنے ہل چلوائے تھے۔ خود اپنے ہاتھوں سے بیج ڈالے تھے۔ اور پھر خود ہی ترائی کرتی رہی اور سہاگہ پھیرتی رہی۔ اور آج

[1] عمر مجید۔ یہ بستی یہ لوگ، ص۔ ۱۸۷، شاہین پبلشرز سرینگر کشمیر ۱۹۷۱

اس کی تمناؤں کی فصل اس کے چاروں طرف لہلہا رہی تھی۔‘‘[1]

عمر مجید کا یہ ناول اپنی تمام فنی خوبیوں کے باعث ایک کامیاب ناول ہے موضوع کے اعتبار سے بھی اسلوب کے اعتبار سے بھی بہت دلکش اور دلچسپ ہے مکالمے چست ہیں۔ منظر کشی کمال کی ہے غرض عمر مجید کا یہ ناول انہیں ریاست جموں و کشمیر میں اردو ناول نگاری کی تاریخ میں زندہ رکھنے کے لئے کافی ہے۔

[1] عمر مجید۔ یہ بستی یہ لوگ ص۔۵۳، شاہین پبلشرز۔۱۹۷۱

جیوتیشور پتھک

۱۹۷۰ کے بعد کے فکشن نگاروں میں جیوتیشور پتھک کا نام بھی شامل ہے جیوتیشور پتھک کا اصل نام جیوتی پرکاش گنڈ وترہ تھا اور قلمی نام جیوتیشور پتھک تھا۔ان کی پیدائش ۱۸ اکتوبر ۱۹۴۰ء میں ریاست کے گرمائی خطے جموں میں ہوئی۔انگریزی ادب میں ایم۔اے کرنے کے بعد ریاستی محکمہ اطلاعات میں ملازم ہو گئے۔اردو زبان وادب سے انھیں کافی دلچسپی تھی۔انہوں نے ۲۵ سال سے اپنے ادبی سفر کا آغاز کیا۔وہ تسلسل کے ساتھ افسانے لکھتے رہے ابتدائی افسانوں میں ''ٹوٹے رشتوں کا روگ'' اور ''اپنے گھاؤ کا درد'' ہیں ان افسانوں میں ترقی پسند خیالات کا غلبہ نظر آتا ہے ۱۹۹۵ء میں ان کا ایک افسانہ 'جزیرہ' شیرازہ سرینگر میں شائع ہوا تھا۔ان کی ابتدائی کہانیوں سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ وہ محنت کش طبقے کے حامی ہیں۔انہوں نے اپنی کہانیوں میں انسان کی کھوکھلی اور بے کیف زندگی کو موضوع بنایا ہے جس کی وجہ سے ان کی کہانیاں ملک کے معتبر اور ممتاز رسائل میں شائع ہوتی رہیں بقول جان محمد آزاد:۔

> ''اس طویل سفر کے دوران آپ کے فن نے کئی موڑ لئے لیکن آپ کی کہانیاں ہر پڑاؤ اپنی شکستہ و مجروح شخصیت کو یکجا کرنے کی کوششیں کرتی رہیں۔آپ نے ہر سنگ میل پر آج کے انسان کی کھوکھلی اور بے کیف زندگی کو موضوع بنایا۔''[۱]

جیوتیشور پتھک بیک وقت افسانہ نگار، شاعر، مترجم، براڈ کاسٹر، ناول نگار اور ٹی وی سیریل رائٹر تھے۔ جموں و کشمیر میں اردو زبان اور شعر و ادب پر جیوتیشور کے بے شمار احسانات ہیں جنہیں فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ جیوتیشور نے نہ صرف افسانہ لکھ کر ادبی دنیا میں اپنی شناخت قائم کی بلکہ فکشن سے ان کی دلچسپی نے انہیں ناول لکھنے پر بھی مجبور کیا۔چنانچہ انھوں نے اردو ادب کو ناول بھی عطا کئے۔ان کے تین ناول ''ہجوم'' ۱۹۸۵ء ''میلی

---

۱ جان محمد آزاد۔جیوتیشور پتھک ،جموں و کشمیر کے اردو مصنفین ۔کلچرل اکیڈمی سرینگر ۴۸۳

عورت''۱۹۸۶اور''کھڑکیاں''۱۹۸۹میں منظرِ عام پر آ چکے ہیں۔

''ہجوم'':

جیوتیشور پتھک کا پہلا ناول ہے جو۱۹۸۵میں جے کے بک ہاؤس ریذیڈسی روڈ جموں (توی) سے شائع ہوا ناول کا انتساب ننھے گلشن کے نام ایک غنچہ جو پھول بننے سے پہلے ہی مرجھا گیا۔ یہ ناول تشدد کے رجحانات کا پیش بین بن کر نئی نسل کے مسائل کا جرات مندانہ تجزیہ پیش کرتا ہے نوجوان نسل میں تشدد کے رجحان کا نفسیاتی جائزہ ناول میں پیش کیا گیا ہے اس کے علاوہ اس ناول میں سیاست دانوں کا نئی نسل کے ساتھ استحصال کو ناول میں پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے نوجوان اور معصوم لوگوں کو سیاست کے دلدل میں کس طرح پھنسانے کی مذموم کوشش ہوتی ہے ناول میں اس طرف بھی خوب اشارے کئے گئے ہیں جیوتیشور پتھک اپنے ناول کے متعلق ''میری بات''میں لکھتے ہیں:۔

> ''ہجوم کو سطحی طور پر پڑھنے والے حضرات ایک سیاسی ناول تصور کریں۔ مگر سیاسی اصطلاحات تو محض ماحول کی کی عکاسی کے لئے ہیں ورنہ اس ماحول میں میں نے بنیادی نکتے کو اٹھانے کی کوشش کی ہے دیوا کر اور سادھنا نئی نسل کی علامتیں ہیں۔ان کے ذہن میں بغاوت ہے جب کہ پروفیسر جودھامل اور کملا پرانی نسل کے لوگ ہیں۔جن کو تشدد کے اس ماحول سے وحشت ہوتی ہے۔ ایک ادیب و دوست اس ناول کو دستاویزی قرار دیتا ہے مگر میں نے کوشش کی ہے کہ جو تفصیلات دی جائیں ان کا تعلق حقیقت سے ہو اور ناول میں دلچسپی اور تسلسل قائم رہے۔''[۱]

ناول میں جیوتیشور پتھک نے دیوا کر اور سادھنا کے ذریعہ یہ دکھانے کی کوشش کی ہے کہ کس طرح سے کسی معمولی مسئلے کو لے کر سیاسی لوگ معصوم اور ہونہار طالب علموں کو اپنے مقصد کی تکمیل کے لئے استعمال کرتے ہیں ناول کے پس منظر سے ہی یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ سیاست دان اپنے مقاصد کی تکمیل کے لئے

---

[۱] جیوتیشور پتھک ،ہجوم،ص ۷۔۶ ، جے کے بک ہاؤس ریذیڈسی روڈ جموں،۱۹۸۵

کسی بھی حد تک پہنچ جاتے ہیں۔

ناول کے دو کردار دیوا کر اور سادھنا سٹوڈنٹ پولیٹکس میں کافی دلچسپی لیتے ہیں اور ان کی اپنی یونین میں بھی ایک الگ پہچان اور شناخت ہے یونیورسٹی میں ان کی ہر بات مانی جاتی ہے اور ان کے ہر فیصلے کو سر آنکھوں پر بٹھایا جاتا ہے لیکن ریاست کے سیاسی حکمران ان کا غلط استعمال کرتے ہیں دراصل سرکار نے بسوں کے کرائے بڑھانے کا اعلان کیا تھا کالج کے طلبا اور اسکولی بچے عام مسافروں سے بھی زیادہ پریشان ہونے لگے تاہم شدید ردعمل شروع ہوا اور آہستہ آہستہ بچے بوڑھے خاص کر طلبا اس تحریک میں حصہ لیتے ہیں بسوں کو روکنا، پتھراؤ کرنا معمول بن جاتا ہے اگرچہ حکومت نے احتجاجی طلبا کو کچھ رعایت دے کر یہ اندولن ختم کیا تھا لیکن ان کے باوجود کچھ طاقتیں ایسی ہیں جو یہ نہیں چاہتی کہ امن قائم ہو۔لیکن اسی دوران عید کے روز گائے کی قربانی سے حالات اور بھی خراب ہو جاتے ہیں۔اندولن ختم ہونے سے کس طرح گئوکشی کا معاملہ سامنے آتا ہے ملاحظہ کیجئے اقتباس:۔

> ''طلباء کے نمائندوں اور سرکاری اہلکاروں اور سیاسی نمائندوں کے درمیان بحث ومباحثہ شروع ہوا اور طلباء کو چند رعایتیں دینے کا فیصلہ کیا گیا۔لہٰذا یہ ایجی ٹیشن اور اندولن ختم ہو گیا مگر چند حلقے اس کا خاتمہ نہیں چاہتے تھے۔انہیں نئی ایجی ٹیشن شروع کرنے کے لئے مواقع چاہئے تھے۔لہٰذا انہوں نے سمجھوتہ ہونے کے بعد بھی بیان بازی کا سلسلہ جاری رکھا۔اس دوران عید کے روز ایک گاؤں میں گئوکشی کی واردات ہوئی۔ پھر کیا تھا رشاسمتی میدان میں کود پڑی۔شہر میں ہڑتال کرادی گئی۔ گاڑیوں پر پتھراؤ ہونے لگے اور لیڈروں نے زوردار بیان دینے شروع کر دیئے۔
>
> ''ہمارا دھرم خطرے میں ہے''
>
> ''گئوماتا کی لاج بچاؤ۔''
>
> شہر میں افراتفری کا ماحول پیدا ہو گیا۔مسلمان سہمے سہمے گھومنے لگے۔

ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان خلیج پیدا کی جارہی تھی۔
دونوں طرف نفرت کی آگ سلگ رہی تھی۔حالات بالکل بارودی تھے۔
ذراسی چنگاری سارے شہر کو جلا کر راکھ کر سکتی تھی۔''[1]

ایسی صورتحال سے نمٹنے کے لئے تمام شہریوں کی ایک میٹنگ بلائی گئی تا کہ شہر میں امن بحال کیا جاسکے۔میٹنگ میں زوردار الزام تراشیاں ہوئیں۔زبردست بحث ہوئی۔ بالآخر امن کا فیصلہ ہوا اس طرح شہر کی رونقیں پھر سے بحال ہوئیں لیکن سیاسی لیڈروں کی نظریں اب آنے والے چناؤ کی طرف لگی ہوئی تھی وہ چاہتے تھے کہ اگر اب ہنگامے کروانے میں کامیاب ہو جائیں تو یہ چناؤ بھی ہم جیت سکتے ہیں۔

جیوتیشور پتھک کا یہ ناول دراصل ایک ہجوم سے ہی شروع ہوتا ہے نعرے لگاتا ہوا یہ ہجوم چوراہے کی طرف ہائے ہائے کی صدایوں میں گونجتا ہوا آگے بڑھ رہا ہے ناول کے شروع کا یہ اقتباس دیکھیں:۔

''نعرے لگاتا ہوا ہجوم چوراہے کی طرف بڑھ رہا تھا ''ہائے ہائے'' کی آوازوں سے فضا گونج رہی تھی۔ دکانداروں نے اپنے شٹر گرا لئے تھے اور سبھی لوگ آنے والے چند لمحات کی وارداتوں کے تصورات سے دہشت زدہ تھے۔

شہر میں گذشتہ پندرہ دنوں سے دہشت پھیلی ہوئی تھی۔شہر کے نوجوان جلوس نکالتے اور پولیس والوں سے ٹکرا جاتے۔ پتھراؤ ہوتا۔ لاٹھیاں چلتیں اور دونوں طرف سے زخمی ہونے والے افراد سے ہسپتال وارڈ بھر جاتے۔''

اس شہر کا اب خدا ہی حافظ ہے معمولی سے معمولی بات پر پتھراؤ، خون خرابہ......نہ جانے ان لوگوں کو کیا ہو گیا ہے۔''[2]

پروفیسر جودھا مل ایک مقامی کالج میں انگریزی کے لیکچرار تھے انہیں حالات کی خرابی کی وجہ سے بہت

---

[1] جیوتیشور پتھک۔ہجوم،ص۔۸۱۔۸۰، جے کے بک ہاؤس ویذیڈنسی روڈ جموتوی ۱۹۸۵ء

[2] جیوتیشور پتھک۔ہجوم،ص۔۹، جے کے بک ہاؤس ریذیدنسی روڈ جموں نوی۔۱۹۸۵

پریشانی ہوتی تھی اور وہ بہت بے چین رہتے تھے وہ کالج اور یونیورسٹی بند ہونے پر جب گھر جاتے ہیں تو ان کی بیٹی سادھنا ان سے پوچھتی ہے کہ خوش کیوں ہیں تو وہ جواباً کہتے ہیں کہ پتھراؤ، ٹیرگیس اور لاٹھی چارج سے مجھے وحشت ہوتی ہے لیکن بیٹی سادھنا جو ایم اے پر پولیس کی ایک جذباتی لڑکی ہے اور سٹوڈنٹس یونین کی جنرل سیکریٹری بھی ہے باپ کو کہتی ہے کہ ڈیڈی ہم خون خرابے سے نہیں ڈرتے کیوں کہ سرکار بات چیت اور امن و امان سے مسائل کے حل میں یقین نہیں رکھتی۔ سادھنا اس ناول کا مرکزی کردار ہے اس کا خاکہ ناول نگار نے یوں کھینچا ہے:۔

> ''سادھنا ایم اے پر پولیس کی طالبہ تھی۔ تقریر کے فن میں ماہر ہونے کی وجہ سے سٹوڈنٹس یونین کے جنرل سیکریٹری چلی گئی اور اب وہ اس ایجی ٹیشن میں بڑھ چڑھ کر حصہ لے رہی تھی۔ صبح سے لے کر رات گئے تک وہ تمام انتظامات میں مصروف رہتی۔ کبھی کسی میٹنگ میں، کبھی جلوس میں، کبھی دھرنے میں۔ اس کا یقین تھا کہ وہ اس طرح سماج کو بدلنے میں اپنا اہم رول ادا کر رہی ہے۔
>
> سرو قد چٹے گورے رنگ اور جاذب شخصیت کی وجہ سے سادھنا تمام یونیورسٹی میں مقبول تھی۔ ہزاروں لوگوں کا اجتماع اس کی پرکشش اور پرجوش تقریر کو نہایت توجہ سے سنا کرتا تھا۔ اس وجہ سے وہ سٹوڈنٹس یونین کا ایک اہم ستون بن چکی تھی۔''[1]

سادھنا کے علاوہ دیواکر بھی اسٹوڈنٹس پولٹکس میں کافی دلچسپی لیتا ہے دیواکر بھی ایک مقبول اسٹوڈنٹ لیڈر رہے جس کو پولیس نے جیل میں ڈال دیا تھا اور اب رہائی ہو رہی ہے وہ سماج کی تبدیلی کا خواہاں ہے ناول کے چوتھے باب میں دیواکر کی رہائی اور اس کی مقبولیت کو ناول نگار نے یوں پیش کیا ہے:۔

> ''دیواکر کی جیل سے رہائی کی خبر شہر میں جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی۔
> اندولن شروع ہونے کے چند دن کے اندر ہی دیواکر کو گرفتار کر لیا گیا تھا۔

[1] جیوتیشوت پتھک۔ ہجوم، ص۔۱۳، جے کے بک ہاؤس ریذیڈنسی روڈ جموں، ۱۹۸۵

کیوں کہ حکام کا خیال تھا کہ جب تک دیواکر جیل سے باہر رہے گا تب
تک یہ تحریک ٹھنڈی نہیں پڑ سکتی۔ کیوں کہ دیواکر کو شہر کے نوجوان طبقہ
میں کافی مقبولیت حاصل تھی اور تحریک کے ابتدائی دنوں میں اس نے
طلبہ اور دوسرے نوجوانوں کو منظّم کرنے میں نمایاں رول ادا کیا تھا اور اب
اکثر جلسوں میں دیواکر کی تقریریں ٹیپ ریکارڈ پر سنی جاتی تھیں۔ جنہیں
ہزاروں لوگوں کا اجتماع نہایت جوش خروش سے سنا کرتا۔''[1]

سادھنا اور دیواکر دونوں ایک دوسرے کی صلاحیتوں سے متاثر ہوتے ہیں اور اس طرح وہ آہستہ آہستہ نہ صرف ذہنی بلکہ جذباتی طور پر بھی ایک دوسرے کے قریب آجاتے ہیں لیکن ان کی قربت کو شکوک کی نظر سے دیکھا جاتا ہے یونیورسٹی کے کئی طلبا سیاست میں کوئی دلچسپی نہیں رکھتے۔ ان میں ایک لڑکی ڈالی شرما بھی ہے یہ ایک امیر باپ کی بیٹی ہے وہ جدید دور کی لڑکی ہوتے ہوئے بھی خود کو فضول کاموں سے دور رکھتی ہے ڈالی کو سادھنا اور دیواکر کی سیاسی زندگی بالکل پسند نہیں۔ وہ سادھنا کی ایک اچھی دوست ہے یہاں میں اختصار سے کام لیتے ہوئے یہ بتانا چاہوں گا کہ جب سادھنا اور دیواکر کی ساری محنت رائیگاں ہوتی ہے سادھنا جب میٹنگ کی سرابراہی نہایت چابکدستی سے کرتی ہے اور اہم نکتے لیڈروں کے سامنے رکھتی ہے لیکن اس میٹنگ کا کوئی مثبت نتیجہ سامنے نہیں آتا۔ اب سادھنا اور دیواکر دونوں مایوس ہوتے ہیں سادھنا کا باپ پروفیسر جودھامل ان دونوں کو سمجھاتا ہے کہ آپ کے اس سب سے جیسے پہلے کچھ نہیں ہوا اب آگے بھی کچھ نہیں ہونے والا۔ کامیاب ہونے کے لئے عوام کو اپنے اعتماد میں لینا پڑتا ہے اس کے بعد سادھنا اور دیواکر کے درمیان اپنے سیاسی کیریئر کے متعلق گفتگو ہوتی ہے سادھنا دیواکر کو پوچھتی ہے کہ اب تم کیا کروگے۔ کوئی نیا پروگرام انجام دینے کے لئے بھی کہتی ہے لیکن دیواکر یوں جواب دیتا ہے:۔

''نہیں۔ میں اب نوجوانوں کی زندگیوں سے نہیں کھیلوں گا۔ پہلے ہی
بہت ہو چکا۔ کبھی مکمل انقلاب کا خواب تو کبھی دوسرا آندولن۔ مگر ہم سب
ان کی امنگوں اور احساسات کو نہیں، پہچان سکے۔ ہم نے صرف اپنے

---

[1] جیوتیشور پتھک، ہجوم، ص۔۱۶۔ جے کے بک ہاؤس ریذیڈنسی روڈ جموں۔ ۱۹۸۵

مفادات کی خاطر انہیں آگ میں دھکیلنا چاہتے مگر نہیں اب میں یہ سب
نہیں کروں گا...... میں پروفیسر بنوں گا تاکہ نئی نسل کو کچھ سکھا سکوں
ریسرچ کروں گا تاکہ نسلوں کے لئے کوئی راستہ تلاش کرسکوں۔''

یہاں پہنچ کر دونوں کو یہ احساس ہوتا ہے کہ اب تک جو وہ کرتے رہے وہ کسی کے کام نہیں آیا اب وہ نئے سرے سے اپنی زندگی کا آغاز کرنا چاہتے ہیں ان تمام واقعات کے چلتے درمیان میں دیواکر اور سادھنا اتنا قریب ہوجاتے ہیں کہ سادھنا دیواکر کو محبت بھرے انداز سے پوچھتی ہے کہ تم کب تک اکیلے چلتے رہو گے سادھنا نے دیواکر کے پوچھنے پر ہر چیز کو تفصیل سے بتایا اور کہا کہ میں یہ نہیں کرسکتا کیوں کہ میں آج یہاں کل دہلی اور پھر...... پھر میں کیوں کسی کو تکلیف دوں غرض وہ سادھنا کی محبت کو ٹھکرا دیتا ہے لیکن سادھنا ناول میں آخر تک اس کا ساتھ دیتی ہے اسے بہت پیار دیتی ہے اس کا خیال رکھتی ہے دیواکر کو انتخابات سے کچھ عرصہ پہلے الیکشن لڑنے کی پیش کش کی جاتی ہے لیکن وہ اس میں دلچسپی نہیں لیتا اور انکار کر دیتا ہے ناول کے آخری باب جس میں انتخاب کی تیاری چل رہی تھی ملاحظہ کیجئے:۔

''انتخابات قریب آنے والے تھے۔
گلی، کوچوں اور بازاروں میں نعروں کا زور تھا
''ہلدر کو ووٹ دو''
''کنول کو ووٹ دو''
''ہل کو ووٹ دو''
''ہاتھ کو ووٹ دو''
''سائیکل، چرخے، ہاتھی، گھوڑے کے لئے ووٹ دو''
اپنا اپنا اعلان، اپنا اپنا نشان، سبھی امیدوار زور شور سے تقریریں کر رہے
تھے۔ نعرے لگا رہے تھے۔ دعوے جتا رہے تھے۔
چھوٹے چھوٹے جلوس گلی کوچوں سے گزر رہے تھے۔

۱؎ جیوتیشور۔ پتھک۔ ہجوم، ص۔۱۶۱ جے کے بک ہاؤس ریذیڈنسی روڈ جموں ۱۹۸۵

مگر دیوا کر اور سادھنا دونوں بالکنی میں بیٹھ کر ان جلوسوں کا نظارہ کرتے۔

گویا وہ ان سے کٹ گئے ہوں۔ اپنے ماضی سے کٹ گئے ہوں۔''[1]

مندرجہ بالا جملوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ منظر کشی میں بھی ناول نگار نے کافی محنت سے کام لیا ہے ان کا یہ ناول پلاٹ کردار نگاری، مکالمہ نویسی، منظر کشی غرض ہر اعتبار سے کامیاب ناول ہے اگر چہ جیوتیشور پتھک کا یہ پہلا ناول تھا لیکن موضوع وفن دونوں کے اعتبار سے ناول اپنی ایک انفرادی پہچان رکھتا ہے۔

میلی عورت:

میلی عورت جیوتیشور پتھک کا دوسرا ناول ہے یہ ناول ''کانچ کے رقیب'' کے عنوان سے اخبار میں سلسلہ وار شائع ہوا۔ ناول ''میلی عورت'' کا موضوع سماجی قدروں کی پامالی ہے۔ ہمارے سماج میں روز بروز خود غرضی، موقع پرستی اور بناوٹ میں اضافہ ہو رہا ہے۔ سائنس دان زمین کی حدود سے پار چاند تاروں اور سیاروں پر کمند ڈال رہے ہیں مگر آج کے انسان کا وجود اتنا ہی سکڑ کر محدود ہوتا جا رہا ہے آج کا انسان اپنی غرض پوری کرنے کے لئے نہ اخلاقی قدروں کا خیال رکھتا ہے نہ اسے آپسی رشتوں کی پرواہ ہے اپنے مقاصد کے حصول کے لئے وہ کچھ بھی کرنے سے نہیں کتراتا۔ خونی رشتے محض رسمی رہ گئے ہیں ان کی معاشرے میں کوئی قدر نہیں۔ ناول 'میلی عورت' ایک لڑکی کی زندگی کا المیہ ہے جسے تقدیر دہلی کی بارونق فضا میں تو لے آتی ہے لیکن سکھ اور چین اسے کبھی میسر نہ ہو سکا۔ وہ ایک شہری سے شادی کرنے کی خواہاں ہے لیکن سماج اسے وہ عزت اور مقام نہیں دیتا جس کی وہ حقدار ہے ناول نگار نے سماج میں ٹوٹتی اور بکھرتی قدروں کی طرف اشارہ کیا ہے شہروں کے ساتھ ساتھ گاؤں دیہات کے لوگ بھی اب موقع پرست ہو گئے ہیں گاؤں کے لوگ جو سماجی رویہ اختیار کئے ہوئے تھے اسے آہستہ آہستہ بھولتے جا رہے مہمان نوازی، پیار محبت کے جذبات وغیرہ اب دیہاتی لوگوں میں بھی نہیں تھے۔ اب ان کے ہاں بھی شہری زندگی کے طور طریقے دکھائی دیتے تھے ناول میں چندن نامی ایک لڑکی اس ناول کا مرکزی کردار ہے چندن دیہاتی لڑکی ہے چندن کا باپ منشی دھیان چند سلاسل پروجیکٹ پر ایک ٹھیکیدار ہے اور روپے پیسے کے معاملے میں بڑا کنجوس ہے وہ مزدوروں سے کم پیسہ میں کام لیتا ہے اور پھر بے ایمانی سے اپنا گھر بھرتا ہے وہ سمنٹ میں زیادہ ریت ملا کر افسران کی آنکھوں میں دھول جھونک دیتا ہے۔ لیکن دھیان چند کو

---

[1] جیوتیشور پتھک۔ ہجوم، ص۔ ۱۶۸۔۱۶۷، جے کے بک ہاؤس ریزیڈنسی روڈ جموں توی، ۱۹۸۵

اپنے گھر، اپنی بیوی بنتی اور اپنی بیٹی سے کوئی لگاؤ نہیں ہے کبھی کبھار گھر آ کر دو تین ہزار روپیہ دے جاتا ہے ایسی صورت میں اس کی بیوی جنگل کے منیجر سے رشتہ قائم کر لیتی ہے اور اس طرح اس کا اثر براہ راست چندن پر پڑتا ہے وہ ماں باپ اور جنگلات کے ٹھیکیدار کے رشتوں کے درمیان لڑک سی گئی ہے وہ چھوٹی عمر سے ہی اپنی ماں اور باپ کے درمیان جھگڑے دیکھتی ہے وہ اپنی ماں بنتی کو جنگل کے منیجر کے قتل کے الزام میں قید ہوتے دیکھتی ہے اور اس کا باپ بھی اسے اپنے پاس رکھنے سے انکار کر دیتا ہے ایسی صورتحال میں وہ راجن کے ساتھ دہلی جا کر شادی کر لیتی ہے دہلی جانے کے بعد بھی اس کی زندگی میں کوئی راحت نہیں۔ دہلی میں اس کا شوہر راجن اور سسر اس کی عصمت کا اپنے مقاصد کے لئے خوب سودہ کرتے ہیں دہلی میں چندن نئی طرز تہذیب اور رہن سہن کو قریب سے دیکھتی ہے چندن کی ساس چاہتی ہے کہ چندن راجن کی کامیابی کا راز بنے وہ راجن کی کسی نمائش سے پہلے ہی چندن کو سمجھاتی کہ تم بڑے بڑے امیروں کے ساتھ میل ملاپ بڑھاؤ تا کہ وہ راجن کی طرف راغب ہوں۔ اس لئے چندن کو مجبوراً وہ کام کرنے پڑتے ہیں جو اس کے گھر والے اس سے کروانا چاہتے ہیں۔ یہاں یہ ظاہر ہوتا ہے کہ جیوتیشور پتھک نے یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ دولت کی خاطر انسان کی عزت کی کوئی وقعت نہیں۔ چندن کو اکثر اس ماحول میں رہنے کی وجہ سے گھٹن ہوتی اسے شراب پینا، تاش کے پتوں پر جھگڑنا سب فضول نظر آتا ہے لیکن وہ یہ سب کرنے پر مجبور ہے دیکھئے راجن سے چندن کس طرح فریاد کرتی ہے:۔

''راجن آج رات واپس آیا تھا۔ ایک ماہ کی دوری کے بعد آج جب چندن اس سے ملی تو وہ سسک سسک کر روئی۔ راجن نے اسے اپنی باہوں میں کس لیا اور بہت دیر تک سینے سے لگا کر اسکے بالوں کو سہلاتا رہا۔

راجن مجھے اس گہرے کنویں سے نکال لو
میں دلدل میں پھنس چکی ہوں
میں تمہاری بیوی بن کر رہنا چاہتی ہوں
مجھے ننگا نہ کرو، بھگوان کے لئے مجھے ننگا نہ کرو

رفتہ رفتہ راجن کی گرفت ڈھیلی ہوتی گئی۔اس نے چندن کوڈھیلا چھوڑ دیا
اورخود تکئے کا سہارا لے کر کچھ سوچنے میں محو ہوگیا۔''[1]

چندن حالات سے لاچار ہوکر سٹفن سے بھی رشتہ قائم کرلیتی ہے سٹفن اس سے ہمدردی جتاتا ہے اور وہ چندن کو عارضی محبت کے چکر میں گرفتار کرنے میں کامیاب ہوجاتا ہے اور آگے چل کر وہ بھی اس کا استعمال کرتا ہے۔سٹفن کسی فیکٹری کے کاغذات پر دستخط لینے کے لئے اس کی عصمت داؤ پر لگاتا ہے اور یوں چندن کو یہاں بھی ناکامی اور دھوکہ ہی کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔

ناول ''میلی عورت'' کے آخر میں سٹفن جو عارضی محبت کر کے چندن کو اپنے مقصد کے حصول کے لئے چندن کی عصمت داؤ پر لگاتا ہے وہ پہلے چندن کے باپ کا قتل کرتا ہے کیوں کہ وہ اس کا بزنس پاٹنر ہوتا ہے اور پھر چندن کے سسر کو بھی وہ موت کے گھاٹ اتار دیتا ہے اور آخر میں چندن ان حالات کے چلتے پہلے سٹفن کو گولی مار دیتی ہے اور اس کے بعد وہ خودکشی کرلیتی ہے۔دیکھئے ناول کا اختتام کچھ یوں ہوتا ہے:۔

''چندن نے بڑھ کر اس سے ریوالور چھین لیا اور یکدم تین گولیاں چلادیں سٹفن کچھ دیر تک وہاں تڑپتا رہا اور پھر کروٹیں بدل کر برف کی سل کی طرح بے ساکت ہوگیا۔گولیوں کی آواز دور تک سناٹے کو چیرتی ہوئی چلی گئی۔چاروں طرف سے پولیس کے سپاہی دوڑنے لگے۔مگر وہ ابھی پہلی منزل میں ہی پہنچے تھے کہ گولیوں کی آواز دوبارہ سنائی دی اور سپاہیوں نے فوراً پہنچ کر دیکھا کہ چندن کی کنپٹی سے خون بہہ رہا تھا اور وہ مچھلی کی طرح تڑپ رہی تھی۔دیکھتے ہی دیکھتے اس کی روح قفس عنصری سے پرواز کر چکی تھی۔''[2]

ناول نگار نے چندن کے کردار کو تراش کر اس کے ذریعے یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ کوئی بھی انسان خراب نہیں ہوتا۔لیکن جس سماج ومعاشرے میں اس کا اٹھنا بیٹھنا ہوتا ہے اس کا اثر اسے خراب کرنے پر مجبور

---

[1] جیوتیشور پتھک ۔میلی عورت ۔ص ۵۷ ۔ جے کے بک ہاؤس ریذیڈنسی روڈ جموں ۔۱۹۸۶
[2] جیوتیشور پتھک ۔میلی عورت ۔ص ۱۱۰، جے کے بک ہاؤس ریریڈنسی روڈ جموں، ۱۹۸۶

کرتا ہے چندن ایک گاؤں کی لڑکی ہے جسے دہلی کے نوجوان راجن سے محبت ہوتی ہے اور وہ راجن کے ساتھ رہ کر بھی خوش رہنا چاہتی ہے لیکن دہلی میں راجن اور اس کے والدین اس لڑکی کو اپنے مقاصد کے لئے استعمال کرتے ہیں اور اس طرح اس میں وہ تمام برائیاں آجاتی ہیں جن کا شہروں میں پایا جانا کوئی معیوب نہیں سمجھا جاتا جیسے شراب، رقص اور غیر مردوں کے ساتھ تعلقات وغیرہ۔

ناول میں چندن کا کردار شروع سے آخر تک متحرک نظر آتا ہے یعنی کہانی چندن کے گرد ہی گھومتی ہے۔ ناول نگار ''میلی عورت'' کے شروع میں 'میری بات' میں چندن کے بارے میں یوں رقمطراز ہیں:۔

> ''اس ناول کا مرکزی کردار چندن میرے ذہن کی اپج نہیں۔ بلکہ وہ سادہ لوح عورت ہے جسے حالات نے جموں کے ایک دور دراز پہاڑی گاؤں سے دہلی کے کسی بارونق اور پرشور علاقے تک پہنچا دیا۔ ان حالات کے ایک مرحلے پر میری اس کے ساتھ ملاقات ہوئی تھی۔ میں نے جب پوچھا یہ سب کیا ہے؟ تو اس نے جواب دیا۔ کیا سب قصور عورت کا ہے؟ ان حالات کی شکار یہ عورت کیا واقعی میلی ہے؟ اس کا جواب تو قارئین ناول پڑھنے کے بعد ہی ڈھونڈ سکیں گے۔''[1]

میلی عورت ناول کے مطالعے کے بعد قاری اس نتیجے پر پہنچتا ہے کہ چندن کسی بھی صورت میں میلی نہیں ہے وہ تو مردوں کے بنائے ہوئے اس نظام میں اس طرح پھنس جاتی ہے کہ باہر نکلنے کا کوئی راستہ نظر نہیں آتا ہے جس کی وجہ سے وہ آخر میں اپنی جان لے لیتی ہے۔ یہ کردار ان عورتوں کی ترجمانی کرتا ہے جو پیدائشی شریف ہیں لیکن سماجی برائیاں یا سماج میں رہنے والے ظالم لوگ انہیں برائی کے دلدل میں پھنسا دیتے ہیں چندن ایک گاؤں کی بھولی بھالی اور معصوم لڑکی ہے جس نے سب کچھ اپنے شوہر کے لئے قربان کیا اسے وہ اپنا دیوتا مانتی تھی لیکن شوہر نے اسے دھوکہ دیا۔ اس نے چندن کی عصمت کو تار تار کر دیا۔

جہاں ناول میں کردار نگاری میں ناول نگار نے بہت فنی مہارت سے کام لیا ہے وہاں اس ناول کا پلاٹ بھی ناول نگار کی فنی صلاحیتوں کا نتیجہ ہے ناول کا پلاٹ چست ہے کہیں بھی کوئی جھول نہیں ہے ایک کے

---

[1] جیوتیشور پتھک۔ میلی عورت۔ ص ۵، جے کے بک ہاؤس ریزیڈنسی روڈ جموں۔ ۱۹۸۶

بعد دوسرا واقعہ بالترتیب آگے آتا رہتا ہے۔ناول کردار نگاری کے اعتبار سے بھی ایک بہترین ناول ہے چندن راجن سفٹن مرکزی کردار ہیں ان کے علاوہ بھی کچھ کردار ہیں جو کہانی کو آگے بڑھانے میں مددگار ثابت ہوتے ہیں ناول میں منظرکشی کے بھی اعلیٰ نمونے مل جاتے ہیں مکالمہ نگاری میں بھی ناول نگار نے اپنے کمالات دکھاتے ہیں مجموعی اعتبار سے ناول میلی عورت موضوع اور فن وتکنیک کے اعتبار سے ایک بہترین اور معیاری ناول ہے۔

کھڑکیاں:

جیوتیشور پتھک کا کا تیسرا ناول ہے جو پہلی بار ۱۹۸۹ء میں مانوی پبلشر پنج تیرتھی جموں سے شائع ہوا یہ ناول ۲۱۲ صفحات پر مشتمل ہے ناول کا عنوان کھڑکیاں اس لئے رکھا ہے کیوں کہ اس کو پانچ مختلف کھڑکیوں کے تحت لکھا گیا ہے۔''کھڑکیاں'' ناول کا موضوع ایک اہم مسئلہ ہے سیاست اخلاقی دیوالیہ پن کا ذریعہ بن چکی ہے اور نئ نسل کو اپنے مقاصد کے لئے استعمال کیا جارہا ہے اس طرح نئ نسل کا ہم مستقبل تباہ کررہے ہیں جو ہم لوگ نئ نسل کے ساتھ کررہے ہیں وہ یقیناً ہمیں ایک دن تباہی کے دہانے پر لے جا کر کھڑا کرے گا۔ ہماری یونیورسٹیوں، دفتروں اور تعلیمی اداروں میں ہر جگہ سیاست چلتی ہے سازشیں ہوتی ہیں اور جوڑ توڑ ہوتی ہے اسمبلیوں میں آیارام اور گیارام کا کھیل ہوتا ہے۔اورعوام کو اپنے دیئے ہوئے ووٹوں کی سودبازی ہوتی ہے ہر کوئی اپنے مقاصد کی تکمیل کے لئے بےچین ہے ہر انسان اپنے مفادات کی بات کرتا ہے یہاں تک کہ بعض موقعوں پر اخبار نویس بھی حقیقت کو سامنے لانے سے کتراتا ہے۔انسانی رشتوں کی لاج رکھنے کے بجائے مادی مصلحتوں پر زور دیا جاتا ہے اس طرح سماج ایک دلدل میں پھنس کر رہ گیا ہے مصنف نے پہلے اس ناول کا نام 'دلدل' رکھنا چاہا لیکن بعد میں 'کھڑکیاں' عنوان دے کر اسے شائع کروایا۔ ناول کے نام کے متعلق جیوتیشور پتھک لکھتے ہیں:۔

> ''درحقیقت جب یہ ناول لکھنا شروع کیا تھا تو میرے ذہن میں اس کا نام 'دلدل' تھا مگر یوں یوں نام کا پلاٹ آگے بڑھتا گیا تو اس کا نام 'کھڑکیاں' رکھنا بہتر سمجھا یہ کھڑکیاں ہمارے سماج کی محض چند جھلکیاں پیش کرتی ہیں ورنہ اس سماج میں جو کچھ ہو رہا ہے ان کی تفصیلات بیان

کرنے کے لئے کئی صحیح کتابیں لکھنا پڑیں گی۔''[1]

ناول کا مرکزی کردار بلیمور یا کا ہے جو ایک صحافی کا کام بخوبی انجام دیتی ہے اور حقائق کو سامنے لانے کی مسلسل کوشش کرتی ہے اور جب اس کو زندگی میں کچھ چین ملتا ہے تو اچانک کینسر جسی بیماری اس کو اپنی لپیٹ میں لے لیتی ہے پروفیسر ہریش چند نام کے مطابق بہت سیدھا سادہ اور سچ کہنے والا شخص ہے وہ بے خوف اور رعایت ہر عام و خاص سے پیش آتا ہے لیکن اس کا یہ رویہ ارد گرد کے ماحول کو پسند نہیں آتا ہے دونوں کردار بلیموریا اور پروفیسر ہریش چندر مل کر کہانی کو آگے بڑھاتے ہیں اس کے علاوہ انسپکٹر جناردھن ایک ایسا شخص ہے جو اپنے منصبی فرائض کو بخوبی سر انجام دیتا ہے وہ نیک نیت اور ایماندار ہے مگر سماج پر غلبہ پانے والے لوگ اسے کئی الٹے کیسوں میں پھنسا دیتے ہیں۔ مگر کتنے ایسے لوگ ہیں جو بے خوفی اور ہمت سے ایسے مصائب سے نپٹتے بھی ہیں اور کئی تھک کر اس طرح کے مصائب سے سمجھوتہ کر لیتے ہیں۔ اور کئی لوگ تو آدھی راہ میں ہی جان دے دیتے ہیں۔

ناول نگار نے دراصل یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ آج کی جو سیاسی صورتحال ہے اس میں سیاسی جماعتیں راتوں رات آپسی سمجھوتہ کر کے وزارتیں بناتی ہیں اور راتوں رات ٹوٹ بھی جاتی ہیں اس طرح اخلاقی قدروں کی دھجیاں اڑائی جارہی ہیں اور عوام کو پریشان کیا جارہا ہے عوام کو استحصال کی چکی میں پیس رہے ہیں۔ اس سیاسی صورتحال کی مکمل تصویر کشی ناول نگار نے اپنے اس ناول میں کی ہے۔

پروفیسر ہریش چندر کی بیوی مدھومتی ہے لیکن ہریش چندر للّی بلیموریاں سے محبت کرنے لگا تھا۔ دونوں ایک دوسرے کو بہت چاہتے تھے یہاں تک کہ اچانک ایک دن ہریش چندر للّی کو شادی کی تجویز بھی پیش کرتا ہے لیکن یہاں للّی بلیموریا اپنی عقلمندی کا ثبوت دیتی ہے وہ اگرچہ محبت کرتی ہے ہریش چندر کو اپنی عصمت تک حوالے کر دیتی ہے لیکن وہ ہریش سے شادی کے لئے تیار نہیں ہوتی ہے وہ سوچتی ہے کہ اگر وہ ایسا کرتی ہے تو یہ ہریش چندر کی بیوی مدھومتی کے ساتھ دھوکہ ہے۔ لیکن ہریش چندر اور للّی بلیموریا کا یہ محبت کا رشتہ چلتا رہا ایک دن بلیموریا کو خون کی قے ہوئی اس دن بلیموریا ہریش چند کے پاس سوئی تھی۔ اس طرح ہریش چندر کو بلیموریا کی بیماری کا پتہ چلتا ہے وہ اسے دوسرے دن ہسپتال لے کے جانچ کراتا ہے کچھ ٹسٹ کی رپوٹ آنے کے بعد

[1] جیوتیشور پتھک۔ کھڑکیاں۔ ص ۴، مانوی پبلشر پنج تیرتھی جموں۔ ۱۹۸۹

معلوم ہوتا ہے کہ بلیموریا کینسر کی مریض ہے ہریش چندراب اس کی تیمارداری کے لئے دفتر سے رفعت حاصل کر لیتا ہےاور ٹھان لیتا ہے کہ وہ بلیموریا کو رونے نہیں دے گا دیکھئے اقتباس:۔

''ہریش چندر کو جب اپریشن کے پروگرام کا پتہ چلا تو اس نے دفتر سے رفعت حاصل کر لی تھی تا کہ پوری توجہ کے ساتھ للّی کی تیمارداری کر سکے اس کے دل و دماغ میں ایک ہی بات تھی کہ وہ للّی کو مرنے نہیں دے گا۔ اگر للّی مرگئی تو اس کی زندگی ادھوری ہوکر رہ جائے گی۔للّی کے بغیر زندگی کا تصور اسے ڈرانے لگتا۔ ایک ناتمام سراب اس کی آنکھوں کے سامنے ناچنے لگ جاتا۔ ایک آسیب اس کو ڈرانے لگ جاتا۔ وہ اکثر رات کو وصت کے عالم میں جاگرتا اور کہتا ''نہیں للّی میں تمہیں مرنے نہیں دوں گا۔تمہاری موت میری شکست ہوگی۔''[1]

للّی کا آپریشن ہوتا ہےلیکن اس کے باوجود بھی وہ مرض نہیں رکا للّی کے آپریشن کے بعد ایک دن جب ہریش چندر انتخابات سے فرصت پا کر للّی کی خبر لینے جاتا ہےتو وہ للّی سے بہت باتیں کرتا ہےللّی کو اب یہ معلوم ہو چکا تھا کہ وہ اب چند لمحوں کی ہی مہمان ہے اس لئے اس نے ہریش کو حوصلہ دیا۔ بہت ساری نصیحتیں کیں ہریش آخر تک یہ امید لگائے رہتا ہے کہ للّی کو کچھ نہیں ہوگا وہ بچ جائے گی جب للّی کی موت ہوتی ہے اس واقع کو ناول نگار نے یوں پیش کیا ہے:۔

''ہری کی پلکیں بوجھل ہو رہی تھیں۔اس کو نیند کی جھپکیاں آرہی تھی اور للّی بڑبڑائے جارہی تھی۔
بچپن میں ہم پریوں کا کھیل کھیلتے تھے سفید کرئسچن لباس پہن کر میں بالکل پریوں کی طرح لگتی تھی۔ مجھے سبھی پیار کرتے تھے اور پریاں مجھے بھی پیاری لگتی تھیں۔ اب میں پریوں کے پاس جاؤں گی ہری۔ اکیلی۔ بالکل اکیلی۔ان بادلوں کے پار۔ان بادلوں کے پار کہتے ہوئے للّی کی

[1] جیوتیشور پتھک۔کھڑکیاں۔ص۔۱۸۹۔ماوی پبلشرز جموں،۱۹۸۹

زبان لڑکھڑانے لگی اور رفتہ رفتہ خاموش ہوگئی۔ ہریش!
اس نے للّی کو جھنجھوڑا۔اس کی آنکھیں تھرا چکی تھیں۔وہ ٹکٹکی لگائے اس کی
طرف دیکھتی رہی۔
''نہیں للّی نہیں یہ نہیں ہوسکتا۔ یہ نہیں ہوسکتا۔میری شکست ہے یہ للّی یہ
میری شکست ہے''
شور سن کر نرس اندر آ گئی۔اس نے ہاتھوں سے کراس بنا کر اس نے للّی
کے لئے دعا کی۔تبھی للّی کی گردن ایک طرف لڑھک گئی تھی۔ ہریش
چندر روتا رہا۔آخر میں نرس نے اس کو الگ کرتے ہوئے کہا
''بی بریو جینٹلمین ۔گاڈ کا یہی مرضی تھا''
نرس نے اس کی آنکھوں کی پتلیاں بند کیں اور للّی کے مردہ جسم کو سفید
چادر سے ڈھانپ دیا دوسرے دن للّی کو شہر کے کرسچین قبرستان میں دفن
کر دیا گیا...... گورنر کی طرف سے پھول مالا بھیجی گئی تھی شہر کی اخباری
زندگی میں کھلنے والی چڑیا اب ہمیشہ کے لئے خاموش ہوچکی تھی۔ایک
کہانی بن چکی تھی۔''[1]

ہریش چندر کے دل میں جو للّی کے لئے محبت ہے وہ انتہائی شدت اختیار کرگئی ہوتی ہے وہ للّی کے انتقال کے بعد فرصت کے وقت میں قبرستان جا کر للّی کی قبر پر گھنٹوں بیٹھ کر روتا رہتا۔اس سے اس کے دل کو سکون پہنچتا تھا۔

جیوتیشور پتھک کے ناول کا پلاٹ مربوط ہے کردار نگاری مکالمہ نگاری اور منظر کشی ہر اعتبار سے ناول اپنی انفرادیت رکھتا ہے ناول میں پانچ کھڑکیوں کے تحت ناول نگار نے بڑی فنی چابکدستی سے چھوٹے چھوٹے ذیلی ابواب کے تحت کہانی تخلیق کی ہے جو حقیقت سے بالکل قریب نظر آتی ہے۔ناول میں کئی دوسرے کردار بھی ہیں جو ضمنی طور پر کہانی کو آگے بڑھانے کے لئے استعمال کئے گئے ہیں ناول میں منظر نگاری کے عمدہ نمونے ملتے

[1] جیوتیشور پتھک ۔کھڑکیاں ص۔۲۰۵۔مانوی پبلشرز جموں۔۱۹۸۹

ہیں ۔انہوں نے مکالمہ نگاری میں بھی اپنا کمال دکھایا ہےغرض جیوتیشور پتھک کا ناول کھڑکیاں اپنے موضوع و فن کے اعتبار سے ایک کامیاب ناول ہے یہاں یہ کہنا بے جانہ ہوگا کہ ریاست جموں وکشمیر کے غیر مسلم ناول نگاروں میں جیوتیشور پتھک کا نام سرفہرست ہےان کے تینوں ناول اپنے تمام تر فنی تقاضوں کو پورا کرتے نظر آتے ہیں۔ریاست جموں وکشمیر میں اردو ناول نگاری کی تاریخ میں جیوتیشور پتھک اپنے تین ناولوں کی بنیاد پر ہمیشہ یاد کئے جاتے رہیں گے۔

فاروق رینزو

ریاست جموں وکشمیر کے ناول نگاروں میں فاروق رینزو کا نام بھی شامل ہے فاروق رینزو ایک اپریل ۱۹۵۵ء کو سری نگر میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم مقامی اسکولوں میں حاصل کی۔ ایس پی کالج سے بی۔ اے کی ڈگری حاصل کی اسی کالج سے ان کے ادبی سفر کا آغاز ہوا۔ ایس پی کالج سے نکلنے والے میگزین کے ایڈیٹر بھی رہے علاوہ ازیں وہ کالج میں ہونے والی سیاسی سرگرمیوں میں بھی کافی متحرک رہے۔ ۱۹۷۶ء میں انھوں نے اعلیٰ تعلیم کے لئے کشمیر یونیورسٹی میں قدم رکھا۔ اپنے تخلیقی سفر کو جاری رکھتے ہوئے انہوں نے ایک ڈرامہ لکھا۔ جسے کافی مقبولیت حاصل ہوئی۔ اور فاروق رینزو کی حوصلہ افزائی میں اس ڈرامے نے اہم رول ادا کیا۔ اس طرح انہیں ادب سے جڑنے اور اپنی ادبی ذوق کی تشنگی بجھانے کا موقع ہاتھ آیا۔ کشمیر یونیورسٹی سے تعلیم مکمل کرنے کے بعد فاروق رینزو نے سرکاری ملازمت اختیار کی۔ انہوں نے ملازمت کے دوران ترقی کے کئی زینے بڑی تیز رفتار سے طے کئے۔ کشمیر ایڈمنسٹریٹو سروس (K A S) میں کامیابی حاصل کرنے کے بعد اہم عہدوں پر رہ کر نہایت ایمانداری سے کام کیا اردو شعر وادب سے انہیں خاص لگاؤ رہا انہیں کشمیری زبان میں بھی لکھنے کا ذوق پیدا ہوا کشمیری زبان میں بھی طبع آزمائی کی لیکن اردو زبان وادب کی ترقی کے لئے وہ ہمیشہ کام کرتے رہے ہیں۔

باقاعدہ طور پر ان کی ادبی زندگی کا آغاز افسانے سے ہوا۔ ان کا پہلا افسانوی مجموعہ ''ڈوبتے کنارے'' ۱۹۷۹ء میں زیور طبع سے آراستہ ہو کر منظر عام پر آیا۔ اس کے بعد اردو ناول میں پہلی بار ۱۹۸۲ میں طبع آزمائی کی اور ایک بہترین ناول ''زخموں کی سالگرہ'' سامنے آیا۔ دوسرا ناول ''انقلاب کا شہید'' ۱۹۸۸ء میں شائع ہوا۔ اس ناول کو انہوں نے بعد میں ''برف کے پھول'' کے عنوان سے بھی شائع کیا۔

ناول ''کشمیر جھیل جلتی ہے'' ۱۹۹۶ء میں شائع ہوا۔ فاروق رینزو تا حیات ہیں اور اپنی ادبی خدمات انجام دے رہے ہیں۔

زخموں کی سالگرہ:

یہ فاروق رینزو کا پہلا ناول ہے یہ ناول ایمنٹی انٹرنیشنل کلب برانچ سرینگر کی وساطت سے ۱۹۸۲ء میں زیورطبع سے آراستہ ہوکر منظر عام پر آیا۔ناول میں موجودہ دور کے ایک اہم مسئلے کوموضوع بنایا گیا ہے یہ مسئلہ طلبا کی بے چینی اوراضطراب ہے طالب علم دن بدن مایوسی کا شکار ہوتے جاتے ہیں اس انتشار، مایوسی اور ناامیدی کی کئی وجوہات ہیں عہد حاضر میں ٹوٹتی ہوئی انسانی قدریں اور ہماری زندگی کی پیچیدیاں ایک وجہ ہے۔علاوہ ازیں ایک دوسرے پرسبقت لے جانے کے جائز و ناجائز طریقے بھی اس مایوسی اورافراتفری کا حصہ ہیں۔ ناول کے 'حرف اول' میں مظہرامام لکھتے ہیں:۔

> ''زخموں کی سالگرہ' فاروقی رینزو کا پہلا ناول ہے۔لیکن اس کے وسیع کینوس کوانہوں نے جس طرح اپنے دائرہ اظہار میں سمیٹا ہے اس کے لئے وہ ہرطرح دادوتوصیف کے مستحق ہیں۔ ناول کا عنوان خوبصورت ہی نہیں معنی خیز بھی ہے اور ناول کے موضوع سے پوری طرح مطابقت رکھتا ہے۔''[۱]

ناول میں مصنف نے معاشرے کی برائیوں اور بدعنوانیوں کوحذف تنقید بنایا ہے اس کے علاوہ جہاں کہیں روشن پہلوآتے ہیں تو ان کا ذکر بھی بہت خوبصورتی اور بڑی بے با کی سے کیا ہے اس کے علاوہ تعلیمی اداروں میں افراتفری کا ماحول بنانے میں سیاست کی عملداری کا ذکر بھی ملتا ہے ساتھ ہی ساتھ ناول میں کئی رومان کی جولانیاں بھی دیکھی جاسکتی ہیں کئی رومان پروان چڑھتے اور پھر بکھر جاتے ہیں یہاں ناول نگار نے رومانی مناظرکواس لئے پیش کیا ہے تا کہ قصے کے لوازمات پورے ہوسکیں۔رومانی مناظرکوابھار کران سے لذت حاصل کرنا ناول نگارکا مقصد ہرگزنہیں ہے۔

مذکورہ ناول میں طلبا کے استحصال کی نقاب کشائی کرنے کی کوشش کی گئی ہے ناول کے اکثر واقعات ناول نگار کی زندگی سے مطابقت رکھتے ہیں یہ موضوع بہت حدتک تازہ اور نیا ہے ناول میں اکثر واقعات خود مصنف کے تجربوں کا حصہ ہیں۔تعلیمی اداروں میں ایسے بیشماراساتذہ اورطلبا ہروقت موجودرہتے ہین جواپنی

۱۔ حرف اول ازمظہرامام مشمولہ زخموں کی سالگرہ (ناول) ص۔۶ ایمنٹی انٹرنیشنل کلب برانچ سرینگر،۱۹۸۲ء

اعلیٰ اقدار کو عزیز رکھتے ہیں ان کے سامنے باد مخالف بھی ہو تب بھی وہ اپنی اقدار کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑتے۔ تعلیمی اداروں میں اکثر و بیشتر طلبا و طالبات کو سیاسی مقاصد کے لئے استعمال کیا جاتا ہے۔ یہ حالات آج بھی جاری ہیں جس کی مثالیں ہیں جامعہ ملیہ اسلامیہ، جواہر لال نہرو یونیورسٹی، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی وغیرہ۔ اس ناول میں فاروق ریزو نے کشمیر یونیورسٹی کے ماحول کی سچی تصویر پیش کی ہے کیوں کہ وہ اس یونیورسٹی میں رہ کر اس کا مشاہدہ کر چکے تھے۔ یہ ناول ان کے اپنے ہی تجربات پر مبنی ہے ناول کشمیر یونیورسٹی کے پس منظر میں لکھا گیا ہے ناول میں یونیورسٹی کے طالب علموں کو کس طرح سیاسی مقاصد کے لئے استعمال کیا جارہا ہے اس کو بڑی خوبصورتی سے پیش کیا ہے اور یونیورسٹی میں زیر تعلیم طلبا کی ذہنی تربیت کا بھی خیال رکھا گیا ہے چنانچہ ناول پر اصلاحی پہلو بھی غالب ہوتا ہے۔

ناول ''زخموں کی سالگرہ'' میں کردار نگاری بھی کمال کی ہے ناول کا مرکزی کردار احمد ہے یہ کافی ذہین کردار ہے اور اس کردار میں وہ تمام خوبیاں بھی موجود ہیں جو اسے ناول کا ہیرو بنانے کے لئے کافی ہیں۔ سیاست اور دوسرے معاملات میں کافی دلچسپی کا مظاہرہ کرتا ہے محبت کو وہ ابتدا میں فضول اور لغو سمجھتا ہے لیکن ناول کے اختتام تک آتے آتے محبت کی چنگاری اس کے دل کو اپنی گرفت میں لے لیتی ہے ناول کے اس کردار کے متعلق اقتباس ملاحظہ کیجئے:۔

> ''وہ ایک خوبصورت صحت مند نوجوان تھا۔ اس کا قد لمبا اور چھاتی چوڑی تھی۔ اس کے روشن ماتھے پر کالے بکھرے حسین بالوں نے اس کی شخصیت کو پرکشش بنا دیا تھا۔ یونیورسٹی کے اکثر لڑکے احمد کو رشک بھری نگاہوں سے دیکھتے تھے۔ اس کے مضبوط کردار اور اس کی غیر معمولی قابلیت نے اس کو یونیورسٹی کے مباحثے ہوں، کھیل ہوں یا امتحانات پہلی پوزیشن احمد کی ہی ہوتی ہے ایک بہترین طالب علم ہونے کے علاوہ احمد ایک بہترین اسٹوڈنٹ لیڈر بھی تھا۔''[1]

اس ناول کی ابتدا ایک ہنگامے سے ہوتی ہے حمید، خورشید اور پیارے لال کی رائے پر یہ سبھی طلبا وی۔

[1] فاروق ریزو، زخموں کی سالگرہ۔ ص۔۱۸۔ ایمٹی انٹرنیشنل کلب برانچ سرینگر، ۱۹۸۲ء

سی دفتر کے سامنے یہ مطالبہ کرتے ہیں کہ انہیں نقل کرنے کی اجازت دی جائے تا کہ وہ آسانی سے پاس ہوسکیں۔ان کا کہنا تھا کہ ہم آخر ڈگریاں حاصل کرنے کے لئے محنت کیوں کریں۔جب یہ ڈگریاں کسی کام کی ہی نہیں۔ایم۔اے اور پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کرنے پر بھی کون سی نوکری ملتی ہے۔ان کا کہنا تھا کہ ڈگریاں بازار میں بھی نہیں بکتی تو پھر ہم کیوں آخر خواہ مخواہ اپنی آنکھوں کی روشنی جلائیں۔طلبا کے اس ڈر کا کہ اتنی محنت کے بعد بھی کون سی نوکری مل جائے گی۔سیاسی لوگ بھرپور فائدہ اٹھاتے ہیں۔وہ سیاسی جماعتیں طلبا کا استعمال کر کے اپنے مقصد میں کامیاب ہونا چاہتی ہیں وہ سیاسی لوگ یہ چاہتے ہیں کہ کسی طرح امن پسند ماحول کو خراب کیا جائے تا کہ پھر سے انتخاب ہوں اور وہ اقتدار میں آسکیں۔لیکن ناول میں احمد، الفت اور شبنم کی دانشمندی نے ان سیاسی لوگوں کو اپنے اوپر حاوی نہیں ہونے دیا ناول میں سیاسی ورکروں میں سے ایک شبنم کا باپ مبشر ریاض ہے لیکن شبنم اپنے والد کی ہٹ دھرمی کا ذکر پولیس کے سامنے کرتی ہے کہ اس ساری کاروائی میں ان کے والد کا بہت بڑا ہاتھ ہے وہ اپنے والد کے متعلق کہتی ہے کہ وہ ہی ان غریب طالب علموں کو بہلا پھسلا کر یونیورسٹی کے حالات خراب کرنے کے اصل ذمہ دار ہیں وہ اپنے باپ کا سچ عیاں کرتی ہے اور دیانتداری کا ثبوت دیتی ہے دیکھئے اقتباس شبنم اپنے والد سے کس طرح ساری بات بڑی بہادری کے ساتھ کہتی ہے:

> ''ہاں ڈیڈی میں تمہاری سازشیں برداشت نہ کرسکی۔میں یہ برداشت نہ کرسکی کہ میرا باپ شہر کے ہزاروں لوگوں کا خون بہائے اور میں تماشا دیکھتی رہوں۔ڈیڈی میں یونیورسٹی میں ان نیچ اور غنڈوں کی مذمت کر کے تھکتی بھی نہ تھی جو وہاں کا امن درہم برہم کرتے تھے۔لیکن جب مجھے معلوم ہوا کہ میرا ہی باپ ان لڑکوں کو ایسا کرنے کے لئے پیسے دیتا ہے تو میرا سر شرم سے جھک گیا۔میں نے تمہیں گرفتار کروایا ڈیڈی۔''[1]

''زخموں کی سالگرہ'' ناول میں ایک اور کردار الفت بھی بڑی اہمیت کا حامل ہے اس کردار میں وہ تمام خوبیاں موجود ہیں جو ایک ناول کی ہیروئن میں عام طور پر ہونی چاہئیں۔الفت بھی کشمیر یونیورسٹی کی طالبہ ہے وہ قانون میں ایم۔اے کر رہی ہے۔وہ اپنے والد دلاور خان کی چہیتی بیٹی ہے۔دلاور خان اپنے وقت میں شہر کے

[1] فاروق ریزو۔زخموں کی سالگرہ،ص۱۵۷،ایمنٹی انٹرنیشنل کلب برانچ سرینگر،۱۹۸۲ء

رئیس لوگوں میں شمار ہوتا تھا۔ بیٹی کو ہمیشہ سے ہی نفرت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے بیٹی پیدا ہونا منحوس مانا جاتا ہے ناول میں فارق ریزنو نے اس مسئلے کو پیش کیا ہے دلاور خان کے ہاں جب بیٹی جنم لیتی ہے وہ دل ہی دل میں بہت پریشان ہوتا ہے جس کے اثرات اس کے چہرے سے بھی نمایاں تھے۔ اقتباس ملاحظہ کیجئے:

> ''......دلاور خان کو اپنی بیوی کے ساتھ حقیقی پیار ہو گیا۔ وہ اس دن بہت خوش ہوا۔ جب اس کی بیوی پہلی بار حاملہ ہو گئی۔ اسے یقین تھا کہ وہ ایک لڑکے کا باپ بن جائے گا لیکن اس وقت اسے بہت تکلیف ہوئی جب اس کی بیوی نے ایک لڑکی کو جنم دیا۔ دلاور خان کو لگا جیسے اسے کسی نے گالی دی ہو۔ دلاور خان نے اگرچہ اپنی بیوی سے کچھ نہ کہا پھر بھی اس کی پیشانی کی لکیریں اس کے غصے کا اظہار کر رہی تھیں۔''[1]

دلاور خان کی توجہ بعد میں اپنی بیٹی پر ہی ہوتی ہے کیوں کہ اس کی بیوی کا انتقال ہو جاتا ہے وہ اپنی بیٹی کو اب محبت کی نگاہ سے دیکھتا ہے اور بیٹی بھی آگے چل کر ایسے کارنامے انجام دیتی ہے کہ باپ کا سر فخر سے بلند ہو جاتا ہے۔

ناول ''زخموں کی سالگرہ'' کئی پہلوؤں کو اپنے اندر سمیٹے ہوئے ہے اس میں الفت اور احمد کی محبت کا واقعہ بھی ہے جب وہ کشمیر یونیورسٹی میں ایک دوسرے سے ملاقات کرتے ہیں تو محبت میں گرفتار ہو جاتے ہیں لیکن الفت اپنے خاندان اور مذہب کا لحاظ رکھتے ہوئے احمد کو سمجھاتی ہے کہ وہ سماج اور مذہب کے بنائے ہوئے قوانین توڑ نہیں سکتے۔ احمد بھی الفت کی باتوں کو مان لیتا ہے اس طرح دونوں سماجی قدروں کا خیال رکھتے ہیں کئی واقعات ایسے آتے ہیں جب ان کی شدید محبت انہیں بھٹکنے پر مجبور کرتی ہے لیکن یہ دونوں ہر آزمائش میں کھرا اترتے ہیں صبر و تحمل سے کام لیتے ہیں الفت کی باتیں احمد کے لئے کافی اہمیت رکھتی ہیں الفت احمد سے کہتی ہے:۔

> ''محبت کا انجام صرف شادی نہیں بلکہ شادی تو محبت کے سینے میں زہریلا خنجر گھونپنے کے مترادف ہے۔ شادی تو محبت کی ہار ہے جو ہارتے ہیں وہ

---

[1] فاروق ریزنو۔ زخموں کی سالگرہ۔ ص ۳۷۔ ایمنٹی انٹرنیشنل کلب برانچ سرینگر ۱۹۸۲ء

محبت نہیں کرتے۔ ہیر رانجھا، سوہنی مہیوال، لیلیٰ مجنوں اور وامق عذرا کے
قصے محبت کی سچی داستانیں ہیں کیوں کہ اس دنیا میں ان میں سے کسی کا
ملن نہ ہوسکا۔''[1]

جیسا کہ اوپر ہم نے اس ناول میں پیش کئے گئے مختلف واقعات کا مختصر سا خاکہ پیش کیا اس سے یہ واضح ہوتا ہے کہ فاروق رینز و اصلاح کے لئے یہ ناول تخلیق کر رہے تھے انہوں نے معاشرے کی برائیوں، سماجی قدروں، تعلیمی اداروں میں سیاسی لوگوں کی مداخلت وغیرہ جیسے بے شمار پہلوؤں کو اپنے ناول کا حصہ بنایا ہے ناول اپنے موضوع اور فن دونوں کے اعتبار سے کافی کامیاب نظر آتا ہے، ناول اپنی تمام تر خصوصیات کی بنا پر ایک اہم ناول تصور کیا جاتا ہے۔

انقلاب کا شہید:

انقلاب کا شہید فاروق رینزو کا دوسرا ناول ہے یہ ناول ۱۹۸۸ء میں بینش پبلی کیشنز جواہر نگر سے شائع ہوا۔ ناول ۲۱۰ صفحات پر مشتمل ہے ناول کا انتساب دانش اور بینش کے نام کیا ہے ناول کے شروع میں سابق وزیر اعظم جناب راجیو گاندھی کا فاروق رینزو کے نام ایک خط شامل ہے ملاحظہ کیجئے:

''نئی دہلی

۲۳ جون ۱۹۸۷ء

پیارے رینزو صاحب

آپ کے ۸ جون کے خط کے لئے میرا شکریہ قبول کیجئے میں بہت خوش ہوں کہ آپ کا نیا ناول آزادی کی لڑائی سے وابستہ ہے میں ذاتی طور پر اس کی کامیابی کے لئے اپنی نیک خواہشات بھیج رہا ہوں۔[2]

آپ کا اپنا

دستخط

راجیو گاندھی

---

[1] فاروق رینزو۔ زخموں کی سالگرہ۔ ص۔ ۱۷۲۔ ایمنٹی انٹرنیشنل کلب برانچ سرینگر، ۱۹۸۲ء

[2] خط از راجیو گاندھی مشمولہ ناول 'انقلاب کا شہید' ص ۵، بنیش پبلیکیشنز جواہر نگر۔ ۱۹۸۸ء

راجیو گاندھی کے خط کے ساتھ ہی ساتھ جنرل سکریٹری نیشنل کانفرنس شیخ نذیر احمد کا خط بھی شامل ہے اس خط کو بھی ملاحظہ کیجئے:۔

Jammu and kashmir National Confereuce.
Control Office
Mujahid Manzil Srinagar
Phone: 1500
Sub Office:
Nawa-i-subh complex
Srinagar, Kashmir
Dated: 23-04-1986

مجھے یہ سن کر انتہائی مسرت ہوئی کہ ادبی دنیا کے ایک جانے۔ پہچانے تخلیق کار جناب فاروق رینزو ایک تاریخی ناول لکھ رہے ہیں یہ قابل تحسین کارنامہ ہے اور مجھے پورا یقین ہے کہ ہماری آنے والی نسل اس ناول کے ذریعہ تحریک آزادی سے روشناس ہوگی اور انہیں گمنام شہید عظیم جنہوں نے آزادی کی قربان گاہ پر اپنی قیمتی جان قربان کی کے بارے میں جانکاری حاصل کرنے کا موقع ملے گا۔ مجھے امید ہے کہ یہ ناول ہمارے نوجوانوں میں قومیت اور سیکولرازم کے جذبات کو اجاگر کرے گا۔ ہماری ریاست نے ہمیشہ سیکولرازم اور فرقہ وارانہ ہم آہنگی دکھا کر دنیا کے لئے مثال قائم کی ہے میں جناب فاروق رینزو کی ناول کی کامیابی کے لئے دعا کرتا ہوں۔[1]

دستخط: شیخ نذیر احمد
جنرل سکریٹری نیشنل کانفرنس۔''

''انقلاب کا شہید'' اس ناول کا مرکزی کردار عظیم ہے جو ایک نہایت ہی غریب گھرانے سے تعلق رکھتا ہے عظیم کے والدین نقش نگاری کا کام کرتے تھے۔ دیکھئے یہ اقتباس:۔

[1] مکتوب از شیخ نذیر احمد مشمولہ ناول انقلاب کا شہید، ص۔۶، بنیش پبلیکیشنز جواہر نگر۔۱۹۸۸ء

''اس نوجوان کا نام تھا عظیم احمد۔ اس کی پیدائش ایک غریب گھرانے میں ہوئی تھی۔ اس کا باپ نقش نگاری کے کام میں ماہر تھا وہ اور عظیم کی ماں دن رات مختلف چیزوں پر نقش نگاری کرتے رہتے تھے۔ لیکن پھر بھی ان کے عیال کو پیٹ بھر کے کھانے کو نہیں ملتا تھا۔ عظیم ان کے آنگن کا ایک ہی پھول تھا۔ انہوں نے اپنی غربت کے باوجود اس پھول کو تعلیم کی خوشبو سے لبریز کرنے کی قسم کھائی تھی۔ انہوں نے عظیم کو ایک ایسے اسکول میں پڑھانے کے لئے بھیجا جو انگریزی ریذیڈنٹ کے قریبی ساتھی نے عیسائی مشینری کے نام پر شہر میں کھولا تھا۔ اس اسکول میں وادی کے بچوں کی تعداد بہت ہی کم تھی۔ کیوں کہ لوگ غربت کی وجہ سے اپنے بچوں کو اس اسکول میں تعلیم حاصل کرنے کے لئے نہیں بھیجتے تھے انہیں یہ بھی شک تھا کہ عیسائی ماسٹر ان کے بچوں کو اپنے آبائی مذہب سے بیگانہ بنا دیں گے۔ ممکن ہے کہ عیسائی ماسٹروں کا مقصد یہی رہا ہو لیکن جن بچوں نے وہاں تعلیم حاصل کی تھی کسی نے بڑا ہو کر اپنے مذہب کو تبدیل نہیں کیا۔''[1]

عظیم کے سکول میں داخلہ کی خبر شہر میں آگ کی طرح پھیل گئی تمام لوگوں نے عظیم کے والدین کو حقارت کی نظر سے دیکھنا شروع کیا۔ عظیم کے والدین نے لوگوں کی پرواہ کئے بغیر سب کچھ برداشت کرتے ہوئے عظیم کی تعلیم جاری رکھی۔ گھر میں اسے قرآن کی تعلیم پابندی سے دی جاتی تھی اور وہ نماز کا پابند رہا۔ اسکول کی اعلیٰ تعلیم اور ماحول نے عظیم کی زندگی میں اہم تبدیلی پیدا کی۔ اسے زندگی کے اچھے آداب اور اخلاق سیکھنے کا موقع ملا۔ اس طرح بہت جلد ہی اس نے محلے والوں کو اپنے آداب اور اخلاق سے اپنا گرویدہ بنا لیا۔ انسانیت اور قوم پرستی کا جذبہ اس کے اندر کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا۔

عظیم کو اپنی بچپن کی ایک نیکی یاد ہے جب اس نے ایک اندھے شخص کو سڑک پار کرنے کے لئے سہارا دیا لیکن اس پار پولیس کے سپاہی نے اس اندھے شخص کو ایک زوردار ڈنڈا مارا وہ سپاہی شراب پی کر گزر رہا تھا۔

[1] فاروق رینزو۔ انقلاب کا شہید۔ ص۔ ۳۹، بنیش پبلیکیشنز جواہر نگر، ۱۹۸۸ء

چنانچہ عظیم کواس سپاہی پر بہت غصہ آیا کہ اس نے اس اندھے شخص کو کیوں مارا۔اس نے اس شرابی سپاہی کو پیٹنا شروع کیا۔اتنے میں اس سپاہی کے دوسرے ساتھی بھی اس کو بچانے کے لئے آتے ہیں اور پھر عظیم اور اندھے شخص کواور مارنا شروع کر دیا پھر وہ سپاہی عظیم کواس کے گھر لے گئے اس کے باپ کو بھی مارنا شروع کیا۔عظیم نے ان سے پوچھا کہ کیوں مار رہے ہو میرے بے گناہ باپ کو تو انہوں نے جواب دیا کہ اس نے ایک باغی یعنی عظیم کو جنم دیا ہے یہ غلاموں کی وادی ہے اور یہاں ہر آدمی غلام ہے غلاموں کی اس وادی کو مہاراجہ پرتاپ سنگھ کے دادا مہاراجہ گلاب سنگھ نے ۷۵ لاکھ روپیہ کے عوض خریدا ہے۔دیکھئے اقتباس:۔

''اس نے ایک باغی کو جنم دیا۔ یہ غلاموں کی وادی ہے اور یہاں کا ہر باشندہ غلام ہے۔ غلاموں کی اس وادی کو مہاراجہ پرتاپ سنگھ کے دادا مہاراجہ گلاب سنگھ نے ۷۵ لاکھ روپیہ کے عوض خریدا ہے یہاں جو بھی آواز ابھرے گی ہم اس کو دبائیں گے۔جس غلام کی آنکھیں اوپر اٹھیں گی ہم انہیں پھوڑ دیں گے......تم نے مہاراجہ کے سپاہی پر ہاتھ اٹھایا اس کی سزا نہ صرف تمہیں بلکہ تمہارے باپ کو بھی ملے گی۔تمہیں مٹانے سے پہلے ہم اس شخص کو مٹائیں گے جس کا خون تمہاری رگوں میں دوڑ رہا ہے سپاہیوں کے سردار نے اس سے کہا۔''[1]

عظیم نہایت ہی ذہین، محنتی اور فرمانبردار بیٹا ہے جو ہر طرح سے اپنے والدین کی خواہشات کو پورا کرنے کی کوشش کرتا ہے عظیم جب علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے بی۔اے میں امتیازی نمبرات حاصل کر کے کامیابی حاصل کرتا ہے اور پھر اس کا داخلہ ایل ایل۔بی میں بھی ہو جاتا ہے تو وہ اس کی خبر فوراً گھر میں بذریعہ خط پہنچاتا ہے۔علی گڑھ میں رہ کر عظیم کی زندگی میں ایک نیا موڑ تب آتا ہے جب اس کے گھر سے پچھلے تین چار ماہ سے خطوط آنا بند ہو جاتے ہیں دیکھئے اقتباس وہ کس طرح کی پریشانیوں سے دوچار ہوتا ہے:۔

''عظیم کے گھر سے پچھلے کئی مہینوں سے کوئی خبر نہیں آئی تھی۔اس نے اپنے باپ کو خطوط بھیجے تھے لیکن پچھلے تین چار مہینوں سے کوئی جواب نہ

[1] فاروق ریزو۔انقلاب کا مشہور،ص۔۴۳۔بنیش پبلی کیشنز جواہر نگر۔۱۹۸۸ء

ملا۔عظیم نے جب سے علی گڑھ یونیورسٹی میں داخلہ حاصل کیا تھا تب سے وہ گھر واپس نہ جاسکا تھا۔گھر جانے کے لئے اس کے پاس خرچہ بھی نہیں تھا اور وہ ہمیشہ تعلیمی سرگرمیوں میں مصروف رہتا تھا۔یونیورسٹی میں اس نے کئی سال اسی طرح گزارے اور ان سالوں میں اسے اپنے باپ کی طرف سے مسلسل خطوط ملتے رہے۔ پھر اچانک خطوں کا سلسلہ بند ہوگیا۔عظیم کی پریشانی بڑھنے لگی۔ادھر ایل ایل بی کا سہ ماہی سمسٹر کا امتحان بھی نزدیک آنے لگا لیکن گھر سے کوئی خط نہیں آیا۔عظیم کی پریشانی انتہا کو پہنچنے لگی کہ اچانک وادی سے خط آیا۔ یہ خط کاشی ناتھ نے لکھا تھا۔ کاشی ناتھ عظیم کے محلے میں رہتا تھا جو ایک عرائض نویس تھا۔چند پیسوں کے عوض خط لکھنا اور پڑھنا اس کا کاروبار تھا۔جب عظیم نے اپنے باپ کو ایل ایل بی کے آنے والے امتحان کے متعلق لکھا تو یہ خط کاشی ناتھ تک پہنچا کاشی ناتھ نے اپنے ہاتھوں سے آج انسانیت کے ناطے اور بغیر کسی معاوضے کے اپنی جیب کے پیسوں کے ٹکٹ لگا کر عظیم کو خط لکھا۔جس میں عظیم کو اس کے باپ کے مرنے کی خبر لکھی تھی۔ یہ خبر سن کر عظیم کے سر پر جیسے آسمان ٹوٹ پڑا۔اس نے اپنی تعلیم چھوڑ کر گھر آنے کا فیصلہ کیا۔''[1]

عظیم گھر آتا ہے اس کی شادی شملہ سے ہوتی ہے ایک دوسرے سے دونوں بے حد محبت کرتے ہیں لیکن مہاراجہ نے عظیم کو مارنے کے لئے عالی شاہ کو حکم دیا تھا۔عالی شاہ نے اپنی بیوی ترانہ کے ذریعے عظیم کو سہاگ رات کے دن ہی سازش کے ذریعے باہر بلوایا۔کیوں کہ سہاگ رات میں ہی عظیم کے سامنے ترانہ اپنی پریشانی لے کر پہنچتی ہے وہ اسے بار بار کہتی ہے کہ میرے ساتھ چلو۔ادھر شملہ کافی پریشان ہے کہ اس طرح سہاگ میں ایک غیر عورت کے ساتھ عظیم کیسے جاسکتا ہے لیکن عظیم ایک صاف دل اور انقلاب ذہن لئے ہوئے ہے وہ ہر کسی کی پریشانی میں مدد کرتا ہے ترانہ اندر اسے فورس کر کے باہر لائی اور باہر ترانہ کا شوہر عالی شاہ کھڑا

[1] فاروق رینزو۔انقلاب کا شہید۔ص ۵۴،ہنیش پبلی کیشنز جواہر نگر۔۱۹۸۸ء

انتظار کر رہا تھا۔ عظیم کو باہر آتے دیکھ کر خوش ہوا۔ عظیم کے باہر آتے ہی اسے اس طرح جھپٹ کر دبوچ لیا کہ وہ سسکی بھی نہ لے سکا۔ عظیم کو وہاں سے لے جا کر ایک کالی اندھیری کوٹھری میں بند کر دیا تھا بند کوٹھری میں عظیم تین دن تک بھوکا پیاسا کراہتا رہا پھر بیہوش ہو کر گر پڑا۔ مہاراجہ اور عالی شاہ آتے ہیں مہاراجہ کے حکم سے عالی شاہ اس پر بہت تشدد کرتا ہے اس کے بازو کاٹتے ہیں اس کا خون ہی اس کے منہ میں ڈالتے ہیں لیکن عظیم کی بہادری دیکھئے اس حالت میں بھی جب اسے عالی شاہ اس طرح کی سزا دیتے ہوئے کہتا ہے کہ مہاراجہ کے قدموں میں گر کر موت کی بھیگ مانگو تو عظیم ایک نعرہ لگاتا ہے ''انقلاب زندہ باد۔ آزادی ہمارا حق ہے'' اس کے بعد مہاراجہ مشعل عظیم کے چہرے کے قریب کرتا ہے عظیم کا جسم جلنے لگتا ہے وہ جھلس جاتا ہے لیکن اچانک بجلی کی پھرتی عظیم کے جسم میں آتی ہے وہ اٹھ کر مہاراجہ کی طرف بڑھنے لگتا ہے۔ مہاراجہ اور عالی شاہ دونوں اسے دیکھ کر ڈر جاتے ہیں لیکن عظیم چونکہ بری طرح جل چکا تھا اس لئے وہ جلد ہی گر گیا اب عالی شاہ قریب جا کر اس کے سینے پر کان رکھ کر اس کی دھڑکن سنتا ہے دیکھئے اقتباس:۔

> ''عالی شاہ جو دور بھاگ گیا تھا وہ نزدیک آ گیا۔ عظیم کو فرش پر دیکھ کر اسے تھوڑا اطمینان ہوا۔ وہ عظیم کے پاس پہنچا اس کے سینے پر کان رکھ کر دل کی دھڑکن سننے کی کوشش کی۔
>
> دل کی دھڑکن بند ہو چکی تھی۔
>
> عظیم مر چکا تھا۔ ایک مجاہد انقلاب کا شہید ہو گیا۔ گمنام شہید۔ جس کے بارے میں کوئی نہ جان سکا۔
>
> عالی شاہ رازدارانہ انداز میں مہاراجہ سے کہنے لگا۔
>
> ''حضور یہ باغی مر چکا ہے۔''[1]

عالی شاہ کے ہاتھوں بعد میں ترانہ اور پھر شملہ بھی قتل ہوتی ہیں انہیں بھی بہت برے طریقے سے اذیتیں دے دے کر مارا جاتا ہے۔ انقلاب کا شہید میں فاروق رینزو نے ان جیتے جاگتے کرداروں کے ذریعے جو حق پر ہیں سچ پر ہیں اور اپنی بات ظالموں کے ظلم کی پرواہ کئے بنا سچ سچ کہتے ہیں پورے معاشرے کی

[1] فاروق رینزو۔ انقلاب کا شہید۔ ص ۱۶۴۔ بنیش پبلیکیشنز جواہر نگر۔ ۱۹۸۸ء

یعنی کشمیری عوام کی زندگی کی خوبصورت تصویر کشی کی ہے۔انقلاب کا شہید ناول اپنے اندر تمام فنی تقاضوں کو سمیٹے ہوئے ہے ناول پلاٹ قصہ،کردار نگاری کئی جگہ بے جا طوالت قاری کے لئے مایوسی کا باعث بنتی ہے۔

کشمیر جھیل جلتی ہے:۔

فاروق رینزو کا یہ ناول ۱۹۹۶ء میں ویلی بک ہاؤس سرینگر سے شائع ہوا۔ناول کا انتساب انجم کے نام کیا گیا ہے اس ناول میں مصنف نے اپنے قلم اور وسیع مشاہدے کا لوہا منوایا ہے ناول ۱۶۵ صفحات پر مشتمل ہے اس ناول کے کل چودہ ابواب ہیں۔ناول کے ذریعے سرزمین کشمیر میں پروان چڑھ رہی بدعنوانیوں،لاقانونیت اور بدحالی کی تصویر دکھانے کی کوشش کی ہے۔ناول میں کئی موضوعات پر بات کی گئی ہے پولیس اور سیاست دانوں کی ملی بھگت سے جرائم پیشہ طبقے کی بھی بھرپور عکاسی ملتی ہے۔ناول کے بارے میں منصور احمد اپنے ایک مضمون میں لکھتے ہیں:۔

> ''کشمیر جھیل جلتی ہے،ان کا تازہ ترین ناول ہے یہ ایک سماجی اور اصلاحی ناول ہے جس میں مصنف نے فریب،ریا،لالچ اور بے چہرگی کے مکروہ پہلو خاص طور سے ابھارے ہیں اس ناول میں مصنف کے لب و لہجے میں زبردست تلخی گھلی ہوتی ہے۔''[۱]

ناول میں فاروق رینزو نے ریاکاروں اور مکاروں کے چہرے سے نقاب اتارنے کی کوشش کی ہے ناول کی کہانی جمال کے گرد گھومتی ہے جمال ناول کا مرکزی کردار ہے جمال ایک جوشیلا اور ذہین نوجوان ہے جس کے اندر وہ تمام خصوصیات موجود ہیں جو ایک ناول کے ہیرو کے لئے ضروری خیال کی جاتی ہیں جمال کے متعلق فاروق رینزو ناول کے شروع میں لکھتے ہیں:۔

> ''جمال کی آنکھوں سے شعلے نکل رہے تھے۔زبان بھیڑیئے کی طرح باہر لٹک رہی تھی۔سرخ زبان سے ٹپکتی لال خون کی تپش سے سفید جھاگ میں تبدیل ہو چکی تھی۔وہ پھر اژدھے کی طرح پھنکار اٹھا۔لوہے کی سفید کلہاڑی ایک بار پھر ہوا میں چمکی۔''[۲]

---

۱ ''شیرازہ''ریاست جموں و کشمیر میں اردو ادب کے پچاس سال۔ص۔۱۸۵۔۱۹۹۸

۲ فاروق رینزو،کشمیر جھیل جلتی ہے ص۔۱۔ویلی بک ہاؤس سرینگر۔۱۹۹۶ء

جمال کے علاوہ ثریا بھی اس ناول میں مرکزی کردار کی حیثیت رکھتی ہے۔ جمال ثریا کی محبت میں گرفتار ہے جمال اور ثریا بچپن سے ایک ساتھ پلے بڑے تھے دونوں بچپن میں مولوی صاحب کے پاس اکٹھے قرآن سیکھنے جاتے تھے۔ دونوں ایک ہی سرکاری اسکول میں پڑھے جمال کا باپ جمال کی پیدائش سے ایک ماہ قبل انتقال کر گیا تھا جب کہ ثریا ایک یتیم لڑکی تھی۔ جمال کی پرورش اس کی ماں نے بڑی ناز ونعمت سے کی۔ جب کہ ثریا کی پرورش ان کے چچا نے کی تھی۔ جمال غریب ہے لیکن اس کے اندر محبت کے پاک جذبات ہیں وہ ثریا کو دل و جان سے چاہتا ہے۔ ثریا کے لئے دنیا کی کسی بھی طاقت سے لڑنے کے لئے تیار ہے دوسری طرف ثریا دولت وثروت کو ترجیح دیتی ہے وہ مال و دولت اور جاہ وحشمت کے لئے بوڑھے سلام سے شادی کر لیتی ہے ثریا سچی محبت کو ٹھکرا دیتی ہے ثریا سلام کی بیوی بن کر بنگلوں میں ضرور رہنے لگتی ہے وہ محبت کے لئے ترستی رہتی ہے لیکن جاہ وحشمت کی خاطر وہ اپنی خواہش کو دباتی ہے ثریا کے متعلق اقتباس:۔

> ''ثریا سلام کے تحفے قبول کر کے تم جمال کی محبت کے ساتھ دھوکہ کر رہی ہو۔ سلام کا مقصد کچھ اور ہے، ثریا کا ضمیر کئی بار چیخ اٹھا تھا ثریا نے ہر بار ضمیر کی اس آواز کا گلا گھونٹ دیا۔ ثریا کو سلام کی دولت میں اس کی شان و شوکت میں اپنے حسین خواب دکھائی دے رہے تھے۔ ان خوابوں میں ایک ہی کمی تھی وہ تھی جمال کی جمال اور یہ ساری دولت اگر ایک ساتھ ہوتی تو ثریا خود کو دنیا کی سب سے خوش قسمت عورت سمجھتی۔''[1]

جمال اپنی ماں سے اپنی محبت کی بات اس وقت کہتا ہے جب جمال کی بوڑھی ماں جمال سے کہتی ہے کہ میں مرنے سے پہلے اپنی بہو کو دیکھنا چاہتی ہوں دیکھئے یہاں مکالمہ نگاری کی بھی بہترین مثال ملتی ہے۔ جمال کی ماں اور جمال ایک دوسرے سے کچھ یوں محو گفتگو تھے:۔

> ''ماں ایک بات کہوں! جمال نے بیمار ماں سے کہا''
>
> ''ہاں کہو بیٹا! فاطمہ نے کھانستے ہوئے کہا''
>
> ماں میں نے تمہاری بہو کو ڈھونڈ لیا ہے۔ جمال نے پہلی بار ماں سے کہا

---

[1] فاروق رینزو، کشمیر جھیل جلتی ہے ص ۵۴۔ ویلی بک ہاؤس سرینگر۔ ۱۹۹۶ء

''سچ! لاغر فاطمہ کے چہرے پر خوشی کے آثار نمودار ہوئے۔

''ہاں ماں۔ میں ثریا سے شادی کرنے والا ہوں'' جمال نے کہا۔

''آؤ جمال میں تمہارا ماتھا چوم لوں۔ ماں نے حسرت بھری آواز میں کہا اس کے ساتھ ہی جمال کے سر کو پکڑ کر قریب لایا اور اس کے ماتھے پر ممتا سے بھرپور ایک بوسہ ثبت کر دیا۔''

''چلو بیٹا میں آج ابھی ثریا کے گھر جا کر اسے اپنے لئے مانگوں گی۔ نکاح جلد پڑھ لو پھر دیر ہو جائے گی اور میری حسرت میرے ساتھ قبر میں دفن ہو جائے گی۔''[1]

مذکورہ بالا اقتباس سے ماں کے جذبات اس کی خواہشات اور اس کی حسرتوں کی عکاسی ملتی ہے ماں کس طرح سے اپنے بیٹے کی شادی کے لئے کوشاں رہتی ہے وہ چاہتی ہے کہ اپنی زندگی میں ہی اپنے بیٹے کی شادی خود اپنے ہاتھوں سے کرائے۔ وہ جمال سے ثریا کا سنتے ہی ثریا کو حاصل کرنے کے لئے جمال سے بضد ہو جاتی ہے اور فوری شادی کرنے کے لئے اصرار کرتی ہے۔ اس سے ماں کی ممتا ظاہر ہوتی ہے۔

جمال کو جب محبت میں ناکامی کا منہ دیکھنا پڑتا ہے تو وہ شرافت سے آگے بڑھ کر دولت کمانے کے لئے مجبور ہوتا ہے اور چاہتا ہے کہ ثریا کو بتا سکے کہ دولت کمانا کوئی بڑی بات نہیں ہے لیکن سچی محبت کم ہی ملتی ہے۔

جمال اور ثریا کی محبت کی داستان کے علاوہ اس میں رشید اور سلیمہ کی کہانی بھی ملتی ہے ان دونوں کرداروں میں بھی محبت کی کہانی اور پھر دولت عزت اور خاندان کو دکھانے کی کوشش کی گئی ہے۔ یہاں پر ناول نگار نے ایک عورت کا دوسرا روپ دکھانے کی سعی کی ہے۔ رشید جو ناجائز باپ کی اولاد ہے اس کے برعکس سلیمہ کافی خوبصورت اور اعلیٰ خاندان سے تعلق رکھتی ہے۔ لیکن سلیمہ یہاں اپنی سچی محبت کا ثبوت دیتی ہے وہ یہ سب جاننے کے باوجود کہ رشید ناجائز باپ کی اولاد ہے تب بھی دل و جان سے اس سے پیار کرتی ہے۔ وہ رشید کا ہو جانا چاہتی ہے لیکن اس کے والدین اس رشتے کے لئے راضی نہیں سلیمہ کا باپ اس رشتے کے لئے تیار نہیں کیوں کہ وہ اپنی بیٹی کی شادی اپنے برابر کے کسی خاندان میں کرنا چاہتا ہے۔

جب رشید اور سلیمہ کے رشتے میں سلیمہ کا باپ رکاوٹ بنتا ہے تو سلیمہ اور رشید دونوں خود خواجہ طارق

---

[1] فاروق ریئز و۔ کشمیر جھیل جلتی ہے۔ ص۔ ۵۵۔ ویلی بک ہاؤس۔ ۱۹۹۶ء

کے پاس جاتے ہیں تا کہ نکاح کرلیں لیکن بدقسمتی سے خواجہ طاروقی ثریا کے باپ کا دوست ہوتا ہے اور اس معاملے کی خبر ملتے ہی رشید کو حوالات میں بند کر دیا جاتا ہے اور سلیمہ پر اس کا باپ ظلم و جبر کرتا ہے اسے طرح طرح کی اذیتیں دیتا ہے رشید کو دس سال کی سزا سنائی سکتی تھی انسپکٹر اکرم رشید کو بار بار سمجھانے کی کوشش کرتا ہے کہ وہ سلیمہ کو بھول جائے اور اپنے خاندان میں کسی سے شادی کرے لیکن رشید نے انسپکٹر کی ایک بھی نہ سنی۔ ایک دن اچانک انسپکٹر کے نمبر پر کال آتی ہے وہ کال دراصل سلیمہ کی ہوتی ہے وہ رشید سے دعا سلام کے بعد اپنے اوپر ہورہے ظلم کی واردات سنانے لگتی ہے اتنے میں سلیمہ کے فون کو کوئی زور سے پھینک کر توڑ دیتا ہے وہ سلیمہ کی لعن طعن کرتا ہے رشید یہ سب سن کر پریشان ہوجاتا ہے وہ انسپکٹر سے عرض کرتا ہے کہ اسے چھوڑ دیا جائے ورنہ میری سلیمہ کو مار دیا جائے گا۔ انسپکٹر اکرم سلیمہ کی ساری بات سن چکا تھا اب دونوں کی سچی محبت اور ان کے ساتھ ہورہے ظلم سے پریشان ہوکر وہ رشید کو رہا کرنا چاہتا تھا لیکن قانون اسے یہ کرنے کی اجازت نہیں دیتا تھا اس لئے وہ یہ نہیں کر پایا۔ ادھر کچھ دیر میں ایڈوکیٹ اشرف پولیس اسٹیشن کے گیٹ پر آ کر کہتا ہے کہ اس لڑکے کو چھوڑ دیا جائے۔ انسپکٹر ایڈوکیٹ سے یہ جاننے کے بعد کہ رشید کی رہائی کے لئے دس لاکھ کی ضمانت دے کر شہر کے ایک معزز شہری نے رشید کو رہا کرنے کی بات کی ہے یہ معزز شخصیت جمال کی ہے جو خود بھی سچی محبت کرتا ہے اور سچی محبت کرنے والے اس جوڑے کے لئے بھی اپنی پوری کوشش کرتا ہے اور دس لاکھ کی ایک بڑی رقم رشید کی ضمانت کے لئے پیش کر کے اس کی ضمانت کراتا ہے۔

ناول میں فاروق ریزو نے سماج کے مختلف اچھے اور برے لوگوں کی طرز زندگی اور ان کی سوچ وفکر کو پیش کرنے کی کوشش کی ہے اور یہ واضح کرنا چاہا ہے کہ دولت ہی سب کچھ نہیں بلکہ ایمانداری، دیانتداری، انسانیت سے انسان کی پہچان ہوتی ہے انسان کا دولت کے چکر میں اچھے رشتوں کو کھودینا غلط ثابت کیا ہے۔ اس ناولٹ میں محبت کی مختلف کہانیاں پیش کی گئی ہیں جن کے ذریعے سچی محبت، دولت عزت، غرض سماج میں ہونے والی اس طرح کی برائیوں کو بے نقاب کرنے کی کوشش کی ہے۔

ناول 'کشمیر جھیل جلتی ہے' فاروق ریزو کا ایک بہترین ناول میں ہے ناول میں مختلف واقعات مسلسل چلتے ہیں واقعات کو ایک دوسرے سے پیوست کرنے میں بھی فاروق صاحب نے اگرچہ کافی محنت سے کام لیا ہے لیکن کہیں کہیں واقعات کی پیچیدگی جھول کا سبب بنتی ہے۔ مکالمے طویل بھی ہیں جاندار بھی ہیں۔ مجموعی طور پر ناول 'کشمیر جھیل جلتی ہے' موضوع اور فن دونوں اعتبار سے ایک کامیاب ناول ہے۔

باب پنجم

ریاست جموں و کشمیر میں اردو ناول

۲۰۰۰ء سے تا حال

(۱) آنند لہر
(۲) ترنم ریاض
(۳) عبدالرشید راگیر
(۴) شبنم قیوم
(۵) نعیمہ احمد مہجور
(۶) حامدی کاشمیری
(۷) وحشی سعید
(۸) شفق سوپوری

آنندلہر

ریاست جموں وکشمیر کے غیر مسلم فکشن نگاروں میں سے آنندلہر بھی ایک اہم نام ہے۔آنندلہر کا پورا نام شام سندر آنند ہےاورلہر تخلص ہے۔آنندلہر کی پیدائش صوبہ جموں کی ضلع پونچھ میں ۲جولائی ۱۹۵۱ء میں ہوئی۔ ان کے والد کا نام شری بلراج آنند تھا جومحکمۂ مال میں بطور گرداور تعینات تھے۔آنندلہر کی ابتدائی تعلیم اپنے وطن پونچھ میں ہوئی اور گورنمنٹ کالج پونچھ سے بی۔ایس۔ای کیا۔بعد میں جموں یونیورسٹی سے۱۹۷۳ء میں انہوں نے ایل۔ایل۔بی کی ڈگری حاصل کی۔طالب علمی کے زمانے میں آنندلہر نے پونچھ کالج اور جموں یونیورسٹی کے کئی مباحثوں میں نمائندگی کی اورسکریٹری کی حیثیت سے اپنے فرائض بحسن وخوبی انجام دیئے۔آنندلہر کے بڑے بھائی شیورتن علی گڑھ یونیورسٹی سے ایم اے۔ایل ایل بی کی ڈگری حاصل کرنے کے بعد جوانی کے عالم میں اس دنیائے فانی سے رخصت ہوئے جوادبی ذوق وشوق رکھنے کے باوجود کوئی ادبی کارنامہ انجام نہ دے سکے۔اس کے برعکس آنندلہر نے اپنی تعلیم کے دوران ہی اپنے جوہر دکھانے شروع کر دیئے تھے۔ان کا پہلا افسانہ ''پتھر کے آنسو'' کے نام سے پہلی بار کالج میگزین میں شائع ہوااور خوب داد وتحسین حاصل کی اس کے علاوہ انہوں نے ایک ڈرامہ ''سرحد کے پہلے'' لکھا جو کالج کے اسٹیج پر کھیلا گیا۔

آنندلہر ملک کے ادبی حلقوں میں اس وقت متعارف ہوئے جب ان کا پہلا ناول ''اگلی عید سے پہلے '' ۱۹۹۷ء میں زیور طبع سے آراستہ ہو کر منظر عام پر آیا۔آنندلہر کے افسانے بھی ملک کے بیشتر ادبی رسائل میں مسلسل شائع ہوتے رہے جن میں ماہنامہ ''شاعر'' ممبئی،ماہنامہ ''انشا'' کلکتہ اور ماہنامہ ''آجکل'' دہلی قابل ذکر ہیں ان کا ایک افسانوی مجموعہ ۲۰۰۱ء میں ''سرکے اس پار'' کے نام سے شائع ہوا۔۲۰۰۲ء میں ایک اور افسانوی مجموعہ ''انحراف'' شائع ہوا۔آنندلہر کا دوسرا ناول ۲۰۰۲ء میں منظر عام پر آیا۔جس کا نام ''سرحدوں کے بیچ'' ہے یہ ناول کافی مقبول ہوااورادبی حلقوں میں کافی پسند کیا گیا۔ان کے ڈراموں کے مجموعے ''نروان'' اور ''تپسوی کون'' ہیں جو شرف قبولیت حاصل کر چکے ہیں ان مجموعوں کے علاوہ ان کے بہت سے افسانے ملک کے مختلف

رسائل وجرائد میں اور اخباروں میں شائع ہو چکے ہیں جو ان کے کسی افسانوی مجموعے میں شامل نہیں ہیں۔آنند لہر پیشے سے وکیل تھے۔ایک ادیب اور سماجی کارکن کے علاوہ وہ ایک بڑے قانون داں بھی تھے۔ان کا شمار ملک کے ممتاز افسانہ نگاروں میں ہوتا تھا۔ان کی گراں قدر ادبی خدمات کے لئے انھیں ادبی اور ثقافتی تنظیموں نے انعامات اور اعزازات سے بھی نوازا۔جن تنظیموں کی وجہ سے انھیں انعامات سے نوازا گیا ان میں راجستھان اردو اکیڈمی ، اتر پردیش اردو اکیڈمی ، میر اکیڈمی لکھنؤ' جموں وکشمیر اردو فورم ایوارڈ' امریکن بائیوگرافیکل انسٹی ٹیوٹ ایوارڈ۔جموں یونیورسٹی اردو پروفیشنل کورس کی طرف سے اعزاز نمی ڈوگری سنسھتان جموں ایوارڈ ، رسا جاودانی میموریل سوسائٹی ، پراچین کلا کیندر چندی گڑھ۔سنگیت ناٹک اکیڈمی ، اڑیسہ ایوارڈ اور جموں کی سب رنگ تنظیم ادبی کنج خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔آنند لہر نے کئی اردو سیریل بھی لکھے۔آنند لہر ایک فنکشن نگار ہونے کے علاوہ ایک مشہور وکیل بھی تھے اس لئے انتہائی مصروفیات کے باوجود بھی پرورش لوح وقلم میں بھی سرگرم اور متحرک نظر آتے تھے۔

جموں وکشمیر اور عدالت عظمیٰ نے انھیں سال ۱۹۹۶ء میں سینئر ایڈوکیٹ کا درجہ دیا گیا۔وہ انجمن ترقی اردو ہند کے لیگل سیل اور جموں وکشمیر یونیورسٹیوں کی طرف سے اردو زبان کے فروغ سے متعلق کمیٹی کے ممبر رہے اور حلقۂ فکر وفن کے بانی اور ممبر بھی رہے۔

آنند لہر کے ادبی سفر کے آغاز اور ان کی ادبی تخلیقات کے متعلق اظہار خیال کرتے ہوئے دیپک بُد کی یوں اقمطراز ہیں:

> ''آنند لہر کی پہلی کہانی 'پتھر کے آنسو' کالج میگزین میں غالباً ۱۹۷۲ء میں شائع ہوئی تھی۔جہاں تک ان کے نظریے کا تعلق ہے انھوں نے ترقی پسندی سے اپنے ادبی سفر کا آغاز کیا اور پھر وقت کے مطالبے کے زیر اثر جدیدیت کی بھول بھلیوں میں کھو گئے مگر حال ہی میں اس طلسم سے باہر نکل کر انھوں نے دوبارہ حقیقت پسندی کی طرف مراجعت کی ان کا یہ سفر کافی دلچسپ رہا اور ان تجربوں سے انھوں نے ادب کی کئی جہتوں کی بازیافت بھی کی۔جدیدیت پسند ہونے کے سبب انکے افسانوں میں

تجریدی رنگ صاف نظر آتا ہے۔ علامتوں کا برمحل استعمال کرنے کا ہنر آنندلہر میں بدرجہ اتم موجود ہے۔ سوچ وفکر کے اس بدلاؤ کے باوجود ان کے افسانوں میں کرشن چندر کی طرح رومانی فضا، پلاٹ اور کردار ملتے ہیں جبکہ نظریاتی طور پر ان کے افسانوں میں تصوراتی، مثالیت پسند اور عینیت پسند زیریں لہریں رواں رہتی ہیں۔ ہندو اساطیر سے وہ کافی مدد لیتے ہیں اور اپنے افسانوں میں سیاسی وسماجی طنز کا استعمال کرتے ہیں البتہ یہ طے ہے کہ وہ رجائیت پسند ہیں اور ہر اندھیرے میں روشنی کی کرن ڈھونڈتے ہیں سرحد کے نزدیک رہنے کے سبب انھیں وہاں کی تناؤ بھری زندگی کا علم ہے جس کی عکاسی وہ اپنے افسانوں میں بارہا کرتے ہیں۔ اس لئے وہ امن وآشتی اور ہندو پاک دوستی کے کوشاں ہیں۔[1]

آنندلہر نے وکالت اور ادب جیسے پیشوں میں نمایاں کارنامے انجام دیئے اور شہرت بھی حاصل کی پسماندہ ضلع سے تعلق رکھنے والی اس شخصیت نے اردو زبان وادب کی ترویج ترقی کے لئے جو کام انجام دیا ہے وہ نہایت ہی اہمیت کا حامل ہے جسے کبھی فراموش نہیں کیا جاسکتا۔ انہوں نے ہمیشہ انسانیت کی قدر کی۔ ان کی نظر میں غریب، امیر، سیاہ، سفید، ہندو، مسلم ذات برادری کوئی بھی معنی نہیں رکھتی بلکہ وہ ہر ایک کے ساتھ دلی محبت شفقت اور ہمدردی کرتے تھے۔

آنندلہر سپریم کورٹ آف انڈیا میں ایک مقدمہ کی سماعت کر رہے تھے کہ اچانک ۲۲ جون ۲۰۱۶ کو انہیں فالج کا حملہ ہوا جس سے ان کے جسم کا دایاں حصہ فالج زدہ ہوگیا تھا جس کی وجہ سے وہ بولنے اور لکھنے سے محروم ہو چکے تھے۔ تب سے آنندلہر کی فیزیوتھراپی چل رہی تھی۔ اہل خانہ کے مطابق ۶ دسمبر ۲۰۱۸ کو رات ڈیڑھ بجے وہ اس دنیا سے ہمیشہ کے لئے رخصت ہوگئے۔ ان کی آخری رسومات بعد دوپہر تین بجے شمشان گھاٹ جوگی گیٹ جموں میں ادا کی گئیں ان کی آخری رسومات میں زندگی کے مختلف شعبہ جات سے تعلق رکھنے والی شخصیات نے شرکت کی ان کی وفات پر بطور سوگ جموں وکشمیر ہائی کورٹ بارایسوسی ایشن نے جمعرات کو ہائی کورٹ اور

---

[1] دیپک بدکی، اردو کے غیر مسلم افسانہ نگار، میزان پبلشرز سرینگر کشمیر، ۲۰۱۶ء، ص ۲۴۲

اس کے تحت عدلیہ اور دیگر عدالتوں میں کام کاج معطل رکھا گیا۔

آنند لہر کو بحیثیت قانون دان، دانشور اور ادیب نہ صرف ریاست جموں کشمیر بلکہ بیرونِ ریاست میں بھی ہمیشہ یاد رکھا جائے گا۔ جگن ناتھ آزاد آنند لہر کے متعلق لکھتے ہیں:۔

> ''میرے عزیز دوست آنند لہر دنیائے ادب میں کسی تعارف کے محتاج نہیں۔ وہ صنف اول کے افسانہ نگار، ناول نگار اور تمثیل نگار ہیں۔ شعر بھی کہتے ہیں لیکن ابھی تک بطور شاعر کے وہ منظر عام پر نہیں آئے منظرِ خاص تک ہی محدود ہیں جہاں تک فکشن نگاری کا تعلق ہے ان کے افسانے ملک کے بلند پایہ ادبی جریدوں میں شائع ہو کر خواص و عوام سے خراجِ تحسین وصول کر چکے ہیں۔''[1]

(۱) اگلی عید سے پہلے:

آنند لہر کا پہلا ناول ہے جو ۱۹۹۷ میں مانوی پرکاشن پنج تیرتھی جموں سے زیو طبع سے آراستہ ہو کر منظر عام پر آیا۔ اس ناول کا انتساب آنند لہر نے کشمیر کی لڑائی اور وہاں شہید ہونے والے لوگوں کے نام کیا ہے جنہیں سیکورٹی فورسز کے سپاہی یا اگروادی کہا گیا۔

آنند لہر کے اس ناول میں سرزمین کشمیر کی ایک درد بھری داستان ہے جو مصنف نے خون دل میں انگلیاں ڈبو کر لکھا ہے یہ داستان ہندوستان کی آزادی سے شروع ہو کر آج تک پہنچی ہے یعنی ۱۹۴۷ء سے ۱۹۹۶ء تک سرزمین کشمیر کی یہ درد بھری داستان ہے جو نصف صدی پر پھیلی ہوئی ہے۔

ایسی روداد ہے جس میں روشنی اور اندھیرا ایک دوسرے کے ساتھ ساتھ چلتے ہیں یہ کہیں کہیں متصادم بھی ہو جاتے ہیں اور نتیجتاً کہیں اندھیرا فتح یاب ہوتا ہے اور کہیں روشنی۔ لیکن انجام میں روشنی ہی کامران و فتح یاب ہوتی ہے جس کا سب سے بڑا سبب یہ ہے کہ نصف صدی کا یہ سارا سفر ناول نگار کے اپنے دل کی تجلی سے جگمگا رہا ہے ناول نگار نہ قنوطی ہے نہ رجائی بلکہ یہ عقیدہ رکھتا ہے کہ دنیا صحیح انسان کے ذریعے بہتر ہو سکتی ہے۔

ناول کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ ناول مجموعی اعتبار سے دو حصوں پر مشتمل ہے اگر چہ ناول نگار

[1] دیباچہ از جگن ناتھ آزاد مشمولہ اگلی عید سے پہلے۔ آنند لہر ص۔۱، مانوی پرکاشن پنج تیرتھی جموں ۱۹۹۷

نے خود اس کو حصوں میں تقسیم نہیں کیا ہے لیکن مطالعہ کے دوران اس کا احساس ہوتا ہے صرف دو حصوں میں تقسیم ہی کیا کئی مقامات پر ایسا بھی محسوس ہوتا ہے کہ ناول کو ابواب میں تقسیم کرنے کی بھی ضرورت ہے اگلی عید ناول کی ابتدا گولیاں چلنے کی آواز سے ہوتی ہے اقتباس ملاحظہ کیجئے:

''ہر طرف گولیاں چلنے کی آواز آ رہی تھی۔ لوگ سہمے ہوئے تھے مگر ایک نعرہ روشنی بن کر اندھیرے کو ہٹانے کی کوشش کر رہا تھا...... ''زندہ باد زندہ باد ہندو مسلم سکھ اتحاد......''

یہ نعرہ لگانے والا کوئی بہت بڑا دوکان دار، کارخانہ دار یا لیڈر نہیں بلکہ کلچے بنانے والا عبدل تھا شاید اس علاقے کا ڈپٹی کمشنر جو کہ وہاں کا حکمران تھا حکومت کر کے اتنا خوش نہ تھا جتنا کہ عبدل کلچے بنا کر......سب کچھ دیکھ کر خیال آتا کہ انسان چاہے تو ذرہ حاصل کر کے بھی خوش ہو سکتا ہے اور نہ چاہے تو پہاڑ حاصل کر کے بھی نہیں۔''[1]

اس ناول کا پہلا حصہ ۱۹۴۷ء کے بعد کے کشمیر سے متعلق ہے اور دوسرا حصہ کشمیر میں علاحدگی پسند نوجوانوں کی جانب سے شروع کی گئی جنگ جو یانہ سرگرمیوں والے کشمیر کے بارے میں ہے جب کشمیر متزلزل ہو جاتا ہے اور کشمیر سے ہندوؤں کی کثیر تعداد ہجرت کرتی ہے۔

آنند کے رگ و پے میں سرزمین کشمیر کی محبت چھپی ہے جو قاری کو ناول کے شروع سے آخر تک نظر آتی ہے قبائلی کے چھرے سے مارا ہوا کتا قبائلیوں کے کپتان کے تصور میں زندہ ہو جاتا ہے اور پوچھتا ہے کہ مجھے کیوں مارا ہے یہاں ناول نگار کا فن قاری کی توجہ کا مرکز بن جاتا ہے۔ یہاں ان قبائلیوں کے درمیان گفتگو ہوتی ہے ایک قبائلی دوسرے سے کہتا ہے یہاں کے کتے بھی عجیب ہیں دوسرا کہتا ہے یہاں کی ہر چیز عجیب ہے تیسرا قبائلی کہتا ہے یہاں کی ہوا بھی عجیب ہے اسے لگتا ہے کہ یہاں کی ہوا میں انسانی پیار بسا ہوا ہے ان باتوں کا اختتام کپتان یہ کہہ کر کرتا ہے کہ ہوا کو ہم انسان سے الگ نہیں کر سکتے۔

آنند لہر کے اس ناول میں یوں تو متعدد کردار ہیں لیکن دو کردار مرکزی ہیں جن کے اردگرد کہانی شروع

[1] آنند لہر۔ اگلی عید سے پہلے، ص ۷۔ مانوی پرکاشن جموں، ۱۹۹۷ء

سے آخر تک گھومتی ہے یہی دو کردار عبداللہ اور بدری ناول کے شروع سے آخر تک نظر آتے ہیں۔

عبداللہ ایک کلیجے والا ہے جس کے دل میں آزادی کی تڑپ اور لگن ہے وہ کشمیر میں خوشحالی اور فارغ البالی کا خواہاں ہے اسے ظلم، جبر اور استحصال سے سخت نفرت ہے وہ فرقہ وارانہ ہم آہنگی میل جول اور بھائی چارے کا علمبردار ہے۔ آزادی کے بعد کشمیر میں خوشحالی اور تعمیر و ترقی کے کاموں کو دیکھ کر گھوڑا بیچ کر سو جاتا ہے لیکن جب کشمیر میں جنگ جیسی سرگرمیاں شروع ہو جاتی ہیں تو وہ نیند سے بھاگ جاتا ہے وہ چونکہ شیہ کشمیر کا ایک ارشاد۔ ہندو مسلم سکھ اتحاد کا زبردست حامی ہوتا ہے اس لئے وہ کشمیر کے موجودہ حالات سے سخت پریشان ہے اسے کشمیر کے اطراف میں کوئی بھی ہم خیال نہیں ملتا اور کوئی ایسا ہے بھی تو وہ ڈر اور خوف کی وجہ سے خاموشی اختیار کئے ہوئے ہے وہ اپنی جان پہچان کے لوگوں سے ملنے جاتا ہے لیکن وہ اسے نہیں مل پاتا۔ وہ یا تو ہجرت کر گئے ہیں یا جیلوں میں بند ہیں اور کچھ سرحد پار ہیں۔ چنانچہ وہ کسی نہ کسی طرح سرحد پار کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ جہاں وہ ٹریننگ کیمپوں کا حال دیکھتا ہے وہ واپس آکر جموں میں مہاجرین سے بھی ملتا ہے۔ جن کی ناگفتہ بہ حالت دیکھ کر وہ دل برداشتہ ہو کر سرینگر جاتا ہے اور لوگوں کو اس بات پر راضی کر لیتا ہے کہ بدری اگلی عید سے پہلے واپس لایا جائے۔ اس ناول کا دوسرا کردار بدری ایک مندر کا پجاری ہے جس کے باپ نے سلیمان کی پرورش مندر ہی میں کی تھی کیوں کہ سلیمان کے والدین بچپن میں ہی مر گئے تھے۔ جب سلیمان بڑا ہوتا ہے تو بدری کا باپ ہی اسے بتاتا ہے کہ وہ مسلمان ہے سلیمان کو نماز روزہ کی اہمیت بدری کے باپ نے ہی بتائی اور اسلام کیا ہے مسلمان کسے کہتے ہیں غرض ایک سچا مسلمان ہونے کے لئے کیا کیا ضروری ہے وہ تمام چیزیں بدری کے باپ نے ہی سلیمان کو بتائیں۔ اس ناول میں بدری کا کردار علامتی انداز میں کشمیری ہندوؤں کی نمائندگی کرتا ہے بدری کا مندر میں شنکھ بجانے کا عمل مسلمانوں کی مسجد میں اذان دینے کے عمل سے ہم آہنگ ہو کر ناول میں فرقہ وارانہ ہم آہنگی، بھائی چارہ، محبت اور اخوت کا ماحول پیدا کرتا ہے کیوں کہ مصنف کی نگاہ میں نماز اور پوجا دونوں قابل احترام عمل ہیں۔ ان کی بدولت عوام میں اعتماد پیدا ہوتا ہے اور ان کی عدم موجودگی میں بداعتمادی پیدا ہوتی ہے ناول نگار کا یہ خیال حقیقت پر مبنی ہے کہ کشمیر کے موجودہ حالات اسی لئے پیدا ہوئے ہیں کہ ہندو اور مسلمان اپنے عقائد میں پکے نہ رہیں مصنف کا یہ بھی خیال ہے کہ بدری کی پوجا عید کی نماز کو مضبوط کر دیتی ہے اور اس کے برت اس کے روزے کی شان ہیں اس لئے بدری کی کشمیر واپسی ضروری

ہے ناول میں سلیمان کا کردار ایک کسان اور سماجی کارکن کا کردار ہے جسے اسی دن گولی کا نشانہ بنایا گیا جس دن گاندھی کو شہید کیا گیا تھا۔سلیمان کے دو بیٹے اکبر اور رشید بھی قاری کی توجہ کا باعث بنتے ہیں اکبر کو سرحد پار جا کر دورانِ تربیت ناانصافی اور ظلم کے خلاف احتجاج کرنے کے جرم میں جیل میں بند کیا جاتا ہے۔ جہاں وہ سرنگ بنا کر بھاگنے کی کوشش کرتا ہے اور پکڑا جاتا ہے۔ ادھر رشید بھی رشوت، بے ایمانی، استحصال اور ظلم کے خلاف احتجاج کرنے کے جرم میں جیل میں بند ہے اور وہ بھی سرنگ نکال کر بھاگنے کی کوشش میں پکڑا جاتا ہے ناول میں یہ مقام نقطۂ عروج کا حامل ہے جب مصنف عبدل کی زبان سے یہ الفاظ ادا کرتا ہے:

''کشمیر کی صرف اتنی ہی کہانی ہے کہ رشید اور اکبر دو بھائی ہیں ایک سرنگ نکال کر سرحد کے اس طرف آنا چاہتا ہے اور دوسرا سرنگ نکال کر سرحد کے اس طرف جانا چاہتا ہے۔''[1]

ناول میں ایک چھوٹا کردار ریشماں کا ہے جو ایثار کا مرقع بن کر سامنے آتا ہے جب بدری کے مندر کا شنکھ چوری ہو جاتا ہے اور ہندوؤں اور مسلمانوں میں بے چینی کی لہر دوڑ جاتی ہے تو ایک ادھیڑ عمر کی عورت ریشماں اپنی عمر بھر کی پونجی لا کر سلیمان کے حوالے کرتی ہے تاکہ شنکھ خریدا جائے۔ اس طرح ہم یہ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ ناول نگار نے کردار نگاری کے فن سے انصاف کرتے ہوئے بہترین کردار تراشے ہیں۔

آنند لہر نے منظر کشی کی بھی بہترین مثالیں ناول میں پیش کی ہیں۔ ایک اقتباس بطور نمونہ ملاحظہ فرمائیں:۔

''ادھر کشمیر میں آزادی کے گلاب نے اپنی خوشبو پھیلانا شروع کر دی اسکول تعمیر ہونے لگے۔ سڑکیں تعمیر ہونے لگیں۔ مندروں میں پوجا ہونے لگی۔ مسجدوں میں سج دھج کر لوگ نمازیں پڑھنے لگے۔ جھیلوں کے اندر شکارے چلنے لگے۔ ہوائیں جھومتی ہوئی نظر آنے لگیں تھیں تھیٹروں میں ڈرامہ دیکھنے والوں کا رش اور مشاعروں میں واہ واہ کی آوازوں نے کشمیر کے قدرتی حسن کو اس طرح سنوارا جس طرح خوب صورت دوپٹے کو کناری سنوارتی ہے۔''[2]

---

[1] آنند لہر۔ اگلی عید سے پہلے۔ ص۔ ۹۰۔ مانوی پرکاشن پنج تیرتھی۔ ۱۹۹۷ء

[2] آنند لہر۔ اگلی عید سے پہلے۔ ص۔ ۳۵، مانوی پرکاشن جموں، ۱۹۹۷ء

ناول کے اختتام میں آنند لہر کا وہ سارا جذبہ سمٹ کر آ گیا ہے جسے ہم عام لفظوں میں ہندو مسلم اتحاد کا ایک سیاسی قسم کا نام دیتے ہیں لیکن حقیقتاً اسے یادوں کی ہم آہنگی کا نام دینا چاہئے ہم اپنی روزمرہ کی عملی زندگی پر نظر ڈالیں تو نظر آئے گا کہ ہم اگر ہندو ہیں تو ہمارے دوستوں میں مسلمانوں کی کمی نہیں اور اگر ہم مسلمان ہیں تو ہمارے حلقۂ احباب میں ہندو دوستوں کی کمی نہیں رکھی گئی بلکہ یہ مزاجی ہم آہنگی کی بنا پر اس طرح نمودار ہوئی ہے جس طرح خود بخود پھول شاخ پر نمودار ہوتا ہے یہی تصویر کشی ناول نگار نے کچھ اس طرح سے کی ہے ناول کا اختتام کیسے ہوتا ہے ملاحظہ کیجئے:۔

''مگر بدری چلا گیا ہے'' ایک شخص نے کہا

''گیا نہیں بلکہ بھاگ گیا ہے'' دوسرے شخص نے کہا

''مگر ہم نے اسے روکا کیوں نہیں؟ ہم بدری کے بغیر مکمل نہیں ہیں اور نہ ہی ہمارے آباواجداد مکمل تھے''

''مگر سوال پیدا ہوتا ہے کہ ہم نے بدری کو جانے کیوں دیا؟

چوتھے شخص نے کہا

''اس کی پوجا ہماری نماز کو مضبوط کرتی تھی۔ اس کے برت ہمارے روزوں کی شان تھے''

دوسرے شخص نے عبدل کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

آؤ بدری کو لے آئیں عبدل نے کہا

''وہ بھی اگلی عید سے پہلے'' لوگوں نے بلند آواز میں جواب دیا۔''[1]

ناول اپنے موضوع کے اعتبار سے بہت دلچسپ ہے فنی اعتبار سے یہ ناول قریب قریب تمام تر تقاضوں کو پورا کرتا نظر آتا ہے اگلی عید سے پہلے ناول لکھ کر آنند لہر نے اپنی ناول نگاری کی شروعات کی تھی لہٰذا چند خرابیوں کا پایہ جانا کوئی مضائقہ نہیں رکھتا۔ مختصراً آنند لہر کا یہ ناول اپنی چند اہم خصوصیات کی بنا پر کامیاب ناول ہے۔

[1] آنند لہر، اگلی عید سے پہلے، ص ۹۵، مانوی پرکاشن جموں ۱۹۹۷ء

سرحدوں کے بیچ:

سرحدوں کے بیچ، آنند لہر کا دوسرا ناول ہے جو۲۰۰۲ء میں شائع ہوا یہ ناول ملک بک ڈپو سے شائع ہوا۔ آنند لہر نے اس ناول کے لئے جس موضوع کا انتخاب کیا ہے وہ بے حد جذباتی ہے ہر حساس انسان سرحد کی پابندیوں کی وجہ سے دل برداشتہ ہو جاتا ہے جہاں نہ کوئی رشتہ ہے نہ کوئی رشتہ دار سرحد دو لوگوں کے دلوں کو جوڑنے سے معذور ہے اس سرحد کے اپنے اصول ہیں جو کہیں سخت بھی ہیں اور کہیں لاپرواہی کے چلتے کشید گی ہو جاتی ہے اور اس کا خمیازہ بھی وہاں آباد لوگوں کو ہی بھگتنا پڑتا ہے ناول ''سرحدوں کے بیچ'' میں انہوں نے کشمیر کے لوگوں کی زندگی کی عکاسی کی ہے کشمیر کے پس منظر میں لکھا گیا یہ ناول سرحد کے قریب رہنے والے لوگوں پر مبنی ہے جو لوگ سرحد کے قریب رہتے ہیں وہ اس پورے علاقے کو اپنا مانتے ہیں۔ انہیں کسی بھی حد یا خط کا اندازہ نہیں ہوتا بلکہ وہ ایک عام آدمی کی طرح اپنے ارد گرد کے وسائل سے ہی زندگی کی ضرورتوں کو پورا کرتے ہیں آنند لہر نے اس ناول میں ایک ایسے گاؤں کی تصویر کشی کی ہے جہاں کے سازگار ماحول میں رام غلام کی بیٹی اپنی گھریلو زندگی غربت اور مفلسی میں گزار رہی ہے وہاں کے لوگوں کی زندگی صرف روٹی اور چٹنی سے بسر ہوتی ہے روٹی کے ساتھ پودینہ کی چٹنی کھاتے ہیں یہی ان کی زندگی کا معمول ہے اور مفلسی و غربت سے لڑنے کا ذریعہ بھی۔ ملک کی تقسیم کب ہوئی سرحد کب قائم کی گئی اس کا اندازہ لوگوں کو بالکل نہیں۔ جس علاقے میں پودینہ پیدا ہوتا تھا وہ علاقہ اب دوسرے ملک کی زمین تھی۔ اس لئے پودینہ توڑنے جانا قانونی جرم ہو گیا روزمرہ کی زندگی میں یہاں کے لوگوں کے لئے کوئی دوسرا متبادل نہیں تھا وہ بہت شوق سے پودینہ توڑنے اور اس کی چٹنی کھاتے لیکن جیسے جیسے ملک کی سرحدوں پر پہرے کی سختی کی جانے لگی یہاں بھی اس کا اثر ہوا۔ سرحد کی قانونی پابندی سے انجان رانی اکثر پودینہ توڑتی تھی لیکن کبھی بھی اسے کسی مصیبت کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔ اس لئے اسے کبھی بھی سرحد کے قائم ہونے کا اندازہ نہیں ہوا۔ دراصل وہ لوگ سمجھتے تھے کہ اسی زمین پر جہاں سے پودینہ اگتا ہے خدا نے یہیں کھڑے ہو کر انسان بنانے کے بارے میں سوچا تھا۔ اقتباس دیکھیں:۔

''ملک بٹا سرحد قائم کر دی گئی مگر لکیروں کا کھیل کھیلنے والے بڑے بڑے
لوگ اس بات کو نہ جانتے تھے کہ اس گاؤں کے لوگ پودینے کی چٹنی کے
بغیر نہیں رہ سکتے۔ کیوں کہ انھوں نے کبھی یہ گاؤں نہ دیکھا تھا اور نہ ہی

یہاں کے لوگوں کو ہنستے کھیلتے دیکھا تھا۔
سچ تو یہ ہے کہ اس گاؤں کے لوگوں کو پودینہ پسند تھا اور وہ زمین جہاں پر
اگتا تھا ان کے لئے خاص اہمیت رکھتی تھی۔ وہ سمجھتے تھے کہ خدا نے یہیں
کھڑے ہو کر انسان بنانے کے بارے میں سوچا تھا۔''[1]

ملک تقسیم کر کے سرحد قائم کرنے والے عام لوگوں کی ضرورت کے مطابق زمین کی سرحد متعین نہیں کرتے بلکہ یہ کام کاغذوں پر ہوتا ہے اور عام لوگوں کو بغیر کسی عذر کے اس سرحد کو ماننا پڑتا ہے لیکن اس سے سرحد پر رہنے والے لوگوں کا نقصان ہوتا ہے انہیں اس کا اندازہ بھی نہیں ہوتا کہ کاغذوں میں کیا گل کھلائے جا رہے ہیں لیکن قانون قانون ہوتا ہے قانون کا احترام ہر شخص پر لازمی ہے اس کی مخالفت کرنے والے کو سزا بھی ملتی ہے لیکن یہ ساری باتیں ان کے لئے ہیں جن کو یہ معلوم ہو کہ آخر سرحد ہے کیا۔ پڑوسی ملک سے تعلقات اور تنازعات پر ہی سرحد کا اندازہ ہوتا ہے نہیں تو گاؤں کے باشندوں کو دوسرے ملک کے عمل دخل کا اندازہ بھی نہیں ہوتا زندگی حسب معمول چلتی رہی وہ لوگ مزے سے اپنی ضروریات کے لئے پودینہ توڑتے رہے لیکن رفتہ رفتہ سرحد پر سختی ہونے لگی۔ ملاحظہ کیجئے اقتباس:۔

''پودینہ توڑنے کا یہ سلسلہ کئی برس چلتا رہا مگر وقت بیتنے کے ساتھ ہی
سرحد کا سانپ بھی جاگ گیا اس نے اپنا زہر پھیلانا شروع کیا۔
پہرے سخت کر دئے گئے۔ یہاں سے زہر کی فصل اگنی شروع ہو گئی تھی اور
سرحد نے اپنی پہچان ظاہر کرنا شروع کر دی اور سرحد کی پہچان ہے گولی
بارود، موت چیخ و پکار۔''[2]

سرحد قائم ہونے کے بعد سرحد پر سرکاری عملے کی تعیناتی سے آس پاس کے لوگوں کی زندگی دوبھر ہو جاتی ہے۔ انہیں قدم قدم پر جواب دہ ہونا پڑتا ہے مگر وہ سرحد کی حد سے واقف نہ ہونے کی وجہ سے دوسرے ملک میں داخل ہوتے ہی حراست میں لئے جاتے ہیں یہ بات عام ہے اور یہ اس ناول کی کہانی ہے۔ اس ناول کا

---

[1] آنند لہر۔ سرحدوں کے بیچ، ص۔۱۸۔۱۷، ملک بک ڈپو دہلی، ۲۰۰۲ء

[2] آنند لہر۔ سرحدوں کے بیچ۔ ص۔۲۰۔۱۹، ملک بک ڈپو دہلی۔ ۲۰۰۲ء

مرکزی کردار رانی ہے جو پودینہ کے لئے سرحد پار جاتی ہے اور وہاں پر پکڑی جاتی ہے لیکن اس سرحد کے سرکاری عملے اور رانی کو اس کے حقیقی جرم کی سزا دینا چاہیں تو شاید یہ ممکن نہ ہو سکے اور مضحکہ خیز معلوم ہو۔ اس لئے انہوں نے رانی کو جاسوسی کے جرم میں گرفتار کر کے جیل بھیج دیا لیکن اقبال جرم نہ کرنے کی وجہ سے رانی کو پولیس اور دیگر جانچ محکمے والوں کی اذیتوں کو برداشت کرنا پڑا۔ آخر میں اس کی ملاقات ایک ایسے پولیس آفیسر سے ہوتی ہے جو رحم دل بھی ہے اور جوان خوبصورت بھی ہے اس نے دراصل نئی نئی نوکری جوائن کی ہے اس لئے ابھی وہ پولیس کے سبھی معاملات سے واقف نہیں ہے جس سے رانی کو تھوڑی راحت ملتی ہے آخر میں راجہ اور رانی ایک دوسرے سے عشق کرنے لگتے ہیں اور ایک دن یہ دونوں ایک دوسرے سے عشق کرنے لگتے ہیں اور ایک دن یہ دونوں جسمانی رشتے قائم کر لیتے ہیں اور رانی ماں بن جاتی ہے راجہ جیل کی نوکری چھوڑ کر باہر ایک کالج جوائن کر لیتا ہے لیکن اس کا دل نہیں لگتا۔ وہ روزانہ جیل کے باہر رانی کا انتظار کرتا ہے اس کا عشق جنون کی حد کو پار کر جاتا ہے وہ مجنوں کی شکل میں دیوانہ ہو کر رانی کو چاہتا ہے ادھر جیل میں رانی کا بیٹا بھی بڑا ہو رہا ہے رانی کی سزا کم کر دی جاتی ہے وہ دن بھی آجاتا ہے جب رانی کو جیل سے رہا کیا جاتا ہے لیکن جیل سے باہر آتے ہی اسے دوسرے ملک بھیج دیا جاتا ہے کیوں کہ وہ دوسرے ملک کی شہری تھی۔ راجہ سرحد کے اس پار رانی سرحد کے اس پار اور سرحد کے درمیان وہ بچہ ہے جس کا کوئی ملک نہیں ہے یہ ناول کا آخری منظر ہے جس میں انسانی ہمدردی تو جھلکتی ہے لیکن درمیان میں ایک سرحد حائل ہو جاتی ہے پورے ناول میں نفسیاتی پہلو غالب ہے۔ رانی کے کردار کے ساتھ ناول کے دوسرے کرداروں کی ہمدردی برقرار رہتی ہے راجہ کا جنون اور رانی کا صبر و تحمل اس ناول کا مرکزی نکتہ ہے ساتھ میں دیگر ضمنی کرداروں میں سدا اقصائی کا کردار مرکزی کردار کے ساتھ ساتھ چلتا ہے اور سزا یافتہ مجرم ہونے کے باوجود وہ حتی الامکان رانی کی مدد کرتا ہے وہیں ہمدرد خاں ایک ظالم و جابر کا کردار ادا کرتا ہے جس سے رانی ہمیشہ خوف زدہ رہتی ہے لیکن نئے جیلر سدانند کی رحم دلی کی وجہ سے رانی کا جیل میں رہنا کچھ آسان ہو گیا تھا۔ سدانند ایک اصول پرست انسان تھا اس لئے اس کے دل میں ہمدردی کا جذبہ تھا لیکن قانوناً وہ رانی کی مدد کرنے میں ناکام رہا۔ البتہ وہ سزا کم کرانے میں کامیاب ہو گیا۔ پھر بھی وہ رانی پر کی جانے والی زیادتیوں کی تاب نہ لا کر نوکری کو خیر آباد کہہ کر پاگلوں کی طرح سڑک پر مارا مارا پھرنے لگا۔

آنند لہر کا یہ ناول فنی و موضوعی اعتبار سے کافی حد تک کامیاب نظر آتا ہے پلاٹ میں ربط ہے کرداروں

سے حسب حال کام لیا گیا ہے مناظر کو بڑی خوبصورتی سے پیش کیا ہے زبان و بیان سادہ اور سلیس ہے مجموعی اعتبار سے ناول 'سرحدوں کے بیچ' آنند کا ایک اہم ناول ہے۔

مجھ سے کہا ہوتا:

آنند لہر کا یہ ناول ۲۰۰۵ء میں اردو بک سوسائٹی دہلی سے شائع ہوا۔ اس ناول کا انتساب آنند لہر نے اپنی چھوٹی بہن کے نام کیا ہے جو صرف دو برس جی سکی۔ یہ ناول ۱۳۱ صفحات پر مشتمل ہے اس ناول کا موضوع عراقی تباہی کے پس منظر میں انسانی رشتوں کا زوال ہے جو کسی واحد ملک کا المیہ نہیں بلکہ امریکہ و عراق کے پس پردہ دو ممالک کی آپسی رنجش اور نسلی امتیازات کا شاخسانہ ہے جس میں بے بس اور مجبور عوام کی ہلاکت لازمی ہے ''مجھ سے کہا ہوتا'' میں پرندوں اور جانوروں کی زبانی تباہی و بربادی کے المیے کو پیش کیا گیا ہے جن میں حال و ماضی اور مستقبل سبھی زمانے شامل ہیں آنند لہر نے اس ناول میں زبان طیور سے جنگ عراق و امریکہ کا ایک نیا منظر دکھایا ہے چیل، طوطا، کوا، بلبل،، مینا، شیر، ریچھ، خرگوش، ہاتھی، کتا، چوہا اور چیونٹی وغیرہ کے توسط سے گل، کلپنا جان، راکیش، موہن، راجہ، رانی اور نغمہ کے جو کردار تراشے گئے ہیں وہ ایسی زندہ حقیقتیں ہیں جن کی جانب دیکھ کر بھی ہماری بے حسی بیدار نہیں ہوتی۔ آنند لہر کو مکالموں پر بخوبی عبور حاصل تھا۔ یہ ناول بہت سے انسانی مسائل کا بھی احاطہ کرتا ہے جو آفاقی نوعیت کے حامل ہیں۔ مثلاً ملکوں کی آپسی رنجشیں نسلی امتیازات، رشتوں کا زوال ان کی بے حرمتی، انسان کی کم ظرفی، خود غرضی امیر قوموں کے ہاتھوں غریبوں کا استحصال، بارود کے دھوئیں سے ہونے والی زمینی تباہیاں۔ ماحولیاتی کثافتیں، ایٹمی ہتھیاروں کا پھیلاؤ اور ان سے پیدا ہونے والے خطرات وغیرہ شامل ہیں۔

جہاں ان موضوعات کی انفرادی اہمیت ہے وہاں آنند لہر نے اتنے ہی موثر لیکن سیدھے سادھے انداز میں اس طرح پیش کرتے ہیں کہ بہت سی ازلی حقیقتوں پر سے پردے اٹھتے چلے جاتے ہیں انسانی فطرت کا ایسا ننگا ناچ شاید ہی اور کہیں دیکھنے کو ملے۔ جیسا کہ پہلے بھی ذکر کیا گیا ہے کہ آنند لہر چونکہ وکیل تھے تو انہیں مکالموں پر عبور حاصل تھا ان کے اس ناول کے مکالمے جاذبِ نظر ہیں اور دلچسپ ہیں اس ناول کے کچھ مکالموں کو یہاں بطور نمونہ پیش کیا جا رہا ہے ملاحظہ کیجئے:۔

''انسان جب اکٹھے بیٹھتے ہیں تو ایک دوسرے کا احترام نہیں کرتے، لڑ

پڑتے ہیں''

مگر کیوں؟

چیل نے سوال دہرایا

کیوں کہ وہ چھوٹے بڑے ملکوں میں بٹے رہتے ہیں وہ رائے کو اہمیت نہیں دیتے بلکہ اس بات کو اہمیت دیتے ہیں کہ کس ملک کا نمائندہ رائے دے رہا ہے۔ اور وہ جو رائے دے رہا ہے اس ملک کے پاس ایٹم بم کتنے ہیں ہائیڈروجن بم کتنے ہیں''

یہ بات سن کران کی پریشانی اور بڑھ گئی۔

''ہم سمجھتے تھے کہ انسان ہمیں قدرتی آفتوں سے بچائے گا''

چڑیاں اور کوئے اکٹھے بول پڑے۔

''تمہیں یہ انسانوں کی عادت کب سے پڑ گئیں ہیں''

ایک چھوٹی سی چڑی نے پوچھا۔

''کیا''

وہ اکٹھے بول پڑے

''اکٹھے مل کر نعرے لگائے جاتے ہیں بات نہیں کی جاتی'' چڑیوں نے پھر کہا

اچھا اس بحث کو چھوڑو ہم کیا بات کر رہے تھے کہ ہم سمجھتے تھے کہ انسان ہمیں قدرتی آفتوں سے بچائے گا۔''[1]

ایک اور مثال دیکھیں:۔

''کیا ہونا تھا ایٹمی تجربوں نے میرے بدن میں کھڈے پیدا کر دیے برف گرم ہوگئی اور ریگستان گرمیوں میں ٹھنڈے ہو گئے'' تم نے روکا

[1] آنند لہر، مجھ سے کہا ہوتا، ص۲۲،۲۱، اردو بک سوسائٹی دہلی،۲۰۰۲ء

کیوں نہیں

''میں روکتی رہی پھول کھلاتی رہی ہوا کے ذریعہ آنے والی تباہی سے سب

کوآ گاہ کرتی رہی''

سب اس کی بات کو حیرانگی سے سننے لگے

''مگر میری بات کسی نے نہ سنی انسان کے خلاف ہتھیار بناتا رہا''

ساحل نے گل کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا

''ہتھیار تو زیادہ اس کے ملک والوں نے بنائے ہیں''

نہیں مجھے معلوم نہیں کیوں کہ میرے لئے تو سب انسان برابر ہیں کیوں کہ

سب کی ایک ناک ہے دو آنکھیں ہیں دو کان ہیں اور ایک چہرہ ہے۔''

اس ناول میں زیادہ تر کردار جنگلی پرندے یا جانور ہیں۔ چند ایک انسانی کردار بھی دکھائی دیتے ہیں لیکن ناول کا زیادہ تر حصہ ان کرداروں کی گفتگو یا حرکات وسکنات کا نتیجہ ہے جو چرند پرند ہیں ناول میں کردار نگاری کی طرف کوئی خاص توجہ نہیں دی گئی ہے شاید آنند لہر نے اس خیال سے کردار نگاری پر زیادہ توجہ نہیں دی کہ قاری کرداروں کی حرکات وسکنات میں کھو جائیں گے تو موضوع کی اہمیت ختم ہو جائے گی اور ناول کا اصل مقصد فوت ہو جائے گا آنند لہر نے حقیقت نگاری کی روایت کے تحت فن پارے کی لسانی کارکردگی کے بجائے اس کے فکری پہلوؤں کی طرف زیادہ توجہ دی جاتی ہے اوپر پیش کردہ مکالمے فن کار کی اس صلاحیت کا ثبوت ہیں ناول کا اختتام کچھ یوں ہوتا ہے جس میں ناول کے عنوان کا ذکر بھی ہے:۔

''موہن نے اس سے پوچھا

''ایک دن جب میں نے دیکھا کہ انسان ہتھیار بنا رہا ہے نئے ملک بنا

رہا ہے اپنی تباہی کا اہتمام خود ہی کر رہا ہے تو میں اپنی نسل کے ساتھ دور

جنگل میں چلا گیا تا کہ ہوا، پانی اور دھوپ کا مزا لے سکوں''

سب کے چہروں پر پسینے آ گئے اور حیرانگی سے اس کی طرف دیکھنے لگے

---

[۱] آنند لہر۔ مجھ سے کہا ہوتا، ص ۶۹، اردو بک سوسائٹی دہلی، ۲۰۰۲ء

''مگر یہ ہوا کیوں''

اس بڑے سانپ نے پوچھا

''ایک آدمی کے پاس بہت زہریلے ہتھیار تھے وہ اس دنیا کو بالکل تباہ کرنا

چاہتا تھا اسے مارنے کے لئے یہ سب کچھ ہوا''

''ہاں ہاں صرف ایک آدمی کو مارنے کے لئے''

ایک آدمی کو مارنے کے لئے یہ زمین، تباہ کی گئی یہ ٹینک چلائے گئے ہوائی

جہازوں سے بم گرائے گئے رشتے ختم کئے گئے لگتا ہے، انسانی عقل

جانوروں سے بھی کم ہوگئی۔

''وہ کیسے''

جان نے پوچھا

''مجھ سے کہا ہوتا، میں چپ کر کے آتا، اسے ڈنک مار کر چلا جاتا''

سانپ نے کہا

''اور زمین بچ جاتی۔''[1]

مجموعی اعتبار سے ناول اپنی چند کمزوریوں کے باوجد کامیاب ناول ہے۔جس کا اندازہ مندرجہ بالا اقتباسات سے لگایا جاسکتا ہے:۔

یہی سچ ہے:

''آنندلہر کا یہ ناول ۲۰۰۸ء اردو بک سوسائٹی دہلی سے شائع ہوا ناول کا انتساب مصنف نے ان لوگوں کے نام کیا ہے جنہیں آنندلہر ان کے قد سے زیادہ نظر آتے ہیں ناول '۱۴۴' صفحات پر مشتمل ہے آنندلہر کے ناول ''یہی سچ ہے'' میں زندگی کے حقائق کی فلسفیانہ انداز میں مختلف کردار اور واقعات کے ارتباط سے بڑے ہی موثر انداز میں پیش کرنے کی سعی کی گئی ہے اس امر سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ عصر حاضر میں ایسا کوئی شعبہ حیات نہیں جہاں بے ایمانی، رشوت خوری، استحصال نہیں ہے ایسے میں اس ناول کے ایک اہم کردار کو شل

[1] آنندلہر۔ مجھ سے کہا ہوتا، ص۔۱۳۱، اردو بک سوسائٹی دہلی، ۲۰۰۲ء

(مصنف) کو اگر اپنی ایمانداری پر ناز ہے تو غلط نہیں ہاں اپنی اس ایمانداری کو ہر پل، ہر لمحہ اپنے وجود پر سوار رکھنا، اپنی ایمانداری کا احساس کراتے رہنا، دوسرے تمام لوگوں کو بے وقوف سمجھنا بہرحال مناسب فعل ہے۔
اس ناول میں آنند لہر نے تین کرداروں کو مرکز بنایا ہے خود مصنف بھی اس ناول میں کوشل کے نام سے مرکزی کردار کی حیثیت رکھتا ہے کوشل کے دو سالے ہیں ایک شیو جو رشوت لے کر خواب بنتا ہے اور دوسرا شنکر جس کے دل میں خوف خدا ہے اور وہ رشوت سے دور بھاگتا ہے ان تین مرکزی کرداروں کے علاوہ ان کرداروں کے بچے، بیویاں اور دیگر کئی ذیلی کردار مثلاً ناگپال دھرم پال وغیرہ کے کردار کو بھی ناول نگار نے بڑے ہی فن کارانہ انداز میں پیش کرنے کی سعی کی ہے۔ آنند لہر نے دو سگے بھائیوں شیو اور شنکر کے ذریعہ امیری، غریبی، پاپ، پنیہ، سورگ نرک کا جو تصور پیش کیا ہے اور ان دونوں بھائیوں کے درمیان جو تضاد اور کشمکش ہے۔ اس کی بڑی عمدہ تصویر کشی ناول نویس نے کی ہے۔ انسانی قدریں کس طرح پامال ہوتی ہیں سماجی رشتے کسی طرح ٹوٹتے بکھرتے ہیں اور سماج پر کس طرح منفی اثرات مرتب ہوتے ہیں آنند لہر نے ان کے اظہار میں اپنی پوری فنی صلاحیتوں کو بروئے کار لایا ہے ناول سبک روی سے شروع ہوتا ہے اور دھیرے دھیرے اس کے کردار، واقعات اور اظہار بیان کے لطیف احساسات و جذبات سے سرشار ہوتے ہوئے قاری کو اپنی گرفت میں لے لیتا ہے کردار اپنی جملہ خصوصیات اور انفرادیت کے ساتھ ابھرتے ہوئے، زندگی کے فلسفے کو بڑے ہی موثر انداز میں پیش کرتے ہیں۔

> مثلاً ''اپنی غرض کے لئے ایماندار ہونا، اپنے سورگ کے لئے دان دینا اور پھر اپنے سکھ کی قیمت پر بچوں کو دکھ دنیا، اس سے بڑا پاپ کوئی نہیں''
>
> ''مگر آپ بھی تو دان دیتے ہیں؟''
>
> ''میں دان نہیں دیتا بلکہ انسانوں کو برابر سمجھتا ہوں اور یہ سمجھتا ہوں کہ سب زمین کے بیٹے ہیں اور زمین پر سب کا حق ہے۔''[1]

اور آگے ایک اقتباس میں لکھتے ہیں:۔

> ''آشا تم بہت خوبصورت ہو دل کرتا ہے ان ہواؤں کو اپنے اندر سمولوں

[1] آنند لہر۔ یہی سچ ہے ص۔۹۱۔ اردو بک سوسائٹی دہلی، ۲۰۰۸ء

جس پر تیری سانسوں کی خوشبو بھی ہے ان نظاروں کو اپنی آنکھوں میں چھپا
لوں جنہیں تیری آنکھوں نے دیکھا ہے۔''[1]

آنندلہر کے خوبصورت اور فکر و معنویت سے بھرپور مکالمے پورے ناول میں احساسات و جذبات کو ابھارتے ہوئے حیات و کائنات کے اسرار و رموز درد و داغ اور جستجو و آرزو کے دریچے وا کرتے ہیں۔ آنندلہر زندگی کے حقائق کو ناول میں پیش کرنے کا ایک منفرد انداز رکھتے ہیں۔ اور تخلیقی لمحوں میں وہ اپنے کردار و واقعات، حادثات، سانحات کے ذریعے اپنے داخلی و خارجی احساسات و جذبات کی ترجمانی کرتے ہوئے فطری تقاضوں کو بھی پورا کرتے ہیں۔

اس ناول کے مختلف کردار، واقعات کے تیز بہاؤ میں اپنی منفرد پہچان کو برقرار رکھتے ہیں کوشل، جو شیو اور شنکر کا بہنوئی ہے اسے اپنی ایمانداری پر اس قدر غرور ہے کہ وہ اپنی بیوی اور بیٹا پر بھی اپنی افسری دکھاتا ہے شیو اپنے بچوں کو انجیئر بنانے کے لئے اپنی بیوی کی عصمت تک کو داؤ پر لگا دیتا ہے دوسری جانب اس کا بھائی شنکر ہے جسے اپنی غربت پر بھی ناز ہے۔ اس کی نگاہ میں دنیا میں کئے گئے اچھے کرم کے صلہ میں یہی سورگ ملے گا کا تصور ہے لوگ اس کی ایمانداری نیکی اور شرافت کی قدر کرتے ہیں ان کے لئے یہی سب سے بڑی دولت ہے اس طرح ان تینوں کرداروں کے بعد ان کے بچوں کی نسل سامنے آتی ہے جو بڑے ہو کر زندگی کے فلسفہ کو اپنے طور پر سمجھنے اور سمجھانے کی کوشش کرتے ہیں۔

زندگی کے یہ نشیب و فراز بدلتے وقت اور حالات خود غرضی، ذلت کا درد و کرب، جذباتی بے کیفی اور استحصال کے تلاطم میں آنندلہر کا یہ ناول عہد جدید کے فلسفہ حیات کو موثر کیفیات سے ہم کنار کرنے میں کامیاب ہے۔ ناول کا اختتام بھی بڑا دلچسپ ہے اور اس میں ناول کا عنوان بھی سامنے آتا ہے۔ ملاحظہ کیجئے ناول کا یہ آخری اقتباس:

''شنکر بھگوان کی تلاش میں تپسیا کرنے کے لئے جنگل میں چلا گیا ہے اور
بے حد دکھی ہے۔
شیو اس دنیا میں رہ کر اپنے پاپوں کی پراشچیت کر رہا ہے اور حد سے زیادہ

[1] آنندلہر۔ یہی سچ ہے، ص۔۱۰۸۔ اردو بک سوسائٹی دہلی، ۲۰۰۸ء

خوش ہے دھرم پال بہت خوش ہے وہ پاپ اور پن کے بندھن سے آزاد
ہے ناگپال ایشور کے ڈر سے ڈرا ہوا ہے اور دکھی ہے۔کوشل کو معلوم ہی
نہ ہے کہ وہ سکھی ہے یا دکھی ہے اور مندر سے گھنٹی کی آواز دے رہی ہے
کہہ رہی۔
''یہی سچ ہے۔''[1]

آنند کا یہ ناول آخری تھا اس کے بعد انہوں نے اردو میں کوئی ناول نہیں لکھا۔ بہر حال ان کی تصنیف و تالیف کا سلسلہ ۲۰۱۶ تک چلتا رہا۔لیکن فالج کے حملے کے بعد وہ اس سب سے اچانک محروم ہو گئے۔

جموں و کشمیر میں اردو ناول نگاری کے ارتقا میں ایک اہم نام آنند لہر کا ہے جنہوں نے چار بہترین ناول لکھے جو فنی و موضوعاتی اعتبار سے کامیاب ناول ہیں۔

[1] آنند لہر۔یہی سچ ہے۔ص۔۱۴۴۔۱۴۳،اردو بک سوسائٹی دہلی۔۲۰۰۸ء

ترنم ریاض

ترنم ریاض اردو شعر وادب میں ایک اہم نام ہے ترنم ریاض بیک وقت ناول نگار، افسانہ نگار، شاعرہ، مترجم اور تحقیق کار کی حیثیت سے جانی جاتی ہیں ترنم ریاض کا اصل نام ترنم فریدہ ہے لیکن قلمی نام ترنم ریاض ہے جس سے انہیں پہچانا جاتا ہے ان کی پیدائش ۹ اگست ۱۹۶۳ء کو سرینگر میں ہوئی۔ ترنم ریاض ایک علمی گھرانے سے ہیں ان کے والد کا نام چودھری محمد اختر خاں ہے ترنم ریاض کا آبائی وطن سیالکوٹ (پاکستان) تھا مگر ہری سنگھ کے دور میں ان کے دادا خدا بخش خاں کو ملازمت کے سلسلے میں کشمیر آنا پڑا جیسا کہ پہلے ذکر کیا گیا کہ ان کا خاندان علم و ادب کا مرقع ہے ان کے دادا خدا بخش قانون داں اور کلگت کے گورنر تھے۔ دادی بھی پرائمری اسکول میں ٹیچر تھی۔ یہی وجہ تھی کہ انھوں نے اپنی اولاد کی تعلیم میں بھی کوئی کسر نہیں چھوڑی ترنم ریاض کے والد چودھری محمد اختر خان آزاد ہندوستان سے پہلے ائیر فورس پائلٹ تھے۔ انہوں نے گریجویشن گولڈن کالج راولپنڈی اور پھر بقیہ تعلیم پنجاب یونیورسٹی سے حاصل کی۔ پڑھنے لکھنے کا بہت شوق تھا۔ خاص طور سے انہیں شعر وادب سے بہت دلچسپی تھی لسانیات پر ان کی عمدہ دسترس تھی عربی فارسی اردو اور پنجابی زبانوں پر انہیں عبور حاصل تھا ترنم ریاض کی والدہ ثریا بیگم کشمیر کے ہی ایک علمی خاندان کی چشم و چراغ تھیں ترنم ریاض نے عربی کی تعلیم اپنی والدہ سے ہی حاصل کی۔

ترنم ریاض کا بچپن سرینگر وادی کشمیر جنت بے نظیر میں گزرا۔ ترنم ریاض کو اس وادی سے والہانہ انسیت ہے ترنم ریاض نے ابتدائی تعلیم مقامی اسکولوں سے حاصل کی۔ ہائی اسکول کی تعلیم کشمیر گرلز ہائی اسکول سے حاصل کی۔ جہاں وہ واحد لڑکی تھی اس کے بعد گریجویشن women college مولانا آزاد روڈ سرینگر سے کیا۔ گریجویشن تک وہ سائنس کی طالبہ رہی ہیں اس کے بعد کشمیر یونیورسٹی سے اردو میں ایم اے کی ڈگری حاصل کی۔ دراصل وہ بی اے کے بعد ایل ایل بھی کرنا چاہتی تھی مگر کشمیر یونیورسٹی میں ایک پروگرام میں ترنم

ریاض کی ملاقات ریاض پنجابی سے ہوئی جن کے مشورے سے انھوں نے کشمیر یونیورسٹی سے بی ایڈ کیا۔تعلیم مکمل کرنے کے بعد وہ ریڈیو اور ٹی۔وی سے منسلک ہو گئیں۔

بچپن سے ہی ترنم ریاض کافی ذہین ہیں اور انہیں ادبی ذوق بھی ہے ان کی شخصیت کے کئی ایسے پہلو ہیں جو ہر ایک کو متاثر کرتے ہیں۔ وہ ایک با اخلاق، دیندار اور مذہبی خاتون ہیں ترنم ریاض کی شخصیت کے بارے میں ایس ایم کوثر رضوی لکھتی ہیں:

> ''ان کی نفاست و نزاکت اور عادات و اطوار کو دیکھ کر ہم انہیں شہزادی کہتے ہیں۔ سچ مچ برا تو نہیں مانتیں لیکن جھوٹ موٹ کی خفگی میں اور بھلی لگتی ہیں۔جنیز جیکٹ ہو، کوٹ ٹرائزرس ہوں، ساری بلاؤز ہو یا شلوار قمیض کوئی بھی لباس زیب تن کریں۔ ہر لباس میں خود اپنی مثال لگی ہیں۔انتہائی مہذب اور شائستہ خاتون ہیں۔''[1]

[1] ایس ایم کوثر رضوی۔مشمولہ میرا رخت سفر ترنم ریاض ص۔۲۸۱

ترنم ریاض کو مطالعے کا بے حد شوق تھا۔ وہ اردو ہی نہیں بلکہ انگریزی کشمیری اور پنجابی زبانیں بھی فرفر بولتی ہیں ان کی شخصیت میں مزاح کا گہرا عنصر بھی شامل ہے۔ دورانِ گفتگو وقفے وقفے سے اپنے لطیف جملوں اور کھنکتی آواز سے ملنے والوں کو اپنے طلسم میں قید کرتی رہتی ہیں اور انہیں ہنستے ہنساتے اپنے ساتھ جوڑ لیتی ہیں۔

ترنم ریاض کی ادبی زندگی کا آغاز بیسویں صدی کی آٹھویں دھائی میں ہوا۔انھوں نے افسانے کے ذریعے ادب کے میدان میں قدم رکھا۔ان کا پہلا افسانہ اس وقت شائع ہوا جب وہ ساتویں یا آٹھویں کی طالبہ تھیں اور ان دنوں وہ ترنم فرید کے نام سے لکھتی تھی۔اسی نام سے ان کا پہلا افسانہ روزنامہ آفتاب میں ۱۹۷۳ء میں سرینگر سے شائع ہوا۔افسانے کے ساتھ ساتھ انہوں نے شاعری بھی شروع کر دی ترنم ریاض کے والد نے ان کی حوصلہ افزائی کی اس طرح ترنم ریاض کا ذوق بڑھتا گیا۔ادبی سفر مسلسل پروان چڑھنے لگا۔افسانے تخلیق کئے غزلیں اور نظمیں لکھتی رہیں۔ دو شاہکار ناول اردو ادب میں اہم اضافہ ہیں دوسری زبانوں کی کہانیوں کا ترجمہ ادبی تحقیقی اور تنقیدی نگارشات منظر عام پر آتے رہے۔ اپنی تحریروں اور ادبی تخلیقات کی بدولت ترنم ریاض ادب کی دنیا میں ایک منفرد شناخت رکھتی ہیں۔

ترنم ریاض کے چار افسانوی مجموعے اب تک منظر عام پر آچکے ہیں۔''یہ تنگ زمین'' (۱۹۹۸)، ''ابابیلیں لوٹ آئی گی'' (۲۰۰۰)، ''یمبر زل'' (۲۰۰۴) اور ''میرا رخت سفر'' (۲۰۰۸) یہ ان کے افسانوی مجموعے ہیں۔ترنم ریاض کے افسانوں میں موضوعات کا تنوع ہے وہ اپنے موضوعات عام زندگی سے منتخب کرتی ہیں تانیثی نظریہ اور فکر ان کے افسانے کا خاص موضوع ہے سلیمان اطہر جاوید اپنے مضمون میں لکھتے ہیں:

''آج اردو افسانے کی دنیا میں جو چند نام معتبر اور منور ہیں ان میں ایک نام ترنم ریاض کا بھی ہے ترنم ریاض نے ترجمے بھی کئے تحقیقی و تنقیدی مضامین بھی سپرد قلم کئے۔ ناول اور افسانے بھی لکھے۔ان کے افسانے ان کے ہم عصر افسانہ نگاروں سے بڑی حد تک جداگانہ رنگ رکھتے ہیں۔ کرداروں کو تو ترنم ریاض نے اپنے قلم سے چھو کر زندہ کر دیا ہے۔''[۱]

ترنم ریاض نے افسانوں کے علاوہ اردو ادب کے لئے دو ناول بھی پیش کئے۔ پہلا ناول ''مورتی'' ۲۰۰۴ میں شائع ہوا اور دوسرا ''برف آشنا پرندے'' ۲۰۰۹ میں منظر عام پر آیا۔شاعری میں بھی ان کا ایک شعری مجموعہ ''پرانی کتابوں کی خوشبو'' کے نام سے ۲۰۰۶ میں شائع ہوا۔تحقیق و تنقید میں بھی انہوں نے اپنا اہم کارنامہ انجام دیا۔ان کے تحقیقی و تنقیدی مضامین کا مجموعہ ''چشم نقش قدم'' ۲۰۰۶ میں زیور طبع سے آراستہ ہو کر منظر عام پر آیا۔تحقیق کے میدان میں ان کی ایک اور کتاب ''بیسویں صدی میں خواتین کا اردو ادب'' ایک بہترین کارنامہ ہے ترنم ریاض نے تین کتابوں کے ترجمے بھی کئے ہیں ''گوسائیں باغ کا بھوت'' ''سنو کہانی'' اور ''ہاؤس بوٹ پر بلی'' ان کی ترجمہ کردہ کتابیں ہیں۔ان تخلیقات سے اندازہ ہوتا ہے کہ ترنم ریاض ادبی دنیا میں ایک اہم نام ہے ترنم ریاض کا تخلیقی سفر ہنوز جاری ہے ان کے مضامین ملکی و غیر ملکی رسالوں اور جریدوں میں شائع ہو رہے ہیں انہیں ان کی ادبی خدمات اور بہترین تخلیقات کے عوض ریاستی و ملکی سطح پر انعامات اور اعزازات سے نوازا جا چکا ہے۔عصر حاضر کی خواتین قلمکاروں میں ترنم ریاض ایک بڑا نام ہے جو اپنے قلم سے اردو ادب کو چار چاند لگا رہی ہیں۔

جموں و کشمیر کی خواتین ناول نگار کی حیثیت سے ترنم ریاض کا نام سرفہرست ہے ان کے دو ناول ہیں

۱۔ شعر و حکمت، بحوالہ میرا رخت سفر، ص ۲۸۰

''مورتی'' اور'' حرف آشنا پرندے'' ان دونوں ناولوں کا یہاں ایک جائزہ پیش کیا جا رہا ہے۔

مورتی:

''مورتی''، ترنم ریاض کا پہلا ناول ہے جو۲۰۰۴ میں شائع ہو کر منظر عام پر آیا۔ ناول تقریباً سو صفحات پر مشتمل ہے اس ناول کا انتساب ترنم ریاض نے اپنے بیٹوں بدران اور میران کے نام کیا ہے ناول ازدواجی زندگی کی ناکامی اور اس ناکامی کے اسباب پر مبنی ہے ناول میں تین اہم کردار ہیں مرکزی کردار ملیحہ ہے جس کے اردگرد پوری کہانی گھومتی ہے اس لڑکی کی زندگی کے نشیب و فراز کے ذریعہ مصنفہ نے کشمیر کی پرانی و نئی تہذیب و ثقافت، سوم، رواج، روایات و کلچر، وہاں کے قدیم عجائب گھروں اور اہم مقامات کی مکمل تصویر کشی کی ہے۔ ملیحہ ایک تعلیم یافتہ اور مجسمہ ساز لڑکی ہے جس کو سنگ تراشی میں دلچسپی ہے قدرتی مناظر کو وہ بہت ہی پیاری نظروں سے دیکھتی ہے اور ان سے بے پناہ محبت کرتی ہے وہ اپنے جذبات اور احساسات کو بڑی آسانی سے خوبصورتی کے ساتھ مجسمے کی شکل میں ڈھالنے کا گر جانتی ہے ایک بار ملیحہ کالج کی طرف سے کشمیر کے ٹور پر جاتی ہے وہاں ٹورسٹ ریسپشن سنٹر سے واپس آتے ہوئے وہ ایک خوبصورت مجسمہ دیکھتی ہے لیکن بعد میں اسے وہ مقام یاد نہیں رہتا تاہم وہ اس مجسمے سے اتنی متاثر ہوتی ہے کہ اس کو قریب سے دیکھنے کی خواہش میں کشمیر کے قدیم تاریخی مقامات میں گھوم گھوم کر تلاش کرتی ہے بالآخر اس کو وہ مورتی ایک عیسائی قبرستان میں ملتی ہے یہ ایک کم عمر عورت کا مجسمہ ہے جو عیسائی مذہب کے مطابق شادی کا لباس زیب تن کئے ہوئے ہے اس مجسمے میں عورت کا روپ نکھرا ہوا ہے اس کے جسم کے تمام اعضاء کو اتنی ہنرمندی اور سلیقے سے تراشا گیا ہے کہ وہ مجسمے کے بجائے جیتی جاگتی ہستی معلوم ہوتی ہے ملیحہ اس مورتی کو ہر زاویے سے دیکھتی ہے اور حیرت انگیز آنکھوں سے ان ہاتھوں اور انگلیوں کو داد دیتی ہے جس نے اسے تراشا ہے اور اس فن کار کے فن کو سلام کرتی ہے۔ ملیحہ جب اس مجسمے کو تلاش کرتی ہے اور اس سے متاثر ہو کر فن کار کے فن کی داد دیتی اور یہ عزم کرتی ہے کہ میں بھی اپنے مجسموں میں زندہ رہوں گی ایک اقتباس دیکھیں:

> ''عافیہ ...... کون ہوگا وہ ...... اور کیا کیا تخلیق کیا ہوگا اس کے ان سونے کے ہاتھوں نے؟'' وہ مجسمے کو کئی منٹ تک بائیں جانب سے گھورتی رہی۔

''اسی لئے کہتے ہیں نا...... کہ فن کبھی نہیں مرتا...... یہ سنگتراش اس مجسمے
میں حیات ہے...... ہے ناں...... دیکھو عافیہ میں اس کے ہاتھوں کو دیکھ
رہی ہوں جو اس لڑکی کے حسن کے پرتو میں زندہ ہیں...... جو...... جو تقریباً
سو سال سے اس خاموش قبرستان میں بے شمار قبروں کے درمیان اکیلی
زندہ جاوید اس قبر کے کونے پر بیٹھی ہے...... مگر...... عافیہ یہ مجسمہ ہی تو
شناخت ہے اس عظیم فنکار کی...... اس کا اس سے بڑھ کر اور کیا تعارف
ہوسکتا ہے کہ وہ اس شاہکار کا خالق ہے جس کی عجیب سی کشش مجھے یہاں
کھینچ لائی۔ میں تو جانتی بھی نہ تھی کہ یہ قبرستان ہے میں سمجھی شاید عجائب
گھر کا...... کوئی حصہ ہوگا...... عافیہ...... میں بھی ......تم دیکھنا اپنے
مجسموں میں زندہ رہوں گی۔ بھلے ہی کوئی میرا نام نہ جانتا ہوگا۔ سو سال
بعد شاید...... میرے فن پارے بھی کسی فن کے پرستار کی توجہ اپنی طرف
مبذول کرائیں گے...... کوئی ایسے ہی میرے بارے میں سوچے گا......
جیسے...... جیسے...... میں۔''[1]

ملیحہ کی زندگی میں تبدیلی تب پیدا ہوتی ہے جب اس کی شادی ایک کاروباری بد ذوق انسان سے ہوجاتی ہے اس کا شوہر سنگ تراشی اور مجسمہ سازی جیسے فن سے بے بہرہ ہوتا ہے اسے ملیحہ کے جذبات کی ذرا بھی قدر نہیں ہوتی ہے اور ملیحہ اپنے قرب و جوار کے ماحول اور شوہر کی بے رغبتی سے اندر ہی اندر گھٹتی رہتی ہے۔ اس کا شوہر اس کے سنگ تراشی کے فن میں کوئی دلچسپی نہیں لیتا ہے اور اس کو بے کار اور ناکارہ کہہ کر بارہا اس کے دل کو ٹھیس پہنچاتا ہے ایک جگہ اس کا شوہر (اکبر علی) فیصل سے ملیحہ کے بارے میں کہتا ہے۔

''انہیں بار بار دورے پڑتے ہیں کس چیز کی کمی ہے ان کو ہر چیز میسر ہے
پھر بھی پتھروں سے سر پھوڑتی رہتی ہیں...... اور......۔''[2]

[1] ترنم ریاض۔ مورتی ص۵۳ نرالی دنیا پبلی کیشنز دہلی ۲۰۰۴

[2] ترنم ریاض۔ مورتی ص۶۲، نرالی دنیا پبلیکیشنز دہلی ۲۰۰۴

اس ناول میں ترنم ریاض مجسمہ تراشی سے ملیحہ کے گہرے عشق کے سہارے قاری کو وادی کشمیر کے خوبصورت تاریخی وثقافتی مراکز کی سیر کراتی ہیں اس کے ساتھ ہی ناول میں یہ بھی بتانے کی کوشش کی ہے کہ کس طرح ایک فن کار کے فن کی ناقدری سے وہ اپنا توازن کھودیتا ہے۔نورالحسنین نے مختصر الفاظ میں کہانی کا خلاصہ پیش کیا ہے دیکھئے:۔

> ''ناول مورتی ،میاں بیوی میں ذہنی ہم آہنگی کے فقدان پر لکھا گیا ہے یہ فقدان خاص طور پر اس وقت محسوس ہوتا ہے جب بیوی کا تعلق فنون لطیفہ سے ہو اس ناول کی بیوی یعنی ملیحہ کا یہی المیہ ہے جس کے باعث وہ نفسیاتی مریضہ بن جاتی ہے خود اذیتی کا شکار ہوجاتی ہے لیکن شوہر اسے سمجھ نہیں پاتا اور آخر ایک دن وہ پاگل ہوجاتی ہے۔''[1]

اس ناول کا ایک اور اہم کردار فیصل ہے جو ملیحہ کی بچپن کی دوست عافیہ کا دیور ہے وہ اپنے کسی کام کے سلسلے میں دہلی آتا ہے اور ملیحہ سے ملاقات کرتا ہے جب وہ ملیحہ کے بنائے ہوئے مجسمے کو دیکھتا ہے تو اس کے فن سے متاثر ہوتا ہے اس کی خوب تعریف کرتا ہے لیکن ملیحہ سے ملاقاتوں کا سلسلہ بڑھتا ہے تو اس کا تعارف ملیحہ کے شوہر اکبر علی سے بھی ہوتا ہے جو اپنی گفتگو سے ہی ایک مغرور اور کڑوے مزاج کا انسان لگتا ہے اس کے جسمانی قد وقامت اور چہرے کے نقش ونگار سے اس کو ایک دھچکا لگتا ہے کیوں کہ ملیحہ ایک تعلیم یافتہ خوش مزاج لڑکی ہونے کے ساتھ نہایت خوبصورت اور حسین وجمیل بیوی ہے مگر کچھ بھی ہو ملیحہ کا شوہر ہونے کے سبب فیصل اس سے بات کرتے ہوئے بڑی خوشی کا مظاہرہ کرتا ہے اور اس طرح جب فیصل اور ملیحہ میں بے تکلف دوستی ہوجاتی ہے تو وہ اکبر علی کو مذاق میں اصغر علی کہنے لگتا ہے ملیحہ فیصل کے اس مزاحیہ انداز سے محظوظ بھی ہوتی رہتی ہے وقت گزرنے کے ساتھ ملیحہ اور فیصل کے درمیان دوستی کا رشتہ بہت گہرا ہوجاتا ہے اور دونوں ایک دوسرے سے بلا جھجک ملنے اور باتیں کرنے لگتے ہیں اس دوران فیصل کو ملیحہ کی ازدواجی زندگی کا صحیح صحیح اندازہ ہوتا ہے کہ کس طرح اکبر علی ملیحہ کو اس کے فن کے حوالے سے ذہنی ٹارچر کرتا ہے۔ملیحہ پر طنز کے تیر چلانے کے معاملے فیصل کے سامنے بھی پیش آتے ہیں مگر فیصل اس وقت کچھ نہ کر پاتا ہے اور اندر ہی اندر بل کھا کر رہ جاتا ہے۔

[1] اردو ناول کی ایک صدی از نورالحسنین مشمولہ رسالہ فکر وتحقیق ناول نمبر ص ۹۳۔۹۲ قومی کونسل برائے زبان اردو اپریل۔جون ۲۰۱۶

ملیحہ کا شوہر بار ہا ملیحہ کے تراشیدہ مجسموں کو گھر سے باہر نکالنے کی دھمکی دیتا ہے کیوں کہ اس کے سامنے ان کی حیثیت بے جان پتھروں کی سی ہے اور وہ اس جگہ کو خالی کرا کے اپنے آفس کی جگہ بنانا چاہتا ہے اس سب کو لے کر ملیحہ بہت پریشان تھی کہ وہ ان مجسموں کو کہاں رکھے فیصل جو ملیحہ سے محبت بھی کرتا ہے اور ملیحہ سے ہمدردی کے جذبے کے ساتھ ملیحہ کے فن کی بھی قدر کرتا ہے لہٰذا اس معاملے میں وہ اس کی مدد کرنا چاہتا ہے اور ان مجسموں کی نمائش کے لئے 'سنگم کلا' میں ایک ہال بک کراتا ہے اس کے خیال میں اس طرح ملیحہ کا گھر خالی ہونے کے ساتھ ساتھ اس کی مشکل بھی آسان ہو جائے گی۔ اور ملیحہ کے تراشے گئے مجسموں کو دیکھ کر لوگ ملیحہ کے فن سے بھی آشنا ہو جائیں گے وہ ابھی یہ سب معاملات طے کر رہا ہوتا ہے کہ ملیحہ کا شوہر ان تمام مجسموں کو نوکروں سے اٹھوا کر بے کار پتھروں کی طرح پھینک دیتا ہے جس سے تمام مجسموں کا کوئی نہ کوئی حصہ ٹوٹ کر بکھر جاتا ہے ملیحہ اپنے محنت لگن اور محبت کے ساتھ تیار کئے گئے اپنے شاہکاروں کی یہ درگت دیکھتی ہے تو یہ صدمہ برداشت نہیں کر پاتی اور اپنا ذہنی توازن کھو دیتی ہے اس کا شوہر اسے پاگل سمجھ کر پاگل خانے بھیجنا چاہتا ہے۔ فیصل اس منظر کو دیکھ کر ملیحہ کے شوہر سے کہتا ہے:

> ''انھیں ۔۔۔ مت لے جایئے پاگل خانے ۔۔۔ اس نے آہستہ سے کہا''
>
> ''انھیں ...... میں اپنے گھر لے جاؤں گا ...... وہیں علاج کراؤں گا۔ اس نے ٹھہر ٹھہر کر مضبوطی سے کہا
>
> ''انھیں ...... مجھے دے دیجئے ......''
>
> ''وہ اکبر علی کے چہرے کی طرف دیکھتا رہا۔ جس پر قطعی کسی تاثر کی جھلک نہیں تھی اور وہ براہ راست اس کی آنکھوں میں دیکھ رہے تھے۔''[1]

فیصل کے یہ جملے دراصل ملیحہ سے اس کی محبت کا واضح ثبوت تھے۔ فیصل ملیحہ کا ایک دوست ہی نہیں تھا بلکہ وہ ملیحہ سے محبت بھی کر چکا تھا جو اس وقت بھی اس کے دل میں تھی فیصل کے کردار کے ذریعے ترنم ریاض نے پرانی دلی کی تاریخی و تہذیبی قدروں کو بھی اجاگر کیا ہے انھوں نے دلی کی تاریخی حیثیت اور ثقافتی حیثیت کا بیان

---

[1] ترنم ریاض۔ مورتی ص ۹۹۔ نرالی دنیا پبلی کیشنز دہلی۔ ۲۰۰۴

بار ہا کیا ہے ایک جگہ لکھتی ہیں:۔

''شہر دلی بھی کسی دل پھینک عاشق کی طرح بدلتا رہا۔ بار ہا بسایا، بار ہا اجڑا۔قدیم لغات فیروزی میں دلی کی تعریف یوں کی ہے کہ پنجاب کا ایک شہر جو دریائے جمنا کے کنارے آباد ہے۔
پنجاب کے ٹکڑے ہو گئے جمنا ندی سوکھ گئی...... یہاں...... برسات میں سیراب ہوتی ہوگئی......اور......شہر دلی اپنی محرومیوں اور ترقیات سمیت نقشۂ ہند پر پورے وقار سے جلوہ افروز ہے کتنی تہذیبیں سمٹ آئیں ہیں اس میں ...... ایک نئی مضبوط metropolis تہذیب وجود میں آچکی ہے۔''[1]

پرانی دلی کے متعلق ایک اور جگہ ترنم ریاض لکھتی ہیں:

''واقعی پرانی دلی نہیں بدلی تھی۔نئی نئی تعمیرات نے پرانی وضع کے مکانوں میں کچھ تبدیلی پیدا کی تھی مگر بہت کم اور صرف کسی کی جگہ ہی اور نسل در نسل رہ رہے مکین ابھی تک اپنا وہی طرز زندگی اپنائے ہوئے تھے جوان کی دو تین پیڑھیوں سے بھی زیادہ پہلے سے رائج تھا۔ ماسوائے کچھ جدید سہولیات کے اپنی تہذیب کو سینے سے لگائے ہوئے تھے۔ پکوان، ملبوسات، عطر، پان وہی کلچر جیسا فیصل نے کتابوں میں پڑھا تھا۔ تصویروں میں دیکھا تھا۔عافیہ بھابی سے سنا تھا۔''[2]

اس ناول کی ایک اہم جہت تانیثیت بھی ہے یہ مرداساس معاشرے کے اس چلن کے خلاف خاموش احتجاج بھی ہے جہاں عورت کے جذبات اور احساسات کو بے وقعت گردانا جاتا ہے عورت کو بھیڑ بکری کی طرح کسی بھی کھونٹے سے باندھا جاتا ہے جہاں عورت کی تخلیقیت اور قائدانہ صلاحیتوں کو نظر انداز کر کے اسے محض

---

[1] ترنم ریاض۔مورتی ص۔۲۹،نرالی دنیا پبلی کیشنز دہلی ۲۰۰۴

[2] ترنم ریاض۔مورتی ص۔۲۲۔نرالی دنیا پبلی کیشنز دہلی ۲۰۰۴

عشرت وزیبائش کی ایک شے مانا جاتا ہے۔

اس ناول کا خوبصورت ترین پہلو اس کا بیانیہ ہے فکشن کی عمارت بیانیہ پر ہی ٹکی ہوتی ہے بیانیہ جتنا طاقتور ہو ترسیل مضمون اتنی ہی موثر ہو جاتی ہے یہاں جزئیات نگاری نے سونے پر سہاگے کا کام کیا ہے ناول نگار نے پیشِ منظر کو موثر بنانے کے لئے پس منظر کی ایسی جاندار تصویریں کھینچی ہیں کہ انسان کو کچھ دیر کے لئے پس منظر میں ہی کھو جاتا ہے۔ ترنم ریاض کے ناول 'مورتی' کے آغاز میں مجسموں کی نمائش کا ذکر ہے نمائش کے لئے رکھے گئے مجسموں کی تفصیل پڑھتے پڑھتے قاری کے ذہن میں معنی کے ایک طلسماتی جہاں کی ان گنت کھڑکیاں وا ہوتی ہیں اقتباس دیکھیں:

''مرد کے مجسمے کا کندھا ٹوٹ چکا تھا اور ٹوٹا ہوا کندھا باقی حصے کے ساتھ لگا کر رکھا گیا تھا۔ جسم اور شانے کی درمیانی دارواضح تھی۔ اس کے قریب ایک گملے میں کیکٹس کا پودا تھا جس کی تازہ سیراب کی گئی مٹی مہک رہی تھی پاس ہی ایک اور مجسمہ تھا۔ ہرن کے بچے کا۔ اس نے کان کھڑے کر کے چوکنے انداز میں اپنی ننھی سی تھوتھنی ذرا سی اوپر اٹھا رکھی تھی۔ اس کا داہنا کان آدھا ٹوٹا ہوا تھا۔ اس کے برابر چھوٹا سا ایک لڑکا کتے کے ساتھ کھڑا تھا۔ ان دونوں کا مجسمہ ایک گول پتھر پر رکھا تھا۔ کتے کی آدھی دم ٹوٹ گئی تھی اور اسی پتھر پر پڑی ہوئی تھی۔ اس کے بعد پتھر کے ایک چوڑے دہانے والے گملے میں لیمو کا چھوٹا سا پیڑ اگا تھا اور اس کی بھیگی ہوئی مٹی سے سوندھی سوندھی خوشبو اٹھ رہی تھی۔ گملے کے برابر دونی رمائے سادھو کا مجسمہ تھا جس کی نیم وا آنکھوں کے اوپر ابروؤں کے عین درمیان سے پیشانی تک جاتی ہوئی چار آڑھی لکیریں ابھریں ہوئی تھیں۔ فن کی یہ باریک دیدنی تھی۔''[1]

ترنم ریاض کا یہ ناول فنی اعتبار سے ایک کامیاب ناول ہے۔ اس کا پلاٹ گھٹا ہوا ہے۔ شروع سے آخر

[1] ترنم ریاض۔ مورتی۔ ص ۹۔۸۔ نرالی دنیا پبلی کیشنز دہلی ۲۰۰۴

تک کہانی میں ربط وتسلسل برقرار ہے قاری کہیں بھی مرکزی کہانی سے دورنہیں ہوتا ہے ناول نگار نے جہاں کہیں بھی تاریخی وثقافتی مراکز کا بیان کیا ہے وہاں بھی قاری بدمزہ ہونے کے بجائے لطف اندوز ہوتا ہے۔اس ناول کے کردار متحرک اور زندہ ہیں جو قاری کو حقیقی نقشہ دکھاتے ہوئے اس پراثر انداز ہوتے ہیں مورتی ناول کو اگر منظر نگاری کے حوالے سے دیکھیں تو ترنم ریاض نے دہلی کی قدیم جگہوں ہوٹلوں اور گلیوں کی تصویر کشی کے ساتھ ساتھ کشمیر کی خانقاہوں اور جھیلوں کا بھی بڑی خوبصورتی کے ساتھ نقشہ کھینچا ہے ایک عجائب گھر کی تصویر کشی کچھ یوں کی ہے:

''وہ لوگ عمارت میں داخل ہوئے ملیحہ بے دلی سے آگے بڑھنے لگی پھر اندر پرانی اور بہت پرانی اور بہت ہی پرانی چیزوں نے اس کی توجہ اپنی جانب مبذول کرالی کہ پہلے ہی ہال میں پتھر کی قدیم مورتیاں کچھ سالم اور کچھ نیم سالم اپنے اپنے دور کی نمائندگی کررہی تھی۔ دھات اور مٹی کے قدیم سکے، زیورات اور ملبوسات، حنوط شدہ چرند وپرند، بوتلوں میں بند سانپ نیولے۔ قدیم ترین ہاتھی کی چوڑی سی دیو قامت کھوپڑی کا آدھہ حصہ (عجائب گھر کے گائڈ نے بتایا کہ اس کھوپڑی کا باقی نصف جنوبی افریقہ کے کسی عجائب خانے میں محفوظ ہے) کتنے عجیب ہیں دنیا کے معاملات ملیحہ نے سوچا تھا۔آبی اور زمینی نقشے، راجاؤں، بادشاہوں کے معاہدے، لباس، ہتھیار ازمنۂ قدیم وقت کی پھلانگ کر ایک جگہ اکٹھے ہوگئے تھے۔ملیحہ سوچتی رہی۔ رہ رہ کر اسے وہ مورتی بھی یاد آجاتی آخر کہاں دیکھا تھا اس نے اسے......؟''[1]

ترنم ریاض کی نگاہ بہت تیز ہے ان کا مطالعہ اور مشاہدہ دونوں وسیع ہیں چھوٹی چھوٹی چیزوں اور مناظر کو وہ بہت گہرائی سے دیکھتی ہیں اور صفحۂ قرطاس پر مختلف رنگوں میں لپیٹ کر بکھیر دیتی ہیں زبان و بیان کے اعتبار سے بھی ناول بہت عمدہ ہے اسلوب نگارش بااثر ہے ناول میں بے پناہ سادگی۔ شستگی اور شائستگی ہے۔مکالمہ

[1] ترنم ریاض۔مورتی ص ۴۵۔نرالی دنیا پبلیکیشنز دہلی ۲۰۰۴

نگاری کے بھی ترنم ریاض نے اچھے نمونے پیش کئے کرداروں سے موقع کی مناسبت سے مکالمے ادا کروائے ہیں جو ان کی شخصیت اور تہذیب کی عکاسی بھی کرتے ہیں غرض یہ کہ ناول تمام فنی تقاضوں کو پورا کرتا ہوا عصر حاضر کا ایک اہم ناول ہے زبان و بیان کی چاشنی، تہذیب و ثقافت پر مصنفہ کی گہری نظر اور تمام فنی باریکیوں کے شعور نے اس ناول کی اثر پذیری میں چار چاند لگا دیئے ہیں۔

برف آشنا پرندے:

ترنم ریاض کا دوسرا ناول ہے جو تقریباً ساڑھے پانچ سو صفحات پر مشتمل ہے یہ ناول بہت ضخیم ہے ۲۰۰۹ میں زیور طبع سے آراستہ ہو کر منظر عام پر آیا۔ ناول پندرہ ابواب پر مشتمل ہے برف آشنا پرندے ایک مسلم کشمیری خاندان کے تہذیبی زوال کی خوبصورت اور معنی خیز داستان ہے کہانی کئی راہوں سے گزرتی ہوئی ذہین الدین اور نزہت پر آٹکتی ہے شوہر اور بیوی کے درمیان روایتی اختلاف، شوہر کی برہمی اور زیادتی بیوی کا صبر اور مظلومی، ان سب کا اثر اولادوں پر عاصم کا بھٹک جانا یوں محسوس ہوتا ہے کہ ناول عاصم کے بھٹکے ہوئے کردار کو رخ دے گا اور موجودہ سماجی بھٹکاؤ اور دہشت گردی وغیرہ سے رشتے استوار کرے گا لیکن ناول میں شیبا کا کردار مرکزی رخ اختیار کر لیتا ہے نجم خاں اور ثریا بیگم کی بیٹی شیبا سے قبل خاندان کے عروج و زوال کے سلسلے سامنے آتے ہیں ایک سوال یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اسے زوال کیوں کہا جائے؟ بدلاؤ کیوں نہیں کہ تبدیلی فطری عمل ہے اور ارتقائی بھی کشمیر کے پس منظر میں یوں کہا جا سکتا ہے کہ شاخ پر پھول کھلتے ہیں مرجھاتے ہیں اور ٹوٹ کر بکھر جاتے ہیں۔

برف آشنا پرندے ناول جہاں ہندوستان اور پاکستان کے سیاست دانوں کو کشمیر کے حالات کی طرف متوجہ اور نتیجہ خیز حکمت عملی کی طرف رجوع کرنے کی دعوت دیتا ہے وہیں کشمیریوں کو خواب غفلت سے بیدار بھی کرتا ہے کہ وہ اپنی سرزمین کے ثقافتی سرمایہ اور معاشرتی امتیازات کو تاریخی حوالے سے پہچانیں اور اپنی کوتاہیوں سے سبق حاصل کریں۔ کیوں کہ سوال صرف سیاسی جماعتوں اور سرگرمیوں کا ہی نہیں بلکہ سوال انسانیت کا ہے انسانی جذبات و احساسات، امیدوں، آرزوؤں، عام انسانوں کے بکھرے خوابوں اور جان و مال کے تحفظ کا بھی ہے اس ناول میں کشمیر کی پانچ ہزار سال پرانی تہذیب کو فکشن کا جامہ پہنایا گیا ہے اہم سوال یہ ہے کہ وادیِ کشمیر کی ثقافتی تاریخ پر جمی برف کیوں نہیں پگھلتی۔ کشمیر کے نوجوانوں کی نئی نسل زخم خوردہ پرندے کی طرح ناپید کرتی بارودی فضا میں خود کو کہاں تلاشتی پھر رہی ہے یہ اس ناول کا مدعا ہے کشمیر کی روایات اور ارضی

استعارات کے سہارے ان سوالوں کو کہانیوں میں پرویا گیا ہے شبنم افروز اس ناول کے متعلق لکھتی ہیں:۔

''اس ناول میں کشمیری معاشرت ثقافت اور سیاست کے مختلف النوع خارجی حقائق ومسائل، واقعات وکردار اور کیفیات وتصورات کا بیان ملتا ہے جن کی معنویت کا رخ باطن یعنی ناول کے مرکزی نقطۂ کشمیر کی طرف ہوتا ہے 'برف آشنا پرندے' کے ناول کی پرواز کشمیر سے شروع ہوتی ہے جو وہاں کے دیہاتی اور شہری زندگیوں کے ساتھ درخشندہ تہذیبی وروحانی اقدار ومیراث، تاریخی جز رومد فطری اور معصوم زندگی کے لازوال حسن، نایاب دست کاری کی روایت اور فنی ریاضت وکسب وکمال کی تابندہ تاریخ تک محدود ہوجانے کے بجائے اپنے مرکزی اور ذیلی وضمنی کرداروں کی پیچیدہ نفسیات اور ان کے دائرۂ عمل کی بے پناہ وسعتوں کے باعث ایک عالمی اور آفاقی جہت بھی حاصل کر لیتا ہے۔''[1]

ناول 'برف آشنا پرندے' میں کشمیر کی تہذیبی تاریخ کا پس منظر خوبصورتی سے پیش کیا گیا ہے ناول کی کہانی چند لوگوں کے اردگرد گھومتی ہے ان کرداروں کا تعلق کشمیر کے زمیندار، اہل قلم اور با اثر گھرانے سے ہے ناول 'برف آشنا پرندے' ترنم ریاض کی گہری نظر، تجربات اور وسیع مطالعہ کے علاوہ تمام فنی تقاضوں کو پورا کرتے ہوئے کشمیر کی رنگا رنگ تہذیب وثقافت کی تصویر کشی ہے ناول کا مرکزی کردار شیبا ایک دلچسپ کردار ہے چونکہ ناول کا سارا منظر شیبا کے اردگرد پھیلا ہے اس لئے شیبا کے کردار میں یکسانیت پورے منظر میں دکھائی دیتی ہے۔ ناول میں تاریخی حوالوں کا ذکر بھی ناول نگار نے اکثر جگہ بڑی مشقت سے کیا ہے جو ناول کی خوبصورتی میں اضافہ کرتے ہیں۔ اس ناول کی سب سے بڑی خوبی کشمیری سماج اور وہاں کی تہذیب ومعاشرت کی پیش کش ہے۔ شہاب ظفر اعظمی اس ناول کے متعلق اپنے ایک مضمون میں لکھتے ہیں:۔

''اس ناول کی سب سے بڑی خوبی کشمیر کی معاشرتی، سماجی اور تہذیبی پیش کش ہے جس کی تفصیل اور باریک جزئیات کشمیر سے ناواقف قاری

[1] شبنم افروز۔ ترنم ریاض کے افسانوں میں خواتین کے مسائل ص ۱۹۷ ایجوکیشنل پبلیشنگ ہاؤس دہلی۔ ۲۰۱۷

کو نہ صرف متحیر کرتی بلکہ ایک نئی دنیا اور ثقافت سے متعارف کراتی ہے
طرز رہائش سے دستر خوان کی تفصیلات تک ہر گوشے کو بڑی وضاحت اور
سچائی سے پیش کیا گیا ہے وہاں کی سیاست اور مسائل پر گفتگو کم ہے
تہذیبی تاریخ کی پیش کش پر زیادہ زور ہے۔''[1]

شیبا کا کردار مرکزی حیثیت رکھتا ہے شیبا ایک تعلیم یافتہ لڑکی ہے جو نئی نسل کی نمائندگی کرتی ہے کشمیر کی تاریخ سے بخوبی واقف ہے کشمیر کو لے کر وہ ہندوستان اور پاکستان کے مزاج اور تیور کو پہچانتی ہے وہ آزادی کے بعد کی نسل کی نمائندگی کرتی نظر آتی ہے اس کے اندر نئی نسل کی سوچ کی احتجاجی لہریں اٹھتی ہیں جو اس کو بے چین کئے رہتی ہیں اس ذہنی انتشار کے باوجود ترنم ریاض نے اسے ایک مضبوط ارادے والی اور زیادتیوں کے خلاف آواز اٹھانے والے کردار کے روپ میں تراشا ہے۔ شیبا کے علاوہ دوسرے معاون کرداروں میں نجم خان، پروفیسر شہاب، پروفیسر دانش، فرخندہ، سکینہ بیگم، یاسمین، حلیمہ بیگم، نوری، عاصم، مختار، پروفیسر زاہد، ثریا بیگم وغیرہ ہیں اگرچہ اس میں شیبا کے علاوہ یہ معاون کردار بھی ہیں لیکن ناول کا سارا تانا بانا شیبا سے ہی ملتا ہے اور وہی کردار اپنے الگ الگ مزاج اور انداز سے کہیں نرم اور کہیں تلخ رویے سے کشمیر کی سیاست، ثقافت اور معاشرت سے قارئین کو واقف کراتا ہے۔ اس کردار کو فکشن کے مشہور نسائی کرداروں میں شامل کیا جاتا ہے۔ شیبا میں جذبات کی گرمی ضرور ہے مگر وہ کبھی بھی اضطراری نظر نہیں آتی شیبا موجودہ زمانے کی لڑکی ہے جو تعلیم اور ملازمت کے لئے اپنے گھر سے باہر دوسرے شہروں میں رہتی ہے دوستوں کے ساتھ وقت گزارتی ہے، اکیلے سیمناروں میں حصہ لیتی ہے وہ اپنے فیصلے لینے کے لئے خود مختار ہے۔ اس کے اوپر صرف ایک پابندی ہے وہ ہے اپنے دل اور روایتوں کی پابندی وہ اپنی زندگی کے متعلق ایک مشکل فیصلہ لے لیتی ہے کہ وہ ساری زندگی تنہائی میں گزارنا چاہتی ہے۔ شیبا کے کرداروں کے متعلق مشہور فکشن نگار سید محمد اشرف لکھتے ہیں:۔

''عصمت چغتائی اور خدیجہ مستور کے کرداروں اور ترنم ریاض کے اس
کردار میں ایک بڑا فرق یہ ہے کہ شیبا موجودہ زمانے کی وہ لڑکی ہے جو
تعلیم اور ملازمت کے لئے اپنے گھر سے باہر دوسرے شہر میں رہتی ہے

[1] اکیسویں صدی میں اردو ناول از شہاب ظفر اعظمی مشمولہ فکر و تحقیق۔ ناول نمبر اپریل۔ جون ۲۰۱۶ ص۔ ۱۰۵

دوستوں کے ساتھ وقت گزارتی ہے...... وہ انتہائی قوت برداشت کے
ساتھ (جو عورت کا خاصہ ہے) اپنی زندگی کے بارے میں ایک کٹھور
فیصلہ کرتی ہے اور تمام زندگی ایک تنہا فرد کی صورت میں گزارنا اپنا مقدر کر
لیتی ہے۔''[1]

برف آشنا پرندے میں پروفیسر دانش ایک کردار ہے جس کی مدد سے مصنفہ نے اپنی ہروئین کا کردار عمدگی سے پیش کیا ہے بہت فطری انداز سے دکھلایا گیا ہے کہ شیبا اپنے استاد کو ایک استاد کی طرح چاہتی ہے یہاں تک کہ اپنے محبوب اور اس کے ساتھ گزاری جانے والی زندگی کو بھی قربان کر دیتی ہے۔ برف آشنا پرندے ناول میں جہاں شیبا کا کردار مرکزی حیثیت رکھتا ہے وہاں دوسرے معاون کرداروں کی بھی اپنی ایک منفرد شناخت ہے۔ جو کشمیری تہذیب وثقافت کو سمجھنے میں قاری کی مدد کرتی ہے۔

ناول ''برف آشنا پرندے'' میں ناول کی تمام فنی خوبیاں موجود ہیں مصنفہ نے وادی کشمیر کی تاریخی تہذیبی اور سماجی بلندیوں کی طرف اشارہ یوں کیا ہے:

''میرا عظیم وطن ۔ میرا کشمیر
نرم خو، حلیم اور حسین کشمیریوں کی زمین ۔ دانشوروں فن کاروں اور
دستکاروں کا خطہ، ریشمو پشم، زعفران اروں اور مرغزاروں کی سر
زمین، پہاڑیوں، پانیوں اور وادیوں کا مسکن یہ کشمیر، جنت بے نظیر،
جس کی پانچ ہزار سال پرانی تاریخ موجود ہے جس کی مثال شاید ہی
دنیا میں کہیں ملے۔
قدیم ترین زبان وتہذیب کا مرکز کشمیر۔ رشیوں منیوں کا کشمیر، شیخ العالم
اور لل دید کا کشمیر، شاکھیہ منی کی پیشین گوئی کا بودھ گہوارہ کشمیر، کشیپ رشی
اور پرورسین کا کشمیر، للتا دتیہ کا اور سوئیہ کا کشمیر اشوک، کنشک، کلھن اور
بڈشاہ کا کشمیر۔ حبہ خاتون کا کشمیر، ارنی مال کا کشمیر۔ اور شاید موسی اور عیسی

[1] بازیافت، کشمیر، تحقیقی وتنقیدی مجلّہ (شمارہ ۴۵۔۴۴) ۲۰۰۹، ص۔ ۲۲۴

کی منتخب آرام گاہ کشمیر ہے جس کے ماضی کی عظمت بے شمار نشانیاں بن کر سارے خطے میں پھیلی ہے......''[1]

ناول برف آشنا پرندے اپنی تمام تر فنی خوبیوں سے پر ہے اس ناول کی کہانی مضبوط پلاٹ، کامیاب کردار نگاری، عمدہ منظر نگاری اور بہترین جزئیات نگاری کے ذریعے قاری کی نگاہ اور دلچسپی کو اپنی گرفت میں لیتی ہے منظر نگاری اور جزئیات نگاری کے اعلیٰ نمونے ناول میں ملتے ہیں۔

اس ناول کی اہم خوبی جزئیات نگاری ہے۔ اشیاء، نباتات، حیوانات اور ان کی حرکات، مقالات، تاثرات اور جذبات کے اظہار سے نثر کو مزید قوت عطا کی گئی ہے مختلف چیزوں کا ذکر یہ ظاہر کرتا ہے کہ ترنم ریاض نے داخلی کیفیات کی بھرپور ترجمانی کے علاوہ داخلی منظر نگاری میں بھی کوئی کسر باقی نہیں چھوڑی درگاہوں کی طرز تعمیر، اخروٹ کی مہک، بادام کے درخت کے مختلف رنگ، کپاس کے پھولوں کی مانند نظر آنے والے لمبے لمبے باسمتی چاول، پرندوں کی شکل وصورت اور ان کی آواز کا ذکر، برف باری کا ذکر نزہت کے ایام حمل کا ذکر، آدم خور چیتے کے شکار کا ذکر بہت خوبصورتی کے ساتھ کیا ہے جس سے قاری متاثر ہوتا ہے۔ منظر نگاری اور جزئیات نگاری کو سمجھنے کے لئے یہ اقتباس دیکھیں:۔

> ''خزاں میری اس حسین وادی کے پتوں کے لئے آسمانوں سے غازہ لئے چلی آتی ہے تو چناروں کی ہریالی قرمزی اور نارنجی ہو کر نیلے آسمان کے پس منظر میں بہشت کا کوئی ان دیکھا پارہ ہو جاتی ہے نرم نرم پروں والے گہرے گہرے رنگوں کے برف پسند پرندے اسے میزبانی کی سعادت بخشتے ہیں برف نیل گوں بادلوں سے مل کر سیدھی اس خطے کی وادیوں، پہاڑیوں اور پانیوں سے رشتہ جوڑنے چلی آتی ہے تو نتیجے میں اس کے دریا اور چشمے محو رقص نظر آتے ہیں اور اس کی جھیلیں اور ندیاں سیماب ہو جاتی ہیں۔''[2]

[1] ترنم ریاض۔ برف آشنا پرندے ص۔۶۳۔۱۶۲ ایجوکیشنل پبلیشنگ ہاؤ دہلی ۲۰۰۹

[2] ترنم ریاض۔ برف آشنا پرندے۔ ص۔۱۲۶۶ ایجوکیشنل پبلیشنگ ہاؤس دہلی ۲۰۰۹

ناول برف آشنا پرندے میں صرف کشمیر کی ظاہری خوبصورتی کو ہی نہیں بلکہ اندرونی قوتوں کو بھی بڑی فنی چابکدستی سے پیش کیا گیا ہے۔ناول میں مرکزی کردار شیبا کو اس کی غیر معمولی تخلیقی قوت سے پوری تہذیب وثقافت کا استعارہ بنادیا گیا ہے پروفیسر قاضی عبدالرحمٰن 'برف آشنا پرندے' ناول کے متعلق یوں رقمطراز ہیں:۔

''ترنم ریاض کا تازہ ترین ناول ''برف آشنا پرندے'' اپنے زمانی ومکانی تناظر کی حد تک خطۂ کشمیر کے لازوال حسن اس کی زخم خوردہ روح، قوت تحمل، ماضی کی خوابیدہ گزرگاہوں اور حال میں زندگی کے افق پر نئی تاب و تپش اور معنویت پر مبنی ایک نہ ختم ہونے والی کہانی ہے۔ناول کا نام بظاہر اپنی ایک علامتی رمزیت کے باوجود معاشرتی حقیقت نگاری کے واضح میلان کا نمائندہ اور پریم چند کی قایم کردہ فکشن کی روایت کی ایک توسیع شدہ نئی حسیت اور شعور وآگہی کا حامل تجربہ ہونے کے سبب اپنی جانب خصوصیت کے ساتھ متوجہ کرتا ہے۔''[1]

''برف آشنا پرندے'' ناول ایک اہم تاریخی دستاویز ہے یہ ناول اپنی تمام تر خوبیوں کے اعتبار سے اردو ادب میں ایک اہم اضافہ ہے ناول کا پلاٹ ترنم ریاض نے بڑی خوبصورتی سے ایک ٹائم فریم کے ساتھ مرتب کیا ہے پلاٹ بہت خوبصورتی سے بنایا گیا ہے۔ ناول کردار نگاری کے حوالے سے بھی بہترین نمونہ ہے کرداروں کا انتخاب ان کے حالات کو مدنظر رکھ کر ان کی صلاحیتوں کے مطابق مکالمے پیش کر کے ناول نگار نے اپنی صلاحیت کا لوہا منوایا ہے ناول تقریباً بیس کردار پر مشتمل ہے اگر چہ مرکزی کردار شیبا ہی ہے لیکن دوسرے ضمنی کردار کہانی کو آگے بڑھانے میں اپنا اپنا رول ادا کرتے ہیں اس لئے ان کی اہمیت سے انکار ممکن نہیں۔ منظر نگاری کے اعتبار سے بھی ناول میں بہترین نمونے ملتے ہیں زبان و بیان کے اعتبار سے بھی ناول بہت عمدہ ہے زبان ناول میں خاص اہمیت کی حامل ہوتی ہے کیوں کہ زبان کے ذریعے اس عہد کے طور طریقے، تہذیبی و معاشرتی جھلکیاں واضح ہوتی ہیں 'برف آشنا پرندے' ناول میں اسلوب کا تنوع اور لسانی اظہار کی اپنی خصوصیت ہے ناول کی زبان سادہ، شستہ اور فطری رنگ میں ڈوبی ہوئی ہے انداز بیان شوخی، ندرت اور شگفتگی جیسے عناصر

[1] بازیافت، کشمیر، تحقیقی وتنقیدی مجلّہ (شمارہ ۴۵۔۴۴) ص۔۲۲۳، ۲۰۰۹ء

سے پر ہے مجموعی طور پر ناول 'برف آشنا پرندے' ترنم ریاض کا ایک شاہکار کارنامہ ہے جو اپنی تمام تر خوبیوں کے سبب شہرت کا حامل ہے ترنم ریاض وادی کشمیر کی واحد خاتون ہیں جنہوں نے اپنے ناولوں میں کشمیر کی پانچ ہزار سالہ تاریخ کو سمیٹا ہے۔ جموں وکشمیر میں اردو ناول کی تاریخ میں ان کے ناول ایک اہم کڑی کی حیثیت رکھتے ہیں جب جب جموں وکشمیر میں ناول نگاری کا ذکر ہوگا تب تب ترنم ریاض اور ان کے ان دونوں ناولوں کا ذکر ضرور کیا جائے گا خاص طور پر جموں وکشمیر کی خواتین ناول نگار کی حیثیت سے ان کا نام سرفہرست ہے۔

عبدالرشید راہگیر

عبدالرشید راہگیر ریاست جموں کشمیر سے تعلق رکھنے والا ایک بڑا نام ہے ان کا اصل نام عبدالرشید خان ہے ان کی پیدائش ۱۴ فروری ۱۹۵۳ میں خطہ لداخ کے ضلع کرگل کے ساکنہ شمشاہ میں ہوئی۔ تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد کچھ عرصہ ضلع کرگل میں الیکشن قانون کی حیثیت سے ملازمت کی۔ اس کے بعد انہیں درس و تدریس کا موقع ملا اور محکمہ تعلیم میں استاد کے عہدے پر فائز ہوئے اور ۱۹۷۱ سے ۲۰۱۱ تک لیہہ، کرگل اور سرینگر کے مختلف تعلیمی اداروں میں فریضہ انجام دیتے رہے۔ ملازمت کے علاوہ کئی دیگر دلچسپ علوم وفنون میں انھوں نے بہترین کارنامے انجام دیئے۔ فرینڈز اردو کلب کے بنیادی کارکن ہونے کے علاوہ اداکارانہ سرگرمیوں سے وابستہ رہ کر اسٹیج پر کھیلے جانے والے ڈراموں میں بھی انھوں نے حصہ لیا۔ انھیں فنون لطیفہ سے گہرا شغف ہے کلچرل اکیڈمی لیہہ کی جانب سے منعقدہ ڈرامہ فیسٹول میں انھیں مزاحیہ اداکاری کے لئے انعامات سے بھی نوازا گیا۔ عبدالرشید راہگیر اپنی ملازمت کے ساتھ ساتھ تصنیف و تالیف سے بھی جڑے رہے اور اردو زبان و ادب کے لئے کام کرتے رہے انہوں نے اپنی تخلیقات میں ادب برائے زندگی کے تصور کے تحت موجودہ عہد کے سماجی ماحول کی مکمل ترجمانی کی ہے اردو افسانہ نگاری کے حوالے سے ان کا ایک مجموعہ ''اندھیرا سویرا'' کے عنوان سے ۲۰۱۴ء میں منظر عام پر آیا۔ اس افسانوی مجموعے میں شامل افسانے ریاست کے نمائندہ اخبارات اور رسائل میں شائع ہوتے رہے۔

عبدالرشید راہگیر کا ناول ''احساس'' ۲۰۱۱ء میں زیور طبع سے آراستہ ہوکر منظر عام پر آیا اس ناول کے علاوہ ان کی مختلف تصانیف سامنے آچکی ہیں اور وہ ابھی بھی اردو ادب کی بقا کے لئے ریاست بالخصوص لداخ میں کام کر رہے ہیں۔

احساس:

عبدالرشید راہگیر کا ناول ''احساس'' ۲۰۱۱ء میں جے کے آفسیٹ پرنٹرز جامع مسجد، دہلی سے شائع ہوا۔ اپنے اسی تخلیقی کارنامے کی وجہ سے نہ صرف ان کا نام فہرست مصنفین لداخ میں درج ہوا بلکہ وہ لداخ ہی نہیں ریاست جموں وکشمیر کے نمائندہ ناول نگاروں میں بھی شامل ہو گئے۔ ناول ''احساس'' لداخ کے پس منظر میں لکھا گیا ہے اور اسی مقصد کے تحت عبدالرشید راہگیر نے لداخی سماج ومعاشرت، رسم ورواج اور تہذیب وتمدن کے تحفظ اور اسے نئی نسل میں منتقل کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس کے علاوہ مصنف کے نزدیک لداخ میں اردو زبان وادب کو فروغ دینا اور نوجوان نسل کو اس کی طرف مبذول کرنا ہے۔ اس مقصد کے تحت انھوں نے لداخ میں ادب تخلیق کرنے کی اس روایت کو تقویت بخشی ہے جس کی بنیاد لداخ میں اردو زبان وادب کے موجد کاچو سکندر خاں سکندر کے ہاتھوں پڑی تھی عبدالرشید راہگیر نے سماج میں ہونے والی تبدیلیوں کو مدنظر رکھ کر بچوں کی تعلیم وتربیت اور عوامی افکار ومسائل کو بحسن وخوبی پیش کیا ہے ناول لداخ کی عام زندگی کے کئی پہلوؤں کو اپنے اندر سمیٹے ہوئے ہے اور ناول نگار نے ہر پہلو کو مکمل طور پر پیش کرتے ہوئے زندگی کی تلخ حقیقتوں کی طرف اشارے کئے ہیں عبدالرشید راہگیر کے ناول ''احساس'' کا پلاٹ مربوط ہے اور منظّم پلاٹ پر مشتمل ہے اس میں ایک مرکزی قصے کے علاوہ کئی ضمنی کہانیاں بھی شامل ہیں ناول کی کہانی کشمیر کے دو اساتذہ وسیم اور اکرم، لداخ کی ایک سادہ لوح لڑکی چھوردل اور وہاں کے ایک بدکردار لڑکے رگزن کے گرد گھومتی ہے۔ رگزن ناقص تعلیم و تربیت کی وجہ سے باغیانہ رویہ اختیار کر لیتا ہے اس کے ذہن سے استاد اور والدین کا خوف نکل جاتا ہے اپنی بری خصلتوں کی وجہ سے وہ ایک بہت بڑا بدمعاش بن جاتا ہے اپنے استاد وسیم کی لاکھ کوششوں کے باوجود بھی وہ سیدھی راہ اختیار نہیں کرتا ہے اور استاد سے دشمنی کی تمام حدیں پار کر کے اس پر جان لیوا حملہ کرنے پر آمادہ ہو جاتا ہے آخر میں اسے اپنی غلطیوں پر شرمندگی محسوس ہوتی ہے اور سب کے سامنے اپنی غلطی قبول کرتا ہے چھوردل نامی ایک جس لڑکی سے اسے محبت تھی اسے پانے میں وہ کامیاب ہو جاتا ہے ناول میں وسیم اور اکرم کے ذریعے معاشرے میں ایک استاد کے معمار قوم ہونے کے دعوے کو سو فیصد درست ثابت کیا ہے چھوردل جو تعلیم سے کنارہ کشی اختیار کر لیتی ہے لیکن استاد وسیم کے ذریعے وہ ایک بار پھر تعلیم میں نمایاں کارنامے انجام دیتی ہے اور ایک نئے سفر کا آغاز ہوتا ہے چھوردل کے والدین تعلیم سے محروم تھے اس لئے وہ سمجھتے تھے کہ آسان

میں کئی سورج ہیں اور ہر دن ایک سورج نکل کر پہاڑوں کے پیچھے چلا جاتا ہے اور وہاں جا کر جمع ہو رہے ہیں چھورول ان کی یہ باتیں سن کر اپنے والدین کو سمجھاتی ہے اقتباس ملاحظہ ہو کس طرح ان لوگوں کے درمیان حسب حال گفتگو کرائی ہے جو کرداروں کے تعلیم یافتہ اور جاہل ہونے کا پتہ بھی دیتی ہے:۔

''بیٹی۔ میں نے تمہارے ابالے سے پوچھا کہ ہر روز ایک نیا سورج اس طرف کی پہاڑوں سے ابھر کر اس طرف والے پہاڑوں میں اتر جاتا ہے تو اتنے سارے سورج آتے کہاں سے ہیں اور جاتے کہاں ہونگے''

''اماں لے آپ کے ذہن میں یہ سوال پوچھنے کا خیال آیا کیوں؟''

''بیٹا۔ پہاڑوں کے پیچھے اترنے والے لوگوں کا ڈھیر تو جمع ہوتا ہوگا نا''

ماں کی بے تکی بات پر چھورول کی ہنسی چھوٹی اور ہنس کر لوٹ پوٹ ہوگئی پھر ذرا وقفے کے بعد ماں کی طرف دیکھ کر بولی۔

''اچھا تو ابالے نے کیا جواب دیا آپ کی بات کا؟''

وہ تو کہتے ہیں کہ پہاڑوں کے پیچھے اور بھی پہاڑی گھاٹیاں ہیں

''یہ تو ابالے جی نے ٹھیک کہا''

''اور کہتے ہیں کہ ان گھاٹیوں میں صرف جھیلیں، چراگاہیں اور ندی نالے ہیں''

''یہ بھی ٹھیک کہا ہے''

''وہ کہتے ہیں کہ وہاں سورج کے گولوں کا نام ونشان ہی نہیں''

''ہو بھی نہیں سکتا''

''یہی تو میں سمجھا رہی تھی انہیں۔ سارے گولے پگھل پگھل کر جھیلوں میں سما جاتے ہوں گے ناں''

''چھورول ماں کی سادگی پر ایک بار پھر کھل کھلا کر ہنس دی اور ہنستی ہوئی بولی۔

''نا اماں لے...... ایسا نہیں ہے سورج کے بہت سارے گولے نہیں بس ایک گولہ ہے جو ہمیشہ ایک ہی جگہ رہتا ہے اور یہ جو مکان کھیت دریا والی ہماری زمین ہے نا۔ جس پر اونچے پہاڑ بھی ہیں یہ دیکھنے میں تو ہموار لگتی ہے مگر اصل میں یہ بھی سورج کے اس گولے کی طرح گول ہے......اور جو ہم سورج کو آسمان کے ایک کنارے سے دوسرے کنارے کی طرف روزانہ جاتے دیکھتے ہیں یہ بھی دراصل ہماری نظروں کا دھوکا ہے...... حقیقت تو یہ ہے کہ سورج ایک جگہ رکا ہوا ہے اور ہماری دھرتی ہمیں اٹھائے دن رات اس کے گرد گھومتی رہتی ہے جس کا ہمیں پتہ ہی نہیں چلتا ......اماں لے جس طرح ہم گاڑی میں سوار ہو کر کہیں جاتے ہیں...... یا جیسے ہوائی جہاز انسانوں کو لے کر ہوا میں چلتی ہے ایسے ہی سمجھ لیجئے زمین بھی گاڑی یا ہوائی جہاز کی طرح ہے۔ ہم اس پر سوار ہیں اور یہ ہمیں لئے سورج کے گرد چکر کاٹتی رہتی ہے۔''[1]

اس ناول کے ذریعے عبدالرشید راہگیر نے ہر طبقے کی اصلاح کرنے کی کوشش کی ہے ناول میں ناول نگار نے یہ بتایا ہے کہ بچوں کی تعلیم و تربیت میں سب سے اہم رول والدین کا ہوتا ہے یہ حقیقت ہے کہ اگر بچے کی زندگی کے ابتدائی مرحلوں میں اس کی پرورش اور تربیت اچھی نہ ہو تو وہ بڑا ہو کر سماج میں ایک باعزت فرد کی زندگی گزارنے کے بجائے بدکاریوں میں مبتلا ہو کر اس معاشرے کے لئے پریشانیوں کا سبب بنتا ہے اور اس وقت جب وہ سماج کے لئے سخت رویہ اختیار کر لیتا ہے تو وہ بے سود ثابت ہوتا ہے ناول کا کردار رگزن اس کی زندہ مثال ہے جس کے پاس نیک اور بد میں تفریق کرنے کا بالکل بھی شعور نہیں اور پورے سماج کے لئے کئی مسائل پیدا کر دیتا ہے ناول نگار عبدالرشید راہگیر خود بھی پیشے کے اعتبار سے چونکہ استاد ہیں اس لئے وہ بچوں کی تعلیم و تربیت کے حوالے سے والدین کو معتبر اور مستند آرا پیش کرتے ہیں انہوں نے لوگوں کو بتایا کہ تیرہ سے انیس سال کے لڑکے لڑکیاں بگڑنے یا سدھرنے کی اسٹیج سے گزر رہے ہوتے ہیں اس اسٹیج میں وہ من مانی

---

[1] عبدالرشید راہگیر۔ احساس، ص ۱۰۸۔۱۰۷، جے کے آفسیٹ پرنٹرز دہلی، ۲۰۱۱ء

شرارتیں نفس کشی، عبادت وریاضت کچھ بھی کرنے کے مجاز ہوتے ہیں انہیں کسی کا روکنا، ٹوکنا بہت ناگوار گزرتا ہے اس لئے ایسے بچوں کو پیار محبت اور نفسیات کی ضرورت ہوتی ہے وہ ڈانٹ ڈپٹ سے بننے کے بجائے بگڑ سکتے ہیں۔

ناول میں کرداروں کی بھرمار نہیں ہے۔ اس میں چند نمایاں کردار ہیں جن کے ذریعے کہانی تسلسل کے ساتھ قارئین تک پہنچتی ہے اس کے کردار ہمارے معاشرے سے لئے گئے ہیں جن میں سماج کے اچھے برے چھوٹے بڑے سب موجود ہیں جن کے ذریعے ناول میں معاشرے کی حقیقی تصویر کشی کی گئی ہے اس میں بچے بوڑھے جوان سب موجود ہیں اور یہی کردار قاری کے ذہن پر گہرے نقوش چھوڑ جاتے ہیں جو ناول میں کامیاب کردار نگاری کا ثبوت ہیں۔

ناول ''احساس'' میں منظر نگاری بھی بہت عمدہ ہے منظر نگاری کی بے شمار مثالیں ناول میں مل جاتی ہیں یہاں ایک مثال بطور نمونہ ملاحظہ کیجئے:۔

> ''سورج دن بھر کی سفر کے بعد مغربی چوٹیوں کے پیچھے نصف سے زیادہ اترا ہی تھا کہ شام کے سائے کھیتوں تک اتر آئے۔ پرندوں نے اڑاڑ کر آشیانوں کو لوٹنا شروع کیا۔ پیڑوں کی ڈالیوں پر پنچھیوں کے بے ہنگم شور نے ساز کی طرح مسلسل بج کر محفل سنگیت جیسی دھوم مچادی۔''[1]

''احساس'' ناول میں مکالمے بھی بہت خوبصورت ہیں اور مکالموں کو فطری طور پر حسب حال ادا کرایا گیا ہے کرداروں کے مابین مکالمے بالکل فطری معلوم ہوتے ہیں۔ ناول میں کہیں بھی جھول نظر نہیں آتا۔ ناول شروع سے آخر تک قاری کو اپنے ساتھ جوڑے رکھتا ہے۔ اس کے مطالعے میں سستی اور تھکاوٹ محسوس نہیں ہوتی۔ عبدالرشید راہگیر ایک انوکھا انداز بیان اختیار کرتے ہیں عبدالغنی شیخ ناول کے پیش لفظ میں لکھتے ہیں:۔

> ''......مصنف نے اس میں اپنے طرز بیان اور روز قلم سے رنگ بھر دیا ہے اور شروع سے آخر تک قاری کی دلچسپی قائم رہتی ہے اس میں ایک اچھے ناول کے سارے عناصر جیسے سپنس، کلائمکس، منظر نگاری اور کردار

---

[1] عبدالرشید راہگیر۔ احساس، ص۔۱۰۰، جے کے آفسیٹ پرنٹرز دہلی۔۲۰۱۱ء

نویسی بہ احسن طریقے سے پیش کئے گئے ہیں اس لئے ناولٹ حقیقت
نگاری کا ایک اچھا نمونہ ہے۔''[1]

نورشاہ اس ناول کے متعلق ناول کے دیباچے میں لکھتے ہیں:۔

''وہ (عبدالرشید راہگیر) ناول ''احساس'' کی کہانی میں زندگی کی تلخ
سچائیوں کی ترجمانی کرتے نظر آتے ہیں اور وہ اس کوشش میں کسی حد تک
کامیاب نظر آتے ہیں ناول ''احساس'' کی کہانی میں کئی کہانیاں ابھرتی
ہیں جو بظاہر پرسکون نظر آتی ہیں لیکن اپنے اندر طوفان چھپائے ہوئی
ہیں۔ان کہانیوں میں محبت کی بھی ایک کہانی ہے جو اپنی دھیمی رفتار کے
ساتھ پوری کہانی پر چھائی ہوئی ہے۔''[2]

مجموعی اعتبار سے عبدالرشید راہگیر کا یہ ناول ''احساس'' کہانی، پلاٹ، کردار نگاری، مکالمہ نگاری، منظر نگاری، زمان ومکان اور زبان و بیان کے حوالے سے مکمل ناول ہے یہ ناول نگار کا نہایت کامیاب تخلیقی کارنامہ ہے جو نہ صرف لداخ میں اردو زبان کو وسعت بخشتا ہے بلکہ لداخی معاشرے کی موجودہ صورتحال کا ایک مکمل منظر نامہ بھی سامنے لاتا ہے۔عبدالرشید راہگیر جموں و کشمیر کے بالخصوص لداخ کے مشہور فکشن نگاروں میں شمار کئے جاتے ہیں وہ ابھی حیات ہیں اور اپنی ادبی سرگرمیوں میں برابر مصروف ہیں۔

---

[1] پیش لفظ از عبدالغنی شیخ مشمولہ ناول احساس، ص ۷۔۶، جے کے آفسیٹ پرنٹرز دہلی ۲۰۱۱ء

[2] دیباچہ از نور شاہ۔مشمولہ ناول احساس ص۔۵، جے کے آفسیٹ پرنٹرز دہلی، ۲۰۱۱ء

شبنم قیوم

شبنم قیوم کا ذکر باب سوم میں تفصیل سے کر دیا گیا ہے البتہ اکیسویں صدی میں جو نیا ناول ’’پچھتاوا‘‘ منظر عام پر آیا ہے اس کے لئے شبنم قیوم کا نام یہاں دوبارہ آیا ہے۔

پچھتاوا:

یہ ناول ۲۰۱۵ء میں میزان پبلشرز سرینگر سے شائع ہوا۔ ناول ۱۸۰ صفحات پر مشتمل ہے اس ناول کا انتساب شبنم قیوم نے ان اداروں اور احباب کے نام جو دولت کمانے کے نشے میں عورت کو عریاں کر رہے ہیں ان خواتین کے نام جو دولت اور شہرت کے لئے ننگی ہو رہی ہیں عزت اور عصمت لٹانے کو ضرورت سمجھتی ہیں ان والدین کے نام، جو اپنی اولاد کے بارے میں لا پرواہ رہ کر ان کے بھٹکنے کا موقعہ فراہم کرتے ہیں۔ ناول ’پچھتاوا‘ کا موضوع آج کے ترقی یافتہ سائنسی وتکنیکی دور میں اخلاقی وروحانی قدروں کے زوال سے تعلق رکھتا ہے کہ جس میں شبنم قیوم نے ایک کڑوے سچ کو بڑی بہادری کے ساتھ ناول میں پیش کیا ہے بہت ہی جرت مندانہ انداز میں ٹی وی کمپیوٹر، لیپ ٹاپ، موبائل فون، اور دوسری ایسی تکنیکی سہولیات کے ذریعے گھر گھر میں فحاشی پہنچانے کے فنی پہلوؤں کو ناول میں سمو دیا ہے۔ کشمیر میں رہ کر نا مساعد حالات کے چلتے ترقی یافتہ سائنسی دور اور موجودہ زمانے کی نئی نئی ایجادات کا گہرائی سے مشاہدہ کرنے کے بعد اس کے مضر اثرات کا اعادہ کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ ناول کے موضوع کے متعلق شبنم قیوم کا وہ اعتراف یہاں نقل کر رہا ہوں جو انھوں نے اس ناول کے شروع میں کیا ہے وہ لکھتے ہیں:۔

> ’’اپنی ایک تصنیف ’’سیکس پولیوشن‘‘ کی تیاری کے دوران ہندوستان کے دو نامور انگریزی میگزین India Today اور Front Line کی جانب سے کالج اور یونیورسٹی کی سطح پر طالبات کے بارے میں ان کے

سیکس پر سروے کی رپورٹ میں ۳۳ فیصد لڑکیوں کی طرف سے سیکس
میں ملوث ہونے اور سیفٹی کے لئے اپنے پرس میں چھتری یعنی کنڈوم اور
مانع حمل گولیاں رکھنے کا اعتراف اور وہ بھی بغیر کسی ہچکچاہٹ اور شرم کے
گویا ڈگری حاصل کرنے کا انکشاف کیا جارہا ہو۔ اپنے اندر بڑا معنی رکھتا
ہے یعنی موجودہ ترقی یافتہ سائنسی دور میں ۳۳ فیصد طالبات کا مباشرت کا
اعتراف ہمارے لئے ششدر ہوکر پریشانی کا باعث بن گیا۔ اسی
دوران روز نامہ ''ہندسماچار'' میں ایک کم سن نابالغ لڑکی کے ناجائز حمل
ٹھہرنے کا انکشاف ہوا تو اسے اس دور کے انسان کی جارحیت اور
تہذیب کا زوال قرار دیا جاسکتا ہے یہ دونوں واقعات گذشتہ چند سال
سے میرے سینے پر ایک بوجھ بن کر رہے۔ اس بوجھ سے نجات پانے
کے لئے مجھے قلم اٹھانا پڑا۔ میرے آج کے اس ناول ''پچھتاوا'' کا
موضوع لگ بھگ حقیقت پر مبنی ہے۔''[۱]

ناول میں جنید اور رانی کی وہ کہانی بیان کی گئی ہے جس میں وہ دونوں فحش فلمیں دیکھنے کے بعد سیکس کرنے کے لئے تیار ہوجاتے ہیں رانی اور جنید جہاں ایک ساتھ اسکول پڑھتے ہیں وہاں ان دونوں کے باپ انیل اور میر اسلم پڑوسی کے اعتبار سے ایک دوسرے کے بہت قریب بھی ہیں۔ ایک دن رانی جنید ٹینس کھیل رہے تھے۔ شٹل کے پیچھے دوڑتے ہوئے نیلم کا پاؤں لان کے ایک کونے میں کیچڑ کے سبب پھسل گیا اور وہ گر گئی۔ کیچڑ سے رانی کا جمپر لت پت ہوگیا۔ جنید نے آکر اسے اٹھالیا۔ رانی اپنے جمپر کی حالت دیکھ کر پریشان سی ہوگئی جنید نے اسے پریشان دیکھ کر کہا اسے اتار کو دھو لیتے ہیں تھوڑی دیر میں سوکھ جائے گا۔ رانی پوچھتی ہے کہ میں تب تک کیا پہنوں گی تو جنید کہتا ہے آؤ چلو اندر چل کر میری شرٹ پہن لو۔ وہ اسے اندر لے جاتا ہے رانی اپنا جمپر اور شمیز اتارتی ہے انڈرویر اور بنیان میں اس کا جسم دیکھ کر جنید کو ایک دم کرنٹ سی لگ گئی۔ اس کے جسم پر ایک گرم سی لہر دوڑ گئی۔ وہ ایک نظر سے رانی کو دوسری نظر سے قد آدم آئینے کو دیکھ رہا تھا جس میں رانی

---

[۱] شبنم قیوم۔ پچھتاوا۔ ص۔۴، میزان پبلشرز سرینگر، ۲۰۱۵ء

آسمان سے اتری ہوئی ایک پری لگ رہی تھی جنید قمیض دینے اور رانی قمیض لینے کے لئے ہاتھ آگے بڑھاتے ہیں لیکن قمیض گر جاتی ہے دونوں قمیض اٹھانے کے لئے جھکتے ہیں تو دونوں کا بدن ایک دوسرے سے چھو گیا۔ دونوں کے جسم میں ایک کرنٹ سی دوڑ گئی اور دونوں قمیض اٹھائے بغیر گلے ملتے ہوئے بیڈ پر دراز ہو گئے۔ دونوں ایک دوسرے سے چمٹ گئے ایک دوسرے سے پیار کرنے لگے انگ سے انگ ملا دیا۔ دونوں کی عجیب کیفیت تھی جب یہ اپنی ہوس کی بھوک مٹاتے ہیں تو دونوں ایک دوسرے کو دو دو بوسے لے کر رخصت ہوتے ہیں کچھ دن بعد جب جنید اور رانی کی ملاقات ہوتی ہے تو جنید رانی سے معافی طلب کرتا ہے تو رانی جنید سے کہتی ہے کہ اس میں نہ تیرا قصور ہے نہ میرا قصور اگر ہے تو یہ کہہ کر رانی چپ ہو جاتی ہے تو جنید اسے کہتا ہے بولو کیا کہنا چاہتی ہو۔ یہاں میں ان دونوں کی بنیادی وجہ بتانے کے لئے ان کے کلمات نقل کرتا ہوں ملاحظہ فرمائیں:۔

''میں کیا بتاؤں......ایک مدت سے میرے اندر یہ خواہش پیدا ہو رہی تھی کہ کاش کوئی لڑکا مجھے اپنے سینے کے ساتھ لگائے میرے ہونٹ میرے گال چوم لے!'' جنید پھر پوچھتا ہے کہ یہ خواہش تمہارے اندر کیسے پیدا ہو گئی تو رانی جواب دیتی ہے۔

''پتہ نہیں......ویسے ٹی وی پر فلمیں اور سیریل ڈرامے دیکھ کر جب ہیرو اور ہیروئن ایک دوسرے سے چمٹ جاتے ہیں بوس کنار کرتے ہیں ایک دوسرے سے لپٹ جاتے ہیں تو میرے اندر آپ ہی آپ یہ چاہت جاگنے لگتی ہے۔ مدت ہوئی میرے گھر پر ٹی وی پر فلم سلسلہ چل رہی تھی ہیرو امیتابھ بچن اور ہیروئن ریکھا کے درمیان عشق، پیار و محبت اور ان کا آپس میں ملنا ایک دوسرے کے جسم کو جسم سے ملانا، بانہوں بانہوں میں جکڑنا، انگ انگ چوم لینا، ہیرو کی طرف سے ہیروئن کی ننگی رانوں کو سہلانا اور پھر بستر میں آ کر ان کا لیٹ جانا، یہ سارا سین دیکھ کر میرے اندر شوق جاگا اور کسی مرد کے لئے میری خواہش پیدا ہو گئی۔ تب سے لے کر اب تک یہ خواہش جاگتی ہے سوتی ہے اور جاگتی ہے۔''

''میری رانی ......، میری بھی حالت اس وقت دگرگوں ہوتی ہے جب
میں اکشئے کمار کو کسی ڈانس گرل کے ساتھ اس حالت میں دیکھتا ہوں جب
وہ ڈانس کے دوران ڈانس گرل کی ننگی ٹانگوں اور رانوں کو ملتا ہے اس کی
پیٹھ اور پیٹ کے بوسے لیتا ہے۔ اس کی گردن اور گلے کو چوم لیتا ہے
ہونٹ، چہرے اور آنکھوں پر بوسہ کر لیتا ہے۔ جب دونوں انگ سے
انگ ملا کر جنسی ملاپ کے بغیر وہ سب کچھ کرتے ہیں جن کو دیکھ کر
جذبات بھڑک اٹھتے ہیں۔ احساسات تڑپنے لگتے ہیں۔ تب میرے
اندر میرے دل میں ایک لڑکی کی خواہش پیدا ہوتی تو ہے البتہ یہ خواہش
سرد آہ میں بدل جاتی ہے۔''[1]

مندرجہ بالا اقتباس سے اس بات کا واضح اشارہ ملتا ہے کہ تکنیکی ایجادات کا غلط استعمال ان لوگوں کی زندگی تباہ کرتا ہے کس طرح وہ فلموں کے ہیرو اور ہیروئن کو دیکھ کر غلط راہ اپنا لیتے ہیں ان کے اندر بھی یہ خواہش پیدا ہوتی ہے۔ رانی کے حاملہ ہونے کا جب راز فاش ہوتا ہے تو وہ خودکشی کر لیتی ہے۔

یہاں ناول نگار نے یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ اگر انسان ان نئ ایجادات کا استعمال غلط کرے گا تو نتیجہ بھی غلط ہوگا۔ اگر صحیح استعمال کرتا ہے تو اچھا بھی حاصل کیا جا سکتا ہے۔ ناول کے حرف اول میں شبنم قیوم میں لکھتے ہیں:۔

''چھوٹے پردے کے سنیما، یعنی ٹی وی کے ذریعے ہم اپنے خیالات اور
نظریات کے ساتھ اپنی فطرت اور خصلت کے مطابق پروگرام دیکھتے تو
ہیں ملکی اور غیر ملکی حالات سے متعلق خبریں دیکھتے سنتے ہیں۔ یہاں تک تو
ٹھیک ہے۔ البتہ من پسند پروگرام یا خبروں کے دوران ایسے اشتہارات
سے سامنا پڑتا ہے کہ فیملی میں بیٹھ کر ایک دوسرے کی طرف دیکھنے کے
قابل نہیں رہ سکتے۔ ٹی وی کے ساتھ کمپیوٹر، لیپ ٹاپ اور موبائل، ان

---

[1] شبنم قیوم۔ پچھتاوا، ص۔۷۵۔۷۴، میزان پبلشرز سرینگر ۲۰۱۵ء

تینوں ایجادات سے جو استفادہ حاصل کیا جا رہا ہے۔اس میں خیالات و نظریات اور اس کے ساتھ فطرت اور خصلت کا عمل دخل شامل ہوتا ہے۔ ان ایجادات سے اچھا بھی اور برا بھی حاصل کیا جا سکتا ہے آپ کی ضرورت کیا ہے اور اس ضرورت میں صحیح اور غلط، اچھائی اور برائی نفسیات اور خیانت یہ سب آپ کی ضرورت اور چاہت پر منحصر ہیں۔لہٰذا اس کا دوش ایجادات کو نہیں دیا جا سکتا، یہ ایجادات گناہ اور ثواب نہیں جانتیں البتہ ہم ان سے گناہ اور ثواب حاصل کر سکتے ہیں۔''[1]

ناول میں کشمیر میں حالات کا وہ نقشہ بہت صاف صاف نظر آتا ہے جب کشمیر کے حالات خراب ہوتے ہیں اور وہاں سے کشمیری پنڈتوں کو جموں منتقل کیا جاتا ہے کشمیر کے حالات کو مدنظر رکھتے ہوئے کشمیری پنڈت وہاں سے ہجرت کر کے جموں یا پھر ریاست سے باہر چلے جاتے ہیں جب کہ وقت کے حکمران نے یہ ہدایت دی تھی کہ وہ عارضی طور پر شفٹ کریں کیوں کہ ہمیں یہاں صفائی کرنا ہے علیحدگی پسند تحریک کا قلع قمع کرنا ہے وادی کی نوجوان نسل کو تباہ کرنا ہے اس کاروائی سے آپ کو بچانے کے لئے عارضی طور پر بحفاظت یہاں سے جموں روانہ کیا جائے گا اور حالات نارمل ہوتے ہی واپس لایا جائے گا لیکن کشمیری پنڈتوں نے اس ہدایت کو نظر انداز کر کے دوسرے مقام پر سکونت اختیار کر لیتے ہیں انیل رینہ اپنے پڑوسی محمد اسلم کے فیصلے پر اپنے گھر میں رہنا ہی مناسب سمجھا اور میر اسلم اور بھائی میر عالم کا احسان ماننے لگا۔ کیوں کہ ریاست سے دوسرے کئی لوگ ہجرت کرنے کے بعد طرح طرح کی مشکلات سے دوچار ہوتے ہیں کشمیری پنڈتوں کو دورانِ ہجرت کئی مسائل کا سامنا کرنا پڑتا ہے ناول کے ایک کردار مہیش بھی اس کا شکار ہوتے ہیں کیوں کہ جموں پہنچتے ہی ان کی بیٹی کو اغوا کیا جاتا ہے۔ جموں شہیدی چوک سے اس کی بیٹی کو اس وقت چند غنڈے آٹو میں لے کر اغوا ہو جاتے ہیں جب مہیش اپنے بیٹے کے ساتھ رات رہنے کے لئے کمرہ دیکھنے گیا۔انیل اور اسلم صدمہ کا اظہار کرتے ہیں کشمیر تباہی کا ذکر مہیش کی زبانی شبنم قیوم نے کچھ یوں کرایا ہے:۔

''میں تو کہتا ہوں۔ ہمارے کشمیر کو نہ جانے کس کی نظر لگی۔ایک طرف قتل

---

[1] شبنم قیوم۔پچھتاوا۔ص۔۸۔میزان پبلشرز سرینگر۔۲۰۱۵ء

وغارت ہوا۔لوٹ مار ہوئی، گولیاں چلیں، بم پھٹے، دوسری طرف عورتوں
اورلڑکیوں کی بے حرمتی ہوئی، اگر یہاں آرمی اورفورسز نے سینکڑوں اور
ہزاروں کی تعداد میں خواتین اورلڑکیوں کی آبروریزی کی۔تو وادی سے
باہر مائیگرنٹ پنڈ تانیوں اوران کی بہوبیٹیوں کی ڈوگروں اورسکھوں نے
جموں سے باہر ہندوؤں نے مال غنیمت جان کرلوٹ کا مال سمجھ کر غنڈہ
گردی اور زور زبردستی کا بدترین مظاہرہ کیا۔ نہ صرف نابالغ اور بالغ
لڑکیوں کے ساتھ بلکہ شادی شدہ خواتین کے ساتھ جنسی درندگی کا مظاہرہ
کیا۔ڈیڑھ دوسال کے اندر جموں دہلی اور پاس پڑوس کی ریاستوں میں
بارہ سو سے زیادہ کنواری لڑکیوں کے ابارشن کرائے گئے یہ سلسلہ برسوں
تک جاری رہا۔ زبردستی شادی کے سینکڑوں واقعات رونما ہوئے۔
کشمیری پنڈت عورتوں اورلڑکیوں کو پا کر ڈوگرے سکھ اور ہندو بھوکے
بھیڑیوں کی طرح ان پرٹوٹ پڑے،کوئی پرسان حال نہیں،کوئی پوچھتا
نہیں نسی کی جیسی کتنی نابالغ اور بالغ لڑکیاں اب بھی لاپتہ ہیں اور یہ ایسا
روگ ہے جولاعلاج ہے۔''[1]

انیل رینہ جوکہ میر اسلم کا پڑوسی بھی ہے اسے پولیس ایک قتل کے معاملے میں شک کے طور پر گرفتار کر لیتی ہے لیکن بعد میں جب اصل قصوروار ملتا ہے تو پولیس انسپکٹر مہیش کے پاس آ کر بتا تا ہے کہ انیل رینہ کو ہم چھوڑنا چاہتے ہیں اس کے لئے ضمانت کی ضرورت ہے چنانچہ مہیش اورلتیکا دونوں رینا کے لئے ضمانت دینے پولیس اسٹیشن پہنچتے ہیں لیکن بدقسمتی سے انیل اس روز صبح حوالات میں بے ہوش پایا گیا تو پولیس نے اسے جموں اسٹیٹ ہسپتال پہنچا دیا مہیش اورلتیکا انیل کی یہ خبرسن کرسٹیٹ ہسپتال کی طرف روانہ ہوئے۔دوڑتے بھاگتے جب وہ سٹیٹ ہسپتال کے ایمرجنسی وارڈ کی طرف جارہے تھے تو انہوں نے اسٹریچر پرکسی لاش کو باہر لاتے ہوئے دیکھا۔مہیش پولیس انسپکٹر کو پہچان گیا اور پوچھا یہ کون ہے اس سے پہلے کہ کچھ جواب ملتا لتیکا انیل کے

[1] شبنم قیوم۔ پچھتاوا۔ص ۹۰۔میزان پبلشرز سرینگر ۲۰۱۵ء

منہ پر سے چادر ہٹا کر دیکھتی ہے وہ انیل کو مردہ دیکھ کر بیہوش ہو جاتی ہے مہیش انیل کے پاؤں پر سر رکھ کر روتا ہے اور کہتا ہے انیل مجھے معاف کر دو میں تم سے معافی مانگنے آیا ہوں۔ لتیکا بھی روتی ہے تھوڑی دیر بعد لاش کو مہیش کے گھر پہنچایا جاتا ہے جہاں لان میں مہیش کی بیوی اور ماں کے ساتھ آشا بھان اس کا بیٹا اور میر اسلم کو پایا انھیں دیکھ کر اس کے منہ سے رونے کی چیخ نکلی۔ لاش اندر پہنچانے کے بعد پولیس اسپکٹر نے بتایا کہ انیل کی جیب سے دوائی ملی ہے جو زیادہ تعداد میں کھانے کے باعث اس کی موت واقع ہوئی ہے اس حادثہ پر گھر میں ایک کہرام سا مچا سب اپنی اپنی جگہ دکھ اور رنج کا اظہار کر رہے تھے میر اسلم جو انیل رینہ کا پڑوسی تھا انیل رینہ کو دیکھ کر دم بخود ہو گیا ہے وہ اپنے دل میں بہت سے سوالات لئے ہوئے ہے یہ کیا ہوا، کیوں ہوا اور کیسے ہوا، اچانک یہ حادثہ۔ وہ سہہ نہ سکا۔ مہیش دونوں ہاتھ میں سر پکڑ روتا رہا۔ غرض سبھی رو رہے تھے۔ شانتا بھان کی رائے سے انیل کی لاش سرینگر جانے کا فیصلہ ہوا۔

یہاں یہ بات واضح ہوتی ہے کہ ناول نگار نے مسلسل حرکت کرنے والے کرداروں کو تراش کر یہ بتایا ہے کہ ظلم، جبر کے آگے بہت سے لوگ آزادی کشمیر کی خاطر اپنی جانیں دیتے ہیں ایجادات کے نقصانات اور کشمیری پنڈتوں کی ہجرت اور پھر ہجرت کے بعد بھی ان کا پریشانیوں میں مبتلا ہو جانا یہ سب ناول کی شکل میں بڑی جرت کے ساتھ شبنم قیوم نے پیش کیا ہے ان کا یہ ناول سیاسی۔ سماجی اور معاشی مسائل کی عکاسی کرتا ہے ناول میں کرداروں کا انتخاب بڑی فنی چابکدستی سے کیا گیا ہے مکالمہ نگاری منظر کشی میں بھی شبنم قیوم نے بڑی عرق ریزی سے کام لیا ہے ناول میں فن کا خوب مظاہرہ کیا گیا ہے ناول ''پچھتاوا'' اپنے موضوع وفن دونوں کے اعتبار سے ایک شاہکار ہے۔

نعیمہ احمد مہجور

ریاست جموں و کشمیر کی خواتین ناول نگاروں میں ایک اہم نام نعیمہ احمد مہجور کا ہے نعیمہ احمد مہجور کی پیدائش سرینگر کے ایک علمی گھرانے میں ہوئی۔نعیمہ احمد مہجور ابتدائی تعلیم حاصل کرنے کے بعد انہوں نے کشمیر یونیورسٹی سے اعلیٰ تعلیم حاصل کی۔اس کے علاوہ لندن یونیورسٹی سے بھی ایم اے کی ڈگری سیاسیات میں حاصل کی۔نعیمہ احمد مہجور صحافی بھی ہیں گوپی چند نارنگ نعیمہ احمد مہجور کے متعلق لکھتے ہیں:۔

> ''نعیمہ احمد کا تعلق وادی کشمیر کے ایک سربرآوردہ اور محترم شاعر غلام محمد مہجور مرحوم کے خانوادے سے ہے وہ ایک دل درد آشنا اور مضطرب روح کی مالک ہیں۔ کسے معلوم تھا کہ ایک دور افتادہ کشمیری گھرانے کی قدامت پسند لڑکی تعلیم کی راہدایوں سے گزرتے ہوئے اور ریڈیو کشمیر کی دشوار گزار آزمائشوں کو عبور کرتے ہوئے ایک دن بی بی سی لندن تک جا پہنچے گی اور جنوبی ایشیا کے حالاتِ حاضرہ کی ہماہمی پر نظر رکھنے اور بش ہاؤس کی شب وروز کی ذمہ داریوں میں گھیرے ہونے کے باوجود گہرے ڈل کے پانیوں میں تیرتے شکاروں اور زعفران کے کشادہ کھیتوں میں پوشیدہ زہر گل کو نہیں بھولے گی۔''[1]

نعیمہ احمد بیک وقت افسانہ نگار، ناول نگار اور صحافی بھی ہیں نعیمہ نے اپنا ادبی سفر افسانے سے شروع کیا۔ پھر انھوں نے ناول میں بھی طبع آزمائی کی اور ''دہشت زادی'' ناول تخلیق کیا۔ یہ ناول انہیں ریاست جموں و کشمیر میں اردو ناول نگاری کی تاریخ میں ایک اہم مقام عطا کرتا ہے۔نعیمہ اپنی تمام تر مصروفیات کے باوجود اردو ادب سے اب بھی وابستہ ہیں اور کشمیر ان کے دل ودماغ پر ابھی بھی حاوی ہے۔لندن میں ہوتے

---

[1] حرف اول از گوپی چند نارنگ مشمولہ دہشت زادی (ناول) ص۔۳۔میزان پبلشرز سرینگر (۲۰۱۲ء)

ہوئے بھی وہ کشمیر کی محبت اپنے دل میں رکھتی ہیں خاتون ناول نگار کی حیثیت سے جموں وکشمیر میں اردو ناول نگاری کی تاریخ میں نعیمہ احمد کا نام ہمیشہ زندہ رہے گا۔

دہشت زادی

نعیمہ احمد مہجور کا یہ ناول میزان پبلشرز سرینگر سے۲۰۱۲ء میں شائع ہوا۔ناول کشمیر کے پس منظر میں لکھا گیا ہے اس ناول میں نعیمہ احمد مہجور نے ۱۹۸۸ء سے۲۰۱۲ء تک کے عرصے میں جو کچھ کیا جو کچھ دیکھا ان تمام حالات وواقعات کی سچی تصویر کشی کی گئی ہے۔۱۹۸۸میں نے اس لئے لکھا کیوں کہ ان کے ناول کے شروع میں کچھ یوں لکھا ہے:۔

''اٹھارہ ستمبر ۱۹۸۸ء بھارت کے زیر انتظام ریاست جموں وکشمیر میں ایک پولیس افسر کے گھر پر بعض بندوق برداروں کے حملے کے بعد بھارت مخالف مظاہرے ہو رہے ہیں اور احتجاجی مظاہروں کے دوران بھارت سے آزادی کے حق میں مطالبہ زور پکڑنے لگا ہے۔''[۱]

ناول ''دہشت زادی'' ایک سوانحی ناول ہے اس میں کشمیری خاتون کی داستان ہے ناول نگار۔خود اپنے ناول کے سرورق پر یوں رقمطراز ہیں۔:۔

''دہشت زادی اس کشمیری خاتون کی داستان ہے جو اپنے کیریر کے آغاز پر اس وقت پر تشدد حالات کے شکنجے میں پھنس گئی جب وادی کشمیر میں سن اسی کے اواخر میں حصول آزادی کی خاطر عسکری تحریک شروع ہوگئی اور ہر طرف قتل وغارت گری، تباہی اور بربادی کے نتیجے میں اسے اپنے گھر نوکری اور شوہر پر اختیار نہیں رہا۔عسکری تحریک نے مسلم آبادی میں بھارت سے آزادی حاصل کرنے کے جذبے کو دوبارہ اجاگر کیا اور وہ بھی اس جذبے سے سرشار ہو کر آزاد مملکت کا خواب دیکھنے لگی مگر تحریک کے ساتھ اس کے شوہر کی جنونی حد تک وابستگی سے اس کی ازدواجی زندگی

[۱] نعیمہ احمد مہجور۔دہشت زادی، ص۔۵، میزان پبلشرز سرینگر، ۲۰۱۲ء

بری طرح متاثر ہوگئی۔گھریلواور بیرونی حالات اس قدر بدتر ہوتے گئے
کہ اس کو بعض اوقات عسکریت پسند اور بھارتی فوجی کے طرز عمل میں کوئی
نمایاں فرق محسوس نہیں ہوا۔ جب حالات اس کے قابو سے باہر ہوگئے تو
وہ روایتی معاشرے میں رہ کر زندگی کے ہر پہلو سے سمجھوتہ کرنے پر مجبور
ہوگئی حتیٰ کہ آزادی کے خواب کو دل کے کسی کونے میں پھر دفن کرنا پڑا۔'' [1]

ناول کا موضوع نعیمہ احمد مہجور کی حیات پر مبنی ہے اس کو سوانحی ناول قرار دیا گیا ہے نعیمہ احمد مہجور نے اپنی زندگی میں رونما ہونے والے حالات و واقعات کو کشمیر کی عام خواتین کے تناظر میں بیان کرنے کی کوشش کی ہے ایسے میں یہ ناول ایک ناول نگار کی زندگی ہی نہیں بلکہ پورے معاشرے کی عورتوں کی زندگی کی مکمل ترجمانی کرتا ہے مصنفہ نے کشمیر کی تحریک آزادی کے آغاز سے ہی یہاں عورتوں ن پر ہو رہے ظلم اور دکھ درد کو خود بھی دیکھا اور جھیلا اس کے علاوہ دوسروں کو بھی اس حالت میں تڑپتے ہوئے دیکھا۔گوپی چند نارنگ اس ناول کے متعلق لکھتے ہیں:۔

''یہ دہشت زادی تاریخ کے اس دلدوز المیے کی داستان کو ورق در ورق
کھولتی ہے یہ اپنی وضع کی الگ ہی تحریر ہے اس کو کوئی بندھا ٹکا نام دینا
مشکل ہے اس میں رسم و رواج میں جکڑی پابہ زنجیر عورت کا درد بھی ہے
اور وادی کی موجودہ سیاسی کشمکش و قومی تاریخ کی چاپ بھی قاری جیسے
جیسے اسے پڑھتا جائے گا متن کے بین السطور سے ایک ایسے مرکزی
کردار کا چہرہ ابھرے گا جو دکھ کے اندروں میں جھانکنے اور وادی کی زخمی
روح سے ہم کلام ہونے کی ہمت رکھتا ہے نیز جو اپنوں و بیگانوں کی چیرہ
دستیوں کو بے نقاب کرنے اور مٹی کی کراہ سننے کی تاب بھی لاسکتا ہے۔'' [2]

اس ناول کے متعلق ہی کشور جہاں زیدی لکھتی ہیں:۔

---

[1] نعیمہ احمد مہجور۔دہشت زادی۔سرورق۔میزان پبلشرز سرینگر۔۲۰۱۲ء

[2] حرف اول از گوپی چند نارنگ مشمولہ دہشت زادی ناول ص میزان ۳۔پبلشرز سرینگر۔۲۰۱۲ء

''بہت ممکن ہے کہ اس موضوع پر کشمیر میں اور بھی تحریریں قلم بند ہوئی ہوں
جو میری نظر سے نہیں گزری مگر نعیمہ کا انداز تحریر بہت سادہ اور پروقار ہے
یہ لڑائی مستحسن نہیں مگر اس کا جواز صرف ہندوستان کے حکمران دے سکتے
ہیں۔ شاید نعیمہ کے ناول کو پڑھ کر حکمرانوں کی ذہنیت بدل جائے اور
پردے کے پیچھے جو کچھ ہو رہا ہے اس پر مزید تحریروں کی صورت میں پردہ
اٹھ جائے۔''[1]

''دہشت زادی'' ناول کی کہانی ناول نگار نے متکلم کردار کے تحت تیار کی ہے یہ کردار خود مصنفہ ہیں کہیں مشکلات کا سامنا کرنے کے بعد ریڈیو میں کام کرتی ہے ریڈیو میں کام کرنے کے دوران سب سے بڑی رکاوٹ اس کا اپنا شوہر اور خاندان کے دوسرے لوگ ہیں کشمیری عوام بالخصوص اس کردار کے رشتہ دار ریڈیو میں کام کرنا اس لئے معیوب سمجھتے ہیں کہ یہ بھارتی حکومت کا ترجمان ہے اور یہاں سے وہی پروگرام نشر ہوتے ہیں جو کشمیر کی آزادی کو زخ پہنچاتے ہیں ن اور کشمیر کی آزادی کو دبانے میں اس ادارے کا کافی بڑا رول ہے ریڈیو کے تحت جو بھی پروگرام نشر ہوتے ہیں وہ دہلی سے منظور شدہ ہوتے ہیں اس کردار کا اگر کوئی اس کام میں ساتھ دینے کے لئے تیار ہے تو وہ اس کردار کا والد ہے جو کافی روشن خیال ہے۔ دیکھئے اقتباس:۔

''جب ریڈیو اسٹیشن میں میری تقرری ہوئی تو میرے خاندان کے اکثر
افراد نے مجھے بےعزتی کا موجب سمجھا، بعض رشتہ دار میرا نام سنتے ہی
تھوتھو کرنے لگے اور سڑک پر مجھے دیکھتے ہی راستہ تبدیل کیا کرتے۔ بابا
کے رشتہ داران کو طعنہ دیتے رہتے ''تمہاری بیٹیوں کو کون رشتہ دے گا
موچیوں کے حوالے کرنا ہوگا تب جا کر ان کی شادی ہو سکتی ہے۔''
مجھے رشتے چھوٹنے کا اتنا افسوس نہیں ہوا جتنا اس بات پر کہ بابا کو اپنے
عزیزوں سے جدا ہونا پڑا حالانکہ میں نے کئی بار نوکری چھوڑنے کا فیصلہ
کیا مگر بابا نے ایسے کرنے سے روکا اور کبھی متزلزل نہیں ہونے دیا۔ بابا

[1] پیش گفتار از کشور ناہید مشمولہ دہشت زادی ناول ص۔۴، میزان پبلشرز سرینگر، ۲۰۱۲ء

ہمیں اپنا سر اوپر اٹھا کر چلنے کا سبق سکھاتے رہے اگر دامن پاک ہے تو
کوئی آپ کا بال بیگا نہیں کرسکتا۔ جو آج نفرت کرتے ہیں وہی کل
تمہارے سامنے گڑگڑائیں گے دنیا کا یہی اصول ہے غلط سوچ رکھنے
والے ہمیشہ پشیمان رہتے ہیں زمانہ انہیں معاف نہیں کرتا'' بابا نے اپنے
رشتوں سے الگ ہوکر مجھے ان کے طعنوں اور طنز سے بچالیا۔''[1]

دہشت زادی ناول کے اس مرکزی کردار کے علاوہ بھی کچھ کردار ہیں جو کشمیری زندگی کے مختلف پہلوؤں کی نمائندگی کرتے ہیں ناول کا مرکزی کردار جب اپنے رشتہ داروں کی پرواہ نہ کرتے ہوئے اپنی مسلسل جدوجہد سے کامیابی پاتا ہے تو پھر اس کی زندگی بدل جاتی ہے جو شوہر اسے پہلے طعنہ دیتا تھا وہی بعد میں اسے محبت سے پیش آتا ہے رشتہ دار بھی اسے اب عزت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں اور اس پر ناز کرتے ہیں لندن جانے کے لئے یہ تیار ہوتی ہے تو سب لوگ کس طرح محبتوں سے رخصت کرتے ہیں اقتباس ملاحظہ فرمایئے:۔

''کوئلوں سے تپتے سماوار سے الائچی اور دارچینی کی خوشبو تازگی کا احساس
دلا رہی ہے۔ مہمان قہوہ نوش فرما رہے ہیں کئی رشتہ داروں نے تحفے
تحائف بھی پیش کئے جن کو کھولنے کا شرف نہیں ملا۔
آج میں سب کی توجہ کا مرکز بنی ہوئی ہوں۔ ہر کوئی آج میرا طواف کر رہا
ہے کوئی مجھ سے بات کرنے کے لئے بے قرار ہے تو کوئی میری قابلیت
اور صلاحت کا اعتراف کر رہا ہے میں اس لمحے کو مٹھی میں قید کرنا چاہتی
ہوں، اس لمحے کو دل و جان سے جینا چاہتی ہوں۔ ہم جیسی عورتوں کے
لئے ایسا لمحہ کبھی کبھار ہی آتا ہے۔''[2]

ناول کے دوسرے کرداروں میں شائستہ کا کردار بھی کافی اہمیت کا حامل ہے یہ کردار ان کشمیری خواتین کی ترجمانی کرتا ہے جو بے گناہ مسلح تحریک کے دوران نامعلوم بندوق برداروں کے ہاتھوں قتل کی گئیں۔ وہ کس

[1] نعیمہ احمد مہجور۔ دہشت زادی۔ ص۔ ۲۹۷ء میزان پبلشرز سرینگر۔ ۲۰۱۲ء

[2] نعیمہ احمد مہجور۔ دہشت زادی۔ ص۔ ۳۱۳، میزان پبلشرز سرینگر، ۲۰۱۲ء

جرم میں قتل کی گئیں اس کا علم خود انہیں بھی نہ ہوسکا قتل کے بعد شائستہ کے قتل پر اتنا ماتم کناں نہیں ہوتا جتنا قتل کرنے کی وجہ پر، شائستہ کو مخبر کہا جاتا ہے اس کو گھر میں دفتر میں اور پورے خاندان میں ذلیل کیا جاتا ہے۔ اس کے قتل کے بعد اس مرکزی کردار کے ذہن میں کئی سوالات پیدا ہوتے ہیں کہ ایسے حالات میں جب سب اس کو غلط ٹھہرا رہے ہیں سچائی کون بتائے گا؟ قتل کی سچائی کون بیان کرے گا اخبار میں وہی لکھا ہوا ملے گا جو ان سے لکھوایا جائے گا۔ لوگ من و عن ان بے بنیاد خبروں پر قبول کریں گے۔ مرکزی کردار شائستہ کے متعلق لکھتی ہیں:۔

''شائستہ کے بارے میں صرف اتنا جانتی ہوں کہ وہ معصوم لڑکی گھر کی پانچ خواتین کا بوجھ سنبھال رہی تھی۔ باپ اور بھائی سے محروم، ماں اور چار جوان بہنوں کا واحد سہارا تھا۔ مگر مجرموں کو کون سمجھائے کہ تم نے ایک گھر کی روزی روٹی چھین لی۔ ایک ماں کا سہارا چھینا۔ اور بہنوں سے ان کی آخری امید ہتھیالی۔''[1]

اس ناول میں سعدیہ کا کردار بھی کافی متحرک ہے جب فوج کریک ڈاؤن کے چلتے ان کے گھر آتی ہے اور اس کے بابا سے سوال کرتی ہے ڈراتی دھمکاتی ہے کہ سچ بتاؤ دہشت گرد تمہارے محلے میں کس کے گھر پناہ لیتے ہیں تو بابا خدا کی قسم کر کے کہتے ہیں کہ مجھے کچھ پتہ نہیں میرا یقین کر لیجئے۔ یہاں دہشت گرد نہیں آتے پھر فوجی اور دباؤ ڈالتے ہیں تو بابا اسے بھی منع کرتے ہیں سعدیہ وہاں جانا ملتوی کرتی ہے اور بابا کو اس دکھ کی حالت میں سہارا بنتی ہے دیکھئے اقتباس:۔

''بابا زمین پر بیٹھ کر اپنا سر ہاتھوں میں رکھ کر خوب روتے ہیں۔ سعدیہ کھڑی دیکھ کر اب بانڈی پورہ جانا ملتوی کرتی ہے وہ بابا کو سینے سے لگا کر خود مرثیہ کرنے بیٹھتی ہے یا ہر کریک ڈاؤن کو ختم کرنے کی آوازیں آتی ہیں اور مرد، لڑکے، بچے، بوڑھے، آزادی کے حق میں نعرے بلند کر رہے ہیں ''ہم کیا چاہتے آزادی'' آزادی کا مطلب کیا لا الہ الا اللہ۔''[2]

[1] نعیمہ احمد مہجور۔ دہشت زادی۔ ص۔۹۰، میزان پبلشرز سرینگر، ۲۰۱۲ء

[2] نعیمہ احمد مہجور، دہشت زادی ص۔۱۲۵۔ میزان پبلشرز سرینگر۔ ۲۰۱۲ء

سعدیہ کا کردار ان ماؤں کی ترجمانی کرتا ہے جن کے بچے انھیں چھوڑ کر سرحد کراس کر جاتے ہیں تا کہ واپس آ کر وہ اپنی جانوں کو اپنے وطن جنت بے نظیر کشمیر کے لئے قربان کر سکیں۔ سعدیہ اولاد کے باہر جانے کے غم میں اپنا گھر بار چھوڑ کر دور دراز گاؤں میں چلی جاتی ہے دراصل وہ اپنا دماغی توازن کھو جاتی ہے اس طرح فریدہ اور فائیزہ نامی دو نسوانی کردار بھی ان کشمیری خواتین کی ترجمانی کرتی ہیں جو طرح طرح کے مصائب کا سامنا کرتی ہیں فائیزہ جو اپنے بھائی بہنوں کی چہیتی ہے اب جوان ہے لیکن اخوانیوں کا سرغنہ اس کے لئے پریشانی کا سبب بنتا ہے وہ بار بار اس کے گھر آتا ہے اخوانی گھر کے سامنے آ خر اپنے ساتھیوں کے ساتھ کبھی کیرم کھیلتا کبھی کچھ دوسری حرکتیں کرتا جس سے فائزہ کے پڑوسی ان پر شک کرتے ہیں ایک طرح سے وہ ایسی صورتحال میں جب اخوانی سرغنہ اپنے ساتھیوں کے ساتھ فائزہ کو پانے کے لئے بار بار اس کے گھر کے پاس جمع رہتے ہیں تو فائزہ کے بھائی یہاں بے بس نظر آتے ہیں وہ اخوانیوں سے دشمنی مول لینا خطرہ سمجھتے ہیں۔ اقتباس ملاحظہ کیجئے:۔

> ''...... ایک طرف اخوانی کی حرکتوں نے ہمارا جینا حرام کر دیا ہے تو دوسری طرف پڑوسی اس کی حرکات اور ہماری خاموشی کو مشکوک سمجھ رہے ہیں وہ شاید ہمیں تحریک مخالف عناصر میں شمار کرنے لگے ہیں جس کے نتیجے میں محلے والوں نے ہمارے ساتھ سلام و دعا بھی بند کر دی۔ ان حالات میں تحریک دشمن عناصر کو دن دھاڑے نہ صرف قتل کیا جاتا ہے بلکہ ان کا مکمل سوشل بائیکاٹ بھی ہوتا ہے اس سے بڑا کیا عذاب ہوگا اگر پڑوسی ہم کو غدار تصور کرنے لگے ہمارا سوشل بائیکاٹ کریں گے اس سے تو موت بہتر ہے اخوانی کے بے ہودہ پن سے ہمارے خاندان کی بدنامی ہو رہی ہے اور ہمارا وقار مٹی میں مل رہا ہے۔''[1]

یہ ناول سوانحی ہے لیکن سماج میں پائے جانے والے ان لوگوں کی بھی مکمل عکاسی کرتا ہے جن کو ظالم اپنے ظلم سے پریشان کرتے ہیں ان گنت شوہروں کو قتل کر کے بیواؤں کی تعداد میں اضافہ کرتے ہیں فوج کس

[1] نعیمہ احمد مہجور۔ دہشت زادی۔ ص۔۲۳۵، میزان پبلشرز سرینگر، ۲۰۱۲ء

طرح زبردستی ان عورتوں پر اپنا حکم چلاتی ہے اس کی جیتی جاگتی تصویریں نعیمہ احمد مہجور نے اس ناول میں پیش کی ہیں تاکہ حقائق کو سامنے لایا جاسکے ناول اپنے پلاٹ کردار نگاری۔ مکالمہ نگاری اور منظر کشی کے اعتبار سے ایک کامیاب ناول ہے یہ ناول ۳۱۸ صفحات پر مشتمل ایک ضخیم ناول ہے میں اپنی بات گوپی چند نارنگ کے ان جملوں پر ختم کرنا چاہوں گا۔

گوپی چند نارنگ اس ناول کے متعلق ناول کے حرف اول میں یوں رقمطراز ہیں:۔

’’مجھے یقین ہے کہ اس کتاب کو فقط ایک نیم سوانحی ناول کے طور پر نہیں بلکہ عورت کی پسماندگی کے خلاف ایک پرسوز احتجاجی دستاویز اور وادی کی انسانیت پسند روحانی میراث ’ریشیت‘ کی درد میں ڈوبی فریاد کے طور پر بھی پڑھا جائے گا۔ یہ بھی ممکن ہے کہ بعض صاحب ذوق نگاہیں ’دہشت زادی‘ اور ’وادی‘ میں تطابق کو بھی دیکھ لیں۔ دونوں میں تانیثیت قدر مشترک ہے اور استحصال اور المیہ کی کیفیت بھی، سنٹرل ایشیا اور جنوبی ایشیا کے دوراہے پر ٹھٹھکا ہوا جس کا وجود اور ثقافتی تشخص منفرد بھی ہے اور متصادم بھی اور جسے نہ اپنوں نے سمجھا ہے نہ بیگانے سمجھنا چاہتے ہیں کیا تخلیقی سطح پر دہشت زادی نے استعارتاً درد کی اس شکن در شکن تمثال اور تطابق کو پالیا ہے؟ اگر ایسا ہے تو مصنفہ نے گویا ایک ہی جست میں دہلیز پار کرلی ہے۔ ہر چند کہ بیانیہ کا سوز ہنوز کچا ہے لیکن شدت احساس اور درد کا تناؤ اپنے ادبی اظہار کا جواز چاہتا ہے۔‘‘[1]

---

[1] حرف اول از گوپی چند نارنگ، مشمولہ دہشت زادی ناول، ص۔۳، میزان پبلشرز سرینگر، ۲۰۱۲ء

حامدی کا کاشمیری

حامدی کاشمیری کا ذکر تفصیل سے باب سوم میں آچکا ہے لیکن ۲۰۱۷ء میں ان کا ایک ناولٹ ''پرچائیوں کا شہر'' منظر عام پر آیا۔ جس کا ذکر اس باب میں کیا جائے گا۔

پرچھائیوں کا شہر:

یہ ناولٹ ۲۰۱۷ میں میزان پبلشرز سرینگر سے شائع ہوا۔ ناولٹ کا انتساب حامدی کاشمیری نے اپنے عم بزگوار کے نام کیا ہے۔ یہ ناولٹ ۵۲ صفحات پر مشتمل ہے۔ ناول میں ایک نہایت ہی حساس، دانشمند اور تعلیم یافتہ لڑکی کی کہانی پیش کی گئی ہے جو منزل پانے کے لئے بہت کچھ سہنے کے لئے مجبور ہے حامدی کاشمیری ناولٹ کے متعلق خود لکھتے ہیں:۔

> ''یہ ناولٹ رواجی ناولوں کی طرح موضاعاتی (Thematic) نہیں ہے اس میں ایک مرکزی نسوانی کردار (صفیہ) کی زندگی کی اونچ نیچ اور کشمکشوں کی جگہ گداز کہانی پیش کی گئی ہے۔ ایک حساس، دانشمند خواب پرست، تعلیم یافتہ لڑکی سامنے آتی ہے جو مردوں کے سماج میں، جس کی نمائندگی افضل کرتا ہے۔ اپنی شناخت کے بحران کا سامنا کرتی ہے لڑکی کی سرگزشت حقیقت نگاری کی پابند نہیں، وہ ایک خود وتکوفرضی کردار کی طرح ناول میں نمود کرتی ہے ناولٹ کا یہ مرکزی نسوانی کردار صفیہ ہر قدم پر اپنے خوابوں کی شکست کا سامنا کرتی ہے۔ وہ جیتے مرتے ''تن ہمہ داغدار شد'' کے مصداق بہت کچھ سہنے کے لئے مجبور ہے وہ ناولٹ کی تخیلی دنیا میں پروان چڑھتی ہے اور منزل یابی کے لئے سفر در سفر کرنے کے

باوجود سفر کی ناتمامی کا کرب جھیلتی ہے۔''[1]

یہ ناولٹ چھ ابواب پر مشتمل ہے صفیہ نامی کردار جو مختلف تکلیفیں برداشت کرتی ہے اس کا ذکر ناولٹ میں شروع سے آخر تک ملتا ہے۔صفیہ اپنے کام کاج سے فارغ ہو کر آسمان کے سینے پر پہاڑوں کو دیکھتی رہتی۔ اس کی ساس کو پیروں،فقیروں کے تعویذ گنڈے جلانے کے بعد جو فرصت ملتی وہ صفیہ کو کوسنے میں صرف کرتی ہے ایک جگہ وہ صفیہ کو یوں کہتی ہے:۔

''ڈائن،تم نے میرے لال کو کھا لیا اور جب سے اس منحوس کو جنا ہے گھر میں نحوست برستی ہے۔اس نے اب خرچہ بھیجنا بھی بند کر دیا ہے۔''[2]

ادھر ڈاکیہ ایک لفافہ تھمانے آتا ہے دراصل یہ طلاق نامہ تھا۔صفیہ کی ماں کھانسنے لگی کیوں کہ کچن گاڑے دھوئیں سے بھر گیا تھا اور سالن جلنے کی بو اس کے نتھنوں میں گھس رہی تھی۔صفیہ اپنی ماں کی کھانسی سے نہایت پریشان تھی جیسے اس کے قدموں کے نیچے سے زمین سرک رہی تھی اب صفیہ ماں سے کہتی ہے کہ اب تم آرام کرو۔اس داستان کی باقی کڑیاں وہ خود جوڑے گی کیوں کہ اب تک اس کی ماں برابر ٹالتی رہتی تھی جس کے سبب آج سینے پر پہاڑ جم گیا۔اس کے بعد وہ کئی مشکلات کا سامنا کرتی ہے۔

ایک دن سالانہ جلسے میں سے ڈیبٹنگ اور آرٹ کمپٹیشن میں اول آنے پر پرائز ملا اس روز وہ بہت نروس تھی وہ جلدی جلدی گھر لوٹی امی نے اسے سینے سے لگا لیا نئے پل کے پاس میمونہ کا گھر تھا وہ میمونہ کے بھائی فیروز کو وہ ناول لوٹانے کے لئے وہاں گئی جو وہ تین دن سے پڑھ رہی تھی۔وہ میمونہ سے ہم کلام ہونا چاہتی تھی لیکن میمونہ کے حلق سے لفظ نہیں نکل رہے تھے۔جیسے میمونہ سالانہ جلسے میں نہ تھی۔فیروز اس دن غائب تھا شام تک وہ انتظار کرتی رہی تاکہ فیروز آئے اور گھر تک اس کا ساتھ دے۔فیروز آیا دونوں نے کچھ دیر باتیں کیں زیادہ باتیں صفیہ ہی کرتی رہی فیروز چپ چاپ سنتا رہا۔وہ بھی فیروز کی خاموشی کا دل ہی دل میں لطف اٹھاتی رہی۔اچانک اسے خواہش پیدا ہوئی کہ وہ کسی چیز پر فیروز پر لڑ پڑے دونوں چھینا جھپٹی پر اتر آئے اور پھر فرش پر ایک دوسرے سے الجھتے رہے۔پھر وہ کہتا ہے میں چلتا ہوں اداسی کے عالم میں اس کی آواز نکلتی ہے وہ

---

[1] حرف اول از حامدی کاشمیری۔پرچھائیوں کا شہر،ص۔۸،میزان پبلشرز سرینگر،۲۰۱۷ء

[2] حامدی کاشمیری۔پرچھائیوں کا شہر،ص۔۱۱۔میزان پبلشرز سرینگر۔۲۰۱۷ء

باغ میں سیب کے پیڑ کے پاس کھڑے تھے۔ موذن کی آواز ٹین کی چھتوں سے ٹکرانے لگی وہ دونوں چپ چاپ کھڑے تھے اچانک فیروز نے اپنا دایاں ہاتھ اس کے کندھے پر رکھ دیا ہاتھ پھسلتا ہوا اس کے سینے کی گولائیوں سے ٹکرا گیا۔ وہ چونک کر فیروز سے کہتی ہے پرندوں کو ہاتھ لگے تو فر سے اڑ جاتے ہیں فیروز نے گھبرا کر ہاتھ کھینچ لیا۔

مچھردانی میں سے کسی ڈھیٹ مچھر نے اس کی گردن پر سوئی سی چبھودی وہ اٹھ بیٹھی اور نرم انگلیوں سے گردن کو سہلانے لگی گردن کا سیاہ داغ جو غائب ہو چکا تھا پھر سے ظاہر ہو رہا تھا۔ اس کا سینہ کھلا تھا بریزئرا تار کر اس نے کھلی نائٹی پہنی تھی۔ دولت آباد کی نیلگوں فضاؤں میں بادام کے شگوفوں کی دھول اڑ رہی تھی اور پائیں باغ میں انگور کی بیل کے پاس کھڑی تھی۔ افضل پتھر کے بنے ہوئے برآمدے پر لیٹے دھوپ سینک رہے تھے۔ ممانی جان مٹی کی دیوار پھلانگ کر سبزی باغ میں تھی دو کالے بھنور گنگناتے ہوئے آئے اور اس کا طواف کرنے لگے۔ وہ ان میں گھر چکی تھی اور فرار کا کوئی راستہ نہ تھا۔ وہ چیختی ہے اور افضل بھیا آواز لگاتی ہے لیکن اتنے میں محسوس ہوتا ہے کہ اس کی گردن میں کسی نے تیز برچھی اتار دی ہے وہ درد سے بلبلا اٹھی گھر میں ان کے علاوہ کوئی دوسرا نہ تھا وہ چیتے کی سی جست لگا کر اندر گئے وہ ایک چھوٹی سی شیشی تھی اور ایک تیز پھل والا چاقو تھا۔ وہ چاقو سے اس کی گردن کو کھرچنے لگا۔ لیکن وہ جھٹکے کے ساتھ الگ ہوگئی اور وہ لمحہ بھر احمق کی طرح اسے دیکھتے رہے۔ وہ کہتا ہے کہ گردن ڈنک کے زہریلے کانٹے سے پھول جائے گی لیکن صفیہ کہتی ہے میں چاقو سے کھرچنے نہیں دوں گی میں مر جاؤں گی افضل کہتا ہے کہ تم مرنہیں جاؤ گی وہ زبردستی لیکر تیزاب کی چھوٹی شیشی اس کی گردن پر انڈیل دیتا ہے۔ چیخ پکار سن کر سب پریشان ہوئے اور سبھی نے افضل کو لعن طعن کیا۔

یہاں یہ کہانی بتانے کا مقصد یہ ہے کہ صفیہ کس طرح تکلیف برداشت کرتی ہے آخر وہ افضل کے اس سلوک سے تنگ بھی آتی ہے اور وعدہ کرتی ہے کہ آئندہ کبھی دولت آباد نہیں آئے گی۔ ایک اقتباس ملاحظہ کیجئے جس سے افضل کردار کی مکمل عکاسی ہوتی ہے:۔

”......درندہ......“

اس نے تہیہ کرلیا کہ وہ کبھی دولت آباد نہیں جائے گی ......کبھی نہیں۔ ممانی جان کو افضل نے ہمیشہ پریشان کیا ہے اور سچ تو یہ ہے کہ ماموں جان

مرتے دم تک ان کے تخریبی رویے سے نالاں رہے۔ وہ چاہتے تھے کہ افضل گھر کی دیکھ بھال کریں۔ شہر میں بزنس کو سنبھالیں لیکن انھوں نے کبھی ان کی خواہش یا تنبیہ پر کان نہیں دھرا وہ عجیب عجیب سی نا قابل فہم عادتوں کے شکار ہو گئے تھے۔ کبھی دو دو تین تین دن کمرے میں سوئے پڑے رہتے کبھی ہفتوں تک شکار کھیلنے جنگلوں میں غائب رہتے کتنی راتیں انہوں نے ہوٹلوں میں کاٹی تھیں۔ جب سے انہیں شراب کی لت پڑ گئی تھی وہ زندگی اور گھر کی جملہ ذمہ داریوں سے لاتعلق ہو گئے تھے۔ ان کا صرف ایک کام رہ گیا تھا کہ وہ رات گئے نشے میں دھت آ کر حسینہ کی بری طرح پٹائی کر دیتے۔''[1]

صوفہ اب بی اے کا امتحان دے چکی تھی اسے یقین تھا کہ وہ امتحان میں نمایاں پوزیشن حاصل کرے گی اور سائیکالوجی ایجوکیشن میں ایم اے کرے گی۔ مس کو یتا نے اس کے آرٹ کی بڑی تعریف کی۔ صوفہ یعنی صفیہ میوزک کالیسن لینے مس کو بتا کے گھر جاتی تھی مس کو یتا نے اسے بتایا کہ تم نے میوزک سبجیکٹ کالج میں نہیں لے کر اپنے آپ سے بے انصافی کی ہے۔ وہ کئی بار طے کرتی ہے ناول پڑھنا چھوڑ دے کبھی پھر خیال ابھرتا ہے کہ کاش فیروز سے دو ناول لے لئے ہوتے وہ کبھی اداس ہوتی ہے دنیا کے جھمیلوں سے پریشان بھی ہوتی ہے۔ ناول کا عنوان جس اقتباس سے اخذ کیا گیا ہے اس میں اسے ایسے محسوس ہوتا ہے کہ وہ اصل دنیا میں نہیں بلکہ پرچھائیوں کے شہر میں ہے۔ دیکھئے اقتباس:۔

''اس نے کتنی بار طے کیا کہ وہ ناول پڑھنا چھوڑ دے خارجی زندگی سے اب اس کا تعلق برائے نام رہ گیا تھا بار بار کلاس میں شاہراہوں کی لگتی بھیڑ میں، سہیلیوں کے جھرمٹ میں، گھر میں، ہر جگہ، اسے محسوس ہوتا کہ وہ اصل دنیا میں نہیں بلکہ پرچھائیوں کے شہر میں چل پھر رہی ہے اور لوگ ...... باتونی، مصروف بے مصرف، ایذا رسان، چاپلوس اور احمق لوگ

---

[1] حامدی کاشمیری۔ پرچھائیوں کا شہر ص۔۲۴، میزان پبلشرز سرینگر، ۲۰۱۷ء

اسے خوابوں کی متحرک پرچھائیاں معلوم ہوتے ہیں۔"[1]

صفیہ اپنی تعلیمی قابلیت کے اعتبار سے اپنے اساتذہ کو بہت لاڈلی لڑکی تھی۔ایک افضل اور اشفاق نامی دو کردار اس کی زندگی میں آتے ہیں افضل سے شادی ہوتی ہے لیکن شادی سے پہلے افضل اور اشفاق دونوں صفیہ سے بہت محبت کرتے تھے جب کہ صفیہ اشفاق کو پانا چاہتی تھی اشفاق اس کے استاد بھی تھے وہ اشفاق کو بہت چاہتی تھی۔لیکن افضل نے زبردستی شادی سے پہلے اسے اپنی ہوس کا نشانہ بنایا پھر مجبوراً افضل سے اس کی شادی ہوتی ہے لیکن شادی کے بعد بھی اسے سکون نہیں ہے اسے شادی کے چند دن بعد (Abortion) کرانا پڑتا ہے اور ادھر جب اشفاق پر نظر پڑتی ہے تب بھی وہ پھر ایک دوسرے سے گھل مل جاتے ہیں لیکن افضل یہ دیکھ کر صفیہ کو لعن طعن کرتا ہے دیکھئے اقتباس:۔

"اس اشفاق کے بچے کو میں اچھی طرح جانتی ہوں......اور تم کو بھی...... میں پہلے ہی تم کو جان چکا تھا، میں اسی دن سب جان چکا تھا جب تم نے اشفاق کے ناجائز بچے کو میرے گلے منڈھ دیا تھا۔ میں نے تمہارا پردہ رکھا لیکن مجھے کیا معلوم تھا کہ تم اتنی ذلیل ہو...... کمینہ...... بازاری عورت!

وہ چپ تھی اس نے صرف اتنا کہا میں تم سے نفرت کرتی ہوں تم انسان نہیں درندے ہو......خاموش......ذلیل کتیا......آخ تھو......! دروازے کو زور کا دھکا لگا کر وہ بھاگے، کف بلب وحشی اور تاریک گہری برفانی رات میں غائب ہو گئے۔"[2]

ناولٹ میں حامدی کاشمیری نے صوفیہ کردار کے ذریعے یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ معاشرے میں کتنی ہی ایسی تعلیم یافتہ لڑکیوں کی زندگی کے ساتھ یہ درندے گندہ کھیل کھیل کر اسے اپنے ہوس کا نشانہ بنا کر اس کی زندگی تباہ و برباد کرتے ہیں۔ یہاں یہ سوال بھی قائم ہوتا ہے کہ پڑھی لکھی تعلیم یافتہ لڑکی ان لوگوں سے تعلق ہی

[1] حامدی کاشمیری۔ پرچھائیوں کا شہر۔ص۔۲۸، میزان پبلشرز سرینگر، ۲۰۱۷ء

[2] حامدی کاشمیری۔ پرچھائیوں کا شہر،ص، ۴۹ میزان پبلشرز سرینگر، ۲۰۱۷ء

کیوں رکھتی ہیں لیکن افضل کی زبردستی نے اس کو آخر اپنی ہوس کا نشانہ بنایا جب کہ وہ اشفاق نامی ایک استاد سے شادی کر کے اپنی ازدواجی زندگی گزارنے کا فیصلہ لے چکی تھی۔ حالات اسے مجبور کرتے ہیں اور بالآخر ہمیشہ کے لئے افضل سے شادی کر کے صفیہ کی زندگی اجیرن بن جاتی ہے۔

ناولٹ اپنے موضوع اور فن کے اعتبار سے ایک بہترین ناولٹ ہے پلاٹ مربوط، کرداروں کا عمدہ انتخاب منظر کشی، مکالمہ نگاری وغیرہ ہر اعتبار سے ناولٹ کامیاب نظر آتا ہے حامدی کاشمیری نے اردو ناول نگاری میں ایک اہم نام کمایا ہے ان کا نام ریاست جموں کشمیر میں اردو ناول نگاری کے اعتبار سے ہی نہیں بلکہ بیک وقت ایک مشہور ادیب، شاعر، محقق اور ناقد کی حیثیت سے بھی ہمیشہ زندہ رہے گا۔ اردو ادب کا یہ ستارہ ۲۸ دسمبر ۲۰۱۸ء کو ہمیشہ کے لئے غروب ہو گیا۔ لیکن ادبی دنیا میں حامدی کاشمیری کا نام ہمیشہ زندہ رہے گا ان کا انتقال اردو ادب کے لئے ناقابل تلافی نقصان ہے۔

وحشی سعید

جموں کشمیر کے ایک مشہور ناول نگار وحشی سعید کسی تعارف کے محتاج نہیں ہیں۔ وحشی سعید کی پیدائش ۱۶ نومبر ۱۹۴۶ء کو سری نگر کے ایک علاقہ نائد کدل میں ہوئی۔ ان کا اصلی نام محمد سعید ترمبو ہے وحشی تخلص اختیار کیا۔ ابتدا میں وحشی سعید ساحل کے نام سے لکھتے تھے لیکن بعد میں ساحل کو ترک کر کے صرف وحشی سعید لکھنا شروع کیا اور اسی نام سے ادبی حلقوں میں جانے جاتے ہیں۔ حبیب اللہ ترمبو وحشی سعید کے پردادا تھے۔ محمد رمضان ترمبو وحشی سعید کے دادا تھے وحشی سعید کے والد کا نام محمد عبداللہ ترمبو تھا اور والدہ کا نام سارہ ترمبو تھا۔ محمد عبداللہ ترمبو کی تین اولادیں تھیں جن میں محمد سعید ترمبو، ظہور احمد ترمبو اور عبدالمجید ترمبو شامل ہیں ان تینوں بھائیوں میں وحشی سعید سب سے بڑے ہیں وحشی سعید کی کوئی بہن نہیں ہے وحشی سعید کی شادی ۱۸ جولائی ۱۹۶۸ء کو اپنی چچیری بہن محترمہ سلیمہ ترمبو سے ہوئی۔ جن کے بطن سے دو اولادیں پیدا ہوئیں ایک بیٹا اشتیاق احمد ترمبو اور ایک بیٹی صبیحہ ترمبو۔ وحشی سعید کی والدہ کا انتقال ۵ جنوری ۱۹۹۳ء کو ہوا جو اہل خانہ کے لئے صدمے کا باعث ثابت ہوا والدہ کی وفات ان کے والد کے لئے بھی صدمے کا باعث بنی اس غم کی گھڑی میں تینوں بیٹوں نے آخری عمر تک اپنے والد کا خیال رکھا اور بالآخر ۱۷ فروری ۲۰۰۷ کو ان کے والد محترم محمد عبداللہ ترمبو بھی رحلت فرما گئے۔

وحشی سعید کی ابتدائی تعلیم سرینگر کے ایک مشہور اسکول ''بسکو'' سے ہوئی۔ جہاں ایک نامور استاد مست لال رازداں بھی تعینات تھے ان سے وحشی سعید کو سیکھنے کا موقع ملا۔ اس سکول سے دسویں جماعت کا امتحان پاس کرنے کے بعد سری نگر کے ایک مشہور ایس۔ پی کالج میں بی۔ اے کی ڈگری کے لئے داخلہ لیا۔ یہاں آنے کے بعد ان کا ادبی ذوق بڑھا اور انھوں نے کالج کے میگزین ''پرتاپ'' میں ۱۹۶۵ء میں اپنی پہلی کہانی ''دھن نہ دے'' کے عنوان سے شائع کی۔ اسی سے حوصلہ پا کر انھوں نے ''تاش کے باون پتے'' کے عنوان سے کہانیوں کا سلسلہ شروع کیا۔ جس کی اشاعت روزنامہ ''آفتاب'' کے ہفتہ وار ادبی اڈیشن میں قریب قریب ایک سال

تک ہوتی رہی۔ وحشی سعید کا ''تاش کے باون پتے'' کالج کا ایک مخصوص کالم تھا، وحشی سعید کی صلاحیتوں کے پیش نظر انہیں کالج کے مجلّے کا مدیر بنایا گیا۔ اس مجلّے میں بھی ان کی تخلیقات متواتر شائع ہوتی رہی وحشی سعید کی ادب دوستی سے ان کے دونوں بھائیوں میں بھی ادبی ذوق پیدا ہوا۔ چنانچہ وحشی سعید کے گھر ادبی محفلیں سجنے لگیں۔ پچاسوں کپ چائے روز بنتے تھے ان کا خرچہ والدہ اٹھاتی تھی۔ اس طرح ان کی صلاحیتوں کو پھلنے پھولنے کا موقع ملا۔

ایس۔ پی کالج سے بی۔ اے کرنے کے بعد اپنی تعلیمی سرگرمیوں کو آگے بڑھانے کی خاطر انھوں نے کشمیر یونیورسٹی کے شعبہ اردو میں ایم۔ اے کرنے کے لئے داخلہ لیا۔ یہاں انھیں معروف ادبی شخصیات سے شرف تلمند حاصل کرنے کا موقع ملا۔ جن میں پروفیسر عبدالقادر سروری، پروفیسر شکیل الرحمٰن اور برصغیر کے سرکردہ شاعر نقاد پروفیسر حامدی کاشمیری شامل ہیں۔ اچھے اساتذہ مل جانے سے ان کی اردو زبان وادب میں گرفت مضبوط ہوتی گئی۔

وحشی سعید بیک وقت شاعر، افسانہ نگار اور ناول نویس ہیں وحشی سعید ہمہ جہت شخصیت کے مالک ہیں انھوں نے اپنے ادبی ذوق کی تسکین کی غرض سے اور اردو ادب کی خدمت کے لئے ۱۹۶۸ء میں دو ماہی رسالہ ''نگینہ'' جاری کیا جس میں مختلف مشہور ومعروف قلمکاروں کے مقالے شامل کئے جاتے تھے۔ یہ رسالہ ۱۹۶۸ء سے ۱۹۷۷ء تک مسلسل نکلتا رہا لیکن بعد میں کسی وجہ کی بنا پر ''نگینہ'' کی اشاعت ترک کرنا پڑی اور تقریباً انتالیس سال تک یہ طوالت کھنچ گئی۔ ۲۰۱۴ء سے وحشی سعید نے ''نگینہ'' کی اشاعت دوبارہ شروع کی اور اس طرح یہ اب تک مسلسل نکل رہا ہے۔

وحشی سعید کے اب تک کئی افسانوی مجموعے منظر عام پر آچکے ہیں جن میں ''سڑک جاری ہے'' ''کنوارے الفاظ کا جزیرہ'' ''خواب اور حقیقت'' شامل ہیں۔

وحشی سعید کے ناول بھی شائع ہوئے ہیں۔ پتھر پتھر آئینہ ایک موسم کا خط اس کے علاوہ ماضی اور حال کے عنوان سے پانچ ناولٹ کا مجموعہ بھی منظر عام پر آچکا ہے ماضی اور حال کے عنوان سے ہی جلد دوم میں ان کے افسانے شامل ہیں۔

وحشی سعید ابھی حیات ہیں اور کشمیر کے مشہور ومعروف فکشن نگار کے طور پر ان کا نام سرفہرست ہے۔ وہ

اپنی دیگر مصروفیات کے باوجود اردو زبان وادب کی ترقی کے لئے کام کر رہے ہیں۔اب یہاں ان کے ناولوں کا تجزیہ پیش کیا جا رہا ہے۔

پتھر پتھر آئینہ:

وحشی سعید کا یہ ناول ۲۰۱۴ء میں شائع ہوا۔ یہ ناول تحریک ہے ناول کے موضوع میں کوئی نیا پن نہیں ہے لیکن وحشی سعید کی فن کاری ہے کہ انہوں نے ناول میں دلچسپی کے ساتھ سماجی حالات کے ساتھ ناول کو ایک اہم موڑ پر ختم کر کے اسے بہت ہی معیاری بنا دیا ہے اور انسانی قدروں کے عروج وزوال کی ایک ایسی تاریخ لکھ ڈالی کہ اسے پڑھ کر قاری میں ترقی کا جذبہ بھی بیدار ہوتا ہے اور دلوں میں محبت، ایثار اور قربانی کا جذبہ پیدا ہوتا ہے۔ پتھر پتھر آئینہ کے ناول موضوع کے اعتبار سے نفسیاتی اور رومانی ناول ہے اس کے مرکزی کردار سرور اور امیتا ہیں ناول میں چند دوسرے کردار بھی ہیں وکی سرور کا سچا اور بے غرض قسم کا دوست ہے جو ذہنی الجھن اور پریشانی کے عالم میں اسے تسلی دیتا ہے ممتاز بیگ اپنے والد کے ساتھ ناول میں متعارف ہوتا ہے بعد میں وہ چہرے سے نقاب اتار کر ولن کے روپ میں سامنے آتا ہے اور سازش کر کے امیہ کے باپ شہاب الدین کو اقتصادی اور معاشی طور پر تباہ کر کے رکھ دیتا ہے سمبھو اقبال کا بوڑھا خادم ہے جس کو امیتا نے بچپن سے جوان ہوتے دیکھا تھا اس کے علاوہ ڈاکٹر ورما اور نرس چند وقفوں میں رسمی طور پر نمودار ہو کر غائب ہو جاتے ہیں ایک دو منظر میں امیہ کا بھائی رشید بھی وقتی طور پر اپنی جھلک دکھا کر غائب ہو جاتا ہے مرکزی کردار سرور اور امیتا کے ہی ہیں جو ناول کے آخر تک موجود رہتے ہیں اور ناول کی کہانی شروع سے آخر تک ان کے ارد گرد گھومتی ہے ناول کی کہانی کو مضبوط اور جاذب نظر بنانے کے لئے مصنف نے کہانی، پلاٹ، کردار منظر، مکالمہ، ماجرا سبھی عناصر سے کام لیا ہے اور ایک اچھے ناول کے لئے جو چیزیں لازم ہوتی ہیں انھیں کا التزام روا رکھا ہے۔

ناول کا ایک مرکزی کردار کہانی کے ہیرو سرور کا ہے اور دوسرا کردار ہیروئن امیتا کا ہے کہانی کا ہیرو ایک غریب خاندان کا چشم و چراغ ہے اس کے مرحوم باپ کی تمنا تھی کہ اس کا بیٹا پڑھ لکھ کر ایک بڑا ڈاکٹر بنے۔ وہ اپنی ماں کے ساتھ رہتا ہے اور چند ہی دن بعد وہ بھی سفر آخرت پر روانہ ہو جاتی ہے۔ امیتا کی ماں گزر چکی ہے اور وہ دولت مند باپ شہاب الدین کی ناز و نعم میں پلی بڑھی لاڈلی بیٹی ہے سرور جس کالج میں پڑھتا ہے اس کالج میں اگلے سال امیتا بھی پہنچ جاتی ہے۔ اسے اپنے حسن اور امیر باپ کی بیٹی ہونے کا غرور ہے جب کہ سرور

ایک محنتی اور قابل طالب علم ہے اور مصوری کا دلچسپ مشغلہ ہے۔ ایتا اس سے متاثر تو ہوتی ہے مگر اس کا تاریک مستقبل دیکھ کر اس کو خاطر میں نہیں لاتی۔ مگر اس کی تعلیمی قابلیت اسے بری طرح کھٹکتی ہے اور وہ حاسدانہ انداز میں اسے اپنے طعن وطنز کا نشانہ بنانے کا کوئی بھی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتی ہے سرور پری میڈیکل میں اچھے نمبروں سے پاس ہو کر پٹنہ میڈیکل کالج چلا جاتا ہے اور وہاں سے ڈاکٹر بن کر ایک اسپتال میں مریضوں کا علاج کرنا شروع کرتا ہے وہاں وہ ایک مریض امتیاز بیگ کا علاج کرتا ہے مریض کے بیٹے کا نام ممتاز بیگ ہے وہ بھی باپ کی تیمارداری میں مصروف ہے یہ ممتاز بیگ امیہ کا منگیتر بھی ہے لہٰذا منگیتر کے باپ کی عیادت کے لئے اپنے باپ شہاب الدین کے ساتھ امیہ بھی وہاں آتی ہے۔ دورانِ گفتگو امیہ وہاں بھی طنز کرنے سے باز نہیں آتی اور سرور سے کہتی ہے کہ وہ ہے تو ہسپتال کا ملازم ہی، وہ کبھی نرسنگ ہوم کا مالک تو ہونے سے رہا۔ شہاب کو آگے چل کر اس بات کا اندازہ ہو جاتا ہے کہ ایتاز کو جو سرور سے خدا واسطے کا بیر ہے یہ بیر نہیں بلکہ در پردہ سرور سے محبت ہے لہٰذا وہ دل میں دشمنی رکھ کر شہاب الدین کو ایک غلط کام میں سرمایہ لگانے پر مجبور کرتا ہے نتیجاً وہ تباہ و برباد ہو کر دانے دانے کو محتاج ہو جاتے ہیں ممتاز بیگ اب باپ بیٹی پر اپنی کھل کر دشمنی ظاہر کرنے کے ساتھ صاف الفاظ میں شادی سے انکار کر دیتا ہے اس پر شہاب الدین کو دل کا دورہ پڑتا ہے۔ سرور ان کا علاج کرتا ہے لیکن شہاب الدین صحت یاب نہیں ہو پاتے ان کا انتقال ہو جاتا ہے۔

سرور اور ایتا کی شادی ہو جاتی ہے سرور پچھلی باتوں پر خاک ڈال کر آگے بڑھنے کا تہیہ کر لیتا ہے اور شب عروسی میں جب دلہن کا گھونگھٹ الٹتا ہے تو وہ کچھ اور ہی بولی۔ وہ کچلے ہوئے جذبات کا وجود تھا جس کی زہریلی اور تیز آواز پھوٹ پڑی۔ وہ ڈاکٹر سے یوں کہتی ہے:۔

> ''ڈاکٹر، آپ مجھے اچھی طرح جانتے ہیں میں کسی زمانے میں آپ کی کلاس فیلو رہی ہوں۔ میرا نام ایتا ہے میں شہاب الدین کی بیٹی ہوں جو مفلس ہے کنگال ہے اور آج ڈاکٹر سرور کی بیوی ہوں ......ڈاکٹر سرور جو ایک عالی شان نرسنگ ہوم کا مالک ہے مشہور معروف ڈاکٹر ہے شہرت یافتہ مصور ہے اور میرا خاوند ہے......میرا رشتہ ممتاز بیگ سے کیوں ٹوٹ گیا، کوئی نہیں جانتا ہے وہ سمجھا تھا کہ میں ڈاکٹر سرور سے محبت کرتی

ہوں، بیوقوف! میں اب وہ امیتا ہوں جو بے بس مجبور ہے......ایک کنگال
کی بیٹی ہے، جسے مشہور ومعروف ڈاکٹر نے اپنی بیوی بنایا۔ جانتی ہوں،
اچھی طرح جانتی ہوں کہ ڈاکٹر سرور کو وقت نے انتقام پورا کرنے کا
موقع دیا۔ ڈاکٹر آپ کامیاب ہوئے، میں جانتی ہوں، آپ میرے
مجازی خدا، اس لئے کہتی ہوں کہ میرے جسم کو چوس لو، اس کو کچل ڈالو،
لیکن اس جسم میں روح نہیں ہے یہ ایک لاش ہے جس سے تم اپنی جنسی
خواہشات پوری کر سکتے ہو۔ تمہیں پیار نہیں ملے گا ڈاکٹر......ایک کھوکھلا
جسم ملے گا۔''[1]

امیتا کا یہ رویہ دیکھ کر سرور کو دھکا لگا اور اس پر سکتہ سا طاری ہو گیا پھر وہ فوراً ہی حجلہ عروسی سے باہر چلا گیا۔ کچھ دن بعد امیتا بیمار ہو گئی وہ اس کے علاج میں مصروف ہو گیا۔ بیماری کے دوران جب سرور اس کی تیمارداری اور علاج کرنے لگا تو آہستہ آہستہ امیتا کی سوچ بھی بدل گئی اور وہ اسے سرتاپا شرافت اور نیکی کا مجسمہ نظر آنے لگا۔ ناول کے اختتام میں جب یہ دونوں ایک دوسرے سے محبت کرنے لگتے ہیں اور ایک دوسرے پر اپنا پیار ظاہر کرتے ہیں وحشی سعید نے اسے یوں بیان کیا ہے۔ ملاحظہ کیجئے:۔

''یقین نہیں آتا ہے......یقین نہیں آتا میں میں زندہ رہوں گی ہاں ہاں
میں زندہ رہنا چاہتی ہوں''
''شاباش میری امیتا......شاباش''
آج امیتا بھی اپنے ہر خول سے باہر آنا چاہتی تھی۔ ہر حقیقت کو پردے
سے عریاں کرنا چاہتی تھی ...... ہر وہ بات بیان کرنا چاہتی تھی جو برسوں
سے اس کے سینے میں دبی ہوئی تھی وہ کہہ پڑی
''سرور......میرے سرور......میں تم سے پیار کرتی ہوں۔ بہت بہت پیار
کرتی ہوں۔ یقین کرو میرا، میں تب سے تمہیں پوجتی ہوں جب تمہیں

[1] وحشی سعید، پتھر پتھر آئینہ، ص۔ ۵۵، مہاویر پریس وارانسی، ۲۰۱۴ء

پہلی بار دیکھا۔سرور میں تمہارے پیار میں پگھلتی رہی۔جلتی رہی۔''

وہ خاموش ہوئی......

سرور نے اسے جھنجھوڑا

''کہو......! کہواور کیا کہنا چاہتی ہو؟''

''سرور، میرے سرور...... میں جانتی ہوں،تم میرے لبوں کو بوسہ نہیں

دے سکتے۔کہیں میرے جراثیم ......نہیں نہیں میں بھی نہیں چاہتی......

لیکن پیار سے میرے رخسار پر......کانوں پر...... پیشانی پر...... پیٹ پر

پیار تو کرو'

سرور نے کہا

''پیاری امیتا اب تم زندگی کی روشنی سے بھاگ نہیں سکتی۔ میں پیار کروں

گا تمہارے لبوں سے اور تمہارے جسم کے ایک ایک عضو سے''

یہ کہتے ہوئے سرور امیتا کے بہت قریب ہو گیا

لبوں سے لب پیوست ہو گئے

گہرا اور طویل بوسہ

اور پتھر پتھر آئینہ ہو گیا۔''[1]

نفسیاتی الجھن کی بنیاد پر استوار اس ناولٹ کی کہانی نظامات کے سہارے آگے بڑھتی ہے ایک امیر ہے ایک غریب ہے۔ایک کی دلچسپی تعلیم میں ہے تو دوسرے کو اپنی مہارت کا اپنا منگیتر بنا کر ناز اں ہے اور اس کے مقابلے میں سرور کو کمتر سمجھتی ہے وہی ممتاز بیگ بعد میں شیطان بن کر سامنے آتا ہے کہانی اور پلاٹ میں فرق ہوتا ہے راجہ مر گیا اور رانی بھی مر گئی یہ پلاٹ ہے جہاں تک اس ناول کے پلاٹ کا تعلق ہے وحشی سعید نے اس میں کہیں بھی ڈھیلا پن نہیں آنے دیا ہے اسے کسے کسائے پلاٹ کے تحت واقعات کی تمام کڑیاں پوری طرح ایک دوسرے سے مربوط ہیں فنی اعتبار سے وحشی سعید کا یہ ناول کامیاب نظر آتا ہے ڈاکٹر مشتاق احمد وانی اپنے

---

[1] وحشی سعید۔پتھر پتھر آئینہ۔ص۔۰۷۔مہاویر پریس وارانسی،۲۰۱۴ء

ایک مضمون میں اس ناول کے فن پر یوں لکھتے ہیں:۔

''ناول نگار نے اس ناول میں ممبئی جیسے مہانگر کی بھاگ دوڑ اور وہاں کی غنڈہ گردی کے ماحول کو دکھانے کی کوشش کی ہے۔ وحشی سعید کے تجربے اور مشاہدے میں جو کچھ آیا ہے انھوں نے اسے تخلیقی جامہ پہنانے کی کوشش کی ہے۔ کردار نگاری، منظر نگاری، مکالمہ نگاری اور تجسس کی کارفرمائی یہ تمام عناصر ترکیبی جن کے بغیر ایک اچھا ناول وجود میں نہیں آتا ہے۔ وحشی سعید نے ان تمام فنی لوازمات کو بحسن وخوبی ناول کے آغاز سے انجام تک پہنچایا ہے کس کردار سے کیا کہلوانا ہے کب کہلوانا ہے اور کیسے کہلوانا ہے یا ضرورت کے مطابق منظر نگاری کو کس طرح دلچسپ اور پر کشش بنانا ہے ان تمام باتوں پر خصوصی توجہ دی گئی ہے اور سب سے بڑی بات یہ کہ ناول کی کہانی میں جھول نظر نہیں آتا۔''[1]

بلا شبہ ''پتھر پتھر آئینہ'' ناول میں محبت کی ایک انوکھی کہانی کو اپنے منفرد انداز میں پیش کیا ہے جو اس بات کا ثبوت ہے کہ وحشی سعید کو ناول کے فن پر مہارت ہے وحشی سعید نے ناول میں منظر نگاری کو کم سے کم الفاظ میں خوبصورتی کے ساتھ پیش کیا ہے اور ماحول کی مرقع کشی کر دی ہے کردار نگاری پر بھی انہوں نے بہت زور دیا ہے ناول میں حسب ضرورت مکالمے استعمال کئے گئے ہیں موقع محل کے اعتبار سے مکالمے لکھے گئے ہیں جو چست اور درست ہیں مجموعی اعتبار سے یہ ناول وحشی سعید کی اولین کامیاب کوشش ہے جو انہیں جموں وکشمیر کے بہترین ناول نگار کی صف میں لا کھڑا کرتا ہے۔

ایک موسم کا خط

یہ ناول بھی پتھر پتھر آئینہ کتاب میں شامل ہے یہ ناولٹ بھی ۲۰۱۴ء میں شائع ہوا۔ اس ناول میں ممبئی کی مدنی زندگی کی جھلک ملتی ہے جس میں امیری اور غریبی کے تفاوت کو منعکس کرنے کی کوشش کی گئی ہے جس سے

[1] جموں وکشمیر میں معاصر اردو ناول از ڈاکٹر مشتاق احمد وانی مشمولہ سہ ماہی دربھنگہ ٹائمز ص۔ ۳۸۔ دربھنگہ ٹائمز پبلکیشنز دربھنگہ، جنوری تا مارچ۔ ۲۰۱۸ء

رومانی واقعات کی طرف اشارہ ملتا ہے ناول میں فلمی کہانیوں کی مانند میلوڈرامائیت ملتی ہے اور نرینہ مرکزی کردار انل کروٹ بدلتے ہی قلی سے قاروں بن جاتا ہے انل گھر سے بھاگ کر ممبئی میں ایک امیر صنعت کار کی بیٹی کومل کا ڈرائیور بن جاتا ہے نوکری کے دوران اسے مالکن کے قہر کا سامنا کرنا پڑتا ہے لیکن جب پانی سر سے اونچا ہو جاتا ہے تو وہ نوکری چھوڑ کر چلا جاتا ہے دوسری جانب جذباتی مالکن ایک معمولی ڈرائیور کی منہ زوری کو اپنی بے عزتی سمجھ بیٹھتی ہے جسے وہ برداشت نہیں کر پاتی وہ انل سے بدلہ لینے کی سبیلیں کرتی ہے موقع پرست انل اپنے دولت مند دادا کی پناہ میں جا کر اس کی دولت کا وارث بن جاتا ہے اسی دولت سے وہ نہ صرف صنعت کار بلکہ کومل کی کمپنی کا حصہ دار بھی بن جاتا ہے اور پھر سبھی کمپنیوں کا چیئر مین مقرر ہوتا ہے اس تحقیر سے خار کھا کر کومل کئی بار انل کو ذلیل کرنے کی کوشش کرتی ہے یہاں تک کہ اس کو مارنے کے لئے سپاری بھی دیتی ہے لیکن اس کی ہر چال الٹی پڑ جاتی ہے آخر کار جب کومل کو یہ معلوم ہوتا ہے کہ انل اس کو نیچا دکھانے کے لئے زیر نہیں کرنا چاہتا ہے بلکہ اس سے محبت کرتا ہے تو دونوں ہمیشہ کے لئے ایک ہو جاتے ہیں۔

ہرنام انٹر پرائزرز اور ہرنام فلم کارپوریشن کا مالک انل جب ایک پارٹی رکھتا ہے تو اس میں کومل کیمیل انڈسٹری کی مالکن کومل کو بھی مدعو کیا جاتا ہے وہ پارٹی میں اس خیال سے آئی تھی کہ انل کا تماشہ بنائے گی لیکن محفل میں جب کلاوتی انل کے ہاتھ پر بوسہ دیتی ہے اور انل سے محبت جتاتی ہے تو کومل یہ محسوس کرتی ہے کہ وہ اس محفل میں خود تماشہ بن کر رہ گئی ہے چنانچہ وہ یہ سب دیکھ سمجھ کر پارٹی ختم ہونے سے پہلے ہی نکل جاتی ہے دوسرے دن مشہور فلمی اخبار ''جل ترنگ'' میں سرخیوں میں یہ خبر آ گئی ''مشہور ایکٹریس کلاوتی نے ہرنام فلم کارپوریشن کے مالک انل ورما کی محبت میں تلخی کا باعث بننے کی کوشش'' ان سرخیوں کے نیچے یہ لکھا تھا:۔

> ''کومل کیمیل انڈسٹری کی مالکن خوبصورت پری وش کومل دیوی اور ہرنام انٹر پرائزز اور ہرنام فلم کارپوریشن کے مالک انل ورما کے درمیان بہت عرصے سے معاشقہ چل رہا ہے......کومل دیوی انل ورما کی پارٹی میں آئی اور چیئر مین صاحب (کومل پیار سے انل ورما کو چیئر مین صاحب کہتی ہے) کہہ کے مبارک باد دی وہ بہت خوش نظر آ رہی تھی......پھر نہ جانے فلم ایکٹریس کلاوتی کو کیا سوجھا کہ وہ کومل دیوی کے سامنے انل ورما سے

اظہار عشق کرنے لگی ......کومل دیوی غصے سے لال پیلی ہوگئیں اور پارٹی
ختم ہونے سے پہلے ہی چلی گئیں۔ جانے سے قبل وہ انل ورما سے ترش
کلامی کے ساتھ پیش آئی۔ مس کلاوتی، دومحبت کرنے والے دلوں کے
درمیان دیوار بن گئی......اب خدا ہی جانے اس محبت کا انجام کیا ہوگا۔''[1]

یہاں یہ بتانے کی کوشش بھی کی گئی ہے ایک جوڑے کی محبت کو ختم کرنے کے لئے لوگ کس طرح پیچھے پڑے رہتے ہیں۔ ناول نگار نے بڑی فنی چابک دستی سے ناول کا اختتام کیا ہے جب کومل دوسرے دن یہ اخبار میں چھپی رپوٹ پڑھتی ہے تو اس کے دل میں آگ لگتی ہے کہ یہ جھوٹی رپورٹ کس نے بھیجی انل کے بنگلے میں اخبار لے کر انل کو بتاتی ہے اور سوال کرتی ہے کہ تم نے کتنے پیسے ان اخبار والوں کو دیئے؟ انل نے جواباً کہا کہ میں تم سے محبت کرتا ہوں لیکن اس کا اعلان کرتا نہیں پھرتا پھر اخبار والوں سے اپنی محبت کا ڈنکا پیٹنے کا کیا فائدہ ہے کومل یہ جواب سن کر مبہوت رہ گئی انل کی صاف گوئی نے کومل کا دل صاف کر دیا اور کومل کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ اسی دوران روی کھنہ نمودار ہو کر انل کو مارنے کی کوشش کرتا ہے کہ وہ کومل کو پانے میں کامیاب ہو سکے لیکن اب کومل کا دل انل کے لئے صاف تھا لہٰذا انل پر روی کی زدوکوب سے جو چوٹیں آئیں تو راکیش دوڑتا ہوا آیا اور انل سے پوچھنے لگا سر چوٹ تو نہیں آئی۔ تب کومل راکیش کو دیکھ کر حیرانگی سے پوچھتی ہے کہ تم یہاں کیسے تو راکیش کہتا ہے کہ میڈم اسٹال کی کتابوں کو آگ لگانے کے بعد انل صاحب نے مجھے ڈھونڈ لیا تھا اور مجھے اس شرط پر معاف کیا تھا کہ آئندہ سے شریفانہ زندگی بسر کروں۔ ناول کے آخر میں رومان کی بھی ایک جھلک ملتی ہے جب انل اور کومل دونوں ایک ہو جاتے ہیں اور ایک دوسرے سے محبت جتاتے ہیں ملاحظہ کیجئے ناول کا آخر حصہ:۔

''واسودیو اور کومل نے بے ہوش انل کو گاڑی میں رکھا۔ بے ہوشی میں انل
بڑبڑا رہا تھا۔

I Love you komal i love you.

کومل کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے

---

[1] وحشی سعید۔ ایک موسم کا خط۔ ص ۱۳۸، مہاویر پریس وارانسی۔ ۲۰۱۴ء

پیار کے شدید جذبے میں وہ انل کے ماتھے کو چومے جا رہی تھی اس نے
پہلی بار محسوس کیا کہ وہ اس سے جو نفرت کرتی آئی ہے وہ نفرت نہیں محبت
تھی!
''شدید محبت......!''
اور پھر موسم کا خط
یک لخت غائب ہو گیا۔''[1]

اس ناول کا پلاٹ بھی نپا تلا ہے جو وقت کی گردش کے ساتھ آگے بڑھتا رہتا ہے۔ کہانی تدریجی مراحل طے کر کے نقطۂ عروج تک پہنچ جاتی ہے اور پھر منطقی طور پر انجام تک سفر کرتی ہے۔ کہانی میں کہیں کوئی جھول نہیں ملتا۔ مرکزی کردار کومل گھمنڈی، خودغرض اور سادیت پسند ہے جو اپنی اسکیموں کو انجام دینے کے لئے کچھ بھی کرنے کے لئے تیار ہو جاتی ہے جب کہ انل کا کردار خوددار محنتی، اولوالعزم اور ہمدردانہ طبیعت کا مالک ہے جو انسانی قدروں کے ساتھ ساتھ حالات کے ساتھ اپنے آپ کو ڈھالتا ہے۔

ماضی اور حال (ناولٹ)

ماضی اور حال کے نام سے ان کی ایک کتاب ۲۰۱۵ میں شائع ہوئی جس کی جلد اول میں پانچ ناولٹ شامل ہیں یہ پانچ ناولٹ ''عجب زندگی ......غضب موت''، ''جائز ...... ناجائز''، ''فطرت ......محبت ...... ندامت''، ''وحشت محبت'' اور ''قحط'' ہیں یہاں بالترتیب ہر ناول کا جائزہ پیش کیا جائے۔

عجب زندگی ......غضب موت

یہ ناولٹ چار ابواب پر مشتمل ہے۔ اس ناولٹ میں مرکزی کردار جبار ہے دوسری اس کی محبوبہ گلابو اور تیسرا ویلن یوسف کا کردار ہے جبار ایک زمیندار کا بیٹا ہے اس کے کئی کھیت ہیں نوکر چاکر ہیں لیکن وہ اپنے کھیتوں میں خود ہل چلاتا ہے خود محنت کرتا ہے، وہیں کھیتوں کی دیکھ بھال کے دوران اس کی زندگی میں گلابو آتی ہے دونوں چھپ چھپ کر ملتے ہیں یوسف ایک بدکردار غنڈہ ہے جس نے زبردستی گلابو کے گھر والوں پر دباؤ

[1] وحشی سعید۔ ایک موسم کا خط۔ ص۔۱۴۰، مہاویر پریس وارانسی، ۲۰۱۴ء

ڈال کر اس کی منگنی کا اعلان کر دیا ہے ایک دن یوسف جبار اور گلابو کو پہاڑ کے نیچے دیکھ لیتا ہے پہاڑ کے نیچے دونوں ایک دوسرے سے پیار کر رہے تھے ملاحظہ کیجئے اقتباس:۔

''گلابو......تمہارے لئے میں ایسا گھر بناؤں گا جس کے ہر کمرے میں ریشمی قالین بچھے ہوں گے۔ وہ گھر دنیا بھر کے نادر و نایاب چیزوں سے سجاؤں گا۔ جو بھی ہمارے گھر آئے گا وہ حیران رہ جائے گا''

''مجھے تمہارے سونے چاندی سے بنے ہوئے گھر میں جگہ نہیں چاہئے تمہارے دل میں جگہ چاہئے۔ تم میرے پاس رہو۔ میں تمہارے پاس رہوں بس، مجھے اور کچھ نہیں چاہئے میں روکھی سوکھی کھا کر بھی تمہارے ساتھ زندگی گذار دوں گی۔ میرے جبار یہ دنیا بہت بری ہے۔ روپیہ کمانے کے لئے کوئی غلط راہ مت اپنانا۔ وہ اپنا پڑوسی صمد خان ہے نا......''

''ہاں کیا ہوا اس کو؟''

''اس کا ایک جوان بیٹا یوسف ہے''

''ہاں وہ مجھے عجیب نظروں سے گھورتا ہے''

''وہ دیکھو کوئی ہمارے طرف آ رہا ہے''

''چلو بھاگو۔''[1]

یہ یوسف ہی تھا جوان کی طرف بڑھ رہا تھا جبار اور گلابو نے پہلے بھاگنے کی کوشش کی لیکن یوسف نے جب گالی دیتے ہوئے پکارا تو جبار غصے سے اس آواز کی جانب لپکا۔ دونوں کے درمیان ہاتھا پائی ہوئی لیکن جبار کا سر ایک پتھر سے ٹکرا کر لہولہان ہو گیا۔ اسے دیکھ کر گلابو چیخ پڑی۔ یوسف گلابو کو ڈانٹ ڈپٹ اور دھمکی دے کر زبردستی گلابو کو اپنے ساتھ لے جاتا ہے اور گلابو کے والدین کو گلابو کے متعلق بتاتا ہے کہ آپ کی بیٹی آپ کی آنکھوں میں دھول جھونک کر اس لفنگے جبار کے ساتھ گل چھرے اڑا رہی ہے۔ اس لڑکی کو لگام کسیئے۔

گلابو کا والد یوسف سے پوچھتا ہے کہ اس کا کیا علاج کیا جائے تو یوسف کہتا ہے کہ آپ گلابو کی اور

---

[1] عجب زندگی......غضب موت از وحشی سعید مشمولہ ماضی اور حال ص۔۱۱، مہاویر پریس وارانسی۔۲۰۱۵ء

میری شادی بہت جلدی کر دیجئے۔ ادھر جب جبار زخمی حالت میں گھر پہنچتا ہے تو پورے گھر والے پریشان ہو جاتے ہیں اور یہ جاننا چاہتے ہیں کہ یہ سب کیسے ہوا لیکن اپنے والد کی بدنامی کی وجہ سے وہ سچ بتانے سے گریز کرتا ہے اور کہتا ہے اندھیرے میں گر پڑنے سے سر پتھر سے ٹکڑا گیا۔ وہ یہ کہہ کر گذشتہ واقعات کے متعلق سوچنے لگتا ہے دل ہی دل میں کہتا ہے یوسف میں تمہیں قتل کر دوں گا۔ وہ دو دن آرام کرنے کے بعد تیسرے دن امی سے اجازت لے کر کھیت جاتا ہے وہاں سے ہوتا ہوا وہ پہاڑ کی طرف جا کر گلابو کا انتظار کر رہا ہوتا ہے کہ شہنائیوں کی آواز اس کے کانوں میں گونجنے لگی اس نے دیکھا کہ اس جانب ایک بارات آ رہی تھی غور سے دیکھا تو دولہا جو سفید گھوڑے پر سوار تھا وہ یوسف پایا جبار کے دل میں یہ سوال آیا کہ یوسف کی شادی کس سے ہو سکتی ہے وہ ایک باراتی سے معلوم کرتا ہے تو وہ بتاتا ہے کہ گلابو کے ساتھ یوسف کی شادی ہو رہی ہے جبار یہ سب دیکھ کر تھکے قدموں سے گھر واپس لوٹا۔ امی نے اسکی اداسی کی پرستش کی لیکن اس نے وجہ نہ بتائی پھر اس کی امی نے کہا تمہارے لئے ایک خوشخبری ہے شہر کے ایک بڑے خاندان سے تمہارے رشتے کی بات آئی ہے گلابو کی شادی یوسف سے ہو جانے کے بعد جبار کی زندگی اجیرن ہوگئی تھی۔ اسے کسی بات سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ ماں کے اصرار پر اس نے ایک شہر کی خوبصورت لڑکی نسرین سے شادی کر لی لیکن نسرین نے پہلی ہی رات کو اس کے سارے خواب چکنا چور کر دئے۔ وہ جبار سے شہر میں چل کر رہنے کے لئے اصرار کرتی ہے پہلے جبار پیار کے ذریعے اس کا دل بہلانے کی کوشش کرتا ہے لیکن ایک دن نسرین گاؤں کی زندگی اور بڑھتی ہوئی مفلسی سے تنگ آ کر اعلان کرتی ہے:۔

> ''اس گھر میں میری زندگی اجیرن بن گئی۔ میں یہاں پاگل ہو جاؤں گی۔ مر جاؤں گی۔ کہاں وہ شہر کی رونق۔ کہاں کلیوں کی چمکتی ہوئی روشنیاں اور ہنگامہ بھری زندگی۔ کہاں وہ کاروں میں بیٹھ کر ایک دنیا گھوم آنا اور یہاں۔ چار گھنٹے بجلی اور پھر باہر بیٹھ کر کھیتوں کو دیکھنا۔ بس دیواروں کو تکتے رہنا۔''[۱]

یہ سب سننے کے بعد جبار نسرین سے یہ کہہ کر گھر سے نکل گیا کہ جب تک تمہارے لئے ڈھیر ساری

---

۱ عجب زندگی......غضب موت از وحشی سعید مشمولہ ماضی اور حال ص۔۱۷۔مہاویر پریس وارانسی ۲۰۱۵ء

دولت نہ کمالاؤں واپس نہیں آؤنگا۔لیکن دولت کمانا آسان نہیں تھا وہ چند دوستوں کے کہنے پر جوئے اور چوری جیسے کاموں میں الجھ گیا اور پھر ایک دن یوسف جواب تھانیدار بن گیا تھا نے ایک خزانے کے جھوٹے کیس میں پھنسا کر جیل میں بند کر دیا۔ جبار کے دل میں بھی یوسف سے انتقام لینے کی آگ پہلے سے ہی بھڑک رہی تھی۔ تھوڑے دن بعد جب جبار جیل سے باہر آیا تو اس نے اپنی نئی زندگی کا آغاز کیا۔اب اس کی دنیا بدل چکی تھی۔ اسے ایک فقیر بابا نے اپنی شاگردی میں لے لیا اور وہ ایک یتیم خانے کے بچوں کی خدمت کرنے لگا۔ جب بابا کا انتقال ہوا تو سب کچھ جبار کو سونپ دیا اب یتیم خانہ جبار کی نگرانی میں آ گیا۔ایک دن وہ یتیم خانے میں بیٹھا ہوا تھا کہ ایک میاں بیوی کی آنے کی خبر ملازم کے ذریعے ملتی ہے کہ بچہ گود میں لینے آئے ہیں۔ جبار نے انہیں اندر بلایا تو اس کے سامنے یوسف اور نسرین تھے۔ جبار نے اب تک جو کچھ بھلا دیا وہ ساری یادیں پھر سے تازہ ہوگئیں۔ یوسف نے بتایا کہ ہماری شادی کو پانچ سال ہو گئے لیکن ہم اولاد سے محروم ہیں جبار کو سارے واقعات یاد آ گئے اور اس کے اندر انتقام کی آگ جو سرد ہوگئی تھی۔ پھر سے ابھر آئی۔ یہاں کہانی کا اقتباس ملاحظہ فرمائیں:۔

''پانچ سال۔ایک لمبی مدت۔دنیا تبدیل ہوگئی ہوگی!!''

''ہماری اندھیری زندگی کو روشنی کا چراغ دے دیجئے''

''کس کے پاس آئے ہو تم لوگ۔ اس کے پاس جس کی جھولی میں تمہارے لئے انتقام کے سوا کچھ نہیں ہے''

اس کی آواز خوفناک تھی۔ یوسف کو چاگر پہاڑ کی وہ آواز یاد آئی جس کی وجہ سے اس نے گلابو سے شادی کی تھی اور پھر اپنا انتقام لینے کے بعد اس کی زندگی تباہ کر کے طلاق دے دیا تھا''

''جبار''

اسی درمیان جبار نے بابا کی کونے میں رکھی ہوئی بندوق اٹھالی۔

یوسف گڑگڑانے لگا۔

''مجھے چھوڑ دو۔ مجھے مار کر تمہیں کیا ملے گا۔ پھانسی کا تختہ۔ میں تمہیں

دولت سے مالا مال کر دوں گا میری جان بخش دو'

''میں اپنے اوپر ہوئے ظلم کو معاف کر سکتا ہوں لیکن گلابو کے قاتل کو......

کبھی نہیں''

بندوق نے شعلہ اگلا۔ یوسف کچھ دیر تڑپنے کے بعد لاش میں تبدیل

ہوگیا۔ بندوق اس کے ہاتھ سے چھوٹ گئی۔ اسے ایسا محسوس ہوا کہ

برسوں بعد اس کی روح کو سکون مل رہا ہو۔''[1]

جبار نے یوسف کو قتل کیا اس جرم کی سزا جبار کو پھانسی کی شکل میں ملی جیل کی کوٹھری میں اپنی موت کو یاد کرتے ہوئے پھانسی چڑھ گیا اور اپنی گلابو سے جاملا۔

کہانی کے ذریعے وحشی سعید یہ بتانا چاہتے ہیں کہ دولت کے لالچ۔ انتقام کی آگ نفرت محبت کے جذبات ایک شریف انسان کو بھی حالات کیا سے کیا بنا دیتے ہیں انہوں نے ناولٹ کے ذریعے انتقام اور انتقام کے نتیجے میں ہونے والے حالات کے بارے میں آگاہ کیا ہے۔ ناولٹ اپنے موضوع اور فن دونوں کے اعتبار سے ایک کامیاب ناولٹ ہے ناولٹ کا پلاٹ مربوط ہے۔ کرداروں اور مکالموں کو بھی بڑی فنی چابکدستی سے پیش کیا ہے منظر نگاری کے بھی بہترین نمونے ملتے ہیں۔ مجموعی اعتبار سے ناولٹ وحشی سعید کی ایک کامیاب تخلیق ہے اور ناولٹ نگاری کی تاریخ میں ایک اہم اضافہ ہے۔

جائز......ناجائز:

وحشی سعید کا یہ ناولٹ بھی 'ماضی اور حال' جلد اول میں شامل ہے۔اس ناولٹ میں وحشی سعید نے ایک اعلیٰ خاندان میں پیدا ہونے والے انور خان کی ناجائز اولاد افضل کی بہت دردناک کہانی کو بیان کیا ہے۔ انور خان جو کہ ایک لیڈر کی حیثیت سے جانے جاتے تھے اپنے ملک کی آزادی کے لئے جدوجہد کر رہے تھے اسی درمیان رقیہ سے منگنی ہوگئی۔ رقیہ اور انور خان کی ملاقاتیں بھی ہوتی رہیں۔ اسی ملاقات میں ان سے غلطی سرزد ہوگئی۔ جو شادی کے بعد ہونا تھا وہ پہلے ہو چکا ہے اور انور خان ملک کی آزادی کے لئے اتنے سرگرم ہوئے کہ ایک دن شہید ہو گئے۔ رقیہ کے ماں باپ کو جب یہ خبر ہوئی کہ رقیہ ماں بننے والی ہے تو ان کے ہوش اڑ گئے

[1] عجب زندگی......غضب موت از وحشی سعید مشمولہ ماضی اور حال، ص ۲۶۔ مہاویر پریس وارانسی، ۲۰۱۵ء

خاندان کی بدنامی کے خوف نے ان کی راتوں کی نیند حرام کردی اور ایک دن جب بچہ ہوا تو بڑی خاموشی سے بدنامی کے ڈر سے بچے کو جمال کے سپرد کردیا گیا کہ اس کی پرورش کہیں دور جا کر کرے اور اس کے لئے لاکھوں روپئے دے دئے گئے۔ جمال جب اس بچے کو لے کر جب گھر گئے تو سوتیلی ماں کو یہ گوارا نہیں ہوا اس طرح افضل کا بچپن گزرنے لگا۔ وہ سوائے جمال کے سب کے پیار سے محروم رہا۔ جمال چونکہ اب افضل کی پرورش کے پیسوں سے مالدار ہوگئے تھے لیکن اس کی سوتیلی ماں کے آگے سب کچھ بیکار تھا۔ وہ دن رات اس پر طنز کرتی۔ وہ اسے حرامی کہہ کر پکارنے لگی۔ جس سے افضل کے دل پر چوٹ لگتی لیکن اس کی رگوں میں شریف خاندان کا خون تھا۔ وہ برداشت کر کے رہ جاتا، انور چونکہ جنگ آزادی میں پھانسی پر لٹکا دیا گیا تھا اس لئے سب کے دلوں میں اس کی عزت تھی۔ وہ عوام کا ہیرو سمجھا جاتا تھا لیکن افضل کی زندگی اجیرن بن گئی تھی۔ ایک شادی کی محفل میں رخسانہ سے ملاقات ہوئی تو دونوں اس پر فدا ہوگئے بشیر جو کہ افضل کا سوتیلا بھائی تھا۔ اس کو یہ بات گوارا نہ ہوئی کہ افضل رخسانہ کو غلط نظروں سے دیکھے اس نے اپنی ماں سے ایک کی دو لگا کر افضل کے خلاف اتنی نفرت پیدا کردی کہ افضل کا گھر میں رہنا مشکل ہوگیا۔ بالآخر وہ گھر چھوڑ کر ہمیشہ کے لئے نکل جاتا ہے جس پر جمال کو بے حد افسوس بھی ہوتا ہے افضل کئی دن بھوکا پیاسا ادھر ادھر بھٹکتا رہا ایک دن وہ بھوکا پیاسا ایک جھونپڑی کے سامنے گر گیا۔ جہاں ایک پیر بابا رہتے تھے پیر صاحب اسے اندر لے گئے۔ اس کا علاج کیا۔ اسے تسلی دی کہ اب گھبرانے کی ضرورت نہیں تم پیر صاحب کے سائے میں آگئے ہو۔ افضل نے اپنی روداد سنائی تو پیر صاحب نے کہا۔ تم گنہگار نہیں بلکہ میرے بعد اس گدی کے تم ہی وارث ہو۔ لیکن افضل اپنی قابلیت اور گناہگاری کا ذکر کرتا ہے تو پیر صاحب اسے سمجھاتے ہیں اقتباس ملاحظہ کیجئے:۔

''تم میرے بعد اس گدی کے وارث ہو''

''لیکن میں اس قابل......''

''قابل، قابلیت کا سوال ہی کہاں ہے یہ تو دل کا سوال ہے جس کا دل صاف ہو۔ جس کے دل میں کسی کے لئے نفرت نہ ہو وہ خدا کے قریب ہوتا ہے اپنی زندگی یوں ضائع مت کرو میری خواہش پوری کرو''

''لیکن......''

''مجھے یقین ہے کہ تم میرے بعد میری گدی اچھی طرح سنبھال سکتے ہو۔''

یہ الفاظ پیر صاحب نے کچھ اس انداز میں کہے کہ افضل کے منھ سے سوائے ان لفظوں کے اور کچھ نہ نکل سکا ''آپ کا حکم اور یقین سر آنکھوں پر''

وقت گزرتا گیا پیر صاحب دنیائے فانی سے رخصت ہو گئے اور افضل کی گفتگو اور نیک کاموں کے سبب لوگ اسے پیر صاحب کہنے لگے۔''[1]

افضل نے اس کے بعد وہ بڑے بڑے کارنامے انجام دیئے کہ دور دور تک افضل کا ڈنکا بجنے لگا۔ جو کام اس کے والد نے ادھورا چھوڑا تھا وہ کام افضل نے پایۂ تکمیل تک پہنچائے۔ اور افضل اس طرح مجاہدین آزادی کا سب سے بڑا لیڈر بن گیا۔ ایک دن کافی عرصہ گزر جانے کے بعد افضل کے ماں باپ اور اس کے گھر والے افضل سے ملنے کے لئے جمال کے ساتھ افضل کے کمرے میں داخل ہوئے پہلے تو افضل اپنے والد کو دیکھ کر خوش ہوا اور جمال کے گلے لگ گیا۔ جمال نے افضل کو بتایا کہ میں تیرے ماں باپ کو بھی ساتھ لایا ہوں۔ جمال کے ساتھ جو لوگ کمرے میں آئے ہیں وہ رقیہ، رضیہ، رخسانہ، اجمل اور بشیر ہیں۔ لیکن ان سب کے آنے پر افضل جمال سے ہاتھ جوڑ کر گڑ گڑاتے ہوئے کہنے لگا کہ مجھے آج اصل واقعہ، اصل کہانی اور اصل حقیقت بتائیے کہ کیا ہوا تھا میری رگوں میں کس کا خون ہے۔ کن حالات سے مجبور کر آپ کے سپرد کیا گیا۔ جمال کچھ سوچ کر بولا میرے اور میرے سپرد بیٹے افضل کے علاوہ سب لوگ کمرے سے باہر چلے جائیں۔ جب سب لوگ باہر چلے گئے تو جمال نے افضل کے سامنے حقیقت بیان کی۔ اس کے بعد افضل نے سب کو اندر بلا کر کہا کہ اب میرے ساتھ آپ تمام لوگوں کا کوئی تعلق نہیں ہے آپ لوگ اب زندگی میں کبھی بھی مجھ سے ملنے کی کوشش نہ کریں جمال ابا جان میرے سب کچھ ہیں وہی میری زندگی ہیں وہی میری ماں وہی میرے باپ ہیں ان کے علاوہ میں کسی رشتے کو نہیں جانتا وہ لوگوں سے کہتا ہے کہ اب سب لوگ چلے جائیں یہ کہہ کر افضل اپنا چہرہ اپنے ہاتھوں میں چھپا لیتا ہے لوگ افضل کے کمرے سے ندامت کے آنسو لئے رخصت ہو گئے جمال وہیں

[1] جائز۔ ناجائز از وحشی سعید مشمولہ ماضی اور حال جلد اول ص۔ ۴۷۔ مہاویر پریس وارانسی۔ ۲۰۱۵ء

کھڑا رہا اتنے میں فریدہ آ گئی۔فریدہ کو دیکھ کر جمال کے دل میں کچھ خیال آیا۔اور اس نے فریدہ کو آنکھوں آنکھوں میں کچھ سمجھایا اور کمرے سے باہر جا کر دروازہ بند کر دیا فریدہ اب افضل کے دکھ درد کا سہارا بنتی ہے ناولٹ کا آخری اقتباس دیکھیں:۔

''فریدہ نے افضل کے کندھے پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔افضل نے سر اٹھا کر دیکھا تو وہ اس کے قدموں پر گر پڑی اور زار و قطار رونے لگی۔افضل نے اس کا چہرا اپنے ہاتھوں میں لیا اس کی آنکھوں سے ندامت اور سچی محبت ٹپک رہی تھی۔افضل کی آنکھوں میں بھی آنسو آ گئے اور اس نے اپنا چہرا فریدہ کے سینے کے درمیان رکھ دیا۔اسے کچھ سکون ہوا۔فریدہ نے اس کے چہرے کو اپنے سینے میں زور سے دبایا اور اس کی آنکھوں کے آنسو اپنی آنکھوں میں جذب کر لئے۔''[۱]

ناول نگار نے ناولٹ میں یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ سارے فیصلے نیت پر ہوتے ہیں اگر ماں باپ سے غلطی ہو جائے تو اس میں ایک بچے کا کیا قصور کوئی ضروری نہیں کہ دنیا جسے حقیر سمجھے وہ برا ہو بلکہ خدا کے نزدیک کون برا ہے، کون اچھا ہے۔اس کو صرف وہی جانتا ہے وہی دلوں میں عزت ڈالتا ہے اور نیت ہی انسان کو اچھا برا انسان بناتی ہے۔جائز ناجائز ایک ایسی ہی کہانی ہے جس میں انسانی معاشرے میں ہونے والی برائیوں اچھائیوں اور انسانی ذہنیت کو اجاگر کیا گیا ہے اور افضل کے کردار کو جو عظمت عطا کی گئی ہے وہ سماج پر ایک طمانچہ ہے کہ آج تک لوگ جسے حقیر سمجھتے تھے آج اسے سب آنکھوں پر بٹھا رہے ہیں وحشی نے خاندانی وقار، جھوٹی شان رکھنے والے لوگوں کے لئے یہ عبرتناک کہانی پیش کی ہے کہانی سات مختصر ابواب پر مشتمل ہے کہانی میں ربط ہے کردار نگاری بھی فنی چابکدستی سے کی گئی ہے۔مکالمے دلچسپ، چست اور جاذبِ نظر ہیں غرض ناولٹ ''جائز ناجائز'' وحشی سعید کا ایک بہترین کارنامہ ہے۔

فطرت......محبت......ندامت:

ماضی اور حال کی جلد اول میں یہ تیسرا ناولٹ ہے یہ ناولٹ ۳۷ چھوٹے چھوٹے ابواب پر مشتمل ہے

[۱] جائز......ناجائز از وحشی سعید مشمولہ ماضی اور حال ص۔۷۰، مہاویر پریس وارانسی۔۲۰۱۵ء

وحشی سعید کے اس ناولٹ کا پلاٹ چھٹی اور ساتویں دہائی کی فلموں سے ملتا جلتا ہے جہاں مزدوروں کے حقوق کی خاطر ٹریڈ یونین کا قیام اور پھر آخر پر کارخانے کا کسی ایسے حادثے سے دوچار ہونا جس کی وجہ سے اس کی سوچ میں مثبت تبدیلی آتی ہے اور فلم کا خاتمہ خوشی پر ہو جاتا ہے ناولٹ میں قاری ایک ایسے کردار سے روبرو ہوتا ہے جس کی چال ڈھال اور طور طریقہ مشکوک نظر آتا ہے امین صاحب نام کا یہ کردار انتہائی درجے کا عیاش ہے وہ شراب و شباب کا رسیا ہے اسی لئے ایک ضمنی کردار لالوا سے مطلوبہ جگہوں تک رہنمائی کرتا ہے امین ایک امیر گھرانے میں پیدا ہوا تھا جس کے والد کو اپنے کاروبار سے فرصت نہیں تھی اور ماں پارٹیوں اور سہیلیوں میں مشغول رہتی تھی۔ اس کے باپ کے منشی رنگین شاہ نے دونوں باپ بیٹوں کو عیش و عشرت، شراب و شباب کی ایسی لت لگائی کہ وہ انسانیت کے درجے سے گر کر جانوروں کی فطرت کا مظاہرہ کرنے لگے۔ باپ کے مرنے کے بعد امین نے کئی بار طے کیا کہ وہ اس مکروہ زندگی سے نکل کر انسان کی جون میں آجائے لیکن ہر بار اسے رنگین شاہ کی عیاری اور اس کے ارادوں کی کم مائیگی نے اسے ایسا کرنے سے باز رکھا۔ پھر ایک دن ایسا بھی آیا کہ اس کی بیوی نے اس کی حیوانی عادات و خصائل سے تنگ آ کر اپنے تین بچوں کے ساتھ میکے کی راہ لی۔ بدقسمتی سے وہ جس ٹرین میں سوار ہوئی وہ ٹرین ایک حادثے کا شکار ہوئی امین کی بیوی اور اس کے چھوٹے بیٹے کی لاش ملی۔ بیٹی اور بڑے بیٹے کا کچھ پتہ نہ چلا۔ امین کی حالت غیر ہوئی وہ اپنے دوست انوکھے خان سے کہنے لگا کہ میں نے اپنی بیوی کی قدر نہ کی جو ہر وقت مجھ پر سب کچھ فدا کرنے کے لئے تیار رہتی تھی۔ میں وہی عیاشی کا کیڑا رہا۔ نہ جانے میری بیٹی اور بیٹے کس حال میں ہوں گے۔

امین اس حادثے کے بعد اپنے دوست کے کہنے پر سمندر نگر چلا آیا تا کہ ہوا پانی بدلنے سے اس کی زندگی میں بھی تبدیلی آئے زندگی پھر رواں دواں ہوئی اور وہ پھر اپنی رنگ رلیوں میں مست ہوا۔ امین نے سمندر نگر میں کپڑے کا کارخانہ لگایا اور اپنی عیاری سے لوگوں کے دل جیتنے میں کامیاب ہوا۔ ایک دن امین کے کارخانے میں ایک لڑکا اقبال علی نوکری کی عرضی لے کر آیا اور امین نے اس کی قابلیت دیکھ اسے بحیثیت کلرک اپنے کارخانے میں ملازم رکھ لیا۔ اقبال نے اپنی ماں رقیہ کو خط لکھ کر اپنے پاس سمندر نگر بلا لیا۔ ادھر امین علی کے پاس دلال جمال آ کر یہ خبر دے گیا کہ طوائف رانی کے پاس ایک نوخیز کلی گلنار نام کی ہے جسے اس کا دشمن صیاد شاہ حاصل کرنا چاہتا ہے یہ سن کر امین سیدھے طوائف رانی کے کوٹھے پر جا پہنچا اور گلنار کو اپنے سامنے منگوایا

لیکن وہ دادِنشاط نہ دے سکا۔ کیوں اس وقت پراسے کاروباری سلسلے میں کسی کام سے جانا پڑا۔ جاتے جاتے اس نے منی بائی سے کہا کہ پورن ماشی تک وہ گلنار کو اپنے پاس امانت رکھے۔ اسی دوران کارخانے میں مزدوروں نے اپنے حق کی خاطر آواز بلند کی اور دیکھتے دیکھتے بات ہڑتال تک پہنچ گئی اقبال علی بھی ہڑتالی مزدوروں کے ساتھ اس طرح مل گیا کہ مزدور اسے اپنا لیڈر ماننے لگے ہڑتال نے طول پکڑا اور فاقوں تک نوبت پہنچی لیکن مزدور اپنے حق کے لئے ڈٹے رہے اقبال علی کو امین نے بلا کر لالچ دینے کی کوشش کی لیکن وہ اپنی فطری اچھائی اور ایمانداری کو ترک کرنے کے لئے تیار نہ ہوا۔ ایک دن اتفاق سے بازار میں اقبال علی اور گلنار کی (جو ریل حادثہ میں جدا ہو گئے تھے) ملاقات ہوئی اور بھائی بہن کے رشتے میں بندھ گئے اقتباس ملاحظہ کیجئے:۔

''رات کو دیر تک جاگنے کے سبب وہ صبح دیر سے اٹھا۔ اٹھتے ہی اسے ہسپتال کا خیال آیا۔ وہ تانگہ لینے باہر بھاگا۔ دوڑ، دھوپ میں وہ ایک لڑکی سے ٹکرا گیا

''اندھے ہو کیا''

''معاف کرنا بہن۔ میں تمہیں دیکھ نہیں سکا۔ میں ذرا پریشان ہوں''

''بہن...... تمہیں معلوم ہے میں کون ہوں۔ میں طوائف ہوں''

''تو کیا ہوا۔ طوائف بھی تو انسان ہوتی ہے۔ کسی کی بہن بیٹی ہوتی ہے''

''تو یہ جان کر بھی کہ میں طوائف ہوں تمہیں مجھ سے کراہیت محسوس نہیں ہوتی''

''بالکل نہیں۔ جب میں نے تمہیں بہن کہہ دیا تو واقعی تم میری بہن ہو''

''تمہارا نام کیا ہے۔ کہاں رہتے ہو''

''میرا نام اقبال ہے اور میں کھولی والی گلی میں رہتا ہوں''

''میں تم سے ملنے آؤں گی۔ آ سکتی ہوں نا''

''بالکل بلا کسی ڈر خوف کے''

''میرا نام گلنار ہے اور میرا ٹھکانہ پورے شہر کو معلوم ہے میں شریف گلی

میں رہتی ہوں''

''بہن میں تم سے ملنے آتا۔لیکن مجھے ڈر ہے کہ وہاں لوگ بھائی بہن کے رشتے پر شک کریں گے''

''میں جانتی ہوں بھیا۔لیکن میں تم سے ملنے ضرور آؤں گی۔''

''بالکل آنا......ارے معاف کرنا۔ماں بیمار ہے مجھے سواری لینی ہے میں چلتا ہوں''

''خدا حافظ بھیا۔''[1]

کچھ دن بعد گلنار اقبال کے گھر آتی ہے اور اقبال کا لاکٹ دیکھ کر وہ حیران ہو جاتی ہے کہ وہ میرا لاکٹ ہی ہے یا اس کا پھر دریافت کرنے پر سارا واقعہ سامنے آتا ہے اور یہ حقیقت پتہ چلتی ہے کہ یہ دونوں بھائی بہن ہیں گلنار اقبال اللہ کا شکر ادا کرتے ہیں کہ اتنے سالوں بعد اللہ نے بچھڑے ہوئے کو ملا دیا۔طوائف منی بھائی نے امین کی پرواہ کئے بغیر گلنار کو اپنے بھائی اقبال کے ہمراہ جانے دیا۔پورن ماشی کو جب امین منی بائی کے پاس گلنار کو حاصل کرنے کے لئے آیا تو منی بائی نے جواب دیا:۔

''نہیں امین صاحب کچھ جذبات، کچھ نیکیاں اتنی قیمتی ہوتی ہیں کہ ساری دنیا کی دولت مل کر بھی اس کو نہیں خرید سکتی۔گلنار کا بچھڑا ہوا بھائی مل گیا۔ اس کے گلے میں بھی وہی لاکٹ تھا جو ریل حادثے کے دوران مجھے ملی گلنار کے گلے میں تھا۔''[2]

ادھر مزدوروں کی ہڑتال میں تیزی آنے لگی۔آخر ایک دن مزدوروں نے کارخانے کے مالک امین کی حویلی میں آگ لگا دی۔امین وہاں سے بھاگ کر اقبال کے دروازے پر پہنچا۔جب گلنار نے اسے دیکھا تو اس نے چلانے کے لئے منھ کھولا ہی تھا کہ امین نے اس کا منہ بند کرلیا۔امین کے ہاتھ میں بے ہوش ہوئی گلنار کا لاکٹ آ گیا۔امین غور سے دیکھنے لگا۔امین نے جب اس لاکٹ کو غور سے دیکھا تو اسے معلوم ہوا کہ یہ تو ویسا ہی

---

[1] فطرت......محبت......ندامت از وحشی سعید مشمولہ ماضی اور حال جلد اول ص۔۱۰۲ مہاویر پریس وارانسی۔۲۰۱۵ء

[2] فطرت۔محبت۔ندامت از وحشی سعید مشمولہ ماضی اور حال جلد اول ص ۱۰۹ مہاویر پریس وارانسی۔۲۰۱۵ء

لاکٹ ہے جیسا میں نے اپنے بیٹے کے گلے میں ڈالا تھا اور بعد میں شبنم نے ویسا ہی بیٹی اور چھوٹے بچے کو بھی پہنا دیا تھا۔ اسے یقین ہوا کہ گلنار میری بیٹی اور اقبال میرا بیٹا ہے وہ افسوس کرتے ہوئے گناہ یاد کرتا ہے خود کو سنبھال کر تیزی سے وہاں سے نکل گیا۔ وہ سیدھا وکیل کے گھر جا کر رات میں ہی معافی چاہتے ہوئے کہتا ہے کہ میں ابھی ابھی شہر سے باہر جا رہا ہوں اس لئے آپ کو کچھ وصیت کرنے آیا ہوں وکیل نے پوچھا کیا وصیت ہے میں اپنی ساری جائیداد آدھی آدھی اقبال اور گلنار کے نام کرنا چاہتا ہوں۔ اس طرح وصیت پر دستخط کرنے کے بعد امین بے نام، بے سمت منزل کی طرف چل پڑا۔ وہ کمزوری اور بیماری کی حالت میں ایک ڈاکٹر کو ملا جس نے اس کا علاج بھی کیا اور اسے مشورہ دیا کہ وہ ہسپتال میں رہے اور مریضوں کی خدمت کرے اسے ثواب بھی ملے گا اور آرام سے زندگی بھی بسر ہوگی۔ چنانچہ امین نے بھی سوچا کہ یہی اس کے گناہوں کا ازالہ ہوسکتا ہے کہ وہ ان غریبوں، مظلوموں اور بے سہاروں کی خدمت میں اپنی بقیہ زندگی گزارے اس طرح وہ ڈٹ کر مریضوں کی خدمت میں لگ جاتا ہے اور ڈاکٹر بھی یہ کہنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔

''بابا۔ آپ اس قدر جنون سے ان مریضوں کی خدمت میں لگ گئے ہیں
گویا معلوم ہوتا ہے کہ یا تو آپ کو بہت ثواب کمانے کی جلدی ہے یا پھر
اپنے گذشتہ گناہوں کا ازالہ کر رہے ہیں۔''[1]

امین کی فطرت میں اب تبدیلی آچکی تھی وہ مریضوں کی خدمت میں اس قدر جنونی ہو گیا تھا کہ جب ایک گاؤں میں ہیضہ پھوٹ پڑا تھا تو ڈاکٹر کے ساتھ کوئی دوسرا ملازم جانے کو تیار نہیں تھا تو یہ بوڑھا امین وہاں چلنے کے لئے تیار ہوتا ہے ڈاکٹر کے منع کرنے پر بھی وہ یوں کہتا ہے:۔

''کیا بات کرتے ہو بیٹا۔ ابھی تم نے جنون کی بات کی۔ کیا تم بھول گئے
کہ خدمت کا جنون مجھ سے وہ کام بھی کرا سکتا ہے جو کہ جوان بھی نہیں
کر سکتا۔''[2]

امین بیماروں کی خدمت میں اس قدر جنونی ہو گیا کہ گاؤں کے سب مریض امین کی خدمت سے بچ

---

[1] فطرت......محبت......ندامت۔ از وحشی سعید مشمولہ ماضی اور حال جلد اول ص۔۱۹۰ مہاویر پریس وارانسی، ۲۰۱۵ء

[2] فطرت......محبت......ندامت از وحشی سعید۔ مشمولہ ماضی اور حال جلد اول ص ۱۳۰ مہاویر پریس وارانسی۔ ۲۰۰۵ء

گئے لیکن امین خود اس خدمت کے دوران ماسک لگانا بھول جاتے تھے چنانچہ اس بیماری کی لپیٹ میں آ گئے اور بالآخر جادونگر کے ہسپتال کے کمرہ نمبر ۱۰ میں وہ اپنے خالق حقیقی سے جا ملے۔ اقبال، رقیہ، گلنار، محمود، رضیہ جو امین کی بیماری کا سن کر آئے تھے ان کے پہنچنے سے پہلے ہی امین کا انتقال ہو چکا تھا۔ اب یہ سب لوگ ڈاکٹر سے اجازت لیتے ہیں کہ کیا ہم ان کے جسد خاکی کو اپنے ساتھ لے جا سکتے ہیں۔ ڈاکٹر اجازت دیتے ہیں اور ان کو بتاتے ہیں کہ ان بوڑھے شخص کے وارث بھی موجود ہیں ایک بیٹا اور بیٹی۔ وہ ڈاکٹر کی یہ بات سن کر چونک جاتے ہیں اور پوچھتے ہیں کہاں ہیں وہ ہم انھیں ان کے والد کی ساری جائیداد سونپ دیں گے۔ ڈاکٹر اپنی بات کی وضاحت کرتے ہوئے کہتا ہے کہ آپ کو ان کی جائداد کسی کو سونپنے کی ضرورت نہیں کیوں کہ آپ ہی ان کے بیٹے اور گلنار ان کی بیٹی ہے اور پھر ڈاکٹر نے سارا واقعہ بیان کر دیا ڈاکٹر سے یہ سن کر اقبال اور گلنار کیا کرتے ہیں ملاحظہ کیجئے ناولٹ کی آخری سطور:۔

> ''اقبال اور گلنار زار و قطار رونے لگے۔ روتے روتے اقبال نے امین کے سر سے چادر ہٹائی تو اسے یوں لگا جیسے کہ ان لوگوں کے طویل انتظار کے بعد ان کے والد کی آنکھیں بند ہوئی ہوں۔ چہرے پر عجیب دلکش سکون تھا۔ اقبال کو یوں لگا جیسے اس کے والد کے مردہ چہرے کے نور سے پورا کمرہ روشن ہو گیا ہو۔''[1]

وحشی سعید کے اس ناولٹ کے آخر میں قاری کے ذہن میں سوال آتا ہے کہ فطرت انسانی کسبی ہے یا وہبی۔ انسان کے اندر ہمہ وقت خیر اور شر کے درمیان تک ہماری رہتی ہے کبھی انسان پر خیر یعنی اچھائی غالب ہو جاتی ہے اور کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ اسی انسان پر شر یعنی برائی حاوی ہو جائے اب اگر کسی پر ساری زندگی شر حاوی رہا اور زندگی کے آخر میں بھی وہ خیر کو اپنا لے خیر اس پر حاوی ہو جائے تو اس کی زندگی کامیاب و کامران ہو سکتی ہے۔ ناولٹ کی خوبی یہ ہے ناول نگار نے مختلف کرداروں کے ذریعے سے ایک ایسی کہانی تراشی ہے جسے پڑھ کر قاری کے اندر نئی تحریک جنم لیتی ہے وہ بھی کچھ کرنے کے لئے آمادہ ہوتا ہے جہاں امین جیسا بوڑھا جو ساری زندگی مظلوموں غریبوں، بے سہاروں کا خون چوستا ہے وہاں عمر کے آخری حصے میں اسے یہ توفیق بھی

[1] فطرت......محبت......ندامت از وحشی سعید مشمولہ ماضی اور حال ص ۱۳۵ مہاویر پریس وارانسی، ۲۰۱۵ء

نصیب ہوتی ہے کہ وہ اس طرح کے غریبوں مظلوموں اور بے سہارا مریضوں کی خدمت کر کے اپنے گناہوں کا ازالہ کرتا ہے۔

ناولٹ فنی اعتبار سے کامیاب ہے پلاٹ چست ہے ربط کا خاص خیال رکھا گیا ہے مکالمے کرداروں کے ماتحت ادا کرائے گئے ہیں کردار نگاری بھی کمال کی ہے منظر کشی کی بھی بہترین مثالیں مل جاتی ہیں۔ میں اپنی بات ناولٹ کی ان ابتدائی سطور پر ختم کرتا ہوں جس سے وحشی سعید کی فنی صلاحیتیں سامنے آتی ہیں:۔

> ''سورج کو ڈوبے ہوئے ابھی کچھ ہی دیر ہوئی تھی کہ سمندر نگر کی وحشت گلی میں ایک لمبے قد کا آدمی داخل ہوا۔ خوبصورت چہرا لیکن اتنا بارعب کہ پہلی بار دیکھنے والا وحشت سے چونک پڑے۔ سوٹ میں ملبوس۔ پاؤں میں انگریزی بوٹ۔ اس نے جیب سے ایک کاغذ نکالا۔''[1]

وحشت محبت:

یہ ناولٹ بھی 'ماضی اور حال' میں الترتیب چوتھے نمبر پر شامل ہے کہانی چھوٹے چھوٹے گیارہ ابواب پر مشتمل ہے اصغر نامی ایک لڑکا جس کی والدہ انتقال کر چکی ہے اور والد زندہ ہیں جن کی خواہش ہے کہ اصغر بی۔ اے کر کے تحصیل دار بن جائے۔ اصغر نہ چاہتے ہوئے بھی والد کی خواہش کے پیش نظر گاؤں چھوڑ کر شہر جاتا ہے وہ کالج میں اس جگہ گیا جہاں داخلے کے فارم بانٹے جا رہے تھے۔ قطار میں لڑکے لڑکیاں سب کھڑے تھے اصغر بھی قطار میں لگ گیا۔ اصغر کے آگے ایک تہذیب یافتہ لڑکی کھڑی تھی جس کے چست کپڑوں سے جسم کا عضو عضو پھوٹ رہا تھا اور دل میں ہوس کی چنگاری بھڑکا رہا تھا۔ لڑکی نے اصغر سے کہا میری جگہ دیکھتے رہیں پلیز میں آتی ہوں لڑکی کے جانے کے بعد اصغر کے پیچھے کھڑے لڑکوں نے اصغر سے اس لڑکی کے چکر میں لڑائی کی کہ اصغر ان سے پیچھے ہو جائے تاکہ یہ لوگ لڑکے کے پیچھے کھڑے ہو سکیں لیکن اصغر کی بہادری نے ان تمام کو وہاں سے بھاگنے پر مجبور کیا اگرچہ معمولی چوٹ اصغر کے ماتھے میں آ گئی تھی۔ لڑکی واپس آئی جب اسے معلوم ہوا کہ اس کی وجہ سے اصغر زخمی ہوا ہے تو اپنا رومال نکال کر ایک قریب میں کھڑے لڑکے کو دیا کہ وہ اصغر کے ماتھے سے خون صاف کرے اس کے محبت کے رومال پر خون کے قطرے بڑے حسین لگ رہے تھے۔ لڑکی کا فارم

---

[1] فطرت......محبت......ندامت از وحشی سعید مشمولہ ماضی اور حال جلد اول ص ۷۱ مہاویر پریس وارانسی، ۲۰۱۵

لینے کا نمبر آیا تو فارم لے کر چلی گئی۔

اصغر شہر میں ایک ڈاکٹر کے پاس جا کر دو روپئے میں مرہم پٹی کراتا ہے پھر وہ شہر میں رہنے کے لئے کمرے کی تلاش میں بازار میں نکلا جہاں اس نے پرانی گلی میں بوسیدہ مکان کے اندر دس روپئے ماہانہ پر ایک کمرہ لے لیا ادھر صبح صبح پچاس روپے کا منی آرڈر آیا تھا۔۱۰۰ روپئے پہلے ہی اس کے پاس تھے چنانچہ اس نے کھانے پینے کا سارا سامان لیا جو ایک مہینے کے لئے کافی تھا۔ مولانا بخش نے اگلے مہینے کا کرایہ بھی اصغر سے ایڈوانس لے لیا۔ مولانا بخش نے پیسے لینے کے بعد اصغر سے کہا کہ تم تھکے ہو آرام کرلو میں تمہارے لئے چائے بھجواتا ہوں اصغر اندر جاتا ہے کچھ دیر کے بعد اٹھارہ انیس سال کی لڑکی چائے لے کر آتی ہے۔ چائے پینے کے بعد وہ پیالی لے کر چلی گئی۔ شام کو پھر دروازے پر دستک ہوئی اب اس کا پرانا دوست اس سے ملنے کے لئے آیا تھا دونوں کے درمیان گفتگو ہوئی۔ نمائش گاہ گھومتے رہے اسٹوڈیو میں فوٹو کھنچوانے بھی گئے وہاں اصغر کی نظر اس لڑکی پر پڑی جو اسے کالج میں ملی تھی وہ لڑکی اصغر سے پہلے فوٹو کھنچوا چکی تھی اس کی سہیلیوں نے کہا چلو رانی اصغر نام سن کر اس خوبصورت نام کی سوچ میں پڑ گیا۔ دوسرے دن وہ کالج میں گیا کلاس کرنے کے بعد وہ کالج کے باغ میں ایک درخت کے نیچے بیٹھ کر پڑھائی کے بارے میں سوچنے لگا۔ اچانک رانی آواز دیتی ہے' ہیلو' رانی کو دیکھ کر اصغر پوچھتا ہے رانی آپ۔ رانی اصغر سے پوچھتی ہے کہ آپ کو میرا گھر کا نام کیسے معلوم ہے پھر خود ہی کہتی ہے میرا اصلی نام صنوبر ہے آپ نے کسی سہیلی سے میرا گھر والا نام سن لیا ہوگا۔ اصغر ہاں میں جواب دیتا ہے صنوبر پھر سوال کرتی ہے کہ یہ خوبصورت قلم کہاں سے لیا تو اصغر کہتا ہے نمائش گاہ سے صنوبر کہتی ہے میں بھی کل وہاں گئی تھی لیکن مجھے نہیں دکھائی دیا۔ اصغر صنوبر کو کہتا ہے کہ آپ کو پسند ہے تو یہی رکھ لیجئے۔ صنوبر شکریہ ادا کرتے ہوئے قلم لیتے ہوئے وہاں سے چلی گئی صنوبر گھر پہنچتی ہے تو ماں پوچھتی ہے کہ خوش نظر آ رہی ہو کیا وجہ ہے بیٹی نے کہا آج میں نے اپنے کالج کے لڑکے کو بے وقوف بنایا اور اس سے یہ قلم اڑ لیا۔ ماں نے کہا بیٹی یہ اچھی بات نہیں۔ صنوبر نے کہا چھوڑو ماں ہم کون سے اچھے ہیں اب صنوبر ماں سے کہتی ہے مجھے سب یاد ہے میرا بچپن، تمہاری جوانی۔ میری جوانی تمہارا بڑھاپا......سب کچھ۔ یہ سننے کے بعد ماں ماضی کے اوراق میں کھو گئی اور اپنے ماضی کو یاد کرنے لگی کہ کس طرح نواب صاحب سے عرض کر کے ان کی بیوی بن کر رہنا چاہتی تھی لیکن ایک داشتہ بن کر ہی وہ نواب صاحب کے ہاں زندگی گزارنے لگی۔ کچھ دیر بعد صنوبر کہتی ہے کہاں کھو گئی

ماں بھوک لگی ہے کھانا دو۔ بوڑھی ماں چونک پڑی کہتی ہے ابھی لاتی ہوں۔

ادھر اب اصغر کے نئے کپڑے سل چکے تھے وہ نئے کپڑے پہن کر کالج جانے کے لئے تیار تھا نصرت اندر آتی ہے اور گفتگو کرتے کرتے جب بے تکلفی بڑھتی ہے تو اصغر یہ پوچھتا ہے کہ کیسی منت ماننے کے لئے درگاہ گئی تھی تو نصرت شرماتے ہوئے کہتی ہے وہ...... وہ مولانا صاحب مجھ سے ایک بچہ چاہتے ہیں اتنا کہہ کر وہ بھاگ گئی۔ اصغر کالج گیا وہاں بھی اس کے خوبصورت کپڑوں سے اس کی تعریف ہونے لگی۔ ادھر کالج میں چھٹیاں ہونے والی تھی۔ عظمت اپنے پہاڑی والے بنگلے پر جانا چاہتے تھے جو شہر سے پانچ میل دو تھا۔ اصغر اپنے گاؤں جانے والا تھا صنوبر چاہتی تھی کہ کوئی لڑکا یہیں رک جائے جس کے ساتھ وہ ہوٹل کے کھانے اور سنیما ہال کا لطف لے سکے لیکن سب نے اپنا اپنا پروگرام بنایا تھا وہ مایوس ہو کر گھر لوٹی ماں کو بستر پر پایا تو ڈاکٹر کو لینے نکلی۔ راستے میں عظمت ملا صنوبر کی بات سن کر وہ بھی ساتھ چل پڑا۔ لیکن جب تک یہ ڈاکٹر کو لے کر ماں کے پاس پہنچتی ماں دنیائے فانی سے کوچ کر چکی تھی۔ عظمت تدفین کے بعد صنوبر کے پاس گیا صنوبر اپنا دکھ عظمت کو بتانے لگی جب اپنی بے بسی کا اظہار کیا تو عظمت نے اپنا پیار ظاہر کرنا شروع کر دیا چنانچہ وہ صنوبر کو اپنے ساتھ لے کر اپنے گھر چلا جاتا ہے۔ اصغر کو اب فکر لاحق ہوئی کیوں کہ صنوبر اب دو دن سے کالج نہیں جا رہی تھی وہ صنوبر کے گھر جا کر پتہ کرتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ عظمت کے ساتھ ہمیشہ کے لئے چلی گئی ہے اب اصغر ٹوٹ جاتا ہے۔ بوجھل قدموں سے وہ اپنے کمرے کی جانب آ رہا تھا راستے میں شرابی کو دیکھ کر وہ بھی ایک بار میں گیا شراب کی بوتل پی لی۔ کمرے تک پہنچتے پہنچتے اس پر نشہ پوری طرح حاوی ہو چکا تھا۔ نصرت اسے دیکھ کر پوچھتی ہے کہ تم لڑکھڑا کیوں رہے ہو سہارا دے کر کمرے میں لے جاتی ہے وہ سمجھ جاتی ہے کہ اصغر شراب پی کر آیا ہے نصرت نے کہا اچھا ہوا مولانا صاحب گھر میں نہیں ورنہ بہت برا ہوتا اصغر یہ جواب دیتے ہوئے پلنگ پر گر پڑا کہ جو میرے ساتھ ہوا ہے اس سے برا کیا ہوتا نصرت اس کے اوپر گر پڑی ہوس کے جذبے جاگ اٹھے۔ وہ اصغر کے اوپر اس کی تعریف کرنے لگی اسے اپنی باہوں میں کھینچ لیا اصغر کے لب جب نصرت کے سینے سے ٹکرائے تو وہ خود پر قابو نہ پا سکا۔ شراب و شباب کے امتزاج نے سب کچھ بدل ڈالا۔ اصغر کو جب ہوش آیا تو خود کو بھی اور نصرت کو بھی برہنہ پایا وہ چونک کر کہتا ہے یہ سب کیا ہو گیا۔ نصرت یہ کہتے ہوئے کہ جو کچھ ہوا اچھا ہوا مولانا صاحب کی غیر موجودگی نے مجھے بھرپور مردانگی کا لطف عطا کیا وہ اصغر کے ہونٹوں کو چومتی ہے اور اپنے

برہنہ سینے کواس کے برہنہ سینے پر رکھتی ہے۔

اصغر گاؤں جانے کے لئے سوٹ کیس اٹھا کر گاؤں کے لئے نکل گیا گاؤں پہنچا تو والد کو بیمار پایا۔ باپ کو بیمار دیکھ کر اصغر نے پوچھا کہ آپ نے اپنی بیماری کے متعلق خط کیوں نہیں لکھا۔ باپ کہتا ہے کہ میں تیری پڑھائی متاثر نہیں کرنا چاہتا تھا میری خواہش تھی کہ تجھے تحصیلدار کی وردی میں دیکھوں شاید اب زندگی باقی نہیں اصغر کا باپ اس سے یہ وعدہ لیتا ہے کہ تم تحصیل دار ضرور بنو گے تا کہ میری جسم نہیں تو میری روح ضرور تمہیں دیکھ سکے وعدہ لیتے ہی اصغر کا باپ انتقال کر گیا اب اصغر کا واحد مقصد تحصیلدار بن کر باپ کی خواہش کو پورا کرنا تھا چنانچہ وہ شہر لوٹ آیا۔

عظمت جو صنوبر کو اس امید سے کہ اپنے والدین کو صنوبر سے شادی کے لئے راضی کر لے گا گھر پہنچ کر بہت پریشان ہوا کیوں کہ عظمت کے ماں باپ ان کی شادی کے لئے تیار نہیں تھے لیکن عظمت صنوبر کے حسن میں اتنا دیوانہ ہو چکا تھا کہ آخر کار ماں باپ کو ہار ماننا پڑی۔ اس طرح ان کی شادی ہو جاتی ہے لیکن صنوبر سے اس کے ساس سسر دونوں ناخوش تھے جب اس کے ساس سسر کو یہ پتہ چلا کہ وہ ماں بننے والی ہے تو عظمت کی ماں چیخ پڑی کہ پتہ نہیں کس کا گناہ ہمارے خاندان کے گلے مڑھ رہی ہے۔ ادھر عظمت ایک ماہ سے زیادہ دنوں کے لئے باہر گیا تھا جب واپس آنے والا تھا تو اس سے پہلے ایک خط بھیجا کہ میں گھر آنے والا ہوں صنوبر بہت خوش تھی لیکن ایک دن اچانک یہ خبر آئی کہ جس ریل گاڑی سے عظمت آ رہا تھا وہ حادثے کا شکار ہو گئی ہے اور عظمت کا نام بھی مرنے والوں کی فہرست میں ہے۔ صنوبر کی دنیا اجڑ گئی ساس سسر نے اسے اپنے گھر سے بھگا دیا۔ اب صنوبر اصغر کے ہاں جاتی ہے وہاں وہ اپنی ساری داستان بتاتی ہے اصغر اسے بہت پیار سے پیش آتا ہے پہلی رات تو صنوبر کو اپنے کمرے میں رکھتا ہے پھر اسے دو مہینے کے لئے کمرہ خرید کر دیتا ہے جہاں صنوبر رہتی ہے اور اصغر وہاں اسے کھانا دینے آتا ہے پھر جب صنوبر کو مردہ بچہ پیدا ہوتا ہے تو وہ مایوسی کے بجائے خوش ہوتی ہے کہ کم از کم اب اپنی نئی زندگی کی شروعات تو اچھے سے ہو گی۔ اصغر اس کو لے کر مولانا کے ہاں دوسرا کمرہ دلواتا ہے جو اصغر کے کمرے کے بغل میں ہے اب وہاں اصغر کا دوست تحصیلدار کا بیٹا بھی آتا ہے ایک دن جب وہ وہاں آتا ہے تو دونوں اصغر کا دوست اور صنوبر باہر گھومنے کے لئے نکل جاتے ہیں اور ایک دوسرے کی محبت میں گرفتار ہو جاتے ہیں ادھر اصغر کی طبیعت بہت خراب ہو رہی تھی ایک دن جب اصغر کافی دیر تک واپس نہیں آیا تو

صنوبر موقع پا کر تحصیل دار کے بیٹے کے پاس چلی گئی ان دونوں نے یہ فیصلہ کیا کہ وہ پرسوں شادی کرلیں گے لیکن کل ایک پارٹی میں جائیں گے دوسرے دن وہ پارٹی میں جاتے ہیں جہاں صنوبر کے علاوہ کوئی دوسری لڑکی نہیں تھی۔ شراب کی محفل چلتی ہے صنوبر کے منہ میں بھی جام کے قطرے ڈال دیئے گئے اوراس طرح نشہ حاوی ہوگیا۔ اب اس کی بیہوشی کا فائدہ اٹھاتے ہوئے سب نے یہ فیصلہ کیا کہ جنسی ہوس کو پورا کیا جائے سب نے پیسے دئے پانچ ہزار دینے والا ڈوبی صنوبر کو اٹھا کر کمرے میں لے گیا۔ باقی اپنی باری کا انتظار کرتے رہے۔ جب صنوبر کا نشہ ٹوٹا تو اس نے ایک نیم اندھیری کوٹھری میں خود کو برہنہ پایا۔ جب وہ خود کو سنبھالتے ہوئے وہاں سے باہر نکلنے لگی تو مولانا بخش سامنے تھے وہ کہنے لگے میں نے تمہیں خریدلیا ہے دیکھئے مولانا کا انداز:۔

> ''تمہیں میں نے خرید لیا ہے۔ اب تم یہیں رہوگی اور میرے گراہکوں کو خوش کروگی بھاگنے کی کوشش نہ کرنا ورنہ ماری جاؤ گی۔ زندہ رہنا ہے تو اس چکلا گھر کو چلاتی رہو۔''[۱]

یہ سن کر صنوبر خوف کے مارے پیچھے ہٹ گئی ادھر اصغر جو کافی دنوں سے ہسپتال میں تھا صبح سیر کو نکلا کہ اچانک ایک لڑکی بھاگتی ہوئی اس کے قدموں میں گر پڑی اور کہنے لگی مجھے بچالو۔ اصغر نے پوچھا تو صنوبر نے بتایا کہ مولانا بخش اس کی عصمت فروشی کرتا ہے وہ زبردستی مجھے اپنے ناجائز فائدے کے لئے استعمال کررہا ہے۔ جب مولانا بخش اصغر اور صنوبر کے پاس پہنچتا ہے تو اصغر کو دھمکی دیتا ہے لیکن اصغر بھی اسے آج سچ بتا دیتا ہے کہ جسے تو اپنا بیٹا سمجھ رہا ہے وہ تیرا ہے یا اصغر کا یہ جا کر اپنی بیوی سے پوچھ لے۔ مولانا بخش اپنی بیوی سے پوچھنے کے لئے گیا نصرت کو سچ بتانا پڑا تو مولانا بخش نے رامپوری چاقو سے اس کا پیٹ چیر ڈالا اس طرح ان دونوں ماں بیٹے کے قتل کے الزام میں مولانا بخش کو گرفتار کرلیا گیا اب اصغر صنوبر کو لے کر مولانا بخش کے گھر اپنے کمرے میں آیا اپنا سامان سمیٹا اور دوسری جگہ کمرہ کرائے پر لے کر رہنے لگا۔ اصغر کو صنوبر کے اب تک کے رویے سے پیار کرنے کی قوت ختم ہوگئی تھی۔ اب صنوبر کو جب اصغر سے پیار نہیں مل رہا ہے تو وہاں سے ایک دن نکل جاتی ہے۔ اصغر اسے صبح نہ پا کر اس کی تلاش میں نکل جاتا ہے لیکن شام تک ڈھونڈنے پر بھی صنوبر نہ ملی پورا دن کچھ نہ کھانے کی وجہ سے ناتواں اصغر گر پڑتا ہے اب وہ ڈاکٹر اسے یہاں پا کر پہچان لیتا ہے اور اسے سخت

---

[۱] وحشت محبت از وحشی سعید مشمولہ ماضی اور حال جلد اول ص۔۱۶۲۔ مہاویر پریس وارانسی۔۲۰۱۵ء

ہدایت دیتا ہے کہ اب اس کو زیادہ دن تک ہسپتال میں رہنا ہے۔ ادھر صنوبر اپنے دن گزارنے کے لئے کئی لوگوں کے ہاں جاتی ہے لیکن سب جگہ سے اسے ناکامی ملتی ہے اسے ایک نوجوان ایک رات اپنے پاس لے جا کر اس کو کھانا کھلا کر جہاں اس کی بھوک ختم کرتا ہے وہاں دوسری طرف اپنے پیٹ کے نیچے کی آگ بھی بجھاتا ہے اور اسے پانچ روپے دے کر رخصت کرتا ہے اب رات ہوگئی تھی صنوبر فٹ پاتھ پر سوگئی تھی فٹ پاتھ پر رات کے دو بجے سڑک بالکل سنسان تھی اور وہ گہری نیند میں تھی کہ کئی بھکاری اس کے پاس آئے اور صنوبر کے ہاتھ پیر منہ سب باندھ کر اس سے اپنی ہوس پوری کرنے لگے۔ اب لاچار صنوبر کا یہی معمول بن چکا تھا کہ دن میں وہ اپنے پیٹ کی آگ بجھانے کے لئے گرا ہک تلاشتی تو رات میں فٹ پاتھ پر سونے کے عوض اپنے جسم کو ان درندوں کے حوالے کرتی جو اسے بھیڑیوں کی طرح نوچتے۔ اس معمول کو پندرہ دن گذر چکے تھے اب اس کی خوبصورتی بدصورتی میں بدلتی جارہی تھی۔ اب اس کو کوئی گرا ہک آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھتا تھا لیکن رات کو فٹ پاتھ پر بھکاری اسے ضرور نوچتے تھے۔ آخر کار وہ بھی بھکاریوں میں شامل ہوگئی۔ ایک دن بھیک مانگتے ہوئے سڑک پار کررہی تھی کہ اس کا سر چکرایا اور گر پڑی۔ اتنے میں ایک گاڑی اس کے جسم کے اوپر سے گزر گئی۔ اسے ہسپتال پہنچایا جاتا ہے جہاں اس کو دیکھنے کے لئے لوگوں کا آنا جانا لگتا ہے اصغر نرس سے پوچھتا ہے کہ یہ انتشار کیسا ہے تو نرس نے ساری بات بتائی اب اصغر بھی اس کو دیکھنے کے لئے جاتا۔ صنوبر کے چہرے سے چادر ہٹا کر اسے دیکھتا ہے اور صنوبر سے کہنے لگا کہ تمہارا یہ حال یہ کیا ہوگیا۔ تو صنوبر نیم مردہ حالت میں بھی اصغر کی آواز سن کر آنکھیں کھولتی ہے اور آخری الفاظ اصغر سے مخاطب ہو کر کہتی ہے:۔

''اصغر......'' اس کے لب بری طرح کانپ رہے تھے۔

''میں نے رانی بننے کا خواب دیکھا۔ اس کے لئے مکروہ فریب سے کام لیا اور دیکھو اس کا نتیجہ...... کارل مارکس کے فلسفوں میں زندگی تلاش کرنے والی کالج کی طلبہ آج بھکارن بن گئی۔ میں نے تمہارے ساتھ بڑا ظلم کیا۔ کاش میں گرنے سے پہلے سنبھل جاتی۔ مجھے معاف کردو۔''[1]

اصغر یہ سن کر ڈاکٹر کو بلانے جاتا ہے ادھر صنوبر کی آواز میں اس قدر چیخ تھی کہ ہسپتال کے درودیوار ہل

[1] وحشت محبت از وحشی سعید مشمولہ ماضی اور حال جلد اول۔ ص۔ ۱۶۷ مہاویر پریس وارانسی ۲۰۱۵ء

گئے سبھی ڈاکٹر اور نرس بھاگتے ہوئے آئے۔ ڈاکٹر نے صنوبر کا معائنہ کیا وہ اس دنیا سے جا چکی تھی اصغر اس کی قبر سے لپٹ کر روتا رہا اس کی دنیا ویران ہوگئی تھی۔ اس نے گاؤں جانے کا ارادہ کیا صحت کافی خراب تھی گاڑی جب بیلا گاؤں رکی تو وہ اتر گیا۔ گاؤں پہنچا تو گاؤں کے لوگوں نے اسے پہچان لیا لوگ اس کے پیچھے دوڑے لیکن گھر کی دہلیز تک آتے آتے اس کے منھ سے سرخ فوار چھوٹا جس نے اسے بے دم کر دیا موت نے اتنی مہلت بھی نہ دی کہ وہ اپنے گھر کی دہلیز کو چوم سکے۔

ناولٹ میں وحشی سعید نے یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ اگر انسان عقل سے کام نہ لے تو اس کی زندگی تباہ ہوجاتی ہے یہاں صنوبر کس طرح اپنی بے وقوفی سے اصغر کا ساتھ بار بار چھوڑتی ہے اور ہر بار درندوں کی جنسی ہوس کے بعد اصغر کے روبرو ہوتی ہے اس طرح اس کی ساری زندگی پریشانیوں میں گزرتی ہے ادھر اصغر جو دل میں صنوبر کی محبت لئے تھا وہ صنوبر کے اس رویے سے دل ہی دل میں بہت بے چین رہتا ہے اندر ہی اندر اس کو غم کھائے جا رہا تھا کہ صنوبر اس کے سامنے کیوں یہ اس طرح کی حرکتیں کر رہی ہے ناول کا عنوان 'وحشت محبت' ہے یہاں وحشت کی ترجمانی صنوبر کے کردار کے ذریعے کی گئی ہے اور محبت کا ترجمان اصغر ہے جو آخری دم تک بھی صنوبر کی مدد کرتا ہے۔ ناولٹ فنی اور موضوعی اعتبار سے کامیاب ہے مکالمہ نگاری منظرکشی کمال کی ہے کرداروں کو تراشنے میں بھی وحشی نے فنی چابکدستی سے کام لیا ہے وحشی سعید کا یہ ایک بہترین ناولٹ ہے۔

ان کا آخری ناولٹ قحط ہے جو ۲۶ مختصر ابواب پر مشتمل ہے یہ ناولٹ شروع سے آخر تک اپنے تمام تر فنی تقاضوں کو پورا کرتا نظر آتا ہے وحشی سعید نے موضوع اور فن دونوں میں بڑی چابکدستی سے کام لیا ہے۔ جاوید انور ان کے ناولٹوں کے متعلق لکھتے ہیں:۔

> ''اپنی ابتدائی شکل میں یہ ناولٹ کیا رہے ہوں گے اس بارے میں تو کچھ نہیں کہہ سکتا لیکن آج یہ ناولٹ جس شکل میں ہیں، یہ بات پورے وثوق سے کہی جاسکتی ہے کہ ان کے موضوعات آج بھی دل میں اتر جانے والے ہیں ناولٹ کے عنوانات بھی خاصے متاثر کن ہیں اور غمازی کرتے ہیں کہ عنوان کے انتخاب میں بھی وحشی سعید نے کتنی ریاضت سے کام لیا ہے انہوں نے ان ناولٹ کے ذریعہ جہاں اپنی تخلیقی صلاحیت کے ایک

نئے رخ کو آشکار کیا ہے وہیں اردو فکشن میں معیاری ناولٹ کا اضافہ بھی
کیا ہے موضوع زبان، منظر کشی، کردار نگاری اور مکالمہ نگاری پر غور کیا
جائے تو ان سب میں انہوں نے جس اختصار سے کام لیا ہے اور جس
طرح ایک ایک لفظ کا خیال رکھا ہے کہ کہیں کوئی لفظ زیادہ کم نہ ہونے
پائے اس نے ان کے ناولٹ کو بہت معیار اور اردو فکشن میں بہت اہم
قدر و قیمت کا حامل بنا دیا ہے۔''[1]

وحشی سعید نے اس میں جو ناولٹ پیش کئے ان میں مسلم معاشرے میں پھیلی ہوئی تمام برائیوں، اچھائیوں، ناانصافیوں اور ظلم و بربریت کے خلاف آواز اٹھانے والے کرداروں کے ذریعے جس طرح کہانی پیش کی گئی ہیں یہ وحشی سعید کے فن کا پتہ دیتی ہے وحشی سعید جموں و کشمیر میں اردو فکشن کا ایک بڑا نام ہے ان کی تخلیقات میں ناولٹ ہی نہیں بلکہ ناول میں بھی اپنی فنی صلاحیتوں کے جوہر دکھائے ہیں۔ ''پتھر پتھر آئینہ'' اور ''ایک موسم کا خط'' اس کی بہترین مثالیں ہیں ان کے ناولٹ بھی ان کی فکشن نگاری میں مہارت کا ثبوت ہیں ماضی اور حال میں شامل پانچوں ناولٹ وحشی سعید کے بڑے فکشن نگار ہونے کا واضح ثبوت ہیں زبان و بیان پر مکمل عبور حاصل ہونے کے ساتھ ساتھ کہانی بیان کرنے کا جو ہنر اور اسلوب ہے لفظوں کا صحیح انتخاب اور استعمال، مکالموں کی موقع و محل کی مناسبت سے ادائیگی وغیرہ سب مل کر وحشی سعید کی فنی صلاحیت کا واضح ثبوت دیتے ہیں وحشی سعید اردو زبان و ادب کے حوالے سے ایک بڑا نام ہے اب تک ان کا بہت سارا تخلیقی کام سامنے آچکا ہے ڈاکٹر مشتاق احمد وانی کے ان الفاظ سے میں اپنی بات ختم کرتا ہوں:۔

''جموں و کشمیر کے افسانوی ادب میں وحشی سعید ایک معتبر و موقر نام ہے
جو چند ادبی خصوصیات کی بنیاد پر انفرادیت اور مقبولیت کا حامل ہے اردو
ادب میں وحشی سعید کی حیثیت ایک ناول نویس اور افسانہ نگار کی ہے فنی و
فکری آہنگ، چست و درست مکالمے، زبان و بیان کا خالص افسانوی
انداز، مانوس علامتوں، استعاروں اور رمز و اشاروں کا برمحل استعمال کے

[1] جاوید انور مشمولہ ماضی اور حال (ناولٹ) مہاویر پریس وارانسی، ۲۰۱۵ء

ساتھ ساتھ فلسفیانہ باتوں کا فنکارانہ اظہار اور سب سے بڑی خوبی
افسانے میں افسانویت کو اختصار کے ساتھ انجام تک پہنچانے اور اسے
برقرار رکھنے کی توفیق وحشی سعید کو حاصل ہے۔"[1]

---

[1] وحشی سعید کی تخلیقی بصیرت از ڈاکٹر مشتاق احمد وانی مشمولہ سہ ماہی لمحے لمحے بدایوں ص۔۲۰۱۵ء

شفق سوپوری

شفق سوپوری بھی ریاست جموں وکشمیر کے ناول نگاروں میں ایک اہم نام ہے شفق سوپوری کی پیدائش محلّہ عشہ پیر صاحب تحصیل سوپور بارہمولہ ضلع میں کشمیری خاندان میں ہوئی۔ شفق سوپوری کا اصل نام عبدالقیوم ختائی ہے اور قلمی نام شفق سوپوری ہے ان کا تخلص شفق ہے انہوں نے ابتدائی تعلیم مقامی اسکولوں سے حاصل کی اور کشمیر یونیورسٹی سے اردو میں ایم۔اے، ایم۔فل اور پی۔ایچ۔ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ شفق سوپوری کو ابتدا سے ہی شعر گوئی کا شوق تھا اور اس شوق نے انہیں شعر کہنے پر مجبور کیا۔ چنانچہ وہ عصر حاضر کے مشہور شاعر، افسانہ نگار، نقاد، محقق، طنز نگار، ناول نگار اور ڈراما نگار بھی ہیں شفق پوری نے ادب کے ہر میدان میں طبع آزمائی کی اور روایت سے انحراف کرتے ہوئے اپنی الگ روش اختیار کی۔ انہوں نے ہموار راہیں ترک کر کے مشکل پسندی کو اپنایا اور دشوار گزار راستوں پر چلنا پسند کیا۔ شفق سوپوری کی فنی خوبیوں کو جس قدر سراہا جائے کم ہے۔

پروفیسر قدوس جاوید شفق سوپوری کے متعلق لکھتے ہیں:۔

> ''شفق سوپوری بے شک ایک اہم ترین شاعر ہیں لیکن شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ وہ ایک محقق، نقاد، کالم نویس، نیچر نگار اور طنز ومزاح نگار بھی ہیں۔ یعنی شفق سوپوری ایک ہمہ جہت تخلیقی فنکار ہیں جن کا قلم شاعری اور نثر دونوں میدانوں میں یکساں طور پر کمال خوبیوں کے ساتھ چلتا ہے۔ اور اب یہ ناول لکھ کر وہ اردو کے فکشن نگاروں کی صف میں بھی شامل ہوگئے۔''[1]

شفق سوپوری اپنی تخلیقی صلاحیت کے سبب اردو دنیا میں بے پناہ مقبولیت حاصل کر چکے ہیں ان کی

---

[1] ''نیلیما'' موضوع کے اعتبار سے اردو کا پہلا ناول از پروفیسر قدوس جاوید مشمولہ ''نیلیما'' ناول، ص۔۱۱، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی، ۲۰۱۶ء

تخلیقات میں ''دل خاک بسر''، ''بیتے موسموں کے دکھ''، ''موسیقی شاعری اورلسانیات''، ''دشت میں دور کہیں''، ''مخزن موسیقی''، ''اردوغزل اور ہندوستانی موسیقی''، ''کلام فیض کا عروضی مطالعہ'' اور ''شگفتا نے وغیرہ اہم ہیں ان کے دو ناول ''نیلیما'' اور ''فائرنگ رینج: کشمیر: ۱۹۹۰'' کافی اہمیت کے حامل ہیں۔ شفق اپنی ادبی تخلیقات کی بنا پر دنیائے ادب میں کسی تعارف کے محتاج نہیں ان کی شہرت دور دور تک پھیلی ہوئی ہے۔ مختصر یہ کہ ریاست جموں وکشمیر کے اردو شعرا و ادبا کی فہرست میں شفق سوپوری کا ایک الگ مقام ہے عصر حاضر کی اردو ادب کی ایک بڑی شخصیت کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ اب ہم یہاں ان کے ناولوں پر بات کرتے ہیں۔

نیلیما:

نیلیما شفق سوپوری کا پہلا ناول ہے جو ۲۰۱۶ء میں ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی سے شائع ہوا۔ نیلیما میں نیرج پور گاؤں کی کہانی ہے یہ گاؤں مغربی بنگال کے ضلع جلپور میں ہے جہاں چائے کے باغات ہیں۔ نیلیما اسی گاؤں کی رہنے والی ہے۔ ایک دن صبح صبح نیلیما بنئے کی دوکان پر مرچ لینے کے لئے ایسے کپڑے پہن کر جاتی ہے جس میں اس کے جسم کا کچھ حصہ نمایاں ہو رہا تھا اس کی بہن نے اسے دوپٹہ اوڑھ کر جانے کے لئے کہا لیکن وہ یہ جواب دے کر کہ میں پہلی مرتبہ نہیں جا رہی ہوں کہہ کر نکل جاتی ہے۔ نیلیما خوبصورت بھی ہے اور الھڑ اور شوخ بھی ہے دوکان پر گاہکوں کی لمبی لائن تھی سب لوگوں کی نظریں نیلیما پر تھیں لیکن نیلیما بھی ان کی گندی نظروں کو سمجھ رہی تھی نیلیما کافی بار دوکاندار سے کہتی ہے کہ مجھے مرچ دیجئے۔ لیکن وہ جان بوجھ کر پہلے دوسرے لوگوں کو سامان دیتا ہے تا کہ نیلیما پر کچھ دیر غلط نظر ڈال سکے جب نیلیما کھڑے کھڑے پریشان ہوگئی تو اس نے زور دے کر کہا لالہ سودا دیتے ہو یا میں جاؤں لالہ اسے جواب دیتا ہے کہ کیوں اتاولی ہو رہی شانتی موسی بڑی دیر سے انتظار کر رہی ہیں پہلے ان کا سامان دیا گیا پھر لالہ نے نیلیما کے ہاتھ سے پیسے لیتے ہوئے کرشن سے کہا دیکھئے کیسے گفتگو ہوتی ہے ان دونوں کے درمیان:۔

''کشنے چھوری کو نپٹا دے...... پتہ نہیں لوگ مرچی کا کیا کرتے ہیں؟'' یہ
سن کر نیلیما کا پارہ اور چڑھ گیا بولی:
''بری نظر سے دیکھنے والوں کی آنکھوں میں جھونکتے ہیں ...... کیوں
بنیائن نے کبھی بتایا نہیں؟''

لالہ نے بڑے پیار سے کہا......''جو خود تتیا مرچ ہوا گر ایک نظر تاؤ بھری
سالن یا چٹنی پر ڈال دے، ایسا تیکھا ہو جائے گا کہ کھانے والے تڑ پڑی
سے سی سی کرتے ساری رات پانی مانگیں گے''
''بدتمیز......''[1]

یہاں سے کہانی باقاعدہ شروع ہوتی ہے اس کے بعد نیلیما جہاں بھی جاتی ہے بری نظر والوں سے ہی اس کا سابقہ پڑتا ہے۔ سب سے پہلے اس کا بہنوئی اسے اپنی ہوس کا نشانہ بنانے کی کوشش کرتا ہے۔ وہ شراب پی کر گھر آتا ہے اس کی بیوی بچے کو سلا رہی تھی اس لئے اس کی سالی نیلیما اسے کھانا دیتی ہے نیلیما کے جسم سے خوبصورت رنگ نے اسے مدہوش کر دیا تھا وہ ٹکٹکی باندھ کر اسے دیکھ رہا تھا رات میں بھی جب اسے نیند نہ آئی تو وہ نیلیما کے کمرے میں جا پہنچا اور نیلیما کے کولہوں پر ہاتھ رکھ دئے کہ اتنے میں نیلیما جاگ گئی چیخ سن کر بنسی کی بیوی بیتا دوڑ کے آئی بنسی کے بال کھسوٹنے لگی دونوں سے کچھ اس انداز سے چلاتے ہوئے کہتی ہے:۔

''حرامی، سور، لفنگے۔'' وہ روہانسی ہوگئی......اور تو! کرم جلی! کلٹا! تمہیں
سیندھ لگانے کے لئے میرا ہی گھر ملا تھا۔ تھو دھتکار ہے تجھ پر۔''[2]

بنسی سے بچنے کے بعد وہ دھنی رام کے جال میں پھنستی ہے وہ اسے کہتا ہے میں تم سے شادی کروں گا میں تمہیں دل سے چاہتا ہوں ساری عمر تمہیں خوش رکھوں گا۔ لیکن نیلما کے ایک سوال کرنے پر ہی وہ فرش سے چادر اٹھا کر نیلیما کی طرف پھینک کر چلا جاتا ہے اب نیلیما پریشان ہوتی ہے کہ وہ کیا کرے گھر جائے تب بھی رات کے پیٹ میں جو بیج پڑا وہ اگر کل پھوٹا تو پنچایت میں کیا جواب دے گی وہ سوچتے سوچتے تھک جاتی ہے وہ دھنی کا انتظار کر رہی تھی نیلیما دھنی کے آنے سے پہلے غسل خانے میں نہانے کے لئے جاتی ہے وہاں بھی راجندر ٹین کی ان چھدری چادروں میں سے نیلیما کو دیکھ رہا تھا۔ دھنی آتے ہی دیکھ کر سمجھ گیا اس نے راجندر کو مارنا شروع کیا نیلیما یہ شور سن کر صابن لگے بدن اور گیلے کپڑوں میں ملبوس باہر آتی ہے اور دھنی کو راجندر سے ہٹاتی ہے راجندر اپنی غلطی پر شرمندہ ہو کر دھنی سے معافی مانگتا ہے۔ یہاں بھی یہ واضح ہوتا ہے کہ نیلیما کو کس

[1] شفق سوپوری۔نیلیما۔ص۔۳۸۔ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی۔۲۰۱۶ء
[2] شفق سوپوری۔نیلیما۔ص۔۴۸۔ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی،۲۰۱۶ء

طرح راجندر بھی اپنی ہوس کا نشانہ بنانے کی ناکام کوشش کرتا ہے'نیلیما' ناول میں شفق سوپوری نے یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ کس طرح جوان لڑکے غریب گھر کی آدی واسی بیٹی کو ہوس کا نشانہ بناتے ہیں نیلیما اس کہانی کا مرکزی کردار ہے جس کے اردوگرد کہانی گھومتی ہے۔ ناول کا یہ کردار بہت متحرک ہے اور شروع سے آخرتک درد سہتا ہے اس کردار کے ذریعے تمام آدی واسی سماج کی بدحالی اور بےقدری کو پیش کیا ہے۔ نیلیما بعد میں بن بیاہی بیوی بن کر دھنی رام کے گھر آجاتی ہے لیکن اس کے گھر آنے کے بعد بھی دھنی کا ظلم اس پر جاری رہتا ہے اسے شادی سے پہلے تو لوگوں نے عزت کو تار تار کرنے کے لئے نشانہ بنانے کی کوشش کی اور بعد میں دھنی رام کے گھر آکر بھی اسے دھنی رام کے ظلم کو برداشت کرنا پڑتا ہے دھنی رام کو ایک دن صبح جب پھیلا ہوا تھا۔نیلیما نے دھنی کے سامنے ناشتہ پیش کیا تو دھنی نے تھالی سرکاتے ہوئے کہا، دیکھئے ان کے درمیان کی بات چیت:۔

''دھنی: نہیں کھانا مجھے۔''

''نیلیما: کیوں......؟''

دھنی: ''نہیں کھانا تو نہیں کھانا''

نیلیما: مگر کیوں......''

دھنی: کیوں کا جواب میرے پاس نہیں''

نیلیما: ''ناشتے پر کیوں غصہ اتار رہے ہو؟''

دھنی: ''میں کیوں کسی پر غصہ اتارنے لگا''

نیلیما: رات کی بات کا غصہ ہے؟

دھنی: ''رات کی بات تم جانو اور وہ۔''

نیلیما: وہ کون......؟

دھنی: وہی جو تمہارے من میں بسا ہے۔

نیلیما: کون میرے من میں بسا ہے؟

دھنی: مجھے کیا معلوم

نیلیما: اچھا تو میرے من میں کوئی اور بسا ہے.....تو''

دھنی: ''تو کیا......اسی کو کھلا کے آئے''

نیلیما: تم ہی میرے من میں بسے ہو......لو آں کرو''[1]

دھنی نے نیلیما کی بازو کو زور سے دھکا دے کر تھالی کو دیوار سے پٹخ دیا۔ جس پر نیلیما بازو پکڑ کر بیٹھ گئی اور دھنی اور اس کے گھر کی کمزوریاں گننے لگی اس نے سب کا ذکر کیا پھر دھنی کے بھائی کے لئے دھنی سے کہا کہ تم اپنے بھائی کو سمجھا دو کہ وہ میرے ساتھ پھوں پھاں نہ کرے۔ یہ سن کر دھنی آپے سے باہر ہوا اور زور سے گھونسہ نیلیما کے گال پر مار دیا۔ دھنی کچھ یوں بڑبڑاتا ہے اقتباس دیکھئے:۔

''رنڈی سالی! تم بھائیوں میں بگاڑ ڈالنا چاہتی ہو......سن آگے چیں چپڑ کی تو منہ کالا کر کے گھر سے دفان کر دوں گا...... پاؤں کی جوتی سر لگی''

''نیلیما تیوار کے گر گئی۔ دھنی کو جلد ہی احساس ہوا کہ اس نے معصوم پر غصہ کیا۔ وہ اس کے پیر پکڑنے لگا۔ نیلیما نے پیر سکیڑ لئے اور دوزانوں ہو کر بنتی کی ...... میرے گوڑ مت پڑا کرو۔ بہت ہوا یہ جٹھ دینا، مجھے میرے حال پر چھوڑ دو......بھگوان کے لئے۔......اس نے گال سے ہاتھ اٹھایا تو دھنی کے دل پر یہ دیکھ کر چھری چلی کہ نیلیما کے گال پر چھوٹا گومڑا پڑا تھا۔ سوجن سے آنکھ بند ہو گئی تھی۔

''ہے بھگوان! یہ کیا انارتھ ہوا۔''[2]

شفق سوپوری نے اپنے اس ناول کے ذریعے آدی واسی سماج کی عورتوں کی نفسیاتی کیفیت اور اس طبقے کے لوگوں کی بنیادی کمزوریوں کا مشاہدہ کر کے ناول میں پیش کیا ہے نیلیما کے ذریعے اس طبقے کی سچی تصویر کھینچ دی گئی ہے نیلیما چونکہ شروع سے اب تک مختلف پریشانیوں کا سامنا کر رہی ہے اس لئے وہ معاشرے کی ساری حقیقت کو اچھی طرح سمجھنے لگی۔ ایک جگہ شفق سوپوری لکھتے ہیں:۔

[1] شفق سوپوری۔ نیلیما۔ ص۔۹۰، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی۔ ۲۰۱۶ء

[2] شفق سوپوری۔ نیلیما۔ ص۹۱۔ ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی۔ ۲۰۱۶ء

> ''وہ یہ حقیقت بھی جان گئی کہ پیسوں کے یہ پوت اپنی ماؤں بہنوں، بیٹیوں اور بیویوں کو پردیس بھیج کر ان کی کمائی کا حساب کرتے وقت ہر کمی بیشی کو جسموں کی دھاندلی سمجھ کر انہیں طعنوں کر سرخ سلاخوں سے داغ دیتے ہیں ......اور شام کو تھک ہار کر آنے والی گھر والی کا نیفہ اس لئے ٹٹولا جاتا ہے کہ کہیں اس میں پیسے اڑس کے نہ رکھے ہوں ......بھوک کی راہ میں جب عورت کی تھکان آجاتی ہے تو زہر میں بجھایا ہوا طعنہ دیا جاتا ہے:
> کس یار کی ناند سے پیاس بجھا کے آئی ہے؟''[1]

ناول نگار نے اپنے ناول میں اس آدی واسی عورت کی مایوس کن صورتحال کا ذکر کیا ہے نیلیما کے علاوہ دوسرے نسوانی کرداروں میں نرملا سمن، کانتا دیوی اور درگا ماں سب پر کئے گئے ظلم کو ناول نگار نے اپنے منفرد انداز میں پیش کیا ہے۔ اس ناول میں یہ بتانے کی کوشش کی گئی ہے کہ آدی واسی مرد جنسی معاملات میں پاک رشتوں کا کوئی خیال نہیں رکھتے ہر کسی کو اپنی ہوس کا نشانہ بنا کر ظلم و جبر کرتے ہیں۔ ناول موضوع کے علاوہ فنی اعتبار سے بھی کامیاب ناول ہے ڈاکٹر مشتاق احمد وانی اپنے ایک مضمون میں اس ناول کے فن کے متعلق لکھتے ہیں:

> ''فنی اعتبار سے اگر دیکھیں تو ناول ''نیلیما'' میں کہانی کی روانی، واقعات کی منطقی ترتیب، کرداروں کی حرکات وسکنات اور ان کی بات چیت اپنی اپنی جگہ پر ناول کو کامیاب بناتے نظر آتے ہیں۔ بیانیہ انداز میں لکھا گیا یہ ناول قاری کی دلچسپی کی برقرار رکھتا ہے پر لطف کی بات یہ ہے کہ شفق سوپوری نے اس ناول میں جو زبان استعمال کی ہے وہ آدی واسی طبقے سے مطابقت رکھتی ہے ان لوگوں کا مخصوص لب ولہجہ، ان کی جہالت اور غیر شائستگی پر دال ہے۔ زیر بحث ناول کی لفظیات میں بہت سے الفاظ اور فقرے ایسے ہیں جو ہندی کے ہیں......''[2]

---

[1] شفق سوپوری۔ نیلیما، ص۔ ۹۴۔ ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی، ۲۰۱۶ء

[2] جموں و کشمیر میں معاصر اردو ناول از ڈاکٹر مشتاق احمد وانی مشمولہ سہ ماہی دربھنگہ ٹائمز ص۔ ۴۵، دربھنگہ ٹائمز۔ پبلیکیشنز، جنوری تا مارچ ۲۰۱۸ء

غرض ناول نیلیما اپنی تمام تر خوبیوں کے پیش نظر بہت کامیاب ناول ہے قریب قریب تمام فنی تقاضوں کو پورا کرتا ہے۔ ناول کی کہانی اور بیان میں اختصار ہے ناول کا پلاٹ واضح ہے جس کی تعمیر کرداروں اور واقعات سے کی گئی ہے ناول میں پیش کردہ واقعات کرداروں سے مطابقت رکھتے ہیں۔یعنی جس طبقے میں جس کردار سے جو کام لیا گیا ہے وہ کردار اور واقعہ میں ایسے گھل مل گئے ہیں کہ کہیں کوئی کردار یا واقعہ غیر فطری نظر نہیں آتا۔ ناول کی کامیابی کا راز شفق کے اسلوب بیان سے بھی ظاہر ہوتا ہے۔ ناول میں منظر نگاری بھی بہت غضب کی ہے جس کے لئے ناول نگار نے موزوں اور مناسب لسانی دروبست سے کام لیا ہے۔ ناول میں کردار نگاری بھی کمال کی ہے انہوں نے کرداروں کی بھیڑ کے بجائے نیلیما کو ہی اکثر واقعات کا مرکز بنایا ہے تا کہ قاری کرداروں کے رشتوں میں الجھنے کے بجائے ناول میں پیش کی گئی آدی واسی سماج سے تعلق رکھنے والی لڑکیوں یا عورتوں کا دکھ درد سمجھ سکے اوران پر ڈھائے جانے والے ظلم وستم اوران کے جنسی استحصال کا راز فاش ہو سکے ناول میں نیلیما کے علاوہ وہ جو کردار ہیں ان کی حیثیت ذیلی ہے جن کی مدد سے نیلیما کی ذہنی،نفسیاتی اور جذباتی کیفیات کو سامنے لانے کوشش کی گئی ہے ناول میں ناول نگار نے چھوٹے چھوٹے مکالموں سے بڑا کام لیا ہے ناول میں منظر کشی کرنے کے لئے بھی ناول نگار نے اپنی ذہنی وسعت اور قلم کی فیاضی کا ثبوت فراہم کیا ہے۔غرض ناول ''نیلیما'' میں شفق سوپوری کے فنی مہارت کے جلوے جگہ جگہ نظر آتے ہیں۔ ناول کے آخر میں ناول نگار کے گھر کام کرنے والی ایک آدی واسی لڑکی کویتا تیواری کا ایک چھوٹا سا ہندی خط شامل ہے جسے میں اردو میں یہاں پیش کرتا ہوں۔

''میں کچھ کہنا چاہتی ہوں۔

میں سب سے پہلے بھیا جی کو دھنیواد کہنا چاہتی ہوں جنہوں نے ہم آدی واسیوں کے بارے میں سوچنا شروع کیا ہے خاص کر ہم آدی واسی عورتوں کے بارے میں جیسی کتاب انھوں نے لکھی ہے اس پر میں ان سب آدی واسی عورتوں کی طرف سے جو کسی نہ کسی طرح سے ظلم کا شکار ہیں شکریہ ادا کرتی ہوں۔ مجھے آشا ہے کہ اس کتاب سے ہمارے آدی واسی سماج میں خاص کر عورتوں کی حالت بدل جائے گی۔ میں اپنے آپ کو خوش قسمت مانتی ہوں جو اتنے بڑے آدمی کے گھر میں کام کرتی ہوں۔ بھیا جی ایک بڑے لیکھک ہونے کے ساتھ ایک بہت ہی اچھے انسان بھی ہیں۔آج کے زمانے میں کسی آدی واسی لڑکی کو بیٹی بنانا اوراس کی مدد کرنا بڑی

بات ہے میں ان سب آدی واسی کو بدھائی دیتی ہوں جنھوں نے بھیا جی کے کام کیا ہے

کویتا تیواری

ایک آدی واسی لڑکی

3-9-2015

ایک اور آدی واسی لڑکی کے یہ جملے بھی دیکھئے:

''ڈاکٹر شفق سوپوری دنیا کے لئے چاہے کتنے بڑے قلم کار ہوں مگر میرے لئے وہ میرے وفادار ہیں وہ ایک پتا کی طرح میرا خیال رکھ رہے ہیں ان کے ہوتے میں اپنے آپ کو اناتھ نہیں سمجھتی۔ مجھے خوشی ہے کہ یہ کہانی لکھنے میں میں نے ان کی مدد کی۔ میں چاہتی ہوں کہ میرے پتا جی اور میری کوشش سے آدی واسی عورتوں کو وہ مان سمان اور آدر ملے جس کی وہ حقدار ہیں۔''

انیما اوراؤ

(ایک آدی واسی لڑکی)

آدی واسی لڑکیوں کے یہ دو خطوط اس لئے یہاں پیش کئے تا کہ یہ بات واضح ہو جائے کہ ان مظلوم، لاچار، بے بس لڑکیوں کے جذبات سے پتہ چلے کہ اگر ایسے موضوعات کا انتخاب کر کے ضرورت کے مطابق ادب تخلیق کیا جائے تو شاید ان مظلوموں کی ہمت بڑھے گی اور ان کے دل پر مرہم لگانے کا کام ہوگا۔ کیوں کہ کوئی بھی ان لوگوں کی طرف خلوص کی نظر سے نہیں دیکھتا ہے یہ آدی واسی طبقے کی لڑکیاں پورا دن کام کرتی ہیں رات میں شوہر ان کے کپڑوں کی تلاشی اس لئے کرتے ہیں کہ شاید ان کے کپڑوں سے کچھ پیسے مل جائیں۔ ان آدی واسی لڑکیوں کی کوئی عزت نہیں کرتا۔ انہیں ہر کوئی استعمال میں لاتا ہے ان کا جنسی استحصال کرتا ہے ان پر ظلم و جبر کیا جاتا ہے شفق سوپوری نے اس اہم موضوع کو ناول کے لئے چنا جو اپنے آپ میں ایک انفرادی رنگ رکھتا ہے ناول تمام تر فنی تقاضوں کو پورا کرتا نظر آتا ہے ناول کے موضوع کے علاوہ ناول نگار نے جو زبان ناول میں استعمال کی ہے وہ بھی آدی واسی سماج میں بولی جانے والی زبان ہے اکثر ایسے الفاظ استعمال کئے گئے ہیں

جو آدی واسی طبقے کے لوگ استعمال کرتے ہیں اس کام کے لئے شفق سوپوری نے اپنے گھر میں کام کرنے والی آدی واسی لڑکی سے مدد لی۔ اور اس طرح یہ بڑا ناول منظر عام پر آیا اور ادبی حلقوں میں اسے شہرت حاصل ہوئی۔ اگر چہ شفق سوپوری کا یہ پہلا ناول تھا لیکن چونکہ شفق کو ناول کے فن پر کمال حاصل تھا اس لئے ان کا یہ پہلا ناول ہی اپنے موضوع اور فن دونوں کے اعتبار سے کامیاب ثابت ہوا اور نہ صرف ریاست بلکہ قومی سطح پر اسے بے پناہ مقبولیت حاصل ہوئی۔

فائرنگ رینج: کشمیر ۱۹۹۰ء

شفق سوپوری کا یہ ناول ۲۰۱۹ء میں ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی سے شائع ہوا۔ یہ ناول آٹھ ابواب پر مشتمل ہے یہ ناول کئی دہائیوں سے کشمیر کے ناگفتہ بہ حالات کی آواز ہے جموں وکشمیر میں اردو فکشن نگاری کے حوالے سے شفق سوپوری عہد حاضر کا ایک اہم نام ہے اس ناول میں بھی انھوں نے ایک پختہ ناول نگار ہونے کا ثبوت فراہم تو کیا ہے کیوں کہ اس سے پہلے جو ناول ۲۰۱۶ء میں نیلیما منظر عام پر آیا تھا وہ بھی شفق سوپوری کو ایک اچھے ناول نگار کی صف میں لانے میں کامیاب ہوا۔ اس ناول کے متعلق پروفیسر ابوالکلام قاسمی ناول کے شروع میں لکھتے ہیں:۔

> ”شفق سوپوری کی افتادِ طبع: ”ہر لحظہ نیا ذوق نئی برق تجلی“ کے مصداق اپنے تخلیقی محرکات کے انکشاف کی متلاشی رہتی ہے۔ انہوں نے ”فائرنگ رینج: کشمیر ۱۹۹۰“ کے نام سے تازہ ترین ناول لکھ کر ایک پختہ ناول نگار ہونے کا ثبوت فراہم تو کیا ہی ہے اپنے ضمیر کی آواز پر لبیک کہنے کی کوشش بھی کی ہے۔ ضمیر کی اس آواز کا تعلق انسانی سروکار، سماجی ذمہ داری اور اخلاقی فریضے سے بھی ہے کشمیر کی سیاسی اور سماجی صورت حال جس طرح برصغیر کے دو ملکوں کی غیر فطری تقسیم کا خمیازہ آج تک بھگت رہی ہے اس کی حرکیات کو فکشن سے بہتر طور پر کسی اور صنف ادب اور اسالیب اظہار میں پیش ہی نہیں کیا جاسکتا تھا۔ شفق سوپوری نے انسانی ضمیر کے ساتھ بحیثیت مجموعی اردو فکشن پر عائد اس قرض کو چکانے

کی کوشش کی ہے جو محض کشمیر ہی نہیں پورے برصغیر میں اردو کے بیدار مغزوں پر عائد تھا۔

شفق نے نہ صرف اس تمام صورتحال کا مشاہدہ کیا ہے بلکہ ان کے عزیز و اقارب نے براہ راست اس کرب اور اذیت کو بھگتا اور تجربہ کیا ہے جو پسمند گان کے لئے ایک ڈراؤنے خواب کی طرح ہنوز ان کے اعصاب پر مسلط ہے۔ظاہر ہے کہ شفق سوپوری سے زیادہ موثر انداز میں اس موضوع کا حق ادا کرنے کا ثبوت کسی اور کے لئے پیش کرنا آسان نہ تھا۔''[1]

ناول کے آٹھوں ابواب مختلف عنوان کے تحت ہیں لیکن ناول میں ربط برقرار رہتا ہے مربوط پلاٹ ہے منظر کشی اور انداز بیان میں بھی انہوں نے بہت عرق ریزی سے کام لیا ہے عام بات کو بھی بڑی خوبصورتی کے ساتھ پیش کیا ہے جس سے پتہ چلتا ہے کہ شفق سوپوری مناظر کشی کا فن بخوبی جانتے ہیں اور الفاظ کا انتخاب بھی بہت بہترین موقع اور واقعہ کے اعتبار سے کرتے ہیں دیکھئے ایک اقتباس:۔

''بی بی سی لندن کی ساری نشریات ختم ہو چکی تھیں یا ہوا نے ریڈیائی لہروں کے ڈولتے سفینے کی سمت بدل دی تھی۔ آدھی رات کو قریبی فریکیونسی والے کسی گمنام اسٹیشن سے کوئی ٹمٹا تا ہوا حزنیہ گیت بج رہا تھا جیسے کسی انجان وحشی قبیلے کی کوئی بروگن الاؤ کے سامنے بال کھولے اپنے کھوئے ہوئے بالم کی یاد میں بروا گا رہی تھی۔ عجیب کسک بھری آواز جس میں آگ کی تپش کے ساتھ کالی چکنی باہوں سے بہتے ہوئے پسینے کی جنگلی خوشبو بھی تھی۔ ہر لہرے میں مست جوانی کی تھکن کے بول۔کبھی ڈھول کی لے درت ہو جاتی تو لگتا کہ دور کسی اداس ساحل پر ہوا ناریل کے پتوں سے مجیرے بنا رہی ہے۔اور ڈوبتی آنکھیں دور دیس سے آنے والے

[1] فائرنگ رینج: کشمیر ۱۹۹۰ اردو ناولوں کی تاریخ میں ایک سنگ میل، از ڈاکٹر ابوالکلام قاسمی مشمولہ ''فائرنگ رینج کشمیر ۱۹۹۰'' ص۔۷۶ ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی۔۲۰۱۹ء

جہازوں کی جھلمل جھلمل کرتی روشنیوں کو دیکھ کر کبھی نہ لوٹ آنے والے
مچھیروں کی راہ تکتے تکتے لہروں پر تھرکتی چاندی سے شکوہ کر رہی ہیں۔''[1]

ناول میں فوج کی زبردستی کو بھی دکھایا گیا ہے ایک دن اچانک جب خواجہ وران کی بیگم تہجد پڑھ رہے تھے کہ مسجد کے لاؤڈ اسپیکر سے اعلان ہوتا ہے:۔

''حضرات! حضرات! حضرات فوج نے اس بستی کو محاصرے میں لیا ہے
بستی والوں کو ہدایت دی جاتی ہے کہ وہ فجر کی نماز گھروں میں ہی ادا
کریں اور نماز کے فوراً بعد مرد اسکول کے میدان اور خواتین جنازہ گاہ
میں جمع ہوجائیں ......مزید یہ انتباہ کیا جاتا ہے کہ اگر خانہ تلاشی کے
دوران کوئی فرد بشر گھر میں پایا گیا تو اسے موقعہ پر ہی گولی ماردی جائے
گی۔''[2]

جب یہ سارے لوگ اسکول کے میدان میں جمع ہوجاتے ہیں صفوں میں بیٹھنے کا حکم ہوا۔فوج چاروں طرف ہتھیاروں سے لیس پہرے پر کھڑی تھی اچانک نو بجے ایک فوجی آفیسر سامنے کھڑا ہو کر اس مجمع پر نظر ڈالتا ہے پھر زوردار آواز سے بولا ''بھارت ماتا کی'' لیکن سامنے سناٹا چھایا تھا کسی نے بھی نعرے کا جواب نہیں دیا تو سپاہیوں نے گولیوں کے کئی راؤنڈ ہوا میں چلائے یہ آواز سن کر عورتوں نے حصار توڑا انہیں محسوس ہوا کہ مردوں پر گولیاں چلائی جارہی ہیں اب آفیسر نے کچھ یوں مخاطب ہوتا ہے:۔

''اب اگر مجھے نعرے کا جواب نہیں ملا تو پیڑوں سے پتے نہیں گریں گے
زمین پر تمہاری لاشیں گریں گی:
''بھارت ماتا کی''
''جے''
''ہندوستان''

[1] شفق سوپوری۔فائرنگ رینج: کشمیر ۱۹۹۰ء ص ۱۰۷، ایجوکشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی ۲۰۱۹ء

[2] شفق سوپوری، فائرنگ رینج: کشمیر ۱۹۹۰، ص۔۱۰۸، ایجوکشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی۔۲۰۱۹ء

''زندہ باد''

''ہاں اب ٹھیک ہے''

اس ناول میں مصنف نے شاعرانہ تخیل اور بیانیہ کی قوت کو بھرپور طریقے سے ناول میں برتنے کی کوشش کی ہے ناول کے فن پر گفتگو کرتے ہوئے ابوالکلام قاسمی لکھتے ہیں:۔

''مصنف نے اپنے شاعرانہ تخیل اور بیانیہ کی قوت کو بھرپور طریقے سے اس ناول میں روبہ عمل لانے کی کوشش کی ہے اس بیانیہ کا واحد متکلم راوی بیانیہ کا حصہ بھی ہے اور پوری صورت حال سے فنی اور معروضی فاصلہ قائم رکھنے میں کامیاب بھی۔ اس ناول کے مرکزی کردار منظور احمد شاہ، خواجہ احمد قدوس۔ نورالدین شاہ اور قادر کانچی کے ساتھ ترکوک ناتھ کول اور کرتار سنگھ کے کردار کی پیش کش ایک طرف ناول نگار کے لبرل نقطۂ نظر کی عکاسی بھی کرتی ہے اور کسی نوع کے اکہرے طرز فکر کو اس پر عائد نہیں ہونے دیتی۔ مزید برآں یہ کہ زبان و بیان کی شگفتگی اور حس مزاح نے اس ناول کو حد درجہ قابل مطالعہ بھی بنا دیا ہے۔''[۲]

شفق سوپوری نے مختلف کرداروں کے ذریعے ایک کہانی تیار کی ہے اس ناول کی کہانی سے کشمیر کا اصلی روپ سامنے آتا ہے کشمیری پنڈتوں کو بھگانے کے جھوٹے الزام میں منظور احمد کو جو کشمیر یونیورسٹی سے انگلش میں پوسٹ گریجویٹ ہیں پکڑ لیا جاتا ہے اور پوچھ تاچھ کے بعد فوجی افیسر کے اشارے پر ایک سپاہی نے منظور کو لات مار کر گرا دیا۔ اور دس بارہ جوان اس پر ایسے ٹوٹ پڑے جیسے شکر پارے پر چیونٹیاں ٹوٹ پڑتی ہیں اس کے بعد اسے دو دن کے لئے کیمپ میں دھکیل دیا گیا ایک فوجی آفیسر نے وہاں بھی کچھ سوالات پوچھنے کے بعد اسے گالی دیتے ہوئے کہا کہ تم نے پنڈتوں کو یہاں سے بھاگنے پر مجبور کیا ہے حرامیوں کا لفظ فوجی آفیسر نے استعمال کیا تھا جو منظور نے برداشت نہ کیا اور فوجی آفیسر کو ٹیڑھا جواب دیا کہ آپ کے پاس فورس ہے آپ کے

[۱] شفق سوپوری۔ فائرنگ رینج، کشمیر ۱۹۹۰۔ ص۔ ۱۱۰۔ ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی۔ ۲۰۱۹ء

[۲] فائرنگ رینج: کشمیر ۱۹۹۰ از ابوالکلام قاسمی، مشمولہ۔ فائرنگ رینج کشمیر ۱۹۹۰۔ ص ۷ ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی۔ ۲۰۱۹ء

پاس طاقت ہے آپ پنڈتوں کو روک سکتے تھے ان کی بستیوں میں پہرا دیتے۔فوجی آفیسر یہ جواب سن کر اپنے ماتحت سے کہتا ہے:۔

''انصاری! اس بھینٹ بکرے کو انٹروگیشن سنٹر بھیج دو۔ لکھ دو کہ اوگرو ادیوں کو چھوڑ کر آ رہا تھا ضبطی میں پستول دکھادو۔اقبال جرم پر دستخط لو۔ورنہ گولی سے اڑادو اور لاش کسی جوہڑ میں پھینک آؤ۔حرام زادہ ہمیں ہماری ڈیوٹی سکھا تا ہے۔''[1]

مندرجہ بالا اقتباس سے یہ سچ بھی سامنے آتا ہے کہ کس طرح فوج جھوٹے الزامات لگا کر کشمیری عوام پر ظلم و جبر کرتی جارہی ہے انہیں سچ سننے سے مطلب ہی نہیں۔ سچ بتانے والے کو وہ جھوٹے الزام میں پھنسا کر کس طرح تشدد کا نشانہ بناتے ہیں۔صرف اتنا ہی نہیں ایک اور اقتباس بھی ملاحظہ کیجئے کہ کس طرح منظور شاہ کے زخمی جسم پر کھارے پانی کا چھڑکاؤ کر کے اذیت پہنچائی جارہی ہے:۔

......کچھ دن گزر گئے کہ پوچھ تاچھ کے لئے نئی پارٹی آئی آدھی رات کو آواز آئی:۔

''شاہ کو گھسیٹ کر لے آؤ''

یہ سن کر میری جان نکل گئی۔دو چار جوانوں نے میرے گلے میں پٹہ ڈال کر مجھے گھسیٹنا شروع کیا۔کوٹھی میں میرے ساتھ بڑبڑانے لگے:''ان اللہ مع الصابرین''(بے شک اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے)

پھر کپڑے اتارے گئے۔ پہلے پرانے زخموں سے کھرنڈ اتارا گیا۔جب خون کی بوندیں رسنے لگیں تو زخموں پر کھارے پانی کا چھڑکاؤ کیا گیا۔ میں بلبلا اٹھا۔لنڈ کریاں کرنے لگا......ایسا درد،ایسی جھل جھلاہٹ،ایسی تیک،ایسی تپش،ایسا کرب کہ جس سے چھوٹنے کے لئے آدمی خوشی خوشی موت کو گلے لگانے پر راضی ہوجائے۔میں گڑ گڑا کر رونے لگا:۔

''ہاں میں دہشت گرد ہوں۔میرے پاس کلاشنکوف ہے بھگوان کے لئے

[1] شفق سوپوری۔فائرنگ رینج: کشمیر ۱۹۹۰۔ص ۔۲۷۔ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی، ۲۰۱۹ء

مجھے پھانسی پر چڑھا دیجئے۔ میرا انکاؤنٹر کیجئے''
مگر میری ساری گریہ وزاری پتھر نچوڑنے کا عمل ثابت ہوئی۔ چھ فٹ
لمبے تین فٹ چوڑے تختے پر اوندھے منہ لٹایا اور بڑی دیر تک میرے
تلوؤں کو پٹوں سے تڑاخ تڑاخ پیٹتے رہے۔''[1]

غرض شفق سوپوری کے ناول میں کشمیر میں ہونے والے ظلم و جبر کی واضح عکاسی ملتی ہے ہر واقع کو ناول نگار نے بڑی خوبصورتی سے پیش کرنے کی کوشش کی ہے ناول میں قاری کی دلچسپی قائم رہتی ہے ناول کے کردار بڑی فنی چابکدستی سے تراشے گئے ہیں مکالمہ نگاری اور منظر کشی کی بہترین مثالیں ناول میں ملتی ہیں ناول اپنی تمام فنی خوبیوں کے پیش نظر ایک کامیاب ناول ہے کی زبان صاف اور رواں ہے ناول انداز بیان کے اعتبار سے بھی ایک انفرادی شناخت رکھتا ہے کیوں کہ اس میں جس طرح کے کردار ہیں جس معاشرے یا جس طبقے سے یا پیشے سے ان کا تعلق ہے اسی کے اعتبار سے ان سے مکالمے بھی ادا کروائے گئے ہیں۔

شفق سوپوری عہد حاضر کے ایک معتبر فکشن نگار ہونے کے علاوہ وہ اچھے شاعر بھی ہیں شفق سوپوری فنون لطیفہ سے مکمل طور پر آشنائی رکھنے والے فنکار ہیں انھوں نے ناول، شاعری، تحقیق تنقید غرض کہ قریب قریب تمام مشہور اصناف ادب پر طبع آزمائی کی اور وہ اس میں کافی حد تک کامیاب بھی ہوئے ہیں اکیسویں صدی کے ادیبوں میں شفق کا جموں و کشمیر میں ایک بڑا نام ہے ابھی ان کے دیگر ادبی کارنامے بھی منظر عام پر آنے کی امید ہے ان کی تخلیقی بصیرت ان کے ناولوں سے واضح ہوتی ہے شفق سوپوری کی تخلیقی صلاحیتوں کو جتنا سراہا جائے اتنا کم ہے بہرحال ان کے ناول ریاست جموں و کشمیر میں اردو ناول کی تاریخ میں ایک اہم اضافہ ہیں۔

---

[1] شفق سوپوری۔ فائرنگ رینج۔ کشمیر ۱۹۹۰،ص۔۸۷۔ ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی۔ ۲۰۱۹ء

حاصل مطالعہ

اردو فکشن کی مقبول ترین اصناف میں ناول بھی شامل ہے ناول سے پہلے داستانوں کا رواج تھا۔ ۱۸۵۷ سے پہلے اردو ادب ایک دوسرے ہی ماحول سے دوچار تھا۔شاعروں اور ادیبوں کے سرپرست عام طور پر امیر اور رئیس لوگ ہوا کرتے تھے آرام پسندی اور عیش وعشرت معاشرے کا حصہ تھی چنانچہ ادب میں بھی اس طرح کے عناصر دکھائی دیتے ہیں لیکن جب یہاں انگریز حاکم ہوئے ظلم و جبر کا دور دورہ ہونے لگا۔اس کے جواب میں بغاوت کی آگ بھڑک اٹھی سارا شیرازہ بکھر گیا ہر شے میں انقلاب آ گیا۔ پورے ہندوستانی سماج میں تضاد اور انتشار پھیلتا گیا۔ایسٹ انڈیا کمپنی اپنے ظلم کے شکنجے کستی چلی گئی۔امتیازات بڑھتے گئے۔ دہلی اجڑ چکی تھی لکھنوی تہذیب انگریزوں کے پیروں تلے روندی جا چکی تھی۔ایسی حالات میں ادب کیسے بچ سکتا تھا وہ بھی لپیٹ میں آیا۔ادیب بھی پریشانی اور خستہ حالی کے بھنور میں پھنسے اور یہی خستہ حالی اور افسردگی ہمیں اس وقت کے ادب میں بھی نمایاں طور پر نظر آتی ہے کیوں کہ ادیب بھی اس سماج کا حصہ تھے وہ بھی ان حالات سے دوچار ہوئے اور اس طرح ان ادیبوں کے ادبی کارناموں میں بھی تبدیلیاں رونما ہوئیں سرسید تحریک شروع ہوئی اس تحریک سے وابستہ مصنفین نے جو ادب تخلیق کیا وہ ہمیں حقیقی تصویر دکھاتا ہے۔اس تحریک سے قبل اگرچہ فورٹ ولیم کالج، دلی کالج وغیرہ بھی اردو زبان وادب کے فروغ کے لئے کام کر چکے تھے۔ جہاں داستانیں لکھی گئیں اس کے علاوہ دیگر زبانوں کی کتابوں کا اردو میں ترجمہ بھی کیا گیا لیکن کوئی ایسی تخلیق منظر عام پر نہیں آئی جو حقیقت کی ترجمانی کرتی ہو۔سرسید بذات خود چونکہ تاریخ، آثار قدیمہ، سیاست، ادب، مذہب اور سائنس وغیرہ جیسے مضامین میں دلچسپی رکھتے تھے انہوں نے اپنی تمام تر مصروفیات کے باوجود تصنفی وتالیف کے لئے وقت نکالا۔لطف کی بات یہ ہے کہ انہوں نے جس موضوع کو بھی اپنے احاطۂ تحریر میں لیا نہ صرف اس کا حق ادا کر دیا بلکہ سرگرم اراکین کی ایک ایسی جماعت بھی دی جس نے ایک نئے طرز فکر اور دبستان کی بنیاد ڈالی۔سرسید تحریک سے وابستہ مصنفین میں محسن الملک، وقار الملک، چراغ علی، محمد حسین آزاد نذیر احمد، حالی اور شبلی وغیرہ شامل ہیں چنانچہ نذیر احمد کے ''مراۃ العروس'' (۱۸۶۹) سے اردو ناول کا آغاز ہوتا ہے اور پھر پنڈت رتن ناتھ سرشار، عبدالحلیم شرر، مرزا محمد ہادی رسوا، پریم چند، قرۃ العین حیدر وغیرہ نے اپنے ناول لکھ کر اس صنف کو پروان چڑھایا۔

ریاست جموں وکشمیر میں چونکہ اردو زبان ۱۸۸۸ میں سرکاری زبان قرار دی گئی اور اس کے بعد ہی اردو زبان میں تصنیف وتالیف کا سلسلہ شروع ہوا۔مہاراجہ پرتاپ سنگھ نے ایک ''سناتن دھرم سبھا'' قائم کی جس میں سالک رام سالک نے کتابچے لکھے۔جن میں لغت اردو، محاورات اردو، داستان جگت روپ وغیرہ شامل ہیں سالک رام سالک کے بھائی ہرگوپال کول خستہ جو ہجرت کر کے چلے گئے تھے۔ان کی کتاب ''گلدستہ کشمیر'' منظر عام پر آئی اس کے علاوہ بھی کچھ لوگوں نے تصنیف وتالیف کا کام کیا۔ڈوگرہ عہد میں چونکہ حکومت کی طرف سے پریس قائم کرنے اور اخبار ورسائل جاری کرنے پر پابندی تھی تو اہل کشمیر بیرون کشمیر کے دوسرے شہروں سے اردو اخبارات ورسائل جاری کرتے تھے جن میں اخبار خیر خواہ کشمیر، کشمیری گزٹ، کشمیری مخزن، صبح کشمیر بہار کشمیر وغیرہ اہم ہیں جن میں کشمیر کے مصنفین اپنے مضامین چھپواتے تھے۔آزادی سے پہلے کے شعرا وادبا میں سالک رام سالک، محمد دین فوق، شہ زور کاشمیری، پروفیسر نندکول طالب، پریم ناتھ پردیسی، غلام رسول نازکی وغیرہ کے نام قابل ذکر ہیں جنہوں نے ریاست جموں وکشمیر میں آزادی سے قبل اردو زبان وادب کی ترقی کے لئے کام کیا ریاست جموں وکشمیر میں اردو ناول کی روایت زیادہ پرانی نہیں ہے۔اگرچہ آزادی سے پہلے بھی یہاں ناول نگاری کے ابتدائی نقوش کا ذکر کتابوں میں مل جاتا ہے۔جن میں سالک رام سالک کے ''داستان جگت روپ'' اور ''تحفہ سالک'' کو ابتدائی ناول قرار دیا گیا ہے لیکن فسادات کے چلتے ۱۹۴۷ سے قبل کی تصانیف زیادہ تر تلف ہوچکی ہیں آزادی سے قبل کا کوئی بھی ناول میری تحقیق کے مطابق دستیاب نہیں ہے دستیاب شدہ ناولوں کے اعتبار سے ۱۹۴۷ کے بعد لکھے جانے والے ناولوں میں رامانند ساگر کا ناول ''اور انسان مرگیا'' ریاست جموں وکشمیر کا پہلا ناول ہے اس ناول سے ہی ریاست میں اردو ناول نگاری کا باقاعدہ آغاز ہوتا ہے اور ان کے بعد ٹھاکر پونچھی، حامدی کاشمیری، علی محمد لون، غلام رسول سنتوش وغیرہ نے اس روایت کو آگے بڑھایا اور اس کی ترقی کے لئے کام کیا۔

۱۹۴۷ سے ۱۹۷۰ تک کے ناولوں میں اور انسان مرگیا، قفس اداس ہے، چاندنی کے سائے، پیاسے بادل، شمع ہر رنگ میں جلتی ہے، شاید ہے تیری آرزو، سمندر پیاسا ہے، بہاروں میں شعلے، اجنبی راستے، بلندیوں کے خواب اور ایک ناؤ کاغذ کی اہم ہیں ان ناولوں میں زیادہ تر ناول فسادات کے موضوع پر ہیں کشمیر کے ناول نگار چونکہ کشمیر میں ہونے والے ظلم وجبر کو خود دیکھ اور جھیل رہے تھے اس لئے انہوں نے اپنے ناولوں

کے ذریعے کشمیر میں ہونے والے فسادات اور ظلم و جبر کی حقیقی تصویر پیش کی ہے۔ ان ناولوں میں ریاست کی بدلی ہوئی سیاسی، سماجی اور تہذیبی زندگی کی خوبصورت اور حیرت انگریز آئینہ داری کی گئی ہے اس کے علاوہ معاشرے کے کرب و انبساط اور دکھ سکھ کو بھی پیش کیا۔ رامانند ساگر نے فسادات کو موضوع بنا کر پہلی مرتبہ ایک ایسا ناول لکھا جس میں لاہور کے اندر ہونے والی قتل و غارت، ہندوؤں مسلمانوں کے درمیان ہونے والے تضادات، فتنے فسادات وغیرہ کی بڑی سچی تصویر کشی ملتی ہے ٹھاکر پونچھی نے مختلف موضوعات کو اپنے ناولوں کا موضوع بنایا ان کے ناولوں میں رومان بھی ہے اور ترقی پسندی بھی ہے اگر چہ یہ ترقی پسند تحریک کے انحطاط کا زمانہ تھا لیکن کشمیر میں اس عہد میں بھی ترقی پسندی کے اثرات نظر آتے ہیں ان کے خاص موضوعات میں سیاسی، سماجی اور مذہبی استحصال اور دیہاتی زندگی کے مسائل ہیں فنی اعتبار سے بھی ٹھاکر پونچھی کے ناول کافی کامیاب ہیں خاص طور پر جس طرح قدرتی حسن کی انہوں نے منظر کشی کی ہے وہ جاذب نظر ہے اور واقعات کو ایسے ترتیب دیا ہے کہ قاری کی دلچسپی برقرار رہتی ہے غرض ان کے ناولوں میں جو قدرتی حسن کا پس منظر ہے وہ کشمیر کے قدرتی مناظر کا عکس ہے حامدی کاشمیری کے ناولوں میں بہاروں میں شعلے، اجنبی راستے، بلندیوں کے خواب وغیرہ بہت اہم ہیں ان ناولوں میں حامدی نے محبت کی ناکامی اور اس کے منفی اثرات، بچپن کی شادی جیسی برائی اور کشمیر کے دلکش اور خوبصورت مقامات کے ساتھ وہاں کی دیہاتی زندگی کے مسائل کو اپنے ناولوں میں پیش کیا ہے۔ حامدی کے ناولوں کی پلاٹ نگاری میں جغرافیائی حقیقت اور مقامی رنگ کی عکاسی ملتی ہے حامدی نے ناولوں کے پلاٹ کی تشکیل میں وادی کشمیر کا سہارا لیا ہے انہوں نے جموں و کشمیر کے خوبصورت مقامات جھیلوں اور دریاؤں وغیرہ کے صحیح نام اور سچی تصویریں پیش کی ہیں ان کے ناولوں میں کشمیر کے خوبصورت مقامات، برفیلے پہاڑ کھلتے پھول، ندیاں، جھرنے، سرسبز میدان اور خوبصورت جنگلوں کے علاوہ کشمیر کی سیاسی، سماجی اور تہذیبی جھلکیاں بھی واضح نظر آتی ہیں۔

علی محمد لون کے ناولوں کا موضوع کافی اہمیت کا حامل ہے سماج میں ذات پات، دین دھرم، رنگ و نسل اور غریب اور امیر کی بنیادوں پر انسانوں کو تقسیم کیا جاتا ہے اس فرق سے انسانوں کے دل میں محبت ہمدردی، خلوص اور انسان دوستی کا جذبہ بالکل ختم ہو گیا ہے یہ ناول کا پس منظر ہے علی محمد لون کا ناول موضوع اور فن دونوں اعتبار سے ایک کامیاب ناول ہے۔ غلام رسول سنتوش نے اپنے ناول کے ذریعے انسان کے باطن میں موجود

ہوسنا کی اور زہرنا کی کو ابھارا ہے انسان کے باطنی امراض یعنی خودغرضی، بوالہوسی اور لذت پرستی وغیرہ کو بڑی خوبصورتی سے پیش کر دیا ہے۔ وجے سوری کے ناول میں ''ایک ناؤ کاغذ کی'' محبت کی ناکامی اور محبت میں کامیاب ہونے کے لئے جو تکلیفیں برداشت کرنی پڑتی ہیں ان کو موضوع بنایا ہے ناول اپنے فن کے اعتبار سے بھی کامیاب ہے ناول کا پلاٹ صاف اور سپاٹ ہے کہیں کوئی جھول نہیں ملتا۔ مکالمہ نگاری، منظر کشی اور کردار نگاری میں بھی ناول نگار نے اپنی فنی مہارت کا ثبوت دیا ہے۔

ریاست جموں وکشمیر میں ۱۹۷۱ سے ۲۰۰۰ تک جو ناول لکھے گئے ان کے موضوعات کچھ نئے ہیں اس عہد کے ناول نگاروں میں جان محمد آزاد، عبدالغنی شیخ، شبنم قیوم، نور شاہ، زینت فردوس، عمر مجید، جیوتیشور پتھک اور فاروق ریز وشامل ہیں جان محمد آزاد نے اپنے ناول ''وادیاں بلا رہی ہیں'' میں کشمیر کے ایک پہاڑی علاقے ''کاغان'' کے پس منظر میں کشمیر کی سماجی زندگی کے تضاد اور شکست اور محرومی کو موضوع بنایا ہے ناول میں سماج کے مختلف طبقوں کے درمیان تصادم، کوہستانی علاقہ کے لوگوں کی سادگی خلوص، خوابوں اور آرزؤں کی کہانی کو پیش کیا گیا ہے ''کشمیر جاگ اٹھا'' میں بھی ناول نگار نے کشمیر کے ایک دورافتادہ گاؤں کے پس پردہ وادی کے دیہاتوں میں رہنے والے لوگوں کی ڈوگرہ عہد کی درد بھری زندگی کی تصویر کشی کی ہے۔ ناول میں جہاں ایک طرف کشمیر کے خوبصورت پہاڑوں کی تصویر کشی ملتی ہے وہاں دوسری طرف وہاں کے سیاسی، سماجی اور معاشی آشوب کو بھی دکھایا گیا ہے ''ظلمات کے مسافر'' میں ظلم کی داستان ملتی ہے ''برفیلے لمحوں کا جنگل'' بھی اپنے موضوع اور فن دونوں اعتبار سے کامیاب ناول ہے عبدالغنی شیخ کا ناول ''وہ زمانہ'' لداخ کے پس منظر میں لکھا گیا ہے اس ناول میں لداخ کے رسم ورواج، رہن سہن، تہواروں اور میلوں کا ذکر ملتا ہے ناول نیم تاریخی ناول ہے ''دل ہی تو ہے'' لیہہ کے پس منظر میں لکھا گیا ایک رومانی ناول ہے عبدالغنی شیخ خطۂ لداخ سے اردو ادب میں بالخصوص ناول نگاری میں ایک بڑا نام ہے ان کے ناولوں کے پلاٹ مربوط ہیں کہانی میں ربط ہے کہیں کوئی جھول نہیں ملتا۔ اپنے موضوع اور فن دونوں کے اعتبار سے عبدالغنی شیخ کے ناول کامیاب ہیں۔

شبنم قیوم کی حیثیت ایک ادیب، ناول نگار اور صحافی کی ہے ان کے ناولوں میں ''زندگی اور موت'' ''چراغ کا اندھیرا'' اور ''یہ کس کا لہو ہے کون مرا'' کافی اہمیت کے حامل ہیں۔ ان کے ناول کشمیر کی سماجی، سیاسی، معاشی اور دیہاتی زندگی کے حقائق سے متعلق ہیں ان میں کشمیری عوام کے دلوں کی دھڑکنوں کو بڑی

خوبصورتی سے پیش کیا گیا ہے شبنم قیوم کے ناول اگر چہ فن کے اعتبار سے ذرا کمزور نظر آتے ہیں لیکن موضوع
کے اعتبار سے یہ ناول کافی اہم ہیں۔ان ناولوں میں سماجی، سیاسی اور معاشی مسائل کی مکمل تصویر کشی کی گئی ہے
نورشاہ کے ناولوں میں جنسی ونفسیاتی خواہشات کے ساتھ ساتھ کشمیر کی نیم تاریخ کو بھی علامتوں اور اشاروں
کے تحت بیان کیا گیا ہے۔عشق ومحبت کے قصے، احباب کے بچھڑنے کا غم اور کشمیر کی عوام پر ہوئے ظلم وستم وغیرہ
جیسے واقعات کا بیان ناول نگار نے بڑی خوبصورتی سے کیا ہے۔زینت فردوس کا ناول انسانیت اور اتحاد کے
اقدار کا اظہار ہے۔انسان دوستی، تفریق کا خاتمہ، دوستی، محبت، اخوت، بھائی چارہ آپسی میل جھول اور ایک
دوسرے کو برداشت کرنے کی قوت کی بہترین مثالیں ناول میں ملتی ہیں زینت فردوس کا ناول اپنے موضوع
اسلوب اور بہترین مکالموں کی وجہ سے ایک کامیاب ناول ہے عمر مجید کے ناول ''یہ بستی یہ لوگ'' میں گاؤں کی
زندگی کے مسائل ہیں جیوتیشور پتھک کے ناول ''ہجوم'' میں نئی نسل کے مسائل کا جرات مندانہ تجزیہ پیش کیا گیا
ہے ناول میں سیاست دانوں کا نئی نسل کے ساتھ استحصال کو موضوع بنایا ہے۔''میلی عورت'' سماجی قدروں کی
پامالی پر مبنی ہے آج کا انسان اپنی غرض اور اپنے مقاصد کے لئے اپنی عورتوں کی عزت کی بھی پرواہ نہیں کرتا اس
سب کو ناول اپنے احاطہ میں لئے ہوئے ہے'' کھڑکیاں'' میں یہ دکھانے کی کوشش کی گئی ہے کہ سیاست دیوالیہ
پن کا ذریعہ بن چکی ہے اور نئی نسل کو بھی سیاست کے دلدل میں پھنسا کر کس طرح ان کے مستقبل کو تباہ کرنے کی
کوشش کی جارہی ہے ناول نگار نے نئے موضوعات کو ناولوں میں پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔فاروق رینزو
کے ناول ''زخموں کی سالگرہ'' میں معاشرے کی برائیوں اور بدعنوانیوں کو حذف تنقید بنایا ہے تعلیمی اداروں میں
سیاسی لوگوں کی مداخلت سے افراتفری کا موحول بنتا ہے ساتھ ہی ساتھ ناول میں رومان کی جولانیاں بھی دیکھی
جاسکتی ہیں۔''انقلاب کا شہید'' اور ''کشمیر جھیل جلتی ہے'' ان کے ناولوں میں بڑی اہمیت کے حامل ہیں ''کشمیر
جھیل جلتی ہے'' میں کشمیر میں پروان چڑھ رہی بدعنوانیوں، لاقانونیت اور بدحالی کی تصویر دکھانے کی کوشش کی
گئی ہے کہ سیاست دیوالیہ پن کا ذریعہ بن چکی ہے اور نئی نسل کو بھی سیاست کے دلدل میں پھنسا کر کس طرح
ان کے مستقبل کو تباہ کرنے کی کوشش کی جارہی ہے ناول نگار نے نئے موضوعات کو ناولوں میں پیش کرنے کی
کوشش کی ہے۔فاروق رینزو کے ناول ''زخموں کی سالگرہ'' میں معاشرے کی برائیوں اور بدعنوانیوں کو حذف
تنقید بنایا ہے تعلیمی اداروں میں سیاسی لوگوں کی مداخلت سے افراتفری کا ماحول بنتا ہے ساتھ ہی ساتھ ناول

میں رومان کی جولانیاں بھی دیکھی جاسکتی ہیں۔ ''انقلاب کا شہید'' اور ''کشمیر جھیل جلتی ہے'' ان کے ناولوں میں بڑی اہمیت کے حامل ہیں ''کشمیر جھیل جلتی ہے'' میں کشمیر میں پروان چڑھ رہی بدعنوانیوں، لاقانونیت اور بدحالی کی تصویر دکھانے کی کوشش کی گئی ہے غرض ۱۹۷۰ سے ۲۰۰۰ تک کے ناولوں کے بے شمار موضوعات ہیں ان کے موضوعات کا دائرہ صرف کشمیر کی خوبصورتی اور وہاں ہو رہے ظلم و جبر کی تصویر ہی نہیں بلکہ ان میں وہ تمام چیزیں ملتی ہیں سماجی قدروں کی پامالی، بچپن کی شادی، محبت کی ناکامی، غریب بچوں کی تعلیم وغیرہ جیسے موضوعات کو اس عہد کے ناول نگاروں نے بڑی فنی چابکدستی سے اپنے ناولوں میں پیش کیا ہے اگر فن کے حوالے سے دیکھا جائے تو جان محمد آزاد، زینت فردوس، نور شاہ اور عمر مجید کے ناول بہت اہمیت کے حامل ہیں ناول پلاٹ، اسلوب، کردار نگاری منظر کشی اور مکالمہ نگاری کے اعتبار سے بہترین ناول ہیں۔

ریاست جموں وکشمیر میں ۲۰۰۰ سے حال تک کے ناول نگاروں میں آنند لہر، ترنم ریاض، عبدالرشید راہگیر، شبنم قیوم، وحشی سعید نعیمہ احمد مہجور اور شفق سوپوری کے نام قابل ذکر ہیں۔ آنند لہر کا تعلق خطہ جموں سے ہے ان کے چار ناول ہیں ان کے ناول ''اگلی عید سے پہلے''، ''سرحدوں کے بیچ''، ''مجھ سے کہا ہوتا'' اور ''یہی سچ ہے'' ہیں ''اگلی عید سے پہلے'' ناول میں سرزمین کشمیر کی ایک درد بھری داستان ہے یہ داستان ہندوستان کی آزادی سے شروع ہو کر آج تک پہنچتی ہے ''سرحدوں کے بیچ'' ناول میں سرحد کے قریب رہنے والے لوگوں کی زندگی کو پیش کیا ہے ''مجھ سے کہا ہوتا'' ناول کا موضوع عراقی تباہی کے پس منظر میں انسانی رشتوں کا زوال ہے جو کسی واحد ملک کا المیہ نہیں بلکہ امریکہ اور عراق کے پس پردہ مختلف ممالک بالخصوص ہند و پاک کی آپسی رنجش اور نسلی امتیازات کا شاخسانہ ہے ''یہی سچ ہے'' ناول میں زندگی کے حقائق کی فلسفیانہ انداز میں مختلف کرداروں اور واقعات کے ارتباط سے بڑے ہی موثر انداز میں پیش کرنے کی سعی کی گئی ہے۔ ان کے ناولوں میں محسوسات، تجربات، مشاہدات، نفسیات اور احساسات کے ساتھ ساتھ گہرے معاشرتی شعور کا احساس بھی ملتا ہے انہوں نے اپنے ناولوں میں سیاسی، سماجی اور تاریخی موضوعات کو فنی چابکدستی سے پیش کیا ہے۔

ترنم ریاض عصر حاضر کی خواتین قلمکاروں میں ایک بڑا نام ہے ان کے دو ناول ''مورتی'' اور ''برف آشنا پرندے'' بڑی شہرت کے حامل ہیں ترنم ریاض کا ناول ''مورتی'' ازدواجی زندگی کی ناکامی اور اس ناکامی کے اسباب پر مبنی ہے ناول میں مصنفہ نے ملیحہ کی زندگی کے نشیب و فراز کے ذریعہ کشمیر کی پرانی و نئی تہذیب و

ثقافت رسم ورواج، روایات وکلچر، وہاں کے قدیم عجائب گھروں اوراہم مقامات کی مکمل تصویر کشی کی ہے۔ملیحہ ایک مجسمہ سازلڑکی ہے جواپنے جذبات واحساسات کو بڑی آسانی سے خوبصورتی کے ساتھ مجسمے کی شکل میں ڈھالنے کا گر جانتی ہے لیکن اس کی زندگی میں ایک موڑتب آتا ہے جب وہ ازدواجی زندگی سے منسلک ہوتی ہے اوراس کا شوہراس کے فن کی قدر کرنے کے بجائے اس کے خوبصورت مجسموں کواٹھا کر پھینک دیتا ہے ملیحہ اسے دیکھ کرٹوٹ جاتی ہے اوراس طرح ایک فن کار کے فن کی ناقدری کے سبب وہ اپنا فن کھوبیٹھتی ہے۔ناول کا موضوع کافی دلچسپ ہے پلاٹ مربوط ہے غرض ناول فنی اورموضوعاتی دونوں اعتبار سے کامیاب ناول ہے ''برف آشنا پرندے'' ناول میں ایک مسلم کشمیری خاندان کے تہذیبی زوال کی خوبصورت اورمعنی خیز داستان ہے یہ ناول جہاں ہندوستان اور پاکستان کے سیاستدانوں کوکشمیر کے حالات کی طرف متوجہ اورنتیجہ خیز حکمت عملی کی طرف رجوع کرنے کی دعوت دیتا ہے وہیں کشمیریوں کوخواب غفلت سے بیدار بھی کرتا ہے کہ وہ اپنی سرزمین کے ثقافتی سرمایہ اورمعاشرتی امتیازات کوتاریخی حوالے سے پہچانیں اوراپنی کوتاہیوں سے سبق حاصل کریں یہ ناول ایک اہم تاریخی دستاویز بھی ہے ناول تمام تر خوبیوں کے اعتبار سے اردوادب میں ایک اہم اضافہ ہے خواتین ناول نگاروں میں ترنم ریاض ریاست جموں وکشمیر کی دوسری ناول نگاروں سے سبقت لے جاتی ہیں ان کے ناولوں موضوع اورفن دونوں اعتبار سے اہم ہیں۔

عبدالرشید راہگیر کا ناول ''احساس'' لداخ کے پس منظر میں لکھا گیا ہے ناول نگار نے لداخ کے رسم و رواج، تہذیب ومعاشرت اور وہاں کے تمدن کے تحفظ اوراسے نئی نسل میں منتقل کرنے کی کوشش کی ہے ناول نگار نے یہ بھی کوشش کی ہے کہ لداخ میں اردوزبان وادب کوکیسے فروغ دیا جائے اورنوجوان نسل کی توجہ تعلیم کی جانب مبذول کی ہے۔ناول کا پلاٹ مربوط ہے ناول اپنی مختلف خوبیوں کی بنا پرایک اہم ناول ہے شبنم قیوم کا ناولٹ ''پچھتاوا'' بھی ایک اہم ناول ہے اس ناول کا موضوع آج کے ترقی یافتہ سائنسی وتکنیکی دور میں اخلاقی قدروں کے زوال سے تعلق رکھتا ہے۔کشمیر کے نامساعد حالات کے چلتے ترقی یافتہ سائنسی دوراور موجودہ زمانے کی نئی نئی ایجادات کا گہرائی سے مشاہدہ کرنے کے بعداس کے مضراثرات کا اعادہ کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ناولٹ میں کرداروں کا انتخاب بڑی فنی چابکدستی سے کیا گیا ہے مکالمہ نگاری منظرکشی میں بھی ناول نگار نے بڑی عرق ریزی سے کام لیا ہے۔نعیمہ احمدمہجور ایک صحافی بھی ہیں اورناول نگار بھی۔ان کا ایک ہی

ناول ہے''دہشت زادی''۔اس ناول میں مصنفہ نے اپنی زندگی میں رونما ہونے والے حالات و واقعات کو کشمیری خواتین کے تناظر میں بیان کیا ہے اس ناول میں صرف ناول نگار کی زندگی نہیں بلکہ پورے معاشرے کی عورتوں کی زندگی کی مکمل ترجمانی ملتی ہے وحشی سعید کے ناولوں میں''پتھر پتھر آئینہ'' ہے ناول موضوع کے اعتبار سے نفسیاتی اور رومانی ناول ہے ناول نگار نے انسانی قدروں کے عروج وزوال کی ایک ایسی تاریخ لکھ ڈالی کہ اسے پڑھ کر قاری میں ترقی کا جذبہ بھی پیدا ہوتا ہے اور دلوں میں محبت ایثار اور قربانی کا جذبہ پیدا ہوتا ہے ناول اپنے موضوع اور فن دونوں اعتبار سے ایک کامیاب ناول ہے۔

شفق سوپوری کا تعلق کشمیر سے ہے ان کے ناول''نیلیما''اور''فائرنگ رینج: کشمیر ۱۹۹۰''ہیں۔''نیلیما'' میں آدی واسی سماج کی عورتوں کی نفسیاتی کیفیت اور اس طبقے کے لوگوں کی بنیادی کمزوریوں کا مشاہدہ کر کے ناول میں پیش کیا گیا ہے نیلیما جو آدمی وادی سماج کی ایک لڑکی ہے اس کے ذریعے آدی واسی سماج کی عورتوں کے ساتھ ہونے والے ظلم و جبر کو پیش کیا گیا ہے ناول نگار نے یہ دکھانے کی کوشش کی ہے کہ آدی واسی مرد جنسی معاملات میں پاک رشتوں کا کوئی خیال نہیں رکھتے ہر کسی کو اپنی ہوس کا نشانہ بنا کر ظلم و جبر کرتے ہیں یہ ناول اپنے موضوع اور فن دونوں اعتبار سے ایک کامیاب ناول ہے۔''فائرنگ رینج: کشمیر ۱۹۹۰''میں کشمیری عوام پر فوج کے ظلم و جبر کی داستان کو پیش کیا گیا ہے شفق سوپوری نے اس ناول میں یہ دکھانے کی کوشش کی ہے کہ کس طرح فوج کشمیری عوام پر جھوٹے الزامات لگا کر ظلم و جبر کرتی جاتی ہے عوام کو جھوٹا ثابت کر کے ان کو تشدد کا نشانہ بنایا جاتا ہے ناول نگار نے بڑی بے باکی سے اس حقیقت کو ناول کے روپ میں پیش کیا ہے۔شفق سوپوری کے دونوں ناول موضوع اور فن کے اعتبار سے کامیاب ناول ہیں۔

ریاست جموں و کشمیر میں لکھے جانے والے ناولوں کے مطالعے سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ یہاں کے ناول نگاروں نے خارجی زندگی کے ساتھ داخلی زندگی کو بھی پیش کیا ہے ان کے ناولوں میں عصری میلانات اور اپنے عہد کے مسائل کی عکاسی ملتی ہے تخیل وتصور کی دلکشی ورنگینی اور اسلوبی کمالات سے زیادہ یہاں کے ناولوں میں عصری بصیرت، سیاسی حالات کا شعور اور سماجی معنویت نظر آتی ہے۔موضوع کے علاوہ یہاں کے ناول نگاروں نے تکنیک کے نت نئے نئے تجربے کئے جیسے شعور کی رو، خود کلامی، خطوط اور ڈائری کی تکنیک وغیرہ۔ پلاٹ بھی اکثر ناولوں کے مربوط ملتے ہیں کردار نگاری اور مکالمہ نگاری کے لحاظ سے بھی یہ ناول کامیاب نظر

آتے ہیں منظر کشی میں تو فنی چابکدستی سے کام لیا ہے قریب قریب ہر ناول میں منظر کشی کی ایسی دلکش اور دلچسپ مثالیں ملتی ہیں کہ قاری وادی سے کوسوں دور بیٹھ کر بھی کشمیر کی خوبصورتی اور وہاں ہو رہے ظلم و جبر کو محسوس کر سکتا ہے۔

ریاست جموں وکشمیر کے ناول نگاروں نے تقریباً ہر عہد میں وقت کے تقاضے کے مطابق ان مسائل کو ناول کے قالب میں ڈھالا ہے یہاں کے ناول نگاروں نے روایت پرستی سے انحراف کرتے ہوئے دوسروں کی اندھا دھند تقلید کرنے کے بجائے اپنے ناولوں کے لئے نئے موضوعات اور اسالیب اختیار کئے ہیں۔ان ناول نگاروں نے محض عصری سیاست یا سماجی مسائل کو ہی موضوع نہیں بنایا بلکہ اس روح کے درد کو بھی گرفت میں لانے کی کوشش کی ہے جو آج کے انسان کی تقدیر ہے غرض ریاست جموں وکشمیر میں اگر چہ اردو ناول کی روایت زیادہ پرانی نہیں ہے اور یہاں گنتی کے ہی کچھ ناول ملتے ہیں لیکن یہاں لکھے گئے ناول موضوع اور فن دونوں اعتبار سے کامیاب ناول ہیں اب یہاں ناول کے معیار و مزاج اور رفتار میں جو تبدیلی اور تیزی آئی ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ریاست جموں وکشمیر بھی اردو ناول کے ارتقا کے سلسلے میں دہلی، لکھنؤ، حیدر آباد وغیرہ کے پیش پیش ہے۔

خلاصہ

باب اول:۔ ''اردو ناول کا سیاسی وسماجی پس منظر'' کے عنوان سے قائم کیا گیا ہے۔ ۱۸۵۷ء کی بغاوت ایک ایسا ہنگامہ ہے جس نے ہندوستان کے ہر شعبہ پر اثر ڈالا چاہے وہ سیاسی ہو یا سماجی ثقافتی ہو یا ادبی ہر زاویہ نظر سے بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ اس لڑائی کے پیچھے اسباب وعلل کا پورا ایک سلسلہ تھا لیکن یہاں صرف ادب سے متعلق بحث کی گئی ہے کوئی بھی ادب اپنے سماج سے متاثر ہوئے بغیر ایک قدم بھی آگے نہیں بڑھ سکتا۔ ہر دور کا ادب اس وقت کے سیاسی وسماجی اتار چڑھاؤ سے کسی نہ کسی نوعیت میں منسلک رہتا ہے۔ پھر یہ ہنگامہ جو مختلف تبدیلیوں کا باعث بنا جس کے اثرات سے ہندوستان ایک انقلابی موڑ سے دو چار ہوا۔ جہاں سماجی وسیاسی تبدیلیاں رونما ہوئیں وہاں ادبی اعتبار سے بھی یہ غدر بہت متاثر کن ثابت ہوا۔ غدر سے پہلے اردو ادب ایک دوسرے ہی ماحول سے دوچار تھا۔ شاعروں اور ادیبوں کے سر پرست عام طور پر امیر اور رئیس لوگ ہوا کرتے تھے۔ سماج میں نرمی، شیرینی اور آسودگی تھی۔ آرام پسندی اور عیش وعشرت معاشرے کا حصہ تھا۔ جاگیردارانہ، سرمایہ دارانہ نظام کے اثرات غالب تھے۔ چنانچہ ادب میں بھی کچھ اس طرح کے عناصر اور اثرات دکھائی دیتے ہیں۔ پھر جب یہاں انگریز حاکم ہوئے رفتہ رفتہ ظلم وجبر کا دور دورہ ہونے لگا۔ اس کے جواب میں بغاوت کی آگ بھڑک اٹھی سارا شیرازہ بکھر گیا۔ ہر شے میں انقلاب آ گیا۔ پورے ہندوستانی سماج میں یہ تضاد اور انتشار پھیلتا گیا۔ ایسٹ انڈیا کمپنی اپنے ظلم کے شکنجے کستی چلی گئی۔ امتیازات بڑھتے گئے۔ دہلی اجڑ چکی تھی لکھنوی تہذیب انگریزوں کے پیروں تلے روندی جا چکی تھی۔ ایسے حالات میں ادب کیسے بچ سکتا تھا لہٰذا وہ بھی لپیٹ میں آیا۔ ادیب بھی پریشانی اور خستہ حالی کے بھنور میں پھنسے اور یہی خستہ حالی، افسردگی ہمیں اس وقت کے ادب میں نمایاں طور پر نظر آتی ہے کیوں کہ ادیب بھی اس سماج کا حصہ تھے وہ بھی ان حالات سے دوچار ہوئے چنانچہ اس عہد کے ادب میں نمایاں تبدیلیاں رونما

ہوئیں۔

مرزا غالب اس دور کے ادبی اور تمدنی روایات کے بہترین پیکر سمجھے جاتے ہیں۔ جو بعض مقامات میں انگریزی پالیسی کے معترف بھی تھے لیکن بغاوت نے انہیں بھی متاثر کیا۔ ان کی شاعری اور خطوط میں اس کے اثرات واضح طور پر دیکھے جاسکتے ہیں۔ خطوط غالب، داستان غدر از ظہیر دہلوی، تاریخ سرکشی بجنور اور اسباب بغاوت ہند از سرسید، تاریخ ہند از ذکا اللہ فغاں دہلوی، واجد علی شاہ، منیر شکوہ آبادی، بہادر شاہ ظفر، شیفتہ وغیرہ کی نظمیں جو دوران بغاوت لکھی گئی تھیں کافی اہم ہیں۔

یہ حقیقت ہے کہ بغاوت اچانک اٹھی اور دب گئی۔ ہنگامے ہوئے اور سرد پڑ گئے لیکن بغاوت کے بعد جو ہندوستانی عوام کا ذہن جاگا، دل میں بیداری آئی، اپنے آپ کو پہچاننے کی سمجھ آئی اور جب ان سب کے باوجود انگریزوں کے ظلم و زیادتی میں کسی طرح کی کمی نہیں آئی تو ساری بیداریاں متحد ہوگئیں اور اپنے آپ کو ایک سنجیدہ اور روشن راہ پر گامزن کر دیا، ذہن جاگا، فکر نے کروٹ لی خیالات روشن ہوئے اور ان سب کے نتائج غدر کے بعد آہستہ آہستہ نمایاں طور پر نظر آنے لگتے ہیں۔ ادب میں بھی اس طرح کی تبدیلیاں رونما ہوئیں ہنگامے سے ذرا پہلے اور ہنگامے کے وقت جو افسردگی، بے بسی، تاریکی اور ویرانی ادب میں ملتی ہے بغاوت کے بعد اس میں بھی تبدیلی آنے لگتی ہے۔ ۱۸۵۷ء کے بعد اردو ادب میں ایک نئی فکر، ایک نئے جوش ایک نئی تبدیلی، ایک نئی تحریر کا آغاز ہونے لگا۔ ادیبوں اور دانشوروں نے بھی سوچا کہ نئے خیالات سے ادب کو کافی فائدہ مل سکتا ہے۔ لہٰذا وہ مستقبل کی شمع روشن کرنے میں لگ گئے اور ادب میں رفتہ رفتہ ایک خاموش انقلاب کی شکل نظر آنے لگی مثنویوں کا دور ختم ہوا کیوں کہ اس کے مزاج کی فضا اب باقی نہ رہی۔ دربار اجڑ گئے تو قصیدے کا زوال آ گیا۔ نیا دور آیا تو مشغولیات بڑھیں۔ داستانیں مٹنے لگیں۔ فرد کے بجائے اب پورے سماج سے تعلق ہونے لگا۔ ادیب سنبھلے اور اپنے قلم کو فضولیات سے ہٹا کر زندگی کی حقیقتوں کی طرف موڑ دیا نیا دور اپنے ساتھ سائنس لایا۔ مغربی رجحانات لایا۔ بس ایسے ہی ماحول میں اردو ادب کے چند علم بردار سامنے آئے جنہوں نے فرسودہ ادب میں نئے خیالات، نئے احساسات اپنے قلم کے ذریعے دیے۔ غرض کہ اس بغاوت سے اردو ادب میں بے شمار تبدیلیاں رونما ہوئیں۔

علی گڑھ تحریک کے ذریعے اردو نثر کی ترقی کے لئے جو کام کیا گیا ہے وہ نا قابل فراموش ہے اردو نثر سرسید احمد خاں کی کاوشوں کی بدولت نہ صرف متاثر ہوئی بلکہ پروان بھی چڑھی اور آخر انیسویں صدی کی ہر ادبی تخلیق پر ان کے افکار و خیالات اور نثری نگارشات کا اثر نظر آتا ہے۔ نہ صرف اردو بلکہ مستقبل کی زبان کے لئے بھی نئی سمت مقرر کی۔

سرسید جو بنیادی طور پر مصلح تھے۔ انہیں جب اپنی آراء اور افکار کے اظہار کے لئے اردو کا دامن تنگ نظر آیا تو انھوں نے خود اپنا ایک جہانِ زبان وادب تعمیر کر ڈالا۔ انھوں نے ارادی طور پر ایسے مضامین لکھے جن میں دلائل وشواہد کی ایک خاص منطقی ترتیب ہوتی ہے ان کی نثر تضاد سے پاک ہے عموماً عبارت آرائی، انشا پردازی اور روایتی محاسن نگارش کو اہمیت نہیں دیتے بلکہ اپنے مقصد کو صراحت اور سلاست سے بیان کرنا ضروری سمجھتے ہیں۔ سرسید نے اپنی تمام تر مصروفیات کے باوجود تصنیف وتالیف کے لئے وقت نکالا تاریخ، آثار قدیمہ، سیاست، صحافت، ادب، مذہب اور سائنس وغیرہ سے ان کی دلچسپی نے ان سے ہر طرح کے موضوعات ومضامین پر خامہ فرسائی کے مواقع فراہم کرائے۔ انھوں نے جس موضوع ومضمون کو بھی اپنے احاطۂ تحریر میں لیا، نہ صرف یہ کہ اس کا حق ادا کر دیا بلکہ سرگرم کارکنوں کی ایک جماعت بھی تیار کر دی جنہوں نے ایک نئے طرز فکر اور دبستان کی بنیاد ڈالی۔ انسٹی ٹیوٹ گزٹ اور تہذیب الاخلاق میں ان کے بے شمار مضامین شائع ہوئے یہ مضامین دو قسم کے تھے، علمی مضامین اور انشائیے۔ سرسید نے اپنے رسالوں اور تحریروں کے ذریعے اردو کے دوسرے ادیبوں کی توجہ ایسے ادب کی طرف مبذول کی جو تعمیری، اخلاقی اور افادی ہوں اور ان کے افکار و خیالات سے متاثر ہو کر ارباب علم وفن کا ایک ایسا حلقہ پیدا ہو گیا جو ان کا ہمنوا اور ہم مسلک بنا، جنھیں انھوں نے فکری سطح پر معروضی طرز اختیار کرنے اور سائنسی نقطہ نظر اپنانے کی دعوت دی۔ رفتہ رفتہ یہ حلقہ وسیع ہوتا گیا اور ان اہل قلم نے جس دبستان کی بنیاد ڈالی وہ علی گڑھ تحریک کے نام سے معروف ہوئی ان کے رفقا نے بھی سلیس وصاف زبان میں اظہار خیال کیا چنانچہ اس تحریک کے زیر اثر انیسویں صدی کی آخری تین دہائیوں میں اردو میں کئی ادیب سامنے آئے جن میں محسن الملک، وقار الملک چراغ علی، محمد حسین آزاد، نذیر احمد، الطاف حسین حالی، شبلی نعمانی اور ذکا اللہ وغیرہ کے نام اہم ہیں۔

وقارالملک بھی سائینٹیفک سوسائٹی کے سرگرم رکن تھے اور تعلیمی تحریک میں سید احمد خاں کے دوش بدوش کوشاں رہے۔ انھوں نے مغربی تعلیم کے ساتھ ساتھ مذہب کی تدریس کو بھی ضروری قرار دیا۔ ان کی تحریروں سے اردو نثر کی ترویج ہوئی ان کے اخلاقی اور اصلاحی مضامین انسٹی ٹیوٹ گزٹ اور تہذیب الاخلاق میں شائع ہوئے۔ انھوں نے کارلائل کی کتاب سے ''انقلاب فرانس'' کا اردو ترجمہ کیا۔ اوران کے خطوط کا مجموعہ بھی سرسید اکیڈمی علی گڑھ سے طبع ہوا ہے۔ چراغ علی عربی، فارسی، انگریزی اور اردو زبانوں کے ماہر تھے۔ لاطینی اور یونانی سے بھی واقفیت تھی چونکہ انھیں اسلام سے غیر معمولی موانست تھی۔ انھوں نے عیسائیوں کی طرف سے اسلام پر کئے گئے اعتراضات کا مدلل جواب لکھا اور کئی انگریزی کتابوں کا اردو میں ترجمہ کیا جن میں ''محمد پیغمبر برحق''، ''تعلیقات''، ''تحقیق الجہاد''، ''اسلام کی دنیاوی برکتیں'' اور ''قدیم قوموں کی مختصر تاریخ''، وغیرہ اہم ہیں۔ محمد حسین آزاد نے ''آب حیات''، ''سخندان فارس''، ''قصص ہند''، ''دربار اکبری'' اور ''نیرنگ خیال'' جیسی تصانیف اردو ادب کے لئے یادگار چھوڑی ہیں منشی ذکاءاللہ بھی سائنٹفک سوسائٹی کے رکن ۱۸۶۶ء میں بنے۔ انھوں نے مغربی علوم کی کتابوں کے اردو تراجم کی پرزور تائید کی اور عملاً سوسائٹی کے اس مقصد کو تقویت پہنچائی۔ ان کی اکثر کتابیں انگریزی سے ترجمہ ہیں۔ ان کی تصانیف ریاضی، تاریخ ادب و فلسفہ اور جغرافیہ کے موضوع پر ہیں تدریسی رسالوں کے علاوہ ''تاریخ ہندوستان'' آٹھ جلدوں میں ان کا ایک اہم کارنامہ ہے۔

مولوی نذیر احمد بھی سرسید تحریک سے وابستہ تھے۔ اصلاح قوم کا جذبہ دونوں میں مشترک تھا۔ نذیر احمد نے اپنا سارا زورِ قلم اصلاح معاشرہ پر صرف کیا اور اس کے ایک جز و یعنی طبقہ نسواں کے حال زبوں کی طرف توجہ کی اور اپنے ناولوں کو ان کی تعلیم اور کردار کی درستی کا ذریعہ بنایا۔ ان کے چھ ناول ''مراۃ العروس''، ''رویائے صادقہ''، ''بنات النعش''، ''توبتہ النصوح''، ''فسانہ مبتلا'' اور ''ابن الوقت'' ہیں جنہیں اردو ادب میں بے پناہ مقبولیت حاصل ہوئی۔

مولانا حالی سے سرسید نے ''مسدس مدوجزر اسلام'' لکھوائی۔ حالی کی نظمیں نیچرل شاعری کا اعلیٰ نمونہ تھیں۔ ''مقدمہ شعروشاعری'' ان کا ایک اہم کارنامہ ہے ''حیات سعدی''، ''یادگار غالب'' اور ''حیات

جاوید'' بھی کافی اہمیت کی حامل ہیں۔شبلی نعمانی مدرسۃ العلوم علی گڑھ میں عربی زبان و ادب کے مدرس ۱۸۸۴ء میں مقرر ہوئے۔شبلی نے ''المامون''، ''الغزالی''، ''الفاروق''، ''شعر العجم '' اور ''موازنہ انیس و دبیر'' لکھ کر اردو نثر کو فروغ دیا۔غرض کہ علی گڑھ کے زیر اثر اردو نثر کی ترقی کی رفتار نہ صرف تیز ہوئی بلکہ اس میں نمایاں تبدیلیاں بھی رونما ہوئیں۔علی گڑھ تحریک نے علمی نثر کو بالخصوص فروغ دیا۔

اردو ناول کی بنیاد نذیر احمد کے ناول ''مراۃ العروس'' سے پڑی جو ۱۸۶۹ء میں لکھا گیا۔مراۃ العروس نذیر احمد کا وہ شاہکار کارنامہ ہے جو ان کی شہرت کا باعث بنا۔جب بھی اردو ناول کا ذکر کیا جائے گا تو نذیر احمد کا نام ضرور آئے گا کیوں کہ نذیر احمد ہی اس صنف کے بانی ہیں۔مراۃ العروس کا موضوع تعلیم نسواں ہے۔مولانا تعلیم نسواں کو اس لئے ضروری قرار دیتے ہیں کہ بچوں کی پرورش و نگہداشت کی ذمہ داری عورتوں پر ہے۔

کچھ فنی خامیوں کے باوجود مراۃ العروس ناول میں مافوق الفطرت عناصر سے گریز اور اس دور کی معاشرتی زندگی کی بھر پور عکاسی اس بات کا ثبوت ہے کہ نذیر احمد نے ناول کی داغ بیل ڈال کر یہ واضح کر دیا کہ ناول ہی اصلاح معاشرہ کا بہترین ذریعہ ہے بنات النعش، ابن الوقت، رویائے صادقہ، توبتہ النصوح اور ''فسانہ مبتلا'' بھی ان کے اہم ناول ہیں۔نذیر احمد کے بعد دوسرے اہم ناول نگار پنڈت رتن ناتھ سرشار ہیں ان کے ناولوں میں ''فسانہ آزاد'' ''سیر کہسار''، ''کافی''، ''پی کہاں''، ''جام سرشار''، ''خدائی فوجدار''، ''کڑم دھڑم'' وغیرہ کافی مقبول ہوئے سرشار انگریزی کے مطالعے سے صنف ناول سے واقف ہو چکے تھے اور اپنی تخلیقات کو انہوں نے ناول سمجھ کر ہی لکھا۔لیکن وہ کہیں لاشعوری طور پر ناول کی حدود سے نکلتے چلے گئے۔وہ اکثر لکھنؤ کی بھیڑ بھاڑ اور سرور کی زبان کے جادو میں اس قدر کھو جاتے ہیں کہ ان کی تحریر اپنے آپ کو ناول نگاری سے دور لے جاتی ہے۔بہر حال سرشار نے نذیر احمد سے بالکل الگ موضوع لے کر اپنی تخلیقات کے ذریعہ صنف ناول میں بہت اہم اضافے کئے جن کو کبھی فراموش نہیں کیا جا سکتا۔عبدالحلیم شرر نے اردو میں تاریخی ناول کی بنیاد ڈالی۔ان کے ناولوں میں ''ملک العزیز ورجینا''، ''حسن انجیلنا''، ''منصور موہنا''، ''قیس ولبنیٰ''، ''ایام عرب''، ''فردوس بریں''، ''مقدس نازنین'' وغیرہ اہم ہیں۔''فردوس بریں''

اردو ناول کی ہیئت میں سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے ناول کا وہ آہنگ جس میں ناول کے پورے عناصر ترکیبی مل کر ایک مکمل تاثر پیدا کرتے ہیں اس ناول میں پلاٹ، کردار، مکالمے، ماحول، جذبات نگاری اور فلسفۂ حیات مل کر اردو ناول کی ہیئت میں ڈرامائی ناول نگاری کی بنیادیں مستحکم کیں۔''فردوس بریں'' میں بھی ڈرامائی ناول کا امتیازی وصف یعنی زندگی کے تجربات کی تصویر کشی ملتی ہے شرر کی ناول نگاری کی حیثیت مسلم ہے انہوں نے تاریخی ناول لکھے ہیں شرر چونکہ اسلامی جذبے سے سرشار تھے اس لئے ان کے یہاں اسلامی کردار مثالی بن کر سامنے آئے ہیں۔شرر دراصل ایمان وآگہی کے تقاضوں کو اپنے ناولوں کی تخلیق سے پورا کرنا چاہتے ہیں لہٰذا اس عقبی زمین میں وہ تجدید نہیں ہو پاتی۔جس کے وہ خواہاں ہیں۔اسلامی شعار مبالغے میں دب جاتا ہے اور تجدید اسلام کی اسپرٹ دم توڑ دیتی ہے مرزا محمد ہادی رسوا کے اہم ناولوں میں''ذات شریف''،''شریف زادہ''،''اختری بیگم''،''افشائے راز'' اور''امراؤ جان ادا'' ہیں ان کی شہرت کا باعث ''امراؤ جان ادا'' ہی بنا، رسوا کے ناول مقصدیت کے حامل ہیں رسوا نے اپنے زمانے کی سماجی زندگی کے جملہ پہلوؤں کو اپنے ناولوں میں مہارت اور خوبی کے ساتھ پیش کیا ہے۔سماجی مسائل کو حالات و واقعات کے پیرائے میں پیش کیا ہے اردو ناول کی تاریخ میں ان کا نام''امراؤ جان ادا'' کی وجہ سے کافی شہرت کا حامل ہے۔

باب دوم:۔''ریاست جموں وکشمیر میں اردو زبان وادب کا ارتقا اور ناول کی روایت'' کے عنوان سے قائم کیا گیا ہے۔ریاست جموں وکشمیر جو اپنے قدرتی حسن اور فطرت کی جادوگری سے مزین ہے کشمیر کے باغات، برف سے ڈھکی ہوئی خوبصورت پہاڑیاں، ڈل جھیل کا منظر، گلمرگ یا سونا مرگ کے وہ خوبصورت مقامات جو ہر راہگیر کو اور ہر سیاح کو اپنا گرویدہ بنا لیتے ہیں جس نے بھی اس وادی میں قدم رکھا اس نے اس کی خوبصورتی اور مسحور کن صورتحال کو قبائے سخن بنا کر پیش کیا۔مصنفین کے لئے ہمیشہ ہی کشمیر ایک محبوب موضوع رہا ہے مختلف شاعروں، ادیبوں اور سیاحوں نے کشمیر کو مختلف نام دیئے ہیں کسی نے اسے فردوس بریں کہا کسی نے جنت بے نظیر کہا ہے یہاں کی تاریخ پر نگاہ ڈالیں تو پتہ چلتا ہے کہ مشہور صوفی سید اشرف الدین عبدالرحمٰن بلبل ۱۳۳۶ء میں اپنے مریدوں اور عقیدت مندوں کے ساتھ کشمیر تشریف لائے۔

ان دنوں کشمیر کے راجاؤں کے آپسی جھگڑوں اور غلط کاموں کی وجہ سے سارا نظام بگڑ چکا تھا۔ان حالات کے پیش نظر ہندو راجاؤں کو اقتدار سے ہاتھ دھونا پڑا اور لداخ کا ایک شہزادہ رینچن شاہ کے ہاتھوں بیعت ہوکر مسلمان ہوگیا۔بلبل شاہ نے نام صدرالدین رینچن شاہ رکھا۔رینچن شاہ کا ایک وزیر جو خود بھی مسلمان ہوگیا تھا فارسی زبان سے آشنا تھا۔وہ دین کی باتیں سن اور سیکھ کر مقامی لوگوں میں اسلام کی تبلیغ کیا کرتا تھا۔ اس طرح قرآن و احادیث اور اسلامی تعلیمات کی وجہ سے عام کشمیری لوگ فارسی اور عربی زبانوں سے واقف ہونے لگے۔

اس طرح فارسی زبان کا چلن عام ہوتا گیا اور اس زبان نے عوام الناس میں اپنی جگہ بنائی اس کی بڑھتی ہوئی مقبولیت کے پیش نظر فارسی سرکاری زبان قرار پائی ڈوگرہ راجاؤں کے عہد تک ریاست میں فارسی ہی سرکاری زبان رہی۔مہاراجہ گلاب سنگھ نے ۱۸۴۶ء میں برطانوی حکومت کے زیر اثر آ کر ریاست جموں وکشمیر کو ۷۵ لاکھ کے عوض خرید لیا تھا۔جس کا اظہار علامہ اقبال نے اپنی شاعری میں بھی کیا ہے گلاب سنگھ نے جب حکومت سے دست برداری کے بعد ۱۸۵۶ء میں مہاراجہ رنبیر سنگھ کو حکومت سونپ دی۔رنبیر سنگھ تقریباً ۲۹ برس حاکم رہے رنبیر سنگھ کے عہد میں بھی اگر چہ فارسی ہی سرکاری زبان رہی لیکن اس دور میں اردو زبان نے اپنے قدم مضبوط کئے۔رنبیر سنگھ نے سنسکرت کالج،رنبیر لائبریری اور دارالترجمہ قائم کیا۔اس کے علاوہ رنبیر سنگھ نے ''بدیا بلاس پریس'' کے نام سے ایک چھاپہ خانہ قائم کیا۔جس سے دارالترجمہ میں ترجمہ شدہ کئی کتابیں شائع کی گئیں۔۱۸۸۵ء میں مہاراجہ رنبیر سنگھ کا انتقال ہوا تو مہاراجہ پرتاپ سنگھ ان کے جانشین ہوئے۔ان کے عہد تک فارسی ہی سرکاری زبان تھی لیکن پرتاپ سنگھ نے اپنے دور حکومت میں ۱۸۸۸ء میں اردو کو سرکاری زبان کا درجہ دیا پرتاپ سنگھ نے عیسائیت تبلیغ کے ردعمل میں ''سناتن دھرم سبھا'' قائم کی تو سالک رام سالک نے کئی کتابچے لکھے جن میں مورتی منڈن،دھرم اپدیش،ارتھ شاستر، لغت اردو،محاورات اردو،داستان جگت روپ وغیرہ شامل ہیں ڈوگرہ دور حکومت میں ریاست میں پریس قائم کرنے اور رسائل اور اخبارات جاری کرنے پر پابندی تھی تو اہل کشمیر بیرون کشمیر کے دوسرے شہروں سے اخبارات و رسائل جاری کرتے تھے جن میں ''اخبار عام''،''خیر خواہ کشمیر''،''ہمدرد کشمیر''،''کشمیری

گزٹ''، ''کشمیری مخزن''، ''صبح کشمیر''، ''بہار کشمیر'' وغیرہ اہم ہیں لیکن بیسویں صدی میں جموں وکشمیر سے ڈوگرہ حکومت کی اجازت کے مطابق پہلا اخبار ''رنبیر'' ۱۹۲۴ء میں جاری ہوا۔ جس کے اڈیٹر ملک راج صراف تھے۔ اس کے بعد کشمیر سے ''وتستا''، ''ہمدرد''، ''صداقت''، ''مارتنڈ''، ''وکیل''، ''حقیقت''، ''خالد'' اور ''خدمت'' وغیرہ اخبارات شائع ہوتے رہے جن میں مقامی ادباء وشعرا کی تخلیقات کو شائع کیا جاتا تھا۔ ۱۹۴۷ء کی تقسیم اور آزادی کے بعد متعدد اخبارات اور رسائل کا سلسلہ جاری ہوا جو آج بھی برقرار ہے آج کی تاریخ میں جموں وکشمیر سے ''شیرازہ''، ''حکیم الامت''، ''تعمیر''، ''بزم ادب'' اور ''تفہیم'' وغیرہ ادبی رسالے شائع ہورہے ہیں ان اخباروں میں ادبی تخلیقات تحقیقی وتنقیدی مضامین کالم وغیرہ شائع ہوتے ہیں، حامدی کاشمیری، محمد یوسف ٹینگ، پروفیسر ظہورالدین، عرش صہبائی، سلطان الحق، رفیق راز اور شبیب رضوی کے علاوہ سیکڑوں شعرا اور ادبا اپنی نگارشات کے ذریعہ ریاست جموں وکشمیر میں اردو زبان وادب کو پروان چڑھانے میں مصروف ہیں چونکہ اردو ریاست کی سرکاری، درباری، دفتری اور کاروباری زبان بھی ہے اور ذریعہ تعلیم بھی ہے اگر چہ ریاست جموں وکشمیر میں اردو کو بعض مسائل کا سامنا ضرور ہے لیکن اس ریاست میں اردو کی جڑیں اتنی مضبوط ہیں کہ ریاست جموں وکشمیر میں اردو کا مستقبل تابناک اور محفوظ ہی نظر آتا ہے۔

ریاست جموں وکشمیر میں اردو ناول کی روایت زیادہ قدیم نہیں ہے لیکن پھر بھی یہاں جو ناول لکھے گئے ہیں وہ ریاست کو ملک کی دوسری ریاستوں کے مدمقابل لا کھڑا کرتے ہیں ریاست جموں وکشمیر میں اردو ناول کے ابتدائی نقوش اگر چہ آزادی سے پہلے بھی ملتے ہیں جس میں سالک رام سالک کی ''داستان جگت روپ'' اور ''تحفہ سالک'' کو اردو ناول کے ابتدائی نقوش قرار دیا گیا ہے اس کے علاوہ محمد دین فوق پنڈت نندلا، موہن لال مروہ، وشوا ناتھ ورما وغیرہ کے قصوں کو ابتدائی نقوش مانا گیا ہے لیکن وہ تمام ابتدائی نقوش فسادات کی وجہ سے تلف ہوگئے ہیں دستیاب شدہ ناولوں کے مطابق اردو کا پہلا باقاعدہ ناول ''اور انسان مر گیا'' (۱۹۴۸ء) ہے جو رامانند ساگر کی تصنیف ہے اس سے پہلے پریم ناتھ پردیسی نے اگر چہ ایک ناول ''پوتی'' کے عنوان سے لکھا تھا لیکن ۱۹۴۷ء کے فساد میں وہ شائع ہونے سے پہلے ہی تلف ہوگیا۔ اس اعتبار سے رامانند ساگر کو ہی اردو کا پہلا ناول نگار مانا جائے گا۔ رامانند ساگر کے بعد ریاست میں دوسرے ناول

نگاروں نے اس روایت کو آگے بڑھایا جن میں ٹھا کر پونچھی، حامدی کاشمیری، علی محمد لون وغیرہ شامل ہیں۔

باب سوم: ''ریاست جموں وکشمیر میں اردو ناول ۱۹۴۷ء سے ۱۹۷۰ء'' عنوان کے تحت قائم کیا گیا ہے اس باب میں چھ ناول نگاروں کو شامل کیا گیا ہے راما نند ساگر کا ناول ''اور انسان مر گیا'' ریاست جموں و کشمیر کا پہلا ناول ہے یہ ناول فسادات کے موضوع پر لکھا گیا ہے ناول چار حصوں پر مشتمل ہے پہلے حصے میں لاہور کے کشت وخون کی تفصیلات ہیں قومیت کے نام پر روا رکھی جانے والی تباہی اور غارت گری کو پیش کیا گیا ہے دوسرے حصے میں ہندوؤں مسلمانوں کے آپسی تضادات کو موضوع بنایا ہے اور پھر تیسرے حصے میں آنند جب مایوس ہوکر اپنے ہاتھوں سے اپنے بیوی بچوں کو ہلاک کرتا ہے اور لڑتے ہوئے جان دینے کے لئے نکل جاتا ہے اس کے علاوہ عورتوں پر کئے جانے والے ظلم وجبر کو بھی اس ناول میں دکھایا ہے۔

ٹھا کر پونچھی کا تعلق خطۂ جموں سے ہے ان کے ناولوں میں ''رات کے گھونگھٹ''، ''شمع ہر رنگ میں جلتی ہے''، ''قفس اداس ہے''، ''چاندنی کے سائے'' اور ''پیاسے بادل'' اہم ہیں۔ ''رات کے گھونگھٹ'' ناول میں سماج کے ٹھیکیداروں کے راز فاش کئے گئے ہیں ٹھا کر پونچھی نے حقیقت کو ہو بہو نقل کر دیا ہے سماج کے چہرے سے پارسائی کے پردوں کی نقاب کشائی کرنے کی کوشش کی ہے ناول نگار نے ایسے کرداروں کو تراشا ہے جو بظاہر نیکی اور شرافت کا لبادہ اوڑھے رہتے ہیں اور بہ باطن انسان کو فریب کے جال میں پھنسانا چاہتے ہیں غرض کہ ناول نگار نے مختلف کرداروں کے ذریعے نئے سماج میں پنپ رہے ناسور کی طرف اشارہ کیا ہے۔ ''شمع ہر رنگ میں جلتی ہے'' ناول دراصل ایک مصور کا المیہ ہے اس میں ان کا درد وکرب اور سماج کے ہاتھوں ان پر روا رکھے جانے والے سلوک کی کہانی کو بہترین انداز میں پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے ''قفس اداس ہے'' ٹھا کر پونچھی کا مشہور سوانحی ناول ہے اس ناول میں غلام رسول سنتوش کی زندگی کو پیش کیا گیا ہے یہ ناول ایک دکھ بھری کہانی ہے جس کے لفظ لفظ میں مصنف کا حساس اور دردمند دل دھڑک رہا ہے ''چاندنی کے سائے'' ناول میں بعض اہم سماجی اور جاگیردارانہ نظام کے مسائل کو موضوع بنایا ہے ناول میں طبقاتی کشمکش اور سماج کے فرسودہ روایات کو بھی نشانہ بنایا گیا ہے ''پیاسے بادل'' ناول میں سماج کے اندر پنپنے والی برائیوں کو پیش کیا گیا ہے اور حقیقت کو عیاں کرنے کے لئے ناول کو ذریعہ بنایا ہے ٹھا کر پونچھی نے

اپنے ناولوں میں اس عہد کے مسائل کو بڑی باریکی سے پیش کیا ہے ٹھاکر پونچھی کے ناول فن کے اعتبار سے بھی کامیاب ناول ہیں پلاٹ، کردار نگاری، منظر کشی، مکالمہ نگاری میں ٹھاکر پونچھی نے فنی چابکدستی سے کام لیا ہے علی محمد لون ناول ''شاید ہے تیری آرزو'' میں دلی کے اس علاقے کو موضوع بنایا ہے جس کی فضا اور جس کی طرز زندگی بداخلاقیات کی غلاظت سے غلیظ ہو چکی ہے سماج میں دین ودھرم، ذات پات رنگ ونسل اور غریب اور امیر کی بنیادوں پر انسانوں کو تقسیم کیا جاتا ہے اس فرق سے لوگوں کے دل سے محبت، ہمدردی، خلوص اور انسان دوستی کا جذبہ بالکل ختم ہو گیا ہے ناول کا پس منظر یہی ہے۔ غلام رسول سنتوش کا ناول ''سمندر پیاسا ہے'' بہت اہم ہے اس ناول میں سنتوش نے بڑی بے رحمی کے ساتھ انسان کے باطن میں موجود ہوسنا کی اور زہرناکی کو ابھارا ہے یہاں زندگی کو ایک روگ کہا گیا ہے یہ روگ انسان کے باطن میں پرورش پاتا ہے یہ خود پرستی، بوالہوسی اور لذت پرستی کا روگ ہے۔ یہاں محبت کی ناکامی کو بھی موضوع بنایا گیا ہے۔

سماج میں رائج کردہ غلط تصورات کتنے نقصان دہ ثابت ہوتے ہیں۔ جو ایک انسان کی جان لے لیتے ہیں کشمیری عوام کے غلط تصورات اور توہمات کے خلاف سنتوش کا یہ ناول ایک احتجاج بھی ہے۔ یہ ناول فنی اور موضوعی دونوں اعتبار سے کامیاب ہے حامدی کاشمیری کے ناولوں میں ''بہاروں میں شعلے''، ''اجنبی راستے'' اور ''بلندیوں کے خواب'' شامل ہیں۔ ''بہاروں میں شعلے'' ناول میں کشمیری عوام کی زندگی کو موضوع بنایا گیا ہے ناول نگار نے سماجی ومعاشرتی زندگی کے مسائل کے علاوہ سیاسی صورتحال اور ڈوگرہ تاناشاہی کے خلاف تحریک کو بھی اس ناول میں پیش کیا ہے ناول نگار نے کشمیری عوام کے مسائل اور کشمیری سماج میں پائی جانے والی برائیوں کو اجاگر کر کے ان کی اصلاح کرنے کی ایک کوشش کی ہے سماجی مسائل کی تصویر کشی کر کے اس سماج کی اصلاح کرنا حامدی کاشمیری کا مقصد تھا۔ ناول فنی اعتبار سے بھی ایک کامیاب ناول ہے منظر کشی کے بہترین نمونے ناول میں ملتے ہیں ''اجنبی راستے'' حامدی کاشمیری کا ایک اہم ناول ہے اس ناول میں ناول نگار نے ایک متوسط طبقے کے ایک مسلم گھرانے کی زندگی کو موضوع بنایا ہے اس طبقے میں محبت کی جو قدر و قیمت ہے خودداری کا جو عنصر ہے تضاد کی جو صورت ہے اور توہمات کے جو بت ہیں وہ صاف طور پر ہمارے سامنے آتے ہیں متوسط طبقے کی گھریلو زندگی کے بے تکلف ماحول کو ناول میں دیکھا جا سکتا ہے۔ یہ حامدی

کاشمیری کا کمال ہے کہ کرداروں کو عام زندگی اور عام ماحول کا نمائندہ بناتے ہیں۔ان کے کردار متوسط طبقے کے مرد اور عورت ہیں کہانی میں جو مسائل ملتے ہیں وہ کشمیر کے متوسط طبقے کے مسائل ہیں ناول میں عوامی زندگی کے ایک اہم مسئلے بچپن کی شادی کو موضوع بنایا گیا ہے لیکن اس سماجی مسئلے کو پیش کرتے ہوئے کئی دوسرے مسائل کی طرف بھی اشارہ کر دیا گیا ہے۔ناول کا پلاٹ سیدھا سادہ اور عام فہم ہے۔کہانی بیانیہ ہے واحد متکلم کی تکنیک میں بیان کی گئی ہے ناول ''بلندیوں کے خواب'' کو عشقیہ داستان کے طور پر پیش کیا گیا ہے ناول میں پہاڑوں، بادلوں اور ہواؤں کے طوفانی پہلوؤں کو دکھایا گیا ہے کہ انسان فطرت کے قہر و غضب کا کس طرح شکار ہوتا ہے اس میں انسان کو قدرت کے سامنے بے بس اور مجبور دکھایا گیا ہے ساتھ ہی انسان کی ہمت و کاوش کے ذریعے فطرت کے طوفانی پہلوؤں سے نبرد آزما ہونے کے مناظر کی عکاسی بھی کی گئی ہے وہ پہاڑوں کو عبور کرتا اور برفیلی آندھیوں سے راستہ نکالتا ہے لیکن انسانی سماج میں جو خرابیاں ہیں اونچ نیچ ہے جو استحصال ہے وہ اس کے خوابوں اور ارادوں کو پامال کر دیتا ہے انسان فطرت پر تو قابو پالیتا ہے مگر وہ سماجی برائیوں کو دور نہیں کر سکتا ہے اور غم والم کا شکار ہو جاتا ہے۔پریشانیوں سے دو چار ہوتا ہے۔یہی ناول کا موضوع ہے جو پورے ناول میں نظر آتا ہے ناول کا پلاٹ مربوط ہے کردار نگاری، مکالمہ نگاری اور منظر کشی میں بھی حامدی کاشمیری نے فنی چابکدستی سے کام لیا ہے ناول موضوع اور فن دونوں اعتبار سے ایک کامیاب ناول ہے۔حامدی کے ناولوں کے پلاٹ میں جغرافیائی حقیقت اور مقامی رنگ کی عکاسی ملتی ہے حامدی کاشمیری نے اپنے ناولوں کے پلاٹ کی تعمیر میں وادی کشمیر کا سہارا لیا ہے۔انھوں نے نالوں کے پلاٹ میں جموں و کشمیر کے خوبصورت مقامات، جھیلوں، باغوں اور دریاؤں وغیرہ کے صحیح نام اور سچی تصویریں پیش کی ہیں۔پلاٹ کی تشکیل میں حامدی کاشمیری نے اپنی فنی مہارت کا ثبوت دیا ہے حامدی کے ناولوں کے کردار بھی حقیقی زندگی سے قریب تر معلوم ہوتے ہیں انھوں نے اپنے ناولوں میں جو کردار پیش کئے ہیں وہ اسی معاشرے سے تعلق رکھتے ہیں منظر کشی میں بھی حامدی کاشمیری نے فنی چابکدستی سے کام لیا ہے ماحول کی عکاسی ان کے ناولوں میں بھی دلچسپی کی ایک اور وجہ ہے مکالمہ نگاری میں بھی بڑی فنی مہارت کا ثبوت دیتے ہیں حامدی کے ناول اسلوب کے اعتبار سے بھی کافی دلکش اور دلچسپ ہیں۔

وجے سوری کا تعلق صوبہ جموں سے ہے ان کا نام ان کے ناول ''ایک ناؤ کاغذ کی'' کی وجہ سے مشہور ہے یہ ناول دراصل ایک ادیب، قلم کار پال کی محبت کی ناکامی کی داستان ہے لیکن کہانی میں دلچسپی کا عنصر باقی رہتا ہے پال جو ایک ادیب ہے ناول اور شاعری میں اس کی خصوصی دلچسپی ہے اس کے اندر تخلیقی صلاحیت بدرجہ اتم موجود ہے وجے سوری نے پال کا جو نقشہ کھینچا ہے وہ صرف پال جیسے ادیب کا نقشہ نہیں بلکہ ہمارے ملک کے تمام ادیبوں کے لئے وہ موزوں ہے ناول کا پلاٹ صاف اور سپاٹ ہے کہانی میں کوئی بھی جھول نہیں ملتا۔ پال اور جوالا کے علاوہ بھی ناول کے کئی کردار ملتے ہیں جو ضمنی ہیں بہر حال ناول کا ہیرو پال اور ہیروئن جوالا ہی ہے زبان و بیان کے اعتبار سے بھی یہ کامیاب ناول ہے اسلوب بیان نہایت دلکش ہے مکالمہ نگاری میں بھی وجے سوری نے کمال دکھایا ہے غرض وجے سوری کا یہ ناول فنی اور موضوعی دونوں اعتبار سے کامیاب ناول ہے۔

باب چہارم: ''ریاست جموں و کشمیر میں اردو ناول ۱۸۷۱ء سے ۲۰۰۰ء تک'' کے عنوان کے تحت قائم کیا گیا ہے اس باب میں جان محمد آزاد، عبدالغنی شیخ، شبنم قیوم، نور شاہ، زینت فردوس، عمر مجید، جیوتیشور پتھک اور فاروق رینزو کے ناولوں کو شامل کیا گیا ہے جان محمد آزاد کا تعلق سری نگر سے ہے ان کا ناول ''وادیاں بلا رہی ہیں'' بہت مشہور ہے اس ناول کا موضوع کچھ نیا نہیں اس میں کرشن چندر کے زیر اثر کشمیر کے ایک پہاڑی علاقے ''کاغان'' کے پس منظر میں سماجی زندگی کے تضاد اور شکست اور محرومی کو اپنا موضوع بنایا ہے۔ ناول نگار نے سماج کے مختلف طبقوں کے درمیان تصادم، کوہستانی علاقوں کے لوگوں کی سادگی، خلوص، خوابوں اور آرزؤں کی کہانی کو پیش کیا ہے جان محمد آزاد نے کشمیر کے خوبصورت مناظر کے علاوہ کشمیر کی غریب عوام کی زندگی کے مسائل کو بڑے موثر انداز میں پیش کیا ہے۔ ''کشمیر جاگ اٹھا'' میں بھی کشمیر کے ایک دور افتادہ علاقہ کو موضوع بنایا ہے ناول میں مطلق العنانیت کے تاریک ترین دور میں استحصال اور جبریت کے ہاتھوں مظلوموں اور بے زبان انسانوں کی کہانی پیش کی گئی ہے ''ظلمات کے مسافر'' ایسے نامراد لوگوں کی کہانی ہے جو موت کی وادیوں سے بے لگام عفریتوں کی طرح رات کے سینے پر بدی کے سفیر اور فن کی پکار بن کر چھا گئے۔ ناول موضوع اور فن دونوں اعتبار سے بہترین ناول ہے ناول کا پلاٹ مربوط ہے

کردار نگاری، منظر کشی اور مکالمہ نگاری میں بھی ناول نگار نے فنی چابکدستی سے کام لیا ہے ''برفیلے لمحوں کا جنگل'' ایک جاسوسی ناول ہے اس ناول میں ایک بین الاقوامی زیرزمین گینگ کی کہانی کو پیش کیا گیا ہے اس گینگ کا بگ باس کے۔ کے ہے جو ہر وقت لوگوں کی آنکھوں میں دھول جھونکنے میں مہارت رکھتا ہے یہ گینگ اپنی سرگرمیوں کا مرکز کشمیر کے ایک صحت افزا مقام گلمرگ کو بناتا ہے اس جگہ کا انتخاب اس لئے کیا جاتا ہے کہ یہاں دنیا کے مختلف حصوں سے لوگ سیاحت کے لئے آتے ہیں غیر قانونی منشیات کی تجارت اس گینگ کا خاص بزنس ہے۔

عبدالغنی شیخ کا تعلق لداخ سے ہے ان کے دو ناول ''وہ زمانہ'' اور ''دل ہی تو ہے'' ہیں ''وہ زمانہ'' ناول میں لداخ کے رسم و رواج، رہن سہن، تہواروں اور میلوں کا ذکر ملتا ہے یہ ایک نیم تاریخی ناول ہے اس ناول کے مطالعے سے قدیم و جدید لداخ کی تہذیب و تمدن، رہن سہن، طرز معاشرت، تعلیم و تربیت وغیرہ سے متعلق پوری جانکاری حاصل ہوتی ہے ان کا دوسرا ناول ''دل ہی تو ہے'' لیہہ کے پس منظر میں لکھا جانے والا پہلا رومانی ناول ہے۔ خطۂ لداخ کے ننگے پہاڑ اور ریتیلے میدان جو صدیوں سے خاموش اور گم سم تھے۔ اچانک سیاحوں کی آمد سے جاگ اٹھتے ہیں سیاحوں کی آمد سے جہاں متعدد لوگوں کی اقتصادی خوشحالی یقینی بن جاتی ہے وہیں اس سرزمین کے لوگوں کا ذہنی سکون، ان کی انفرادیت اور معصومیت مجروح ہونے لگتی ہے ناول کا پلاٹ مربوط ہے عبدالغنی شیخ نے عالمی ادب کے شاہکار ناولوں کا مطالعہ کیا ہے اور ان سے فیض حاصل کیا ہے انہیں پوری طرح اس بات کا احساس تھا کہ پلاٹ ناول کی ریڑھ کی ہڈی ہے یہ نہ ہو تو ناول کی عمارت اٹھ نہیں سکتی۔ عبدالغنی شیخ کے دونوں ناول اپنے موضوع اور فن کے اعتبار سے بھی کامیاب ناول ہیں۔

شبنم قیوم کا تعلق سرینگر سے ہے ان کا ناول ''زندگی اور موت'' جذباتیت اور انقلاب پسند رومانیت کا ایک دلچسپ امتزاج ہے ناول اگرچہ اپنے موضوع کے اعتبار سے ایک بہترین ناول ہے لیکن فنی اعتبار سے دیکھا جائے تو کچھ کمزور نظر آتا ہے یہ ابتدائی کوشش تھی اس لئے ناول نگار فن پر توجہ نہیں دے پائے۔ ''چراغ کا اندھیرا'' ناول میں غنڈہ گردی کے ایسے دور کو موضوع بنایا گیا ہے جب رہبر رہزن بن گئے تھے۔ یہاں انھوں نے اس قسم کے سیاہ کارنامے یا حرکتیں کرنے والے حاکموں اور سیاسی ٹھیکیداروں پر ایسی ضربیں

لگائیں ہیں جن سے قاری متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ ناول میں وہ تمام صفات موجود ہیں جو ایک عمدہ اور معیاری ناول کے لئے ضروری تصور کی جاتی ہیں۔ تجسس اور سنسنی خیزی، بدی کی ناکامی اور اچھے لوگوں کی فتح اس ناول کا بنیادی موضوع ہے۔

''یہ کس کا لہو ہے، کون مرا'' شبنم قیوم کا نیم تاریخی اور سیاسی ناول ہے ناول کا موضوع کشمیر کی سیاسی تاریخ ہے ناول کا پس منظر ۱۹۴۷ء کے بعد ریاست جموں و کشمیر میں پیدا ہونے والے حالات و واقعات پر مبنی ہے تقسیم کے بعد جہاں ایک طرف پاکستان نے قبائلی فوج کو وادی بھیج کر یہاں کی اینٹ سے اینٹ بجا دی تھی تو دوسری طرف مہاراجہ ہری سنگھ اور شیخ محمد عبداللہ کی درخواست پر ہندوستان کی افواج کو قبائلوں کے مقابلے میں صف آرا ہونا پڑا غرض ناول میں آزادی کے بعد کی سیاسی صورتحال کا نقشہ ناول میں ملتا ہے شبنم قیوم کا یہ ناول تمام فنی تقاضوں کو پورا کرتا ہے موضوع کی جدت کی بنا پر ناول بہت مقبول ہوا اور بہت تیزی سے فروخت ہوا۔ کشمیر کی تاریخی اور سیاسی سچائی کو ناول نگار نے اپنے ناول میں پیش کر کے ایک اہم کارنامہ انجام دیا ہے۔ نور شاہ کا تعلق سرینگر سے ہے ان کے ناول ''قفس اداس ہے''، ''آؤ سو جائیں'' اور ''لمحے اور زنجیریں'' ہیں۔ ''قفس اداس ہے'' وادی کے معتبر فکشن نگار جناب نور شاہ کے زور قلم کا نتیجہ ہے۔ نور شاہ فن کی کرشمہ سازیوں پر بھروسہ رکھتے ہیں اور زندگی و سماج کے تمام مسائل کا حل فن ہی میں ڈھونڈتے ہیں انہیں اس بات کا کامل یقین ہے کہ فنون لطیفہ انسانی زندگی کے بے شمار مسائل کا حل نہیں نور شاہ ترقی پسند تحریک سے لکھ رہے ہیں اور وہ ادب کے بدلتے رجحانات سے پوری طرح واقف ہیں جدیدیت کی گھن گرج کو انہوں نے محسوس بھی کیا ہے اور اظہار ذات کے لئے بروئے کار بھی لایا ہے۔ ''آؤ سو جائیں'' ناول میں مصنف نے جنسی و نفسیاتی خواہشات کے ساتھ ساتھ کشمیر کی نیم تاریخ کو بھی علامتوں اور اشاروں کے تحت بیان کیا ہے ناول میں عشق و محبت کے قصے، احباب کے بچھڑنے کا غم اور کشمیر کی عوام پر ہوئے ظلم و ستم وغیرہ جیسے چھوٹے چھوٹے واقعات کا بیان ملتا ہے اور واقعات کے علاوہ کشمیری لیڈروں پر طنز، فرقہ پرستوں سے دور رہنے کا سبق، حب الوطنی کا جذبہ اور آپسی بھائی چارے کا پیغام ملتا ہے۔ اس کے علاوہ ایک بدکردار عورت کا کردار تراش کر ناول نگار نے یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ بدکردار عورتوں سے دور رہنا چاہئے۔ نور

شاہ نے ناولٹ میں کرداروں کی خارجی اور باطنی دنیا کو کبھی براہ راست اور کبھی بلا واسطہ طور پر بڑی باریک بینی سے پیش کیا ہے نور شاہ کا اسلوب اکثر ایک دلکش استعاراتی فضا کی تشکیل بھی کرتا ہے جو ان کے مخصوص رومانی مزاج سے ہم آہنگ ہے ''لمحے اور زنجیریں'' ناول کے ذریعے معاشرے میں پائی جانے والی ایسی برائیوں اور خامیوں کو اجاگر کیا ہے کہ جن سے ہندوستانی تہذیب و معاشرت کی توہین ہوتی ہے قارئین کو ان برائیوں سے بچانے اور خامیوں کو دور کرنے کا سبق ملتا ہے فنی اعتبار سے نور شاہ کے تینوں ناول بہت کامیاب ہیں۔ ان کے ناولوں میں قصہ، پلاٹ، کردار نگاری مکالمہ نگاری، منظر کشی اور زبان و بیان کا استعمال بڑی فنی چابکدستی سے کیا گیا ہے۔

زینت فردوس ریاست جموں و کشمیر کی خواتین ناول نگاروں میں پہلا نام ہے ان کا ناول ''نئی سحر'' اپنے موضوع کے اعتبار سے بہت اہمیت کا حامل ہے۔ ناول کا موضوع انسانیت اور اتحاد کے اقدار کا اظہار کرتا ہے۔ انسان دوستی، تفریق کا خاتمہ، دوستی، محبت، اخوت، بھائی چارہ آپسی میل جول اور ایک دوسرے کو برداشت کرنے کی قوت کی بہترین مثالیں ناول میں پیش کی ہیں اس ناول میں بارہا ایسے واقعات رونما ہوتے ہیں جن سے ہمارے جذبات کی تطہیر ہوتی ہے ناول اپنے موضوع کے اعتبار سے بہترین ناول ہے لیکن ناول کی بے جا طوالت اور پیچیدگی ناول کی کمزوری بن جاتی ہے ناول چند فنی خامیوں کے باوجود کامیاب ناول ہے ناول کی پوری کہانی میں انسان دوستی اور ہندو مسلم اتحاد و بھائی چارگی کی فضا چھائی ہوئی نظر آتی ہے۔ عہد حاضر میں اس ناول کی اہمیت اور بھی بڑھ جاتی ہے۔ عمر مجید کا ناول ''یہ بستی یہ لوگ'' گاؤں کی زندگی پر مبنی ہے ناول میں گاؤں کی زندگی کے مسائل کو دیکھ کر یہاں کی مصیبت زدہ عوام کے دکھ درد کی تصویر کشی بڑی فنکاری سے کی ہے ناول میں جلنور گاؤں کے پس منظر میں پورے کشمیر کے گاؤں کی درد بھری اور کراہتی زندگی کو پیش کرنے کی کوشش کی ہے ان کے اس ناول میں سرمایہ داروں اور جاگیرداروں کے ہاتھوں کئے جانے والے ظلم کو بھی بیان کیا گیا ہے عمر مجید کا یہ ناول اپنی تمام فنی خوبیوں کے باعث ایک کامیاب ناول ہے موضوع کے اعتبار سے بھی ناول کافی دلچسپ ہے مکالمہ نگاری اور منظر کشی میں بھی ناول نگار نے کمال دکھایا ہے۔

جوتیشور پتھک کا تعلق جموں سے ہے ان کے تین ناول ہیں ''ہجوم''، ''میلی عورت'' اور ''کھڑکیاں''۔ ''ہجوم'' ناول میں سیاست دانوں کا نئی نسل کے ساتھ استحصال کو پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے نوجوان اور معصوم لوگوں کو سیاست کے دلدل میں کس طرح پھنسانے کی مذموم کوشش ہوتی ہے ''میلی عورت'' کا موضوع سماجی قدروں کی پامالی ہے ہمارے سماج میں روز بروز خودغرضی، موقع پرستی اور بناوٹ میں اضافہ ہورہا ہے سائنس دان زمین کی حدود سے پار چاندتاروں اور سیاروں پر کمند ڈال رہے ہیں مگر آج کے انسان کا وجود اتنا ہی سکڑ کر محدود ہوتا جارہا ہے آج کا انسان اپنی غرض پوری کرنے کے لئے نہ اخلاقی قدروں کا خیال کرتا ہے نہ ہی آپسی رشتوں کی پرواہ کرتا ہے۔ ''کھڑکیاں'' ناول کا موضوع ایک اہم مسئلہ ہے سیاست اخلاقی دیوالیہ پن کا ذریعہ بن چکی ہے اورنئی نسل کو اپنے مقصد کے لئے استعمال کیا جارہا ہے اس طرح نئی نسل کا اہم مستقبل تباہ کررہے ہیں مجموعی طور پر جیوتیشور پتھک کے تینوں ناول اپنے موضوع اور فن کے اعتبار سے بہترین ناول ہیں۔

فاروق رینزو کا تعلق سرینگر سے ہے ان کا ناول ''زخموں کی سالگرہ'' بہت مشہور ہے ناول میں موجودہ دور کے اہم مسئلے کو موضوع بنایا گیا ہے یہ مسئلہ طلبا کی بے چینی اور اضطراب ہے طالب علم دن بدن مایوسی کا شکار ہوتے جاتے ہیں۔ اس انتشار، مایوسی اور ناامیدی کی کئی وجوہات ہیں عہد حاضر میں ٹوٹتی ہوئی انسانی قدریں اور ہماری زندگی کی پیچیدگیاں ایک اہم وجہ ہے۔ ''انقلاب کا شہید'' ناول میں ناول نگار نے ان جیتے جاگتے کرداروں کے ذریعے جوحق پر ہیں سچ پر ہیں اور اپنی بات ظالموں کے ظلم کی پرواہ کئے بنا سچ سچ کہتے ہیں پورے معاشرے کی یعنی کشمیری عوام کی زندگی کی دردبھری داستان بڑے موثر انداز میں پیش کی گئی ہے ناول اپنے تمام فنی تقاضوں کو پورا کرتا نظر آتا ہے ''کشمیر جھیل جلتی ہے'' ناول کے ذریعے سرزمین کشمیر میں پروان چڑھ رہی بدعنوانیوں، لاقانونیت اور بدحالی کی تصویر دکھانے کی کوشش کی گئی ہے ناول میں فاروق رینزو نے ریاکاروں اور مکاروں کے چہرے سے نقاب اتارنے کی کوشش کی ہے

باب پنجم: ''ریاست جموں وکشمیر میں اردو ناول ۲۰۰۰ء سے تاحال'' کے عنوان سے قائم کیا گیا ہے اس باب میں آنندلہر، ترنم ریاض، عبدالرشید راہگیر، شبنم قیوم، وحشی سعید، حامدی کاشمیری اور شفق سوپوری کے

ناولوں کا شامل کیا ہے۔آنند لہر کا تعلق خطہ جموں سے ہے ان کا ناول ''اگلی عید سے پہلے'' سرزمین کشمیر کی ایک درد بھری داستان ہے یہ درد بھری داستان ۱۹۴۷ء سے ۱۹۹۶ء تک کی ہے جو نصف صدی پر پھیلی ہوئی ہے ناول فنی اعتبار سے بھی کامیاب ناول ہے۔''سرحدوں کے بیچ'' ناول کے لئے آنند لہر نے جس موضوع کا انتخاب کیا ہے وہ بے حد جذباتی ہے ہر حساس انسان سرحد کی پابندیوں کی وجہ سے دل برداشتہ ہو جاتا ہے جہاں نہ کوئی رشتہ ہے نہ کوئی رشتہ دار ہے سرحد لوگوں کے دلوں کو جوڑنے سے معذور ہے سرحد کے قریب رہنے والے لوگوں کی زندگی کی عکاسی ملتی ہے کشمیر کے پس منظر میں لکھا گیا یہ ناول سرحد کے قریب رہنے والے لوگوں پر مبنی ہے جو اس پورے علاقے کو اپنا مانتے ہیں ''مجھ سے کہا ہوتا'' ناول میں جانوروں اور پرندوں کے ذریعے تباہی و بربادی کے المیے کو پیش کیا گیا ہے جن میں حال و ماضی اور مستقبل سبھی زمانے شامل ہیں یہ ناول بہت سے انسانی مسائل کا بھی احاطہ کرتا ہے جو آفاقی نوعیت کے حامل ہیں مثلاً ملکوں کی آپسی رنجشیں، نسلی امتیازات، رشتوں کا زوال، ان کی بے حرمتی، انسان کی کم ظرفی، خود غرضی، امیر قوموں کے ہاتھوں غریبوں کا استحصال، بارود کے دھوئیں سے ہونے والی زمینی تباہیاں وغیرہ جیسے مسائل شامل ہیں ''یہی سچ ہے'' ناول میں زندگی کے حقائق کو فلسفیانہ انداز میں مختلف کرداروں اور واقعات کے ارتباط سے بڑے ہی موثر انداز میں پیش کیا گیا ہے اور یہ دکھایا ہے کہ عصر حاضر میں کوئی ایسا شعبہ نہیں جہاں رشوت خوری، بے ایمانی، استحصال نہیں ہے مجموعی طور پر آنند لہر کے سبھی ناول چند فنی کمزوریوں کے باوجود کامیاب ناول ہیں۔

ترنم ریاض کا ناول ''مورتی'' ازدواجی زندگی کی ناکامی اور اس ناکامی کے اسباب پر مبنی ہے ملیحہ نامی ایک لڑکی جو مجسمہ ساز ہے جو طرح طرح کے مجسمے بناتی ہے اور لوگ اس کے فن کو دیکھنے اور مجسمے خریدنے دور دور سے آتے ہیں ناول نگار اس ناول میں مجسمہ تراشی سے ملیحہ کے گہرے عشق کے سہارے قاری کو وادی کشمیر کے خوبصورت تاریخی و ثقافتی مراکز کی سیر کراتی ہیں اس کے ساتھ ہی یہ بھی بتانے کی کوشش کی ہے کہ کس طرح ایک فن کار کے فن کی ناقدری کے سبب وہ اپنا دماغی توازن کھو بیٹھتا ہے ''مورتی'' ناول کا پلاٹ مربوط ہے منظر کشی کی بھی بہترین مثالیں ملتی ہیں اسلوب، کردار نگاری اور مکالمہ نگاری میں بھی ناول نگار نے

فنی چابکدستی سے کام لیا ہے۔''برف آشنا پرندے'' ناول میں زمانی و مکانی تناظر کی حد تک خطہ کشمیر کے لازوال حسن، اس کی زخم خوردہ روح، قوت تحمل ماضی کی خوابیدہ گزرگاہوں اور حال میں زندگی کے افق پر نئی تاب وتپش اور معنویت پر مبنی ایک کبھی نہ ختم ہونے والی کہانی ہے کشمیر کی روزمرہ زندگی، کشمیر کی قدرتی خوبصورتی، وہاں کے پکوان اور طرز زندگی کی تصویرکشی کی گئی ہے ناول تاریخ کا ایک آئینہ ہے جس میں کشمیر کی شناخت کشمیری افراد کے مصائب، کشمیر کے تہذیبی احیا کو دیکھا اور محسوس کیا جاسکتا ہے یہ ناول اپنے موضوع، پلاٹ، کرداروں، مکالمات، پرندوں، نباتات، خوبصورت تاریخی عمارتوں اور مختلف جذبوں کی کیفیات کے باوصف ایک اہم ناول نظرآتا ہے۔

عبدالرشید راہگیر کا تعلق خطۂ لداخ سے ہے ان کا ناول ''احساس'' لداخ کے پس منظر میں لکھا گیا ہے اور اسی مقصد کے تحت عبدالرشید راہگیر نے لداخی رسم ورواج اور تہذیب وتمدن کے تحفظ اور اسے نئی نسل میں منتقل کرنے کی کوشش کی ہے اس کے علاوہ لداخ میں اردو زبان وادب کو فروغ دینا اور نوجوان نسل کو اس کی طرف مبذول کرنا ہے۔ ناول موضوع وفن دونوں اعتبار سے ایک مکمل ناول ہے شبنم قیوم کے ناول ''پچھتاوا'' کا موضوع آج کے ترقی یافتہ سائنسی وتکنیکی دور میں اخلاقی وروحانی قدروں کے زوال سے تعلق رکھتا ہے ناول نگار نے بہت ہی جرات مندانہ انداز میں ٹی وی، کمپیوٹر، لیپ ٹاپ، موبائل فون اور دوسری ایسی تکنیکی سہولیات کے ذریعے گھر گھر میں فحاشی پہنچانے جیسے پہلوؤں کو ناول میں سمودیا ہے۔اس ناول میں یہ واضح اشارہ ملتا ہے کہ تکنیکی ایجادات کا غلط استعمال ان لوگوں کی زندگی تباہ کرتا ہے کس طرح وہ فلموں کے ہیرو اور ہیروئن کو دیکھ کر غلط راہ اپنا لیتے ہیں یہ ناول اپنے تمام فنی تقاضوں کو پورا کرتا ہے۔

نعیمہ احمد مہجور کا ناول ''دہشت زادی'' ایک سوانحی ناول ہے ناول کا موضوع نعیمہ احمد مہجور کی حیات پر مبنی ہے اس کو سوانحی ناول قرار دیا گیا ہے نعیمہ نے اپنی زندگی میں رونما ہونے والے حالات وواقعات کو کشمیر کی خواتین کے تناظر میں بیان کرنے کی کوشش کی ہے اس طرح یہ ناول پورے معاشرے کی عورتوں کی زندگی کی مکمل ترجمانی کرتا ہے حامدی کاشمیری کا ناولٹ ''پرچھائیوں کا شہر'' ایک نہایت ہی حساس، دانشمند اور تعلیم یافتہ لڑکی کی کہانی ہے جو اپنی منزل پانے کے لئے بہت کچھ سہنے کے لئے مجبور رہے ناولٹ اپنے

موضوع اورفن کے اعتبار سے ایک بہترین ناولٹ ہے پلاٹ مربوط، کرداروں کا عمدہ انتخاب، منظرکشی کی عمدہ مثالیں، مکالمے جاندارغرض کہ تمام فنی تقاضوں کو یہ ناولٹ پورا کرتا ہے۔

وحشی سعید عصر حاضر کے مشہور ناول نگار ہیں ان کا ناول ''پتھر پتھر آئینہ'' انسانی قدروں کے عروج و زوال کی ایک ایسی تاریخ ہے جسے پڑھ کر قاری میں ترقی کا جذبہ بھی بیدار ہوتا ہے اور دلوں میں محبت، ایثار اور قربانی کا جذبہ پیدا ہوتا ہے ''پتھر پتھر آئینہ'' ناول موضوع کے اعتبار سے نفسیاتی اور رومانی ناول ہے محبت کی ایک انوکھی کہانی کو اپنے منفرد انداز میں پیش کیا ہے جو اس بات کا ثبوت ہے کہ ناول نگار کو ناول کے فن پر مہارت ہے ''ایک موسم کا خط'' اس ناول میں ممبئی کی مدنی زندگی کی ایک جھلک ملتی ہے جس میں امیری اور غریبی کے تفاوت کو منعکس کرنے کی کوشش کی گئی ہے جس سے رومانی واقعات کی طرف اشارہ ملتا ہے۔ ''عجب زندگی ......غضب موت'' ناولٹ میں دولت کے لالچ، انتقام کی آگ، نفرت محبت کے جذبات ملتے ہیں یہ چیزیں ایک شریف انسان کو بھی کیا سے کیا بنا دیتی ہیں انہوں نے ناول کے ذریعے انتقام اور انتقام کے نتیجے میں ہونے والے حالات کے بارے میں آگاہ کیا ہے۔ یہ ناولٹ اپنے موضوع اور فن دونوں اعتبار سے ایک بہترین ناولٹ ہے۔ ''جائز ...... ناجائز'' ناولٹ میں وحشی سعید نے ایک اعلیٰ خاندان میں پیدا ہونے والے انور خان کی ناجائز اولاد افضل کی بہت دردناک کہانی بیان کی ہے۔ ''فطرت ......محبت ...... ندامت'' میں ناولٹ کا پلاٹ چھٹی اور ساتویں دہائی کی فلموں سے ملتا جلتا ہے جہاں مزدوروں کے حقوق کی خاطر ٹریڈ یونین کا قیام اور پھر کارخانے کا کسی ایسے حادثے سے دوچار ہونا جس کی وجہ سے اس کی سوچ میں مثبت تبدیلی آتی ہے اور فلم کا خاتمہ خوشی پر ہوتا ہے ''وحشت محبت'' اور ''قحط'' بھی اپنے موضوع اور فن کے اعتبار سے کامیاب ناولٹ میں وحشی سعید عصر حاضر کے مشہور ادیب ہیں۔

شفق سوپوری کا تعلق سرینگر کشمیر سے ہے ''نیلیما'' ناول کے ذریعے آدی واسی سماج کی عورتوں کی نفسیاتی کیفیت اور اس طبقے کے لوگوں کی بنیادی کمزوریوں کا مشاہدہ کر کے ناول میں پیش کیا ہے نیلیما کے ذریعے اس طبقے کی سچی تصویر پیش کی ہے نیلیما چونکہ شروع سے آخر تک مختلف پریشانیوں کا سامنا کر رہی ہے اس لئے وہ معاشرے کی ساری حقیقت کو اچھی طرح سمجھنے لگی۔ ناول میں یہ دکھانے کی کوشش کی گئی ہے کہ

آدی واسی مرد جنسی معاملات میں پاک رشتوں کا کوئی خیال نہیں رکھتے ہر کسی کو اپنی ہوس کا نشانہ بنا کر ظلم و جبر کرتے ہیں ناول کا پلاٹ مربوط ہے فنی و موضوعی دونوں اعتبار سے یہ کامیاب ناول ہے۔ شفق سوپوری کا دوسرا ناول ''فائرنگ رینج: کشمیر ۱۹۹۰'' ہے جس میں کشمیری عوام پر فوج کے ظلم و جبر کی داستان کو پیش کیا گیا ہے فوج جھوٹے الزامات لگا کر کشمیری عوام پر کس طرح ظلم و جبر کرتی ہے انہیں سچ سننے سے مطلب ہی نہیں۔ وہ سچ بتانے والے کو جھوٹے الزام میں پھنسا کر تشدد کا نشانہ بناتے ہیں ناول نگار نے بڑے جرات مندانہ انداز میں اس حقیقت کی تصویر کشی کی ہے۔ شفق سوپوری کے دونوں ناول اپنے موضوع اور فن کے اعتبار سے بہترین ناول ہیں۔

مجموعی اعتبار سے دیکھا جائے تو ریاست جموں و کشمیر میں اردو ناول کی تعداد اگرچہ بہت کم ہے لیکن اب اس کی رفتار میں تیزی بھی آئی ہے اور معیار میں بھی نمایاں تبدیلی رونما ہوئی ہے ریاست میں لکھے گئے اکثر ناول موضوع اور فن دونوں اعتبار سے کامیاب ناول ہیں۔

بنیادی ماخذ

نمبر شمار	کتاب کا نام	مصنف	مطبع	سنہ اشاعت
۱	اجنبی راستے	حامدی کاشمیری	شاہین بک اسٹال سرینگر	۱۹۵۷
۲	احساس	عبدالرشید راہگیر	جے کے آفسیٹ پرنٹرز، دہلی	۲۰۱۱
۳	اگلی عید سے پہلے	آنند لہر	مانوی پرکاشن جموں	۱۹۹۷
۴	انقلاب کا شہید	فاروق رینزو	بنیش پبلیکیشنز جواہر نگر، سرینگر	۱۹۸۸
۵	اور انسان مر گیا	رامانند ساگر	نو ہند پبلیشرز لیمٹیڈ بمبئی	۱۹۴۸
۶	ایک موسم کا خط	وحشی سعید	مہاویر پریس، وارانسی	۲۰۱۴
۷	ایک ناؤ کاغذ کی	وجے سوری	ہائی وے پبلیکیشنز، جموں	۱۹۶۵
۸	برف آشنا پرندے	ترنم ریاض	ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، نئی دہلی	۲۰۰۹
۹	برفیلے لمحوں کا جنگل	جان محمد آزاد	اردو مرکز پبلکیشنز سرینگر	۱۹۹۵
۱۰	بلندیوں کے خواب	حامدی کاشمیری	ادارۂ ادب، بہوری کدل سرینگر، کشمیر	۱۹۵۸
۱۱	بہاروں میں شعلے	حامدی کاشمیری	شاہین بک اسٹال سرینگر	۱۹۵۷
۱۲	پتھر پتھر آئینہ	وحشی سعید	مہاویر پریس، وارانسی	۲۰۱۴
۱۳	پچھتاوا	شبنم قیوم	میزان پبلیشرز سرینگر	۲۰۱۵
۱۴	پرچھائیوں کا شہر	حامدی کاشمیری	میزان پبلیشرز سرینگر	۲۰۱۷
۱۵	پیاسے بادل	ٹھاکر پونچھی	رسالہ بیسویں صدی، دہلی	----
۱۶	چاندنی کے سائے	ٹھاکر پونچھی	رسالہ بیسویں سدی، دہلی	----
۱۷	چراغ کا اندھیرا	شبنم قیوم	نیو کشمیر پریس سرینگر	۱۹۶۹
۱۸	دل ہی تو ہے	عبدالغنی شیخ	کشمیر مرکنٹائل پریس سرینگر، کشمیر	۱۹۷۸

۱۹	دہشت زادی	نعیمہ احمد مہجور	میزان پبلشرز سرینگر	۲۰۱۲
۲۰	رات کے گھونگھٹ	ٹھاکر پونچھی	رسالہ بیسویں صدی، دہلی	۱۹۶۰
۲۱	زخموں کی سالگرہ	فاروق رینزو	ایمنٹی انٹرنیشنل کلب برانچ، سرینگر	۱۹۸۲
۲۲	زندگی اور موت	شبنم قیوم	--------	----
۲۳	سرحدوں کے بیچ	آنند لہر	ملک بک ڈپو، دہلی	۱۹۹۷
۲۴	سمندر پیاسا ہے	غلام رسول سنتوش	کمار گیلری نئی دہلی	۱۹۶۵
۲۵	شاید ہے تیری آرزو	علی محمد لون	جے کے بک ہاؤس جموں	۱۹۶۲
۲۶	شمع ہر رنگ میں جلتی ہے	ٹھاکر پونچھی	رسالہ بیسویں صدی، دہلی	۱۹۶۴
۲۷	ظلمات کے مسافر	جان محمد آزاد	میکاف پریس سرینگر، کشمیر	۱۹۸۹
۲۸	فائرنگ رینج: کشمیر ۱۹۹۰ء	شفق سوپوری	ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی	۲۰۱۹
۲۹	قفس اداس ہے	ٹھاکر پونچھی	مشورہ بک ڈپو، دہلی	----
۳۰	کشمیر جاگ اٹھا	جان محمد آزاد	اردو مرکز متصل مجاہد منزل، سرینگر	۱۹۸۴
۳۱	کشمیر جھیل جلتی ہے	فاروق رینزو	ویلی بک ہاؤس، سرینگر	۱۹۹۶
۳۲	کھڑکیاں	جیوتیشور پتھک	مانوی پبلشر پنج تیرتھی، جموں	۱۹۸۹
۳۳	ماضی اور حال (جلد اول)	وحشی سعید	مہاویر پریس، وارانسی	۲۰۱۵
۳۴	مجھ سے کہا ہوتا	آنند لہر	اردو بک سوسائٹی، دہلی	۲۰۰۵
۳۵	مورتی	ترنم ریاض	نرالی پبلیکیشنز، نئی دہلی	۲۰۰۴
۳۶	میلی عورت	جیوتیشور پتھک	جے کے بک ہاؤس، جموں	۱۹۸۶
۳۷	نئی سحر	زینت فردوس	مگھر مل باغ سرینگر، کشمیر	۱۹۷۷
۳۸	نیلیما	شفق سوپوری	ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی	۲۰۱۶
۳۹	وادیاں بلا رہی ہیں	جان محمد آزاد	جان محمد آزاد پبلیکیشنز فتح کدل، سرینگر	۱۹۸۰

۴۰	وہ زمانہ	عبدالغنی شیخ	کشمیر مرکنٹائل پریس سرینگر، کشمیر	۱۹۷۷
۴۱	ہجوم	جیوتیشور پتھک	جے کے بک ہاؤس، جموں	۱۹۸۵
۴۲	یہ بستی یہ لوگ	عمر مجید	شاہین پبلشرز سرینگر، کشمیر	۱۹۷۱
۴۳	یہ کس کا لہو ہے، کون مرا؟	شبنم قیوم	شانہ ادب سرینگر، کشمیر	۱۹۷۵
۴۴	یہی سچ ہے	آنند لہر	اردو بک سوسائٹی، دہلی	۲۰۰۸

ثانوی ماخذ

نمبر شمار	کتاب کا نام	مصنف	مطبع	سنہ اشاعت
۱	آنند لہر شخصیت اور فن	فدا کشتواڑی	اردو نیشنل ڈیولپمنٹ سوسائٹی کشمیر	۲۰۰۶
۲	اختر شہنشاہی	اختر الدولہ	اختر پریس، لکھنؤ	۱۸۸۸
۳	ادبی تخلیق اور ناول	محمد احسن فاروقی	مکتبہ اسلوب کراچی	۱۹۶۳
۴	اردو کے غیر مسلم افسانہ نگار	دیپک بدکی	میزان پبلشرز، سرینگر	۲۰۱۶
۵	اردو ناول آزادی کے بعد	اسلم آزاد	نکھار پبلیکیشنز مئوناتھ بھنجن	۱۹۸۱
۶	اردو ناول کی تاریخ وتنقید	علی عباس حسینی	ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ	۱۹۸۷
۷	اردو ناول کی تنقیدی تاریخ	احسن فاروقی	ادارہ فروغ اردو، لکھنؤ	۱۹۶۲
۸	اردو ناول نگاری	سہیل بخاری	مکتبہ جدید لاہور	۱۹۶۰
۹	اردو ناول کی پیش رفت	منصور خوشتر	ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی	۲۰۱۷
۱۰	اردو ناول: سمت ورفتار	سید علی حیدر	شبستان شاہ گنج، الہ آباد	۱۹۷۷
۱۱	اردو ناول کا سفر	ناز قادری	مکتبہ صدف، مظفر پور	۲۰۰۱

۱۲	اردو ناول کا سماجی اور سیاسی مطالعہ ابتدا سے ۱۹۴۷ء تک	صالحہ زریں	سرسوتی پریس، الہ آباد	۲۰۰۰
۱۳	اردو ناول کا سماجی اور سیاسی مطالعہ ۱۹۴۷ء اور اس کے بعد	نگینہ جبین	کیشو پرکاشن، الہ آباد	۲۰۰۲
۱۴	اردو ناول: آغاز وارتقا	عظیم الشان صدیقی	ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی	۲۰۰۸
۱۵	اردو ناول نگاری	سہیل بخاری	الحمرا پبلشرز، دہلی	۱۹۷۲
۱۶	اردو کا پہلا ناول نگار	اویس احمد ادیب	اسرار کریمی پریس، الہ آباد	۱۹۳۴
۱۷	اردو ناولوں میں نسائی حسیت	ڈاکٹر حمیرہ سعید	ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی	۲۰۰۹
۱۸	اردو کے اسالیب بیان	محی الدین قادری زور	احمدیہ پریس چارمینار، حیدرآباد	۱۹۳۲
۱۹	امراؤ جان ادا	مرزا رسوا	مکتبہ شاہراہ، دہلی	۱۹۸۵
۲۰	انتخاب مضامین سرسید	انور صدیقی	مکتبہ نئی دہلی	۲۰۱۱
۲۱	انقلاب ۱۸۵۷ء	پی۔سی۔جوشی	ترقی اردو بیورو	۱۹۸۳
۲۲	ایک زخم اور سہی	شبنم قیوم	میزان پبلشرز، سرینگر	۲۰۱۵
۲۳	برصغیر میں اردو ناول	خالد اشرف	اردو مجلس دہلی	۱۹۹۴
۲۴	بنات النعش	ڈپٹی نذیر احمد	اتر پردیش اردو اکادمی، لکھنؤ	۱۹۸۳
۲۵	بیسویں صدی میں اردو ناول	یوسف سرمست	ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی	۲۰۰۸
۲۶	تحقیق وتنقید	اختر اورینوی	کتابستان کملا نہرو روڈ، الہ آباد	۱۹۶۱
۲۷	تذکرہ معاصرین	مالک رام	مکتبہ جامعہ لیمٹیڈ، دہلی	۱۹۷۲
۲۸	ترنم ریاض کے افسانوں میں خواتین کے مسائل	شبنم افروز	ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی	۲۰۱۷
۲۹	ترقی پسند اردو ناول	انور پاشا	پیش رو پبلیکیشنز، نئی دہلی	۱۹۹۲
۳۰	ترجمہ کا فن اور روایت	قمر رئیس	ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ	۲۰۱۱

۳۱	تلاش وتوازن	قمر رئیس	جمال پریس، دہلی	۱۹۶۸
۳۲	توبتہ النصوح	ڈپٹی نذیر احمد	اتر پردیش اردو اکادمی لکھنؤ	۱۹۸۳
۳۳	جموں وکشمیر کے اردو افسانہ نگار	نورشاہ	میزان پبلشرز سرینگر	۲۰۱۱
۳۴	جموں وکشمیر میں اردو ادب کی نشو ونما	برج پریمی	دیپ پبلیکیشنز، کشمیر	۱۹۹۲
۳۵	حیات رحیم	مہجور	لاہور	۱۹۲۲
۳۶	حیات محسن	محمد امین زبیری	مسلم یونیورسٹی پریس، علی گڑھ	۱۹۳۴
۳۷	داستان تاریخ اردو	حامد حسن قادری	عزیزی پریس، آگرہ	۱۹۵۷
۳۸	داستان سے افسانے تک	وقار عظیم	جمال پریس، دہلی	۱۹۶۸
۳۹	دھنک یادوں کی	فاروق نازکی	------	----
۴۰	ذات شریف	مرزا رسوا	شاہی پریس، لکھنؤ	----
۴۱	ریاست جموں وکشمیر کے اردو مصنفین	جان محمد آزاد	جموں اینڈ کشمیر اکیڈمی آف آرٹ کلچر اینڈ لینگویجز	۲۰۰۴
۴۲	ریاست جموں وکشمیر میں اردو ادب	حامدی کاشمیری	گلشن پبلشرز، سرینگر	۱۹۹۱
۴۳	زبان وبیان	ظ۔ انصاری	آزاد کتاب گھر، دہلی	۱۹۵۹
۴۴	شریف زادہ	مرزا رسوا	شاہی پریس لکھنؤ	۱۹۲۰
۴۵	شعر نو	محمد حسن	ادارہ فروغ اردو لکھنؤ	۱۹۶۱
۴۶	عبدالحلیم شرر بحیثیت ناول نگار	علی احمد فاطمی	قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی	۲۰۰۷
۴۷	کشمیر میں اردو	عبدالقادر سروری	جموں اینڈ کشمیر اکیڈمی آف آرٹ کلچر اینڈ لینگویجز	۱۹۹۳

نمبر	کتاب	مصنف	ناشر	سنہ
۴۸	گلدستہ کشمیر	ہرگوپال خستہ	شاہین پبلشرز، سرینگر	۱۹۸۶
۴۹	مراۃ العروس	ڈپٹی نذیر احمد	کتابی دنیا دہلی	۲۰۰۳
۵۰	مرزا رسوا حیات اور ناول نگاری	ڈاکٹر آدم شیخ	نسیم بک ڈپو لکھنؤ	۱۹۶۸
۵۱	مسدس حالی	الطاف حسین حالی	مطبع مجتبائی دہلی	۱۸۷۷
۵۲	مقالات سرسید	محمد اسماعیل پانی پتی	مجلس ترقی ادب کلب روڈ، لاہور	۱۹۶۳
۵۳	مہجور شناسی	محمد یوسف ٹینگ	کلچرل اکیڈمی سرینگر	۱۹۸۷
۵۴	میرا رخت سفر	ترنم ریاض	ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی	۲۰۰۸
۵۵	ناول کا فن	ابوالکلام قاسمی	ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ	۱۹۹۲
۵۶	ناول کیا ہے؟	محمد احسن فاروقی	نسیم بک ڈپو لکھنؤ	۱۹۱۰
۵۷	ناول اور متعلقات ناول	ڈاکٹر مجید بیدار	نیشنل فائن پرنٹنگ پریس، حیدرآباد	۱۹۸۹
۵۸	نور شاہ فکر و فن	محمد اقبال لون	میزان پبلشرز سرینگر	۲۰۱۷
۵۹	ہندو پاک میں اردو ناول تقابلی مطالعہ	انور پاشا	پیش رو پبلیکیشنز، نئی دہلی	۱۹۹۰
۶۰	وحشی سعید ایک منفرد فکشن نگار	ڈاکٹر سیفی سرونجی	انتساب پبلی کیشنز، سرونج	۲۰۱۵
۶۱	ہم عصر اردو ناول ایک مطالعہ	قمر رئیس رعلی احمد فاطمی	ایم۔آر، پبلیکیشنز، دہلی	۲۰۰۷
۶۲	۱۸۵۷ء کا تاریخی روزنامچہ	خلیق نظامی	ندوۃ المصنفین، دہلی	۱۹۵۸

رسائل و جرائد

نمبر شمار	رسالے کا نام	مطبع	سنہ اشاعت
۱	آجکل	پبلیکیشنز ڈویژن، دہلی	۱۹۷۲
۲	بازیافت (تحقیقی وتنقیدی مجلّہ)	شعبۂ اردو، کشمیر یونیورسٹی	۲۰۰۶
۳	تہذیب الاخلاق (جلد۔۳) شمارہ نمبر۔۱	علی گڑھ	۱۸۷۲
۴	تہذیب الاخلاق (جلد۔۹۴) شمارہ نمبر۔۱	علی گڑھ	۱۸۷۵
۵	دربھنگہ ٹائمز (جنوری تا مارچ)	دربھنگہ ٹائمز پبلیکیشنز، دربھنگہ بہار	۲۰۱۸
۶	شیرازہ (جموں وکشمیر میں اردو ادب کے پچاس سال)	جموں اینڈ کشمیر اکیڈمی آف آرٹ کلچر اینڈ لینگویجز	۱۹۹۸
۷	شیرازہ (ہمعصر ناولٹ نمبر)	جموں اینڈ کشمیر اکیڈمی آف آرٹ کلچر اینڈ لینگویجز	۲۰۱۶
۸	شیرازہ (عبدالغنی شیخ نمبر)	جموں اینڈ کشمیر اکیڈمی آف آرٹ کلچر اینڈ لینگویجز	۲۰۱۸
۹	شیرازہ (غلام رسول سنتوش نمبر)	جموں اینڈ کشمیر اکیڈمی آف آرٹ کلچر اینڈ لینگویجز	۲۰۱۰
۱۰	فکر وتحقیق (جولائی تا ستمبر)	قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی	۲۰۱۳
۱۱	فکر وتحقیق (اپریل تا جون) ناول نمبر	قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی	۲۰۱۶
۱۲	فکر ونظر (جنوری) شمارہ اول	علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ	۱۹۶۰
۱۳	کتاب نما (حامدی کاشمیری شخصیت اور ادبی خدمات) خصوصی شمارہ	مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، جامعہ نگر، نئی دہلی	۲۰۰۲
۱۴	لمحے لمحے	بدایوں	۲۰۱۵

تحقیقی مقالہ برائے ڈی۔فل۔

نگراں

پروفیسر شبنم حمید

صدر شعبۂ اردو

الہ آباد یونیورسٹی پریاگ راج (الہ آباد)

مقالہ نگار

امتیاز احمد

ریسرچ اسکالر

شعبۂ اردو الہ آباد یونیورسٹی پریاگ راج (الہ آباد)

شعبۂ اردو

الہ آباد یونیورسٹی پریاگ راج (الہ آباد)

۲۰۲۱ء

A THESIS SUBMITTED FOR THE DEGREE OF D.Phil. IN THE FACULTY OF ARTS UNIVERSITY OF ALLAHABAD

Under the Supervision of:

Prof. Shabnam Hameed
Head of Department
Department of Urdu
University of Allahabad
Prayagraj (Allahabad)

Submitted By:

Amtiaz Ahmad
Research Scholar
Department of Urdu
University of Allahabad
Prayagraj (Allahabad)

DEPARTMENT OF URDU
UNIVERSITY OF ALLAHABAD
PRAYAGRAJ, ALLAHABAD
2021

خلاصہ

باب اول:۔ ''اردو ناول کا سیاسی وسماجی پس منظر'' کے عنوان سے قائم کیا گیا ہے۔ ۱۸۵۷ء کی بغاوت ایک ایسا ہنگامہ ہے جس نے ہندوستان کے ہر شعبہ پر اثر ڈالا چاہے وہ سیاسی ہو یا سماجی ثقافتی ہو یا ادبی ہر زاویہ نظر سے بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ اس لڑائی کے پیچھے اسباب وعلل کا پورا ایک سلسلہ تھا لیکن یہاں صرف ادب سے متعلق بحث کی گئی ہے کوئی بھی ادب اپنے سماج سے متاثر ہوئے بغیر ایک قدم بھی آگے نہیں بڑھ سکتا۔ ہر دور کا ادب اس وقت کے سیاسی وسماجی اتار چڑھاؤ سے کسی نہ کسی نوعیت میں منسلک رہتا ہے۔ پھر یہ ہنگامہ جو مختلف تبدیلیوں کا باعث بنا جس کے اثرات سے ہندوستان ایک انقلابی موڑ سے دو چار ہوا۔ جہاں سماجی وسیاسی تبدیلیاں رونما ہوئیں وہاں ادبی اعتبار سے بھی یہ غدر بہت متاثر کن ثابت ہوا۔ غدر سے پہلے اردو ادب ایک دوسرے ہی ماحول سے دوچار تھا۔ شاعروں اور ادیبوں کے سر پرست عام طور پر امیر اور رئیس لوگ ہوا کرتے تھے۔ سماج میں نرمی، شیرینی اور آسودگی تھی۔ آرام پسندی اور عیش وعشرت معاشرے کا حصہ تھا۔ جاگیردارانہ، سرمایہ دارانہ نظام کے اثرات غالب تھے۔ چنانچہ ادب میں بھی کچھ اس طرح کے عناصر اور اثرات دکھائی دیتے ہیں۔ پھر جب یہاں انگریز حاکم ہوئے رفتہ رفتہ ظلم وجبر کا دور دورہ ہونے لگا۔ اس کے جواب میں بغاوت کی آگ بھڑک اٹھی سارا شیرازہ بکھر گیا۔ ہر شے میں انقلاب آ گیا۔ پورے ہندوستانی سماج میں یہ تضاد اور انتشار پھیلتا گیا۔ ایسٹ انڈیا کمپنی اپنے ظلم کے شکنجے کستی چلی گئی۔ امتیازات بڑھتے گئے۔ دہلی اجڑ چکی تھی لکھنوی تہذیب انگریزوں کے پیروں تلے روندی جا چکی تھی۔ ایسے حالات میں ادب کیسے بچ سکتا تھا لہٰذا وہ بھی لپیٹ میں آیا۔ ادیب بھی پریشانی اور خستہ حالی کے بھنور میں پھنسے اور یہی خستہ حالی، افسردگی ہمیں اس وقت کے ادب میں نمایاں طور پر نظر آتی ہے کیوں کہ ادیب بھی اس سماج کا حصہ تھے وہ بھی ان حالات سے دوچار ہوئے چنانچہ اس عہد کے ادب میں نمایاں تبدیلیاں رونما

ہوئیں۔

مرزا غالب اس دور کے ادبی اور تمدنی روایات کے بہترین پیکر سمجھے جاتے ہیں۔ جو بعض مقامات میں انگریزی پالیسی کے معترف بھی تھے لیکن بغاوت نے انہیں بھی متاثر کیا۔ ان کی شاعری اور خطوط میں اس کے اثرات واضح طور پر دیکھے جاسکتے ہیں۔ خطوط غالب، داستان غدر از ظہیر دہلوی، تاریخ سرکشی بجنور اوراسباب بغاوت ہند از سرسید، تاریخ ہند از ذکا اللہ فغاں دہلوی، واجد علی شاہ، منیر شکوہ آبادی، بہادر شاہ ظفر، شیفتہ وغیرہ کی نظمیں جو دوران بغاوت لکھی گئی تھیں کافی اہم ہیں۔

یہ حقیقت ہے کہ بغاوت اچانک اٹھی اور دب گئی۔ ہنگامے ہوئے اور سرد پڑ گئے لیکن بغاوت کے بعد جو ہندوستانی عوام کا ذہن جاگا، دل میں بیداری آئی، اپنے آپ کو پہچاننے کی سمجھ آئی اور جب ان سب کے باوجود انگریزوں کے ظلم وزیادتی میں کسی طرح کی کمی نہیں آئی تو ساری بیداریاں متحد ہوگئیں اور اپنے آپ کو ایک سنجیدہ اور روشن راہ پر گامزن کر دیا، ذہن جاگا، فکر نے کروٹ لی خیالات روشن ہوئے اور ان سب کے نتائج غدر کے بعد آہستہ آہستہ نمایاں طور پر نظر آنے لگتے ہیں۔ ادب میں بھی اس طرح کی تبدیلیاں رونما ہوئیں ہنگامے سے ذرا پہلے اور ہنگامے کے وقت جو افسردگی، بے بسی، تاریکی اور ویرانی ادب میں ملتی ہے بغاوت کے بعد اس میں بھی تبدیلی آنے لگتی ہے۔ ۱۸۵۷ء کے بعد اردو ادب میں ایک نئی فکر، ایک نئے جوش ایک نئی تبدیلی، ایک نئی تحریر کا آغاز ہونے لگا۔ ادیبوں اور دانشوروں نے بھی سوچا کہ نئے خیالات سے ادب کو کافی فائدہ مل سکتا ہے۔ لہٰذا وہ مستقبل کی شمع روشن کرنے میں لگ گئے اور ادب میں رفتہ رفتہ ایک خاموش انقلاب کی شکل نظر آنے لگی مثنویوں کا دور ختم ہوا کیوں کہ اس کے مزاج کی فضا اب باقی نہ رہی۔ دربار اجڑ گئے تو قصیدے کا زوال آ گیا۔ نیا دور آیا تو مشغولیات بڑھیں۔ داستانیں مٹنے لگیں۔ فرد کے بجائے اب پورے سماج سے تعلق ہونے لگا۔ ادیب سنبھلے اور اپنے قلم کو فضولیات سے ہٹا کر زندگی کی حقیقتوں کی طرف موڑ دیا نیا دور اپنے ساتھ سائنس لایا۔ مغربی رجحانات لایا۔ بس ایسے ہی ماحول میں اردو ادب کے چند علم بردار سامنے آئے جنھوں نے فرسودہ ادب میں نئے خیالات، نئے احساسات اپنے قلم کے ذریعے دیے۔ غرض کہ اس بغاوت سے اردو ادب میں بے شمار تبدیلیاں رونما ہوئیں۔

علی گڑھ تحریک کے ذریعے اردو نثر کی ترقی کے لئے جو کام کیا گیا ہے وہ نا قابل فراموش ہے اردو نثر سر سید احمد خاں کی کاوشوں کی بدولت نہ صرف متاثر ہوئی بلکہ پروان بھی چڑھی اور آخر انیسویں صدی کی ہر ادبی تخلیق پر ان کے افکار و خیالات اور نثری نگارشات کا اثر نظر آتا ہے۔ نہ صرف اردو بلکہ مستقبل کی زبان کے لئے بھی نئی سمت مقرر کی۔

سر سید جو بنیادی طور پر مصلح تھے۔ انہیں جب اپنی آراء اور افکار کے اظہار کے لئے اردو کا دامن تنگ نظر آیا تو انھوں نے خود اپنا ایک جہانِ زبان و ادب تعمیر کر ڈالا۔ انھوں نے ارادی طور پر ایسے مضامین لکھے جن میں دلائل و شواہد کی ایک خاص منطقی ترتیب ہوتی ہے ان کی نثر تضاد سے پاک ہے عموماً عبارت آرائی، انشا پردازی اور روایتی محاسن نگارش کو اہمیت نہیں دیتے بلکہ اپنے مقصد کو صراحت اور سلاست سے بیان کرنا ضروری سمجھتے ہیں۔ سر سید نے اپنی تمام تر مصروفیات کے باوجود تصنیف و تالیف کے لئے وقت نکالا تاریخ، آثار قدیمہ، سیاست، صحافت، ادب، مذہب اور سائنس وغیرہ سے ان کی دلچسپی نے ان سے ہر طرح کے موضوعات و مضامین پر خامہ فرسائی کے مواقع فراہم کرائے۔ انھوں نے جس موضوع و مضمون کو بھی اپنے احاطۂ تحریر میں لیا، نہ صرف یہ کہ اس کا حق ادا کر دیا بلکہ سرگرم کارکنوں کی ایک جماعت بھی تیار کر دی جنہوں نے ایک نئے طرز فکر اور دبستان کی بنیاد ڈالی۔ انسٹی ٹیوٹ گزٹ اور تہذیب الاخلاق میں ان کے بے شمار مضامین شائع ہوئے یہ مضامین دو قسم کے تھے، علمی مضامین اور انشائیے۔ سر سید نے اپنے رسالوں اور تحریروں کے ذریعے اردو کے دوسرے ادیبوں کی توجہ ایسے ادب کی طرف مبذول کی جو تعمیری، اخلاقی اور افادی ہوں اور ان کے افکار و خیالات سے متاثر ہو کر ارباب علم و فن کا ایک ایسا حلقہ پیدا ہو گیا جو ان کا ہمنوا اور ہم مسلک بنا، جنھیں انھوں نے فکری سطح پر معروضی طرز اختیار کرنے اور سائنسی نقطہ نظر اپنانے کی دعوت دی۔ رفتہ رفتہ یہ حلقہ وسیع ہوتا گیا اور ان اہل قلم نے جس دبستان کی بنیاد ڈالی وہ علی گڑھ تحریک کے نام سے معروف ہوئی ان کے رفقا نے بھی سلیس و صاف زبان میں اظہار خیال کیا چنانچہ اس تحریک کے زیر اثر انیسویں صدی کی آخری تین دہائیوں میں اردو میں کئی ادیب سامنے آئے جن میں محسن الملک، وقار الملک چراغ علی، محمد حسین آزاد، نذیر احمد، الطاف حسین حالی، شبلی نعمانی اور ذکا اللہ وغیرہ کے نام اہم ہیں۔

وقار الملک بھی سائیٹیفک سوسائٹی کے سرگرم رکن تھے اور تعلیمی تحریک میں سید احمد خاں کے دوش بدوش کوشاں رہے۔ انھوں نے مغربی تعلیم کے ساتھ ساتھ مذہب کی تدریس کو بھی ضروری قرار دیا۔ ان کی تحریروں سے اردو نثر کی ترویج ہوئی ان کے اخلاقی اور اصلاحی مضامین انسٹی ٹیوٹ گزٹ اور تہذیب الاخلاق میں شائع ہوئے۔ انھوں نے کارلائل کی کتاب سے ''انقلاب فرانس'' کا اردو ترجمہ کیا۔ اور ان کے خطوط کا مجموعہ بھی سرسید اکیڈمی علی گڑھ سے طبع ہوا ہے۔ چراغ علی عربی، فارسی، انگریزی اور اردو زبانوں کے ماہر تھے۔ لاطینی اور یونانی سے بھی واقفیت تھی چونکہ انھیں اسلام سے غیر معمولی موانست تھی۔ انھوں نے عیسائیوں کی طرف سے اسلام پر کئے گئے اعتراضات کا مدلل جواب لکھا اور کئی انگریزی کتابوں کا اردو میں ترجمہ کیا جن میں ''محمد پیغمبر برحق'' ''تعلیقات'' ''تحقیق الجہاد'' ''اسلام کی دنیاوی برکتیں'' اور ''قدیم قوموں کی مختصر تاریخ'' وغیرہ اہم ہیں۔ محمد حسین آزاد نے ''آب حیات'' ''سخندان فارس'' ''قصص ہند'' ''دربار اکبری'' اور ''نیرنگ خیال'' جیسی تصانیف اردو ادب کے لئے یادگار چھوڑی ہیں منشی ذکاءاللہ بھی سائنٹفک سوسائٹی کے رکن ۱۸٦٦ء میں بنے۔ انھوں نے مغربی علوم کی کتابوں کے اردو تراجم کی پرزور تائید کی اور عملاً سوسائٹی کے اس مقصد کو تقویت پہنچائی۔ ان کی اکثر کتابیں انگریزی سے ترجمہ ہیں۔ ان کی تصانیف ریاضی، تاریخ ادب و فلسفہ اور جغرافیہ کے موضوع پر ہیں تدریسی رسالوں کے علاوہ ''تاریخ ہندوستان'' آٹھ جلدوں میں ان کا ایک اہم کارنامہ ہے۔

مولوی نذیر احمد بھی سرسید تحریک سے وابستہ تھے۔ اصلاح قوم کا جذبہ دونوں میں مشترک تھا۔ نذیر احمد نے اپنا سارا زور قلم اصلاح معاشرہ پر صرف کیا اور اس کے ایک جزو یعنی طبقہ نسواں کے حال زبوں کی طرف توجہ کی اور اپنے ناولوں کو ان کی تعلیم اور کردار کی درستی کا ذریعہ بنایا۔ ان کے چھ ناول ''مراۃ العروس''، ''رویائے صادقہ''، ''بنات النعش''، ''توبتہ النصوح''، ''فسانہ مبتلا'' اور ''ابن الوقت'' ہیں جنہیں اردو ادب میں بے پناہ مقبولیت حاصل ہوئی۔

مولانا حالی سے سرسید نے ''مسدس مدوجزر اسلام'' لکھوائی۔ حالی کی نظمیں نیچرل شاعری کا اعلیٰ نمونہ تھیں۔ ''مقدمہ شعروشاعری'' ان کا ایک اہم کارنامہ ہے ''حیات سعدی''، ''یادگار غالب'' اور ''حیات

جاوید'' بھی کافی اہمیت کی حامل ہیں۔شبلی نعمانی مدرسۃ العلوم علی گڑھ میں عربی زبان و ادب کے مدرس ۱۸۸۴ء میں مقرر ہوئے۔شبلی نے''المامون''،''الغزالی''،''الفاروق''،''شعرالعجم ''اور''موازنہ انیس و دبیر'' لکھ کر اردو نثر کو فروغ دیا۔غرض کہ علی گڑھ کے زیر اثر اردو نثر کی ترقی کی رفتار نہ صرف تیز ہوئی بلکہ اس میں نمایاں تبدیلیاں بھی رونما ہوئیں۔علی گڑھ تحریک نے علمی نثر کو بالخصوص فروغ دیا۔

اردو ناول کی بنیاد نذیر احمد کے ناول''مراۃ العروس'' سے پڑی جو ۱۸۶۹ء میں لکھا گیا۔مراۃ العروس نذیر احمد کا وہ شاہکار کارنامہ ہے جوان کی شہرت کا باعث بنا۔جب بھی اردو ناول کا ذکر کیا جائے گا تو نذیر احمد کا نام ضرور آئے گا کیوں کہ نذیر احمد ہی اس صنف کے بانی ہیں۔مراۃ العروس کا موضوع تعلیم نسواں ہے۔مولانا تعلیم نسواں کو اس لئے ضروری قرار دیتے ہیں کہ بچوں کی پرورش ونگہداشت کی ذمہ داری عورتوں پر ہے۔

کچھ فنی خامیوں کے باوجود مراۃ العروس ناول میں مافوق الفطرت عناصر سے گریز اور اس دور کی معاشرتی زندگی کی بھر پور عکاسی اس بات کا ثبوت ہے کہ نذیر احمد نے ناول کی داغ بیل ڈال کر یہ واضح کر دیا کہ ناول ہی اصلاح معاشرہ کا بہترین ذریعہ ہے بنات النعش ،ابن الوقت ،رویائے صادقہ ،توبتہ النصوح اور''فسانہ مبتلا'' بھی ان کے اہم ناول ہیں۔نذیر احمد کے بعد دوسرے اہم ناول نگار پنڈت رتن ناتھ سرشار ہیں ان کے ناولوں میں''فسانہ آزاد''''سیر کہسار''،''کامنی''،''پی کہاں''،''جام سرشار''،''خدائی فوجدار''، ''کڑم دھڑم'' وغیرہ کافی مقبول ہوئے سرشار انگریزی کے مطالعے سے صنف ناول سے واقف ہو چکے تھے اور اپنی تخلیقات کو انہوں نے ناول سمجھ کر ہی لکھا۔لیکن وہ کہیں لاشعوری طور پر ناول کی حدود سے نکلتے چلے گئے۔وہ اکثر لکھنؤ کی بھیڑ بھاڑ اور سرور کی زبان کے جادو میں اس قدر کھو جاتے ہیں کہ ان کی تحریر اپنے آپ کو ناول نگاری سے دور لے جاتی ہے۔بہر حال سرشار نے نذیر احمد سے بالکل الگ موضوع لے کر اپنی تخلیقات کے ذریعہ صنف ناول میں بہت اہم اضافے کئے جن کو کبھی فراموش نہیں کیا جا سکتا۔عبدالحلیم شرر نے اردو میں تاریخی ناول کی بنیاد ڈالی۔ان کے ناولوں میں''ملک العزیز ورجینا''،''حسن انجیلنا''،''منصور موہنا''،''قیس ولبنیٰ''،''ایام عرب''،''فردوس بریں''،''مقدس نازنین'' وغیرہ اہم ہیں۔''فردوس بریں''

اردو ناول کی ہیئت میں سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے ناول کا وہ آہنگ جس میں ناول کے پورے عناصر ترکیبی مل کر ایک مکمل تاثر پیدا کرتے ہیں اس ناول میں پلاٹ، کردار، مکالمے، ماحول، جذبات نگاری اور فلسفۂ حیات مل کر اردو ناول کی ہیئت میں ڈرامائی ناول نگاری کی بنیادیں مستحکم کیں۔''فردوس بریں'' میں بھی ڈرامائی ناول کا امتیازی وصف یعنی زندگی کے تجربات کی تصویر کشی ملتی ہے شرر کی ناول نگاری کی حیثیت مسلم ہے انہوں نے تاریخی ناول لکھے ہیں شرر چونکہ اسلامی جذبے سے سرشار تھے اس لئے ان کے یہاں اسلامی کردار مثالی بن کر سامنے آئے ہیں۔شرر دراصل ایمان وآگہی کے تقاضوں کو اپنے ناولوں کی تخلیق سے پورا کرنا چاہتے ہیں لہٰذا اس عقبی زمین میں وہ تجدید نہیں ہو پاتی۔جس کے وہ خواہاں ہیں۔اسلامی شعار مبالغے میں دب جاتا ہے اور تجدید اسلام کی اسپرٹ دم توڑ دیتی ہے مرزا محمد ہادی رسوا کے اہم ناولوں میں ''ذات شریف''، ''شریف زادہ''، ''اختری بیگم''، ''افشائے راز'' اور ''امراؤ جان ادا'' ہیں ان کی شہرت کا باعث ''امراؤ جان ادا'' ہی بنا، رسوا کے ناول مقصدیت کے حامل ہیں رسوا نے اپنے زمانے کی سماجی زندگی کے جملہ پہلوؤں کو اپنے ناولوں میں مہارت اور خوبی کے ساتھ پیش کیا ہے۔سماجی مسائل کو حالات و واقعات کے پیرائے میں پیش کیا ہے اردو ناول کی تاریخ میں ان کا نام ''امراؤ جان ادا'' کی وجہ سے کافی شہرت کا حامل ہے۔

باب دوم:۔''ریاست جموں وکشمیر میں اردو زبان وادب کا ارتقا اور ناول کی روایت'' کے عنوان سے قائم کیا گیا ہے۔ریاست جموں وکشمیر جو اپنے قدرتی حسن اور فطرت کی جادوگری سے مزین ہے کشمیر کے باغات، برف سے ڈھکی ہوئی خوبصورت پہاڑیاں، ڈل جھیل کا منظر، گلمرگ یا سونا مرگ کے وہ خوبصورت مقامات جو ہر راہگیر کو اور ہر سیاح کو اپنا گرویدہ بنا لیتے ہیں جس نے بھی اس وادی میں قدم رکھا اس نے اس کی خوبصورتی اور مسحور کن صورتحال کو قبائے سخن بنا کر پیش کیا۔مصنفین کے لئے ہمیشہ ہی کشمیر ایک محبوب موضوع رہا ہے مختلف شاعروں، ادیبوں اور سیاحوں نے کشمیر کو مختلف نام دیئے ہیں کسی نے اسے فردوس بریں کہا کسی نے جنت بے نظیر کہا ہے یہاں کی تاریخ پر نگاہ ڈالیں تو پتہ چلتا ہے کہ مشہور صوفی سید اشرف الدین عبدالرحمٰن بلبل ۱۳۳۶ء میں اپنے مریدوں اور عقیدت مندوں کے ساتھ کشمیر تشریف لائے۔

ان دنوں کشمیر کے راجاؤں کے آپسی جھگڑوں اور غلط کاموں کی وجہ سے سارا نظام بگڑ چکا تھا۔ ان حالات کے پیش نظر ہندو راجاؤں کو اقتدار سے ہاتھ دھونا پڑا اور لداخ کا ایک شہزادہ رینچن شاہ کے ہاتھوں بیعت ہو کر مسلمان ہو گیا۔ بلبل شاہ نے نام صدرالدین رینچن شاہ رکھا۔ رینچن شاہ کا ایک وزیر جو خود بھی مسلمان ہو گیا تھا فارسی زبان سے آشنا تھا۔ وہ دین کی باتیں سن اور سیکھ کر مقامی لوگوں میں اسلام کی تبلیغ کیا کرتا تھا۔ اس طرح قرآن و احادیث اور اسلامی تعلیمات کی وجہ سے عام کشمیری لوگ فارسی اور عربی زبانوں سے واقف ہونے لگے۔

اس طرح فارسی زبان کا چلن عام ہوتا گیا اور اس زبان نے عوام الناس میں اپنی جگہ بنائی اس کی بڑھتی ہوئی مقبولیت کے پیش نظر فارسی سرکاری زبان قرار پائی ڈوگرہ راجاؤں کے عہد تک ریاست میں فارسی ہی سرکاری زبان رہی۔ مہاراجہ گلاب سنگھ نے ۱۸۴۶ء میں برطانوی حکومت کے زیر اثر آ کر ریاست جموں و کشمیر کو ۷۵ لاکھ کے عوض خرید لیا تھا۔ جس کا اظہار علامہ اقبال نے اپنی شاعری میں بھی کیا ہے گلاب سنگھ نے جب حکومت سے دست برداری کے بعد ۱۸۵۶ء میں مہاراجہ رنبیر سنگھ کو حکومت سونپ دی۔ رنبیر سنگھ تقریباً ۲۹ برس حاکم رہے رنبیر سنگھ کے عہد میں بھی اگرچہ فارسی ہی سرکاری زبان رہی لیکن اس دور میں اردو زبان نے اپنے قدم مضبوط کئے۔ رنبیر سنگھ نے سنسکرت کالج، رنبیر لائبریری اور دارالترجمہ قائم کیا۔ اس کے علاوہ رنبیر سنگھ نے ''بدیا بلاس پریس'' کے نام سے ایک چھاپہ خانہ قائم کیا۔ جس سے دارالترجمہ میں ترجمہ شدہ کئی کتابیں شائع کی گئیں۔ ۱۸۸۵ء میں مہاراجہ رنبیر سنگھ کا انتقال ہوا تو مہاراجہ پرتاپ سنگھ ان کے جانشین ہوئے۔ ان کے عہد تک فارسی ہی سرکاری زبان تھی لیکن پرتاپ سنگھ نے اپنے دور حکومت میں ۱۸۸۸ء میں اردو کو سرکاری زبان کا درجہ دیا پرتاپ سنگھ نے عیسائیت تبلیغ کے ردعمل میں ''سناتن دھرم سبھا'' قائم کی تو سالک رام سالک نے کئی کتابچے لکھے جن میں مورتی منڈن، دھرم اپدیش، ارتھ شاستر، لغت اردو، محاورات اردو، داستان جگت روپ وغیرہ شامل ہیں ڈوگرہ دور حکومت میں ریاست میں پریس قائم کرنے اور رسائل اور اخبارات جاری کرنے پر پابندی تھی تو اہل کشمیر بیرون کشمیر کے دوسرے شہروں سے اخبارات و رسائل جاری کرتے تھے جن میں ''اخبار عام''، ''خیر خواہ کشمیر''، ''ہمدرد کشمیر''، ''کشمیری

گزٹ''، ''کشمیری مخزن''، ''صبح کشمیر''، ''بہار کشمیر'' وغیرہ اہم ہیں لیکن بیسویں صدی میں جموں وکشمیر سے ڈوگرہ حکومت کی اجازت کے مطابق پہلا اخبار ''رنبیر'' ۱۹۲۴ء میں جاری ہوا۔ جس کے اڈیٹر ملک راج صراف تھے۔ اس کے بعد کشمیر سے ''وتستا''، ''ہمدرد''، ''صداقت''، ''مارتنڈ''، ''وکیل''، ''حقیقت''، ''خالد'' اور ''خدمت'' وغیرہ اخبارات شائع ہوتے رہے جن میں مقامی ادباء وشعرا کی تخلیقات کو شائع کیا جاتا تھا۔ ۱۹۴۷ء کی تقسیم اور آزادی کے بعد متعدد اخبارات اور رسائل کا سلسلہ جاری ہوا جو آج بھی برقرار ہے آج کی تاریخ میں جموں وکشمیر سے ''شیرازہ''، ''حکیم الامت''، ''تعمیر''، ''بزم ادب'' اور ''تفہیم'' وغیرہ ادبی رسالے شائع ہو رہے ہیں ان اخباروں میں ادبی تخلیقات تحقیقی وتنقیدی مضامین کالم وغیرہ شائع ہوتے ہیں، حامدی کاشمیری، محمد یوسف ٹینگ، پروفیسر ظہور الدین، عرش صہبائی، سلطان الحق، رفیق راز اور شبیب رضوی کے علاوہ سیکڑوں شعرا اور ادبا اپنی نگارشات کے ذریعہ ریاست جموں وکشمیر میں اردو زبان وادب کو پروان چڑھانے میں مصروف ہیں چونکہ اردو ریاست کی سرکاری، درباری، دفتری اور کاروباری زبان بھی ہے اور ذریعہ تعلیم بھی ہے اگرچہ ریاست جموں وکشمیر میں اردو کو بعض مسائل کا سامنا ضرور ہے لیکن اس ریاست میں اردو کی جڑیں اتنی مضبوط ہیں کہ ریاست جموں وکشمیر میں اردو کا مستقبل تابناک اور محفوظ ہی نظر آتا ہے۔

ریاست جموں وکشمیر میں اردو ناول کی روایت زیادہ قدیم نہیں ہے لیکن پھر بھی یہاں جو ناول لکھے گئے ہیں وہ ریاست کو ملک کی دوسری ریاستوں کے مدمقابل لا کھڑا کرتے ہیں ریاست جموں وکشمیر میں اردو ناول کے ابتدائی نقوش اگرچہ آزادی سے پہلے بھی ملتے ہیں جس میں سالک رام سالک کی ''داستان جگت روپ'' اور ''تحفہ سالک'' کو اردو ناول کے ابتدائی نقوش قرار دیا گیا ہے اس کے علاوہ محمد دین فوق پنڈت نندلا، موہن لال مروہ، وشوا ناتھ ورما وغیرہ کے قصوں کو ابتدائی نقوش مانا گیا ہے لیکن وہ تمام ابتدائی نقوش فسادات کی وجہ سے تلف ہوگئے ہیں دستیاب شدہ ناولوں کے مطابق اردو کا پہلا باقاعدہ ناول ''اور انسان مر گیا'' (۱۹۴۸ء) ہے جو رامانند ساگر کی تصنیف ہے اس سے پہلے پریم ناتھ پردیسی نے اگرچہ ایک ناول ''پوتی'' کے عنوان سے لکھا تھا لیکن ۱۹۴۷ء کے فساد میں وہ شائع ہونے سے پہلے ہی تلف ہوگیا۔ اس اعتبار سے رامانند ساگر کو ہی اردو کا پہلا ناول نگار مانا جائے گا۔ رامانند ساگر کے بعد ریاست میں دوسرے ناول

نگاروں نے اس روایت کو آگے بڑھایا جن میں ٹھاکر پونچھی، حامدی کاشمیری، علی محمد لون وغیرہ شامل ہیں۔

باب سوم: ''ریاست جموں و کشمیر میں اردو ناول ۱۹۴۷ء سے ۱۹۷۰ء'' عنوان کے تحت قائم کیا گیا ہے اس باب میں چھ ناول نگاروں کو شامل کیا گیا ہے راما نند ساگر کا ناول ''اور انسان مر گیا'' ریاست جموں و کشمیر کا پہلا ناول ہے یہ ناول فسادات کے موضوع پر لکھا گیا ہے ناول چار حصوں پر مشتمل ہے پہلے حصے میں لاہور کے کشت وخون کی تفصیلات ہیں قومیت کے نام پر روا رکھی جانے والی تباہی اور غارت گری کو پیش کیا گیا ہے دوسرے حصے میں ہندوؤں مسلمانوں کے آپسی تضادات کو موضوع بنایا ہے اور پھر تیسرے حصے میں آنند جب مایوس ہو کر اپنے ہاتھوں سے اپنے بیوی بچوں کو ہلاک کرتا ہے اور لڑتے ہوئے جان دینے کے لئے نکل جاتا ہے اس کے علاوہ عورتوں پر کئے جانے والے ظلم و جبر کو بھی اس ناول میں دکھایا ہے۔

ٹھاکر پونچھی کا تعلق خطۂ جموں سے ہے ان کے ناولوں میں ''رات کے گھونگھٹ''، ''شمع ہر رنگ میں جلتی ہے''، ''قفس اداس ہے''، ''چاندنی کے سائے'' اور ''پیاسے بادل'' اہم ہیں۔ ''رات کے گھونگھٹ'' ناول میں سماج کے ٹھیکیداروں کے راز فاش کئے گئے ہیں ٹھاکر پونچھی نے حقیقت کو ہو بہو نقل کر دیا ہے سماج کے چہرے سے پارسائی کے پردوں کی نقاب کشائی کرنے کی کوشش کی ہے ناول نگار نے ایسے کرداروں کو تراشا ہے جو بظاہر نیکی اور شرافت کا لبادہ اوڑھے رہتے ہیں اور بہ باطن انسان کو فریب کے جال میں پھنسانا چاہتے ہیں غرض کہ ناول نگار نے مختلف کرداروں کے ذریعے نئے سماج میں پنپ رہے ناسور کی طرف اشارہ کیا ہے۔ ''شمع ہر رنگ میں جلتی ہے'' ناول دراصل ایک مصور کا المیہ ہے اس میں ان کا درد و کرب اور سماج کے ہاتھوں ان پر روا رکھے جانے والے سلوک کی کہانی کو بہترین انداز میں پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے ''قفس اداس ہے'' ٹھاکر پونچھی کا مشہور سوانحی ناول ہے اس ناول میں غلام رسول سنتوش کی زندگی کو پیش کیا گیا ہے یہ ناول ایک دکھ بھری کہانی ہے جس کے لفظ لفظ میں مصنف کا حساس اور دردمند دل دھڑک رہا ہے ''چاندنی کے سائے'' ناول میں بعض اہم سماجی اور جاگیردارانہ نظام کے مسائل کو موضوع بنایا ہے ناول میں طبقاتی کشمکش اور سماج کے فرسودہ روایات کو بھی نشانہ بنایا گیا ہے ''پیاسے بادل'' ناول میں سماج کے اندر پنپنے والی برائیوں کو پیش کیا گیا ہے اور حقیقت کو عیاں کرنے کے لئے ناول کو ذریعہ بنایا ہے ٹھاکر پونچھی نے

اپنے ناولوں میں اس عہد کے مسائل کو بڑی باریکی سے پیش کیا ہے ٹھاکر پونچھی کے ناول فن کے اعتبار سے بھی کامیاب ناول ہیں پلاٹ، کردار نگاری، منظر کشی، مکالمہ نگاری میں ٹھاکر پونچھی نے فنی چابکدستی سے کام لیا ہے علی محمد لون ناول ''شاید ہے تیری آرزو'' میں دلی کے اس علاقے کو موضوع بنایا ہے جس کی فضا اور جس کی طرز زندگی بداخلاقیات کی غلاظت سے غلیظ ہو چکی ہے سماج میں دین ودھرم، ذات پات رنگ ونسل اور غریب اور امیر کی بنیادوں پر انسانوں کو تقسیم کیا جاتا ہے اس فرق سے لوگوں کے دل سے محبت، ہمدردی، خلوص اور انسان دوستی کا جذبہ بالکل ختم ہو گیا ہے ناول کا پس منظر یہی ہے۔ غلام رسول سنتوش کا ناول ''سمندر پیاسا ہے'' بہت اہم ہے اس ناول میں سنتوش نے بڑی بے رحمی کے ساتھ انسان کے باطن میں موجود ہوسنا کی اور زہرنا کی کو ابھارا ہے یہاں زندگی کو ایک روگ کہا گیا ہے یہ روگ انسان کے باطن میں پرورش پاتا ہے یہ خود پرستی، بوالہوسی اور لذت پرستی کا روگ ہے۔ یہاں محبت کی ناکامی کو بھی موضوع بنایا گیا ہے۔

سماج میں رائج کردہ غلط تصورات کتنے نقصان دہ ثابت ہوتے ہیں۔ جو ایک انسان کی جان لے لیتے ہیں کشمیری عوام کے غلط تصورات اور توہمات کے خلاف سنتوش کا یہ ناول ایک احتجاج بھی ہے۔ یہ ناول فنی اور موضوعی دونوں اعتبار سے کامیاب ہے حامدی کاشمیری کے ناولوں میں ''بہاروں میں شعلے''، ''اجنبی راستے'' اور ''بلندیوں کے خواب'' شامل ہیں۔ ''بہاروں میں شعلے'' ناول میں کشمیری عوام کی زندگی کو موضوع بنایا گیا ہے ناول نگار نے سماجی ومعاشرتی زندگی کے مسائل کے علاوہ سیاسی صورتحال اور ڈوگرہ تانا شاہی کے خلاف تحریک کو بھی اس ناول میں پیش کیا ہے ناول نگار نے کشمیری عوام کے مسائل اور کشمیری سماج میں پائی جانے والی برائیوں کو اجاگر کر کے ان کی اصلاح کرنے کی ایک کوشش کی ہے سماجی مسائل کی تصویر کشی کر کے اس سماج کی اصلاح کرنا حامدی کاشمیری کا مقصد تھا۔ ناول فنی اعتبار سے بھی ایک کامیاب ناول ہے منظر کشی کے بہترین نمونے ناول میں ملتے ہیں ''اجنبی راستے'' حامدی کاشمیری کا ایک اہم ناول ہے اس ناول میں ناول نگار نے ایک متوسط طبقے کے ایک مسلم گھرانے کی زندگی کو موضوع بنایا ہے اس طبقے میں محبت کی جو قدر و قیمت ہے خودداری کا جو عنصر ہے تضاد کی جو صورت ہے اور توہمات کے جو بت ہیں وہ صاف طور پر ہمارے سامنے آتے ہیں متوسط طبقے کی گھریلو زندگی کے بے تکلف ماحول کو ناول میں دیکھا جا سکتا ہے۔ یہ حامدی

کاشمیری کا کمال ہے کہ کرداروں کو عام زندگی اور عام ماحول کا نمائندہ بناتے ہیں۔ان کے کردار متوسط طبقے کے مرد اور عورت ہیں کہانی میں جو مسائل ملتے ہیں وہ کشمیر کے متوسط طبقے کے مسائل ہیں ناول میں عوامی زندگی کے ایک اہم مسئلے بچپن کی شادی کو موضوع بنایا گیا ہے لیکن اس سماجی مسئلے کو پیش کرتے ہوئے کئی دوسرے مسائل کی طرف بھی اشارہ کر دیا گیا ہے۔ناول کا پلاٹ سیدھا سادہ اور عام فہم ہے۔کہانی بیانیہ ہے واحد متکلم کی تکنیک میں بیان کی گئی ہے ناول ''بلندیوں کے خواب'' کو عشقیہ داستان کے طور پر پیش کیا گیا ہے ناول میں پہاڑوں، بادلوں اور ہواؤں کے طوفانی پہلوؤں کو دکھایا گیا ہے کہ انسان فطرت کے قہر و غضب کا کس طرح شکار ہوتا ہے اس میں انسان کو قدرت کے سامنے بے بس اور مجبور دکھایا گیا ہے ساتھ ہی انسان کی ہمت و کاوش کے ذریعے فطرت کے طوفانی پہلوؤں سے نبرد آزما ہونے کے مناظر کی عکاسی بھی کی گئی ہے وہ پہاڑوں کو عبور کرتا اور برفیلی آندھیوں سے راستہ نکالتا ہے لیکن انسانی سماج میں جو خرابیاں ہیں اونچ نیچ ہے جو استحصال ہے وہ اس کے خوابوں اور ارادوں کو پامال کر دیتا ہے انسان فطرت پر تو قابو پا لیتا ہے مگر وہ سماجی برائیوں کو دور نہیں کر سکتا ہے اور غم والم کا شکار ہو جاتا ہے۔پریشانیوں سے دوچار ہوتا ہے۔یہی ناول کا موضوع ہے جو پورے ناول میں نظر آتا ہے ناول کا پلاٹ مربوط ہے کردار نگاری، مکالمہ نگاری اور منظرکشی میں بھی حامدی کاشمیری نے فنی چابکدستی سے کام لیا ہے ناول موضوع اور فن دونوں اعتبار سے ایک کامیاب ناول ہے۔حامدی کے ناولوں کے پلاٹ میں جغرافیائی حقیقت اور مقامی رنگ کی عکاسی ملتی ہے حامدی کاشمیری نے اپنے ناولوں کے پلاٹ کی تعمیر میں وادی کشمیر کا سہارا لیا ہے۔انھوں نے نالوں کے پلاٹ میں جموں و کشمیر کے خوبصورت مقامات، جھیلوں، باغوں اور دریاؤں وغیرہ کے صحیح نام اور سچی تصویریں پیش کی ہیں۔پلاٹ کی تشکیل میں حامدی کاشمیری نے اپنی فنی مہارت کا ثبوت دیا ہے حامدی کے ناولوں کے کردار بھی حقیقی زندگی سے قریب تر معلوم ہوتے ہیں انھوں نے اپنے ناولوں میں جو کردار پیش کئے ہیں وہ اسی معاشرے سے تعلق رکھتے ہیں منظرکشی میں بھی حامدی کاشمیری نے فنی چابکدستی سے کام لیا ہے ماحول کی عکاسی ان کے ناولوں میں بھی دلچسپی کی ایک اور وجہ ہے مکالمہ نگاری میں بھی بڑی فنی مہارت کا ثبوت دیتے ہیں حامدی کے ناول اسلوب کے اعتبار سے بھی کافی دلکش اور دلچسپ ہیں۔

وجے سوری کا تعلق صوبہ جموں سے ہے ان کا نام ان کے ناول ''ایک ناؤ کاغذ کی'' کی وجہ سے مشہور ہے یہ ناول دراصل ایک ادیب، قلم کار پال کی محبت کی ناکامی کی داستان ہے لیکن کہانی میں دلچسپی کا عنصر باقی رہتا ہے پال جو ایک ادیب ہے ناول اور شاعری میں اس کی خصوصی دلچسپی ہے اس کے اندر تخلیقی صلاحیت بدرجہ اتم موجود ہے وجے سوری نے پال کا جو نقشہ کھینچا ہے وہ صرف پال جیسے ادیب کا نقشہ نہیں بلکہ ہمارے ملک کے تمام ادیبوں کے لئے وہ موزوں ہے ناول کا پلاٹ صاف اور سپاٹ ہے کہانی میں کوئی بھی جھول نہیں ملتا۔ پال اور جوالا کے علاوہ بھی ناول کے کئی کردار ملتے ہیں جو ضمنی ہیں بہر حال ناول کا ہیرو پال اور ہیروئن جوالا ہی ہے زبان و بیان کے اعتبار سے بھی یہ کامیاب ناول ہے اسلوب بیان نہایت دلکش ہے مکالمہ نگاری میں بھی وجے سوری نے کمال دکھایا ہے غرض وجے سوری کا یہ ناول فنی اور موضوعی دونوں اعتبار سے کامیاب ناول ہے۔

باب چہارم: ''ریاست جموں و کشمیر میں اردو ناول ۱۸۷۱ء سے ۲۰۰۰ء تک'' کے عنوان کے تحت قائم کیا گیا ہے اس باب میں جان محمد آزاد، عبدالغنی شیخ، شبنم قیوم، نور شاہ، زینت فردوس، عمر مجید، جیوتیشور پتھک اور فاروق رینزو کے ناولوں کو شامل کیا گیا ہے جان محمد آزاد کا تعلق سری نگر سے ہے ان کا ناول ''وادیاں بلا رہی ہیں'' بہت مشہور ہے اس ناول کا موضوع کچھ نیا نہیں اس میں کرشن چندر کے زیر اثر کشمیر کے ایک پہاڑی علاقے ''کاغان'' کے پس منظر میں سماجی زندگی کے تضاد اور شکست اور محرومی کو اپنا موضوع بنایا ہے۔ ناول نگار نے سماج کے مختلف طبقوں کے درمیان تصادم، کوہستانی علاقوں کے لوگوں کی سادگی، خلوص، خوابوں اور آرزؤں کی کہانی کو پیش کیا ہے جان محمد آزاد نے کشمیر کے خوبصورت مناظر کے علاوہ کشمیر کی غریب عوام کی زندگی کے مسائل کو بڑے موثر انداز میں پیش کیا ہے۔ ''کشمیر جاگ اٹھا'' میں بھی کشمیر کے ایک دور افتادہ علاقہ کو موضوع بنایا ہے ناول میں مطلق العنانیت کے تاریک ترین دور میں استحصال اور جبریت کے ہاتھوں مظلوموں اور بے زبان انسانوں کی کہانی پیش کی گئی ہے ''ظلمات کے مسافر'' ایسے نامراد لوگوں کی کہانی ہے جو موت کی وادیوں سے بے لگام عفریتوں کی طرح رات کے سینے پر بدی کے سفیر اور فن کی پکار بن کر چھا گئے۔ ناول موضوع اور فن دونوں اعتبار سے بہترین ناول ہے ناول کا پلاٹ مربوط ہے

کردار نگاری، منظر کشی اور مکالمہ نگاری میں بھی ناول نگار نے فنی چابکدستی سے کام لیا ہے ''برفیلے لمحوں کا جنگل'' ایک جاسوسی ناول ہے اس ناول میں ایک بین الاقوامی زیر زمین گینگ کی کہانی کو پیش کیا گیا ہے اس گینگ کا بگ باس کے۔ کے ہے جو ہر وقت لوگوں کی آنکھوں میں دھول جھونکنے میں مہارت رکھتا ہے یہ گینگ اپنی سرگرمیوں کا مرکز کشمیر کے ایک صحت افزا مقام گلمرگ کو بناتا ہے اس جگہ کا انتخاب اس لئے کیا جاتا ہے کہ یہاں دنیا کے مختلف حصوں سے لوگ سیاحت کے لئے آتے ہیں غیر قانونی منشیات کی تجارت اس گینگ کا خاص بزنس ہے۔

عبدالغنی شیخ کا تعلق لداخ سے ہے ان کے دو ناول ''وہ زمانہ'' اور ''دل ہی تو ہے'' ہیں ''وہ زمانہ'' ناول میں لداخ کے رسم و رواج، رہن سہن، تہواروں اور میلوں کا ذکر ملتا ہے یہ ایک نیم تاریخی ناول ہے اس ناول کے مطالعے سے قدیم و جدید لداخ کی تہذیب و تمدن، رہن سہن، طرز معاشرت، تعلیم و تربیت وغیرہ سے متعلق پوری جانکاری حاصل ہوتی ہے ان کا دوسرا ناول ''دل ہی تو ہے'' لیہہ کے پس منظر میں لکھا جانے والا پہلا رومانی ناول ہے۔ خطۂ لداخ کے ننگے پہاڑ اور ریتیلے میدان جو صدیوں سے خاموش اور گم سم تھے۔ اچانک سیاحوں کی آمد سے جاگ اٹھتے ہیں سیاحوں کی آمد سے جہاں متعدد لوگوں کی اقتصادی خوشحالی یقینی بن جاتی ہے وہیں اس سرزمین کے لوگوں کا ذہنی سکون، ان کی انفرادیت اور معصومیت مجروح ہونے لگتی ہے ناول کا پلاٹ مربوط ہے عبدالغنی شیخ نے عالمی ادب کے شاہکار ناولوں کا مطالعہ کیا ہے اور ان سے فیض حاصل کیا ہے انہیں پوری طرح اس بات کا احساس تھا کہ پلاٹ ناول کی ریڑھ کی ہڈی ہے یہ نہ ہو تو ناول کی عمارت اٹھ نہیں سکتی۔ عبدالغنی شیخ کے دونوں ناول اپنے موضوع اور فن کے اعتبار سے بھی کامیاب ناول ہیں۔

شبنم قیوم کا تعلق سرینگر سے ہے ان کا ناول ''زندگی اور موت'' جذباتیت اور انقلاب پسند رومانیت کا ایک دلچسپ امتزاج ہے ناول اگرچہ اپنے موضوع کے اعتبار سے ایک بہترین ناول ہے لیکن فنی اعتبار سے دیکھا جائے تو کچھ کمزور نظر آتا ہے یہ ابتدائی کوشش تھی اس لئے ناول نگار فن پر توجہ نہیں دے پائے۔ ''چراغ کا اندھیرا'' ناول میں غنڈہ گردی کے ایسے دور کو موضوع بنایا گیا ہے جب رہبر رہزن بن گئے تھے۔ یہاں انھوں نے اس قسم کے سیاہ کارنامے یا حرکتیں کرنے والے حاکموں اور سیاسی ٹھیکیداروں پر ایسی ضربیں

لگائیں ہیں جن سے قاری متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ ناول میں وہ تمام صفات موجود ہیں جو ایک عمدہ اور معیاری ناول کے لئے ضروری تصور کی جاتی ہیں۔ تجسس اور سنسنی خیزی، بدی کی ناکامی اور اچھے لوگوں کی فتح اس ناول کا بنیادی موضوع ہے۔

''یہ کس کا لہو ہے، کون مرا'' شبنم قیوم کا نیم تاریخی اور سیاسی ناول ہے ناول کا موضوع کشمیر کی سیاسی تاریخ ہے ناول کا پس منظر ۱۹۴۷ء کے بعد ریاست جموں وکشمیر میں پیدا ہونے والے حالات وواقعات پر مبنی ہے تقسیم کے بعد جہاں ایک طرف پاکستان نے قبائلی فوج کو وادی بھیج کر یہاں کی اینٹ سے اینٹ بجا دی تھی تو دوسری طرف مہاراجہ ہری سنگھ اور شیخ محمد عبداللہ کی درخواست پر ہندوستان کی افواج کو قبائلوں کے مقابلے میں صف آرا ہونا پڑا غرض ناول میں آزادی کے بعد کی سیاسی صورتحال کا نقشہ ناول میں ملتا ہے شبنم قیوم کا یہ ناول تمام فنی تقاضوں کو پورا کرتا ہے موضوع کی جدت کی بنا پر ناول بہت مقبول ہوا اور بہت تیزی سے فروخت ہوا۔ کشمیر کی تاریخی اور سیاسی سچائی کو ناول نگار نے اپنے ناول میں پیش کر کے ایک اہم کارنامہ انجام دیا ہے۔ نور شاہ کا تعلق سرینگر سے ہے ان کے ناول ''قفس اداس ہے''، ''آؤ سو جائیں'' اور ''لمحے اور زنجیریں'' ہیں۔ ''قفس اداس ہے'' وادی کے معتبر فکشن نگار جناب نور شاہ کے زور قلم کا نتیجہ ہے۔ نور شاہ فن کی کرشمہ سازیوں پر بھروسہ رکھتے ہیں اور زندگی وسماج کے تمام مسائل کا حل فن ہی میں ڈھونڈتے ہیں انہیں اس بات کا کامل یقین ہے کہ فنون لطیفہ انسانی زندگی کے بے شمار مسائل کا حل نہیں نور شاہ ترقی پسند تحریک سے لکھ رہے ہیں اور وہ ادب کے بدلتے رجحانات سے پوری طرح واقف ہیں جدیدیت کی گھن گرج کو انہوں نے محسوس بھی کیا ہے اور اظہار ذات کے لئے بروئے کار بھی لایا ہے۔ ''آؤ سو جائیں'' ناول میں مصنف نے جنسی ونفسیاتی خواہشات کے ساتھ ساتھ کشمیر کی نیم تاریخ کو بھی علامتوں اور اشاروں کے تحت بیان کیا ہے ناول میں عشق ومحبت کے قصے، احباب کے بچھڑنے کا غم اور کشمیر کی عوام پر ہوئے ظلم وستم وغیرہ جیسے چھوٹے چھوٹے واقعات کا بیان ملتا ہے اور واقعات کے علاوہ کشمیری لیڈروں پر طنز، فرقہ پرستوں سے دور رہنے کا سبق، حب الوطنی کا جذبہ اور آپسی بھائی چارے کا پیغام ملتا ہے۔ اس کے علاوہ ایک بدکردار عورت کا کردار تراش کر ناول نگار نے یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ بدکردار عورتوں سے دور رہنا چاہئے۔ نور

شاہ نے ناولٹ میں کرداروں کی خارجی اور باطنی دنیا کو کبھی براہ راست اور کبھی بلا واسطہ طور پر بڑی باریک بینی سے پیش کیا ہے نور شاہ کا اسلوب اکثر ایک دلکش استعاراتی فضا کی تشکیل بھی کرتا ہے جو ان کے مخصوص رومانی مزاج سے ہم آہنگ ہے ''لمحے اور زنجیریں'' ناول کے ذریعے معاشرے میں پائی جانے والی ایسی برائیوں اور خامیوں کو اجاگر کیا ہے کہ جن سے ہندوستانی تہذیب و معاشرت کی توہین ہوتی ہے قارئین کو ان برائیوں سے بچانے اور خامیوں کو دور کرنے کا سبق ملتا ہے فنی اعتبار سے نور شاہ کے تینوں ناول بہت کامیاب ہیں۔ ان کے ناولوں میں قصہ، پلاٹ، کردار نگاری مکالمہ نگاری، منظر کشی اور زبان و بیان کا استعمال بڑی فنی چابکدستی سے کیا گیا ہے۔

زینت فردوس ریاست جموں و کشمیر کی خواتین ناول نگاروں میں پہلا نام ہے ان کا ناول ''نئی سحر'' اپنے موضوع کے اعتبار سے بہت اہمیت کا حامل ہے۔ ناول کا موضوع انسانیت اور اتحاد کے اقدار کا اظہار کرتا ہے۔ انسان دوستی، تفریق کا خاتمہ، دوستی، محبت، اخوت، بھائی چارہ آپسی میل جول اور ایک دوسرے کو برداشت کرنے کی قوت کی بہترین مثالیں ناول میں پیش کی ہیں اس ناول میں بارہا ایسے واقعات رونما ہوتے ہیں جن سے ہمارے جذبات کی تطہیر ہوتی ہے ناول اپنے موضوع کے اعتبار سے بہترین ناول ہے لیکن ناول کی بے جا طوالت اور پیچیدگی ناول کی کمزوری بن جاتی ہے ناول چند فنی خامیوں کے باوجود کامیاب ناول ہے ناول کی پوری کہانی میں انسان دوستی اور ہندو مسلم اتحاد و بھائی چارگی کی فضا چھائی ہوئی نظر آتی ہے۔ عہد حاضر میں اس ناول کی اہمیت اور بھی بڑھ جاتی ہے۔ عمر مجید کا ناول ''یہ بستی یہ لوگ'' گاؤں کی زندگی پر مبنی ہے ناول میں گاؤں کی زندگی کے مسائل کو دیکھ کر یہاں کی مصیبت زدہ عوام کے دکھ درد کی تصویر کشی بڑی فنکاری سے کی ہے ناول میں جلنور گاؤں کے پس منظر میں پورے کشمیر کے گاؤں کی درد بھری اور کراہتی زندگی کو پیش کرنے کی کوشش کی ہے ان کے اس ناول میں سرمایہ داروں اور جاگیرداروں کے ہاتھوں کئے جانے والے ظلم کو بھی بیان کیا گیا ہے عمر مجید کا یہ ناول اپنی تمام فنی خوبیوں کے باعث ایک کامیاب ناول ہے موضوع کے اعتبار سے بھی ناول کافی دلچسپ ہے مکالمہ نگاری اور منظر کشی میں بھی ناول نگار نے کمال دکھایا ہے۔

جوتیشور پتھک کا تعلق جموں سے ہے ان کے تین ناول ہیں ''ہجوم''، ''میلی عورت'' اور ''کھڑکیاں''۔ ''ہجوم'' ناول میں سیاست دانوں کا نئی نسل کے ساتھ استحصال کو پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے نوجوان اور معصوم لوگوں کو سیاست کے دلدل میں کس طرح پھنسانے کی مذموم کوشش ہوتی ہے ''میلی عورت'' کا موضوع سماجی قدروں کی پامالی ہے ہمارے سماج میں روز بروز خود غرضی، موقع پرستی اور بناوٹ میں اضافہ ہورہا ہے سائنس دان زمین کی حدود سے پار چاند تاروں اور سیاروں پر کمند ڈال رہے ہیں مگر آج کے انسان کا وجود اتنا ہی سکڑ کر محدود ہوتا جارہا ہے آج کا انسان اپنی غرض پوری کرنے کے لئے نہ اخلاقی قدروں کا خیال کرتا ہے نہ ہی آپسی رشتوں کی پرواہ کرتا ہے۔ ''کھڑکیاں'' ناول کا موضوع ایک اہم مسئلہ ہے سیاست اخلاقی دیوالیہ پن کا ذریعہ بن چکی ہے اور نئی نسل کو اپنے مقصد کے لئے استعمال کیا جارہا ہے اس طرح نئی نسل کا اہم مستقبل تباہ کررہے ہیں مجموعی طور پر جیوتیشور پتھک کے تینوں ناول اپنے موضوع اور فن کے اعتبار سے بہترین ناول ہیں۔

فاروق رینزو کا تعلق سرینگر سے ہے ان کا ناول ''زخموں کی سالگرہ'' بہت مشہور ہے ناول میں موجودہ دور کے اہم مسئلے کو موضوع بنایا گیا ہے یہ مسئلہ طلبا کی بے چینی اور اضطراب ہے طالب علم دن بدن مایوسی کا شکار ہوتے جاتے ہیں۔ اس انتشار، مایوسی اور ناامیدی کی کئی وجوہات ہیں عہد حاضر میں ٹوٹتی ہوئی انسانی قدریں اور ہماری زندگی کی پیچیدگیاں ایک اہم وجہ ہے۔ ''انقلاب کا شہید'' ناول میں ناول نگار نے ان جیتے جاگتے کرداروں کے ذریعے جوحق پر ہیں سچ پر ہیں اور اپنی بات ظالموں کے ظلم کی پرواہ کئے بنا سچ سچ کہتے ہیں پورے معاشرے کی یعنی کشمیری عوام کی زندگی کی درد بھری داستان بڑے موثر انداز میں پیش کی گئی ہے ناول اپنے تمام فنی تقاضوں کو پورا کرتا نظر آتا ہے ''کشمیر جھیل جلتی ہے'' ناول کے ذریعے سرزمین کشمیر میں پروان چڑھ رہی بدعنوانیوں، لاقانونیت اور بدحالی کی تصویر دکھانے کی کوشش کی گئی ہے ناول میں فاروق رینزو نے ریاکاروں اور مکاروں کے چہرے سے نقاب اتارنے کی کوشش کی ہے

باب پنجم: ''ریاست جموں وکشمیر میں اردو ناول ۲۰۰۰ء سے تاحال'' کے عنوان سے قائم کیا گیا ہے اس باب میں آنند لہر، ترنم ریاض، عبدالرشید راہگیر، شبنم قیوم، وحشی سعید، حامدی کاشمیری اور شفق سوپوری کے

ناولوں کا شامل کیا ہے۔آنند لہر کا تعلق خطہ جموں سے ہے ان کا ناول ''اگلی عید سے پہلے'' سرزمین کشمیر کی ایک درد بھری داستان ہے یہ درد بھری داستان ۱۹۴۷ء سے ۱۹۹۶ء تک کی ہے جو نصف صدی پر پھیلی ہوئی ہے ناول فنی اعتبار سے بھی کامیاب ناول ہے۔''سرحدوں کے بیچ'' ناول کے لئے آنند لہر نے جس موضوع کا انتخاب کیا ہے وہ بے حد جذباتی ہے ہر حساس انسان سرحد کی پابندیوں کی وجہ سے دل برداشتہ ہو جاتا ہے جہاں نہ کوئی رشتہ ہے نہ کوئی رشتہ دار ہے سرحد لوگوں کے دلوں کو جوڑنے سے معذور ہے سرحد کے قریب رہنے والے لوگوں کی زندگی کی عکاسی ملتی ہے کشمیر کے پس منظر میں لکھا گیا یہ ناول سرحد کے قریب رہنے والے لوگوں پر مبنی ہے جو اس پورے علاقے کو اپنا مانتے ہیں ''مجھ سے کہا ہوتا'' ناول میں جانوروں اور پرندوں کے ذریعے تباہی و بربادی کے المیے کو پیش کیا گیا ہے جن میں حال و ماضی اور مستقبل سبھی زمانے شامل ہیں یہ ناول بہت سے انسانی مسائل کا بھی احاطہ کرتا ہے جو آفاقی نوعیت کے حامل ہیں مثلاً ملکوں کی آپسی رنجشیں، نسلی امتیازات، رشتوں کا زوال، ان کی بے حرمتی، انسان کی کم ظرفی، خود غرضی، امیر قوموں کے ہاتھوں غریبوں کا استحصال، بارود کے دھوئیں سے ہونے والی زمینی تباہیاں وغیرہ جیسے مسائل شامل ہیں ''یہی سچ ہے'' ناول میں زندگی کے حقائق کو فلسفیانہ انداز میں مختلف کرداروں اور واقعات کے ارتباط سے بڑے ہی موثر انداز میں پیش کیا گیا ہے اور یہ دکھایا ہے کہ عصر حاضر میں کوئی ایسا شعبہ نہیں جہاں رشوت خوری، بے ایمانی، استحصال نہیں ہے مجموعی طور پر آنند لہر کے سبھی ناول چند فنی کمزوریوں کے باوجود کامیاب ناول ہیں۔

ترنم ریاض کا ناول ''مورتی'' ازدواجی زندگی کی ناکامی اور اس ناکامی کے اسباب پر مبنی ہے ملیحہ نامی ایک لڑکی جو مجسمہ ساز ہے جو طرح طرح کے مجسمے بناتی ہے اور لوگ اس کے فن کو دیکھنے اور مجسمے خریدنے دور دور سے آتے ہیں ناول نگار اس ناول میں مجسمہ تراشی سے ملیحہ کے گہرے عشق کے سہارے قاری کو وادی کشمیر کے خوبصورت تاریخی وثقافتی مراکز کی سیر کراتی ہیں اس کے ساتھ ہی یہ بھی بتانے کی کوشش کی ہے کہ کس طرح ایک فن کار کے فن کی ناقدری کے سبب وہ اپنا دماغی توازن کھو بیٹھتا ہے ''مورتی'' ناول کا پلاٹ مربوط ہے منظر کشی کی بھی بہترین مثالیں ملتی ہیں اسلوب، کردار نگاری اور مکالمہ نگاری میں بھی ناول نگار نے

فنی چابکدستی سے کام لیا ہے۔''برف آشنا پرندے'' ناول میں زمانی و مکانی تناظر کی حدتک خطہ کشمیر کے لازوال حسن، اس کی زخم خوردہ روح، قوت تحمل ماضی کی خوابیدہ گزرگاہوں اور حال میں زندگی کے افق پر نئی تاب وتپش اور معنویت پر مبنی ایک کبھی نہ ختم ہونے والی کہانی ہے کشمیر کی روزمرہ زندگی، کشمیر کی قدرتی خوبصورتی، وہاں کے پکوان اور طرز زندگی کی تصویر کشی کی گئی ہے ناول تاریخ کا ایک آئینہ ہے جس میں کشمیر کی شناخت کشمیری افراد کے مصائب، کشمیر کے تہذیبی احیا کو دیکھا اور محسوس کیا جا سکتا ہے یہ ناول اپنے موضوع، پلاٹ، کرداروں، مکالمات، پرندوں، نباتات، خوبصورت تاریخی عمارتوں اور مختلف جذبوں کی کیفیات کے باوصف ایک اہم ناول نظر آتا ہے۔

عبدالرشید راہگیر کا تعلق خطۂ لداخ سے ہے ان کا ناول''احساس''لداخ کے پس منظر میں لکھا گیا ہے اور اسی مقصد کے تحت عبدالرشید راہگیر نے لداخی رسم ورواج اور تہذیب وتمدن کے تحفظ اور اسے نئی نسل میں منتقل کرنے کی کوشش کی ہے اس کے علاوہ لداخ میں اردو زبان وادب کو فروغ دینا اور نوجوان نسل کو اس کی طرف مبذول کرنا ہے۔ ناول موضوع وفن دونوں اعتبار سے ایک مکمل ناول ہے شبنم قیوم کے ناول ''پچھتاوا'' کا موضوع آج کے ترقی یافتہ سائنسی وتکنیکی دور میں اخلاقی وروحانی قدروں کے زوال سے تعلق رکھتا ہے ناول نگار نے بہت ہی جرات مندانہ انداز میں ٹی وی، کمپیوٹر، لیپ ٹاپ، موبائل فون اور دوسری ایسی تکنیکی سہولیات کے ذریعے گھر گھر میں فحاشی پہنچانے جیسے پہلوؤں کو ناول میں سمودیا ہے۔اس ناول میں یہ واضح اشارہ ملتا ہے کہ تکنیکی ایجادات کا غلط استعمال ان لوگوں کی زندگی تباہ کرتا ہے کس طرح وہ فلموں کے ہیرو اور ہیروئن کو دیکھ کر غلط راہ اپنا لیتے ہیں یہ ناول اپنے تمام فنی تقاضوں کو پورا کرتا ہے۔

نعیمہ احمد مہجور کا ناول''دہشت زادی''ایک سوانحی ناول ہے ناول کا موضوع نعیمہ احمد مہجور کی حیات پر مبنی ہے اس کو سوانحی ناول قرار دیا گیا ہے نعیمہ نے اپنی زندگی میں رونما ہونے والے حالات وواقعات کو کشمیر کی خواتین کے تناظر میں بیان کرنے کی کوشش کی ہے اس طرح یہ ناول پورے معاشرے کی عورتوں کی زندگی کی مکمل ترجمانی کرتا ہے حامدی کاشمیری کا ناولٹ''پرچھائیوں کا شہر''ایک نہایت ہی حساس، دانشمند اور تعلیم یافتہ لڑکی کی کہانی ہے جو اپنی منزل پانے کے لئے بہت کچھ سہنے کے لئے مجبور رہے ناولٹ اپنے

موضوع اورفن کے اعتبار سے ایک بہترین ناولٹ ہے پلاٹ مربوط، کرداروں کا عمدہ انتخاب، منظرکشی کی عمدہ مثالیں، مکالمے جاندارغرض کہ تمام فنی تقاضوں کو یہ ناولٹ پورا کرتا ہے۔

وحشی سعید عصر حاضر کے مشہور ناول نگار ہیں ان کا ناول ''پتھر پتھر آئینہ'' انسانی قدروں کے عروج و زوال کی ایک ایسی تاریخ ہے جسے پڑھ کر قاری میں ترقی کا جذبہ بھی بیدار ہوتا ہے اور دلوں میں محبت، ایثار اورقربانی کا جذبہ پیدا ہوتا ہے ''پتھر پتھر آئینہ'' ناول موضوع کے اعتبار سے نفسیاتی اور رومانی ناول ہے محبت کی ایک انوکھی کہانی کو اپنے منفرد انداز میں پیش کیا ہے جو اس بات کا ثبوت ہے کہ ناول نگار کو ناول کے فن پر مہارت ہے ''ایک موسم کا خط'' اس ناول میں ممبئی کی مدنی زندگی کی ایک جھلک ملتی ہے جس میں امیری اور غریبی کے تفاوت کو منعکس کرنے کی کوشش کی گئی ہے جس سے رومانی واقعات کی طرف اشارہ ملتا ہے۔ ''عجب زندگی ......غضب موت'' ناولٹ میں دولت کے لالچ، انتقام کی آگ، نفرت محبت کے جذبات ملتے ہیں یہ چیزیں ایک شریف انسان کو بھی کیا سے کیا بنا دیتی ہیں انہوں نے ناول کے ذریعے انتقام اور انتقام کے نتیجے میں ہونے والے حالات کے بارے میں آگاہ کیا ہے۔ یہ ناولٹ اپنے موضوع اورفن دونوں اعتبار سے ایک بہترین ناولٹ ہے۔ ''جائز ...... ناجائز'' ناولٹ میں وحشی سعید نے ایک اعلیٰ خاندان میں پیدا ہونے والے انور خان کی ناجائز اولاد افضل کی بہت دردناک کہانی بیان کی ہے۔ ''فطرت ......محبت ...... ندامت'' میں ناولٹ کا پلاٹ چھٹی اور ساتویں دہائی کی فلموں سے ملتا جلتا ہے جہاں مزدوروں کے حقوق کی خاطر ٹریڈ یونین کا قیام اور پھر کارخانے کا کسی ایسے حادثے سے دوچار ہونا جس کی وجہ سے اس کی سوچ میں مثبت تبدیلی آتی ہے اور فلم کا خاتمہ خوشی پر ہوتا ہے ''وحشت محبت'' اور ''قحط'' بھی اپنے موضوع اورفن کے اعتبار سے کامیاب ناولٹ میں وحشی سعید عصر حاضر کے مشہور ادیب ہیں۔

شفق سوپوری کا تعلق سرینگر کشمیر سے ہے ''نیلیما'' ناول کے ذریعے آدی واسی سماج کی عورتوں کی نفسیاتی کیفیت اور اس طبقے کے لوگوں کی بنیادی کمزوریوں کا مشاہدہ کر کے ناول میں پیش کیا ہے نیلیما کے ذریعے اس طبقے کی سچی تصویر پیش کی ہے نیلیما چونکہ شروع سے آخر تک مختلف پریشانیوں کا سامنا کر رہی ہے اس لئے وہ معاشرے کی ساری حقیقت کو اچھی طرح سمجھنے لگی۔ ناول میں یہ دکھانے کی کوشش کی گئی ہے کہ

آدی واسی مرد جنسی معاملات میں پاک رشتوں کا کوئی خیال نہیں رکھتے ہر کسی کو اپنی ہوس کا نشانہ بنا کر ظلم و جبر کرتے ہیں ناول کا پلاٹ مربوط ہے فنی و موضوعی دونوں اعتبار سے یہ کامیاب ناول ہے۔ شفق سوپوری کا دوسرا ناول ''فائرنگ رینج: کشمیر ۱۹۹۰'' ہے جس میں کشمیری عوام پر فوج کے ظلم و جبر کی داستان کو پیش کیا گیا ہے فوج جھوٹے الزامات لگا کر کشمیری عوام پر کس طرح ظلم و جبر کرتی ہے انہیں سچ سننے سے مطلب ہی نہیں۔ وہ سچ بتانے والے کو جھوٹے الزام میں پھنسا کر تشدد کا نشانہ بناتے ہیں ناول نگار نے بڑے جرات مندانہ انداز میں اس حقیقت کی تصویر کشی کی ہے۔ شفق سوپوری کے دونوں ناول اپنے موضوع اور فن کے اعتبار سے بہترین ناول ہیں۔

مجموعی اعتبار سے دیکھا جائے تو ریاست جموں و کشمیر میں اردو ناول کی تعداد اگر چہ بہت کم ہے لیکن اب اس کی رفتار میں تیزی بھی آئی ہے اور معیار میں بھی نمایاں تبدیلی رونما ہوئی ہے ریاست میں لکھے گئے اکثر ناول موضوع اور فن دونوں اعتبار سے کامیاب ناول ہیں۔